لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ

راشد شاز

لَا يَمُوتُ

ایک خودنوشت

لا یموت محض ایک خودنوشت نہیں گو کہ اسے اس پیرائے میں لکھنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے آپ کو بہت سی مانوس آوازیں سنائی دیں گی اور بسا اوقات تو ایسا لگے گا کہ آپ کا ان کرداروں سے جنم جنم کا رشتہ ہو۔ دبی کچلی آوازیں، کٹے پھٹے لوگ، مسخ شدہ زندہ لاشے جن سے زندگی کی رمق چھین لی گئی ہوں۔ ان ستم نصیبوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ دراصل ہوا کیا ہے۔ اہلِ یہود اپنے اوپر گزرنے والے سانحے کو ہولوکاسٹ سے موسوم کرتے ہیں اور فلسطینیوں نے اپنے قومی سانحے کو، جس نے ان کی معمول کی زندگی کو گذشتہ پچھتر برسوں سے تہہ و بالا کر رکھا ہے، نکبہ کا نام دے رکھا ہے۔ غم کے مارے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ سہولت بھی حاصل نہیں کہ اس حادثۂ عظمیٰ کو جو ان کے ساتھ پیش آیا ہے کوئی ڈھنگ کا نام ہی دے سکیں۔

کہنے کو تو یہ ایک شخص کی داستانِ حیات ہے مگر ان اوراق میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی شب و روز کچھ اس طرح رقم ہوتے چلے گئے ہیں کہ قاری ہر صفحے پر رک کر سوچتا ہے کہ اسے واقعات کی یہ ترتیب اور اس کے اندر پوشیدہ معانی کا علم اب تک کیوں کر نہ ہو سکا۔

بہتوں کے لئے یہ کتاب چشم کشا ثابت ہوگی۔ البتہ اس بیانیے کا ایک فطری نقص یہ ہے کہ یہ قصۂ جانکاہ بھی اپنی تمام تر محشر بیانیوں کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے اس حادثۂ عظمیٰ کو کوئی نام دینے میں ناکام نظر آتا ہے۔ کیا عجب کہ یہی اس کی خوبی بھی ہو کہ جب تک غیر معمولی واقعات وحوادث کے بیان کے لئے ایک نئی اور مناسب لغت وجود میں نہ آئے، لکھنے والا اسے گرفت میں لائے تو کیسے؟

Rs. 300.00

ISBN: 978-93-81461-39-6

Milli Publications
New Delhi

لایموت

ایک خودنوشت

ایک خود نوشت

لا یموت فیھا ولا یحییٰ

جہاں نہ انھیں موت آئے گی اور نہ وہ زندگی جئیں گے

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز نئی دہلی

اپنے پیارے بیٹوں ابراہم ہادی، محمد مہدی اور ان کی عمر کے دوسرے نوجوانوں،
خاص طور پر اپنے عزیز شاگردوں کے نام جن کے کاندھوں پر
اس ظلمت کدۂ شب کو سحر کرنے کی ذمہ داری آن پڑی ہے۔

ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

بارالٰہا!
تیرے مذبح خانے میں میرے یقین کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے...
تُو کنزاً مخفیا تھا، مگر جب سے تیرا ظہور ہوا ہمارے حالات دگرگوں ہیں...
کمزور دبا لیے گئے، نقص من الاموال والجوع کی باتیں اب ہمیں تسلی نہیں دیتیں...
کسی نے نازی تعذیب گاہ کی دیوار پر یہ کیا لکھ دیا:
'اگر کوئی خدا ہے تو اسے ایک دن مجھ سے اس بات کے لیے معافی مانگنی پڑے گی جو مجھ پر گذر رہی ہے...
آخر کس جرم کی پاداش میں؟'
تنگ آمد بجنگ آمد! یعقوب نے تجھ سے دو دو ہاتھ کیے
مگر ہم تو تیرے آخری علمبردار ٹھہرے، ہمارے حق میں بھی تو بروٹس بنا پھرتا ہے؟
ہم نہ رہے تو تیری ربوبیت کا علم کون اُٹھائے گا؟
تو کہتا ہے ہم اُمتِ مختار ہیں، واقعی! لطیف طنز میں تیرا کوئی ثانی نہیں۔
بہت ہو چکا اب ہمیں بخش دے، کارِ پیمبری کسی اور کو تفویض کر
یا رقیب بالعباد! اب بس کر!

فہرست

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گزر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق
مسلمانے زما بیچارہ تر نیست

ہندی غلاموں کی شب کی کوئی سحر نہیں۔اس مٹی میں سورج کا گزر نہیں۔ ہماری طرف نگاہِ کرم کریں کہ مشرق میں ہندوستان کے غلام مسلمانوں سے زیادہ کوئی بے بس و بیچارہ نہیں۔

ا

خالم مخول

ایک دن والد مرحوم خواب میں نظر آئے۔ صدر دروازے کے باہر، جہاں وہ اکثر مجھے بیرونی اسفار کے لیے خیر باد کہتے، ان کے ہاتھ میں قرآن مجید کا وہی نسخہ تھا جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے۔ چہرے پر طمانیت اور مسرت کی غیر معمولی کیفیت، ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی گلابی جاڑے کی صبح چہل قدمی کے لیے نکلے ہوں۔ کہنے لگے تم کیوں نہیں لکھتے، داستان کا اگلا حصہ تو تمھیں ہی لکھنا تھا۔

ابّا کے ہاتھ میں قرآن مجید کا وہ نسخہ جسے عرف عام میں حمائل شریف کہا جاتا ہے، آج عرصہ بعد دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ایمرجنسی کے ایام میں ظالموں نے انھیں اس نسخہ سے محروم کر دیا تھا۔ دُنیا کے مختلف اطراف و اکناف کی سیر کرتے ہوئے جب بھی قرآن مجید کے کسی خوبصورت نسخے پر میری نظر پڑتی، میں اسے ان کے لیے بہترین تحفہ سمجھتا۔ ایک بار استنبول سے بڑی تقطیع کا روشن نسخہ ان کے لیے خاص طور پر لے کر آیا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا، بہت خوش ہوئے اور پھر خاموش خلا میں گھورنے لگے جیسے وہ اپنے بچپن کا حمائل شریف تلاش کر رہے ہوں، جس کا ایک ایک صفحہ ان کے حافظے پر ہمیشہ ہمیش کے لیے مرتسم ہو کر رہ گیا تھا۔ قرآن مجید انھوں نے بالالتزام ہم سب بھائیوں کو خود پڑھایا۔ اس اہم فریضے کو انھوں نے کسی اتالیق کے سپرد کرنا کبھی مناسب نہ جانا۔ اور پھر اس کے مطالب و معانی پر بحث، ننھے دل و دماغ میں بڑے خیالات کی آبیاری، نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا، جیسی کہ وہ تھی بچپن سے ہی مختلف دکھائی دینے لگی۔ مگر یہ سب کچھ ایک ہلا مارنے والی دلخراش داستان تھی جس کے بیان کے لیے ایک نئی لغت کی ضرورت تھی۔ اس لغت کی تلاش میں، میں نے دُنیا کے مختلف ملکوں کی خاک چھانی۔ ان اقوام و ملل کی تاریخ اور ان سے تعامل کی بھی کوشش کی جن پر گذشتہ صدیوں میں مصائب و آلام کے غیر معمولی حوادث پیش آئے ہیں۔ مسلم اسپین کے موریسکو مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کے لیے جن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا، کولمبس کی نئی دُنیا میں مقامی آبادی اور سیاہ فام افریقی غلاموں پر جو قیامت گزری، نازی جرمنی میں اہل یہود کے تعذیبی کیمپ اور کمیونسٹ روس میں گلاگ آرکی پیلیگو کی دلخراش داستانوں میں ایک ایسے اسلوب کی تلاش میں سرگرداں رہا جو میرے ذاتی

کرب اور ملّی محرومیوں کو بیان کرنے میں کسی قدر ممد و معاون ہوسکے۔ برسہا برس کی اس تلاش وجستجو کے دوران مجھ پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری رہی۔ ایام طالب علمی کا واقعہ ہے۔ ایک دن لندن میں بس کی بالائی منزل پر سوار تھا کہ اچانک ورجن میگا اسٹور پر نظر پڑ گئی۔ خیال آیا کہ شاید گوہر مقصود یہاں ہاتھ آئے۔ کرب واندوہ کی ویڈیو یہاں کچھ زیادہ تو نہ ملی البتہ ایک مغنیہ انقلاب کے توسط سے ایک ریڈیکل بک شاپ تک رسائی ضرور ہوگئی، جہاں انقلابی لٹریچر، شعلہ بار خطیبوں کے کیسٹ اور مختلف اقوام وملل پر ہونے والے مظالم کی ڈاکیومینٹری حتیٰ کہ اہل یہود پر گزرے مظالم کی فیچر فلمیں بھی وافر تعداد میں دستیاب تھیں۔ ایک نئی لغت کی تلاش میں، میں نے ان تمام عجائب گھروں کو بھی چھان مارا جن کی زیارت سے عام انسانوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، لیکن تب بھی مجھے اس لغت کی تلاش میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

بات یہ ہے کہ یہودیوں کا ہولوکاسٹ، سیاہ فام غلاموں کا ڈی ہیومنائزیشن، نوآبادیاتی استعمار کے ہاتھوں مقامی آبادی کی نسل کشی جیسے واقعات کا تعلق ایک محسوس عمل سے تھا۔ لوگوں کے لیے ان مظالم سے آگہی کچھ زیادہ مشکل نہ تھی، لیکن آزاد ہندوستان میں مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی اس کا حقیقی احساس و ادراک ہمارے کبار زعما کو بھی کم ہی تھا۔ ان کا جسم تو جیل کی سلاخوں سے باہر تھا، لیکن ان کے دل و دماغ میں آہنی سلاخیں کچھ اس انداز سے اُگ آئی تھیں کہ اب ان کے لیے خود اپنی حقیقی قدر و قیمت کا ادراک مشکل ہو کر رہ گیا تھا۔ بظاہر ان کے پیر زنجیروں سے آزاد تھے، لیکن فی الواقع انھیں اپنی زنجیروں سے پیار تھا۔ وہ ایک مجبور و بے بس اور مقہور اقلیت میں تبدیل ہو چکے تھے اور انھیں اپنی اسی حیثیت کے برقرار رکھنے پر اصرار بھی تھا۔ ایک دن اپنے مشفق استاذ سیدی وقار حسین صاحب مرحوم کی مجلس میں بیٹھا تھا، کہنے لگے: ہمارے ہاں یہ جو تعذیب کا انداز ہے، شکست و ریخت کا داخلی عمل ہے، اس پر خود تعذیب کے ماروں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے، پھر بھلا دوسروں کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع کیسے ہو۔

* * *

بچپن کی دھندلی یادوں میں بعض کرداروں کی سرّیت بہت بعد تک ایک معمہ بنی رہی۔ ان کا اصل نام تو کسی کو پتا نہ تھا۔ لوگ انھیں عرفِ عام میں پروفیسر کہتے۔ سیاہ اچکن میں ملبوس سر پر سیاہ مخملی ٹوپی، ہاتھ میں سفید موتیوں والی خوبصورت تسبیح اور جیب سے لٹکتی ہوئی گھڑی کی سنہری چین، ان کے سج دھج میں اضافہ کرتی۔ ایک چھوٹی سی ڈائری یا بیاض اپنے پاس رکھتے اور اکثر اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ پروفیسر کا کوئی گھر تھا اور نہ کوئی رشتہ دار، بال بچے تھے اور نہ خاندان۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ یہ آتے کہاں سے ہیں اور جاتے کہاں ہیں۔ ان کی چلت پھرت میں ایک بے نیازانہ شان تھی۔ بولتے کم اور سوچتے زیادہ تھے اور پھر نہ

جانے کیا اپنی ڈائری میں کچھ لکھتے جاتے۔لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہتے۔کوئی انھیں مجذوب اور دیوانہ گردانتا اور بعضوں کے نزدیک کثرت علم و دانش کے ہاتھوں ان کی شخصیت مجروح ہوگئی تھی۔ باتوں باتوں میں فرماتے: افغان خفی مخول است۔شدت جذب میں خالم مخول کی گردان کرتے اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو انگریزی زبان میں جارج پنجم کو لکھے گئے اپنے مکتوب کے پیراگراف کے پیراگراف ان کی زبان پر آجاتے۔ یہ بات بہت بعد میں پتا چلی کہ پروفیسر ایک تعلقہ دار خاندان کے چشم و چراغ تھے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوکر لاہور کی ایک سرکاری دانش گاہ میں ابھی اپنی عملی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا کہ تقسیم کا سانحہ پیش آ گیا۔کئی سال کی کشمکش کے بعد بالآخر وطن کی خوشبو انھیں ہندوستان لے آئی، لیکن یہاں ان پر جو قیامت گزری اس نے ان کے وجود کو اندر سے منہدم کر دیا۔ وہ عالم جذب میں اب دُنیا کو تکا کرتے۔آزاد ہندوستان میں ان کے لیے اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن جب وہ ہمارے گھر آتے، بزبان خود اپنی دعوت کا اعلان کر دیتے۔ ایسا صرف ہمارے ہاں نہ ہوتا بلکہ اکثر گھروں میں ان کی دعوت کے انعقاد کا یہی انداز تھا۔ایک دن کھانے سے فراغت کے بعد جب ان پر وارفتگی کا عالم طاری تھا اور وہ فارسی کا کوئی مصرع گنگنا رہے تھے، میں نے ان کے اس خوشگوار موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا: یہ آپ اپنی بیاض میں کیا لکھتے رہتے ہیں؟ کہنے لگے تمھیں پتا نہیں، دراصل میں خط لکھنے کا عادی ہوں، چھوٹے چھوٹے پیغامات لکھتا ہوں۔ کسے لکھتے ہیں اتنے سارے خط آپ؟ یہ سن کر زیر لب مسکرائے، اپنی جیب سے چھوٹے چھوٹے کئی لفافے نکالے جن پر لکھا تھا، مستقبل کے نام۔مگر مستقبل تو کوئی شخص نہ ہوا، پھر آپ کے یہ خطوط ڈاکیہ کسے دے گا؟ یہ سن کر اچانک ایسا لگا جیسے انھیں کوئی صدمہ پہنچا ہو، وہ مبہوت ہوگئے ہوں۔ان پر حزن و یاس کی وہی پرانی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ پھر سے دور خلا میں گھورنے لگے۔

پروفیسر جب بھی آتے ایک نئے مژدہ یا ایک نئی وعید کی اطلاع دیتے۔کبھی کہتے سبز گنبد سے ندا آرہی ہے، بہت جلد اہل ایمان کو فتح نصیب ہوگی۔کبھی کہتے اہل یہود کو عنقریب تابوتِ سکینہ ملنے والا ہے، ہم ایک ملحمۂ کبریٰ کے قریب آ پہنچے ہیں۔کبھی فرماتے مزامیر داؤد اب مغرب کو منتقل ہوگیا ہے، اب مشرق میں کچھ نہیں رکھا۔ سننے والے کہتے: لگتا ہے پروفیسر نے آج کوئی نیا خواب دیکھا ہے، مگر وہ ان باتوں سے بے پروا اپنی بیاض میں بڑی سرعت کے ساتھ کچھ لکھتے جاتے۔ ایک دن جو قریب سے دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پورے صفحہ پر بار بار یہی دو الفاظ لکھے گئے تھے: خالم مخول خالم مخول خالم مخول....

پروفیسر کی سیاہ اچکن ہم بچوں کے لیے خاصی دلچسپی کی چیز تھی۔ اس اچکن میں نہ جانے کتنی جیبیں تھیں اور ہر جیب میں ایک الگ دُنیا آباد تھی۔کسی جیب میں بیاض اور قلم رکھا ہے تو کہیں جیبی گھڑی لٹک رہی

ہے۔ کہیں تہہ بہ تہہ کاغذات ہیں تو کہیں تازہ بہ تازہ لکھے گئے خطوط اور کہیں ضرورت کی مختلف چیزیں۔ گویا اچکن نہ ہو پورا سفری خیمہ ہو، جسے پروفیسر ہمہ وقت اپنے ساتھ لیے چلتے۔ گرمی کے موسم میں یہ اسے خاص انداز سے موڑ کر اپنے شانوں پر آویزاں کر لیتے۔ فرشی مجلسوں اور خاص طور پر کھانا کھاتے ہوئے وہ اسے اپنے پاس ہی نگاہوں کے سامنے رکھتے، لیکن اٹھتے ہوئے ایک ندائے وحشت بلند کرتے: ہائے میری اچکن، کہاں گئی میری اچکن۔ حالانکہ وہ سامنے ہی پڑی ہوتی اور انھیں نظر نہ آتی۔ کبھی کبھی تو خوب واویلا کرتے۔ لوگ ان کی اچکن اٹھا کر ان کی گود میں رکھ دیتے، پھر وہ اچکن کی جیبوں کو ٹٹولتے، تب انھیں یقین آتا کہ ان کی اچکن انھیں دوبارہ مل گئی ہے۔ ویسے تو وہ اخبار کی باریک تحریریں بھی پڑھ لیتے لیکن نہ جانے اچانک ان کے ساتھ کیا ہوتا کہ وہ شور مچاتے کہ ارے کہاں گئی میری بصارت، مجھے کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی لنگڑاتے ہوئے چلتے اور یہ کیفیت ان پر کئی دنوں تک طاری رہتی، حالانکہ ان کی دونوں ٹانگیں سلامت تھیں۔ چلتے چلتے اچانک دائیں طرف کچھ اس طرح جھک جاتے گویا کسی گولہ باری کا شکار ہونے سے بچ رہے ہوں۔ کبھی ہم کلامی کچھ اس انداز سے کرتے جیسے جنوں کی مجلس میں بیٹھے ہوں اور بیک وقت کئی لوگوں کو الگ الگ جواب دے رہے ہوں۔ کبھی اچانک اُٹھ کھڑے ہوتے، کہتے چلیے چلیے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ حالانکہ ان کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا۔ بچے ان ہی حرکتوں کے سبب ان سے تفریح لیتے اور بڑی عمر کے سنجیدہ لوگ انھیں مجذوب سمجھتے۔ ایک دن میں نے والد صاحب سے پوچھا: یہ پروفیسر صاحب اس طرح کی حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟ اپنی اچکن کو خود ہی گم کرتے ہیں، حالانکہ وہ سامنے پڑی ہوتی ہے، ڈائری میں خالم مخول لکھتے ہیں اور اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک لنگڑانے لگتے ہیں۔ بولے: بیٹا حالات کا مارا ہے، آگ وخون کے دریا سے گزرا ہے، تعذیب کے سفر میں اپنے آپ کو بحال نہ رکھ پایا، ہر شخص میں غم سہارنے کی قوت نہیں ہوتی، اس کے اندرون میں کوئی کاری زخم لگا ہے، زخمی روح اسے بے چین کیے رکھتی ہے، اللہ اس پر اپنا فضل کرے اور ایسی آزمائش سے دوسروں کو محفوظ رکھے۔

بچپن کی یادوں میں پروفیسر تنہا ایسے کردار نہیں جو حالات کی فتنہ انگیزیوں کے سبب اپنا آپ برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔ مجذوبوں اور دیوانوں کی ایک کہکشاں تھی جو والد صاحب سے ہمدردی کے دو بول سننے اور حسنِ سلوک کی توقع میں ان کے گرد جمع رہتی۔ ایک صاحب تھے بوتل میاں، ان کی عمر ایک سو چار سال بتائی جاتی۔ کمر خمیدہ ہو کر کمان بن گئی تھی، لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلتے۔ آواز میں وہی ترنگ، جذبۂ جہاد سے سرشار، اکل حلال کی تلاش میں سرگرداں۔ اس عمر میں بھی وہ مسجد کے سامنے کتابوں کا اسٹال لگاتے اور اپنی محنت سے اپنا رزق حاصل کرتے۔ خمیدہ کمری کے باوجود ان کے کندھے سے ہمیشہ ایک تھیلا لٹکتا رہتا جس میں

دینی کتابیں اور سیپارے وغیرہ ہوتے، گویا یہ ان کی چلتی پھرتی دکان تھی۔ اکل حلال کے ساتھ ساتھ تبلیغ و اصلاح کا کام بھی جاری رہتا۔ معاملات میں انتہائی کھرے، چھوٹوں پر شفیق اور جود وسخا میں اوروں سے بڑھ کر لیکن کیا مجال کہ ان کے سامنے کوئی اجلی پیاز کا تذکرہ کردے۔ اجلی پیاز کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتے۔ ایک دن کسی کے کہنے پر میں نے اپنی معصومیت میں ان سے پوچھ لیا: بڑے میاں! کیا آپ کے پاس اجلی پیاز ہے؟ بس نہ پوچھیے ایک قیامت گزر گئی۔ میں نے اتنے کریم اور شفیق بزرگ کو اچانک اس طرح رخ بدلتے نہ دیکھا تھا، میں رونے لگا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بڑے میاں تحریک خلافت کے ہراول دستہ میں رہے ہیں۔ محمد علی اور شوکت علی کی تحریک میں انھوں نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ یہ کیفیت کچھ اس طرح ان کی شخصیت کا حصہ بنی کہ وہ آج بھی اسی طرح اپنا عصا اٹھا کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے، گویا ابھی ابھی محمد علی کے جلسۂ خلافت سے واپس آرہے ہوں۔ ایک عرصہ گزرا، حالات بدل گئے، خلافت ختم ہوئی، ملک تقسیم سے دوچار ہوا، لیکن بڑے میاں پر مجاہدانہ جذب کی وہی کیفیت طاری رہی۔ اب اگر انھیں کوئی خمیدہ کمری کا حوالہ دیتا اور اُجلی پیاز کے استعارے سے ان کی کبرسنی پر طنز کرتا تو وہ اسے اپنے جذبۂ ایمانی کی نفی سمجھتے۔

ایک صاحب تھے منشی ایوب، ان کا تعلق جنوبی ہند کی کسی ریاست سے تھا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں ہمارے پڑوس میں آکر بس گئے تھے۔ غالباً ان کے آگے پیچھے بھی کوئی نہ تھا۔ یہ صاحب تنہا ایک بڑے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی شیریں مقالی کی یاد آج بھی میرے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ فنا ان کا خاص موضوع تھا۔ وہ موت کا بیان کچھ اس دلچسپی اور رنگ آمیزی کے ساتھ کرتے کہ زندگی کے مقابلہ میں موت ایک بہتر متبادل معلوم ہونے لگتی۔ اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ منشی ایوب اپنی ہر گفتگو میں موت کی کیفیت کا بیان کیوں لے بیٹھتے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ ایام شباب میں وہ اسلامی ریاست کی تمنا میں پاکستان جا پہنچے تھے۔ شومئ قسمت کہ وہ جس ٹرین میں سوار تھے اس میں پاکستان پہنچتے پہنچتے چند ہی لوگ زندہ بچ پائے تھے۔ خود منشی ایوب پر کئی دنوں تک سکتہ کی کیفیت طاری رہی۔ حملہ آوروں نے مردہ سمجھ کر ان سے اعراض نہ کیا۔ پھر جب ہوش میں آئے تو گویا ایک دُنیا بدل چکی تھی۔ پاکستان میں انھیں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی سو بالآخر وہ ہندوستان لوٹ آئے۔ دو تین دن یا اس سے زیادہ منشی ایوب پر سکتے (coma) کی جو کیفیت رہی یہ تجربہ ان کا حاصلِ سفر بن گیا۔ جب کبھی موڈ میں ہوتے بڑی دلآویزی کے ساتھ عالم بالا کے اس سفر کی روداد سناتے۔ فرماتے: موت خوف کھانے کی چیز نہیں، یہ تو دروازہ ہے، ابدیت میں داخلے کا دروازہ۔ بس جانو ایک طویل سرنگ ہو جس کے دوسرے سرے پر نور ہی نور ہو۔ ارواح اور فرشتے آپ کے استقبال کے لیے پلکیں بچھائے ہوں۔ سرنگ میں داخلہ کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہلکے ہو کر فضا میں

تیرنے لگے ہوں۔ غم و اندوہ، تفکر و الم سب کچھ کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہو۔ ایک ناقابل بیان انبساط آپ پر سایہ فگن ہو، جیسے جیسے آپ سرنگ کا سفر کرتے جاتے ہیں پچھلی زندگی کے جاہ و حشم ہیچ معلوم ہوتے ہیں، گویا مدت بعد قیدی کو رہائی نصیب ہوئی ہو۔ حریت ابدی کی مسرتوں کا بیان انسان کے بس کی بات نہیں۔

اس زمانہ کی مقبول عام کتابیں دوزخ کا کھٹکا اور موت کا جھٹکا جسے پڑھ کر موت سے وحشت پیدا ہوتی تھی، منشی ایوب کی سحر بیانی ان سب پر پانی پھیر دیتی تھی۔ دو چار بار جو بھی ان کی مجلس میں بیٹھ جاتا اس کے اندر سے موت کا ڈر غائب ہو جاتا۔ اب جو ان کی باتوں کو یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ بظاہر ایک عام سے تاجر کو دل و دماغ کی تقلیبِ نو reconditioning پر یہ قدرت کہاں سے حاصل ہوگئی تھی۔ مایوس لوگوں میں وہ زندگی کی جوت جگاتے اور مال و جاہ کے اندھے خوگروں کا تناظر کچھ اس طرح بدلتے کہ ان کے دل و دماغ کی کایا پلٹ ہو جاتی۔ وہ اپنی معجز بیانی کے سبب اکثر محفل پہ چھا جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر اسٹیفن سے ان کی نوک جھونک جاری رہتی جو اس شہر میں انگریزی دواؤں کے بڑے تاجر تھے۔ ڈاکٹر اسٹیفن ہمیشہ سوٹ بوٹ اور ٹائی میں ملبوس رہتے۔ ان کے ہاتھ میں انگریزی کا کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ اندرون تو ان صاحب کا بھی مجروح تھا، البتہ انھوں نے اپنے غم کو مغربی طرز معاشرت میں چھپا رکھا تھا۔ جون جولائی کی سخت گرمی میں بھی ڈاکٹر اسٹیفن جب رکشہ سے اترتے تو ان کے سوٹ اور ٹائی کے تکلف میں کوئی کمی نظر نہ آتی۔ اس زمانہ میں سائیکل کو بھی ایک معزز سواری کا رتبہ حاصل تھا، ان کے ایک دوست جنھیں لوگ عرف عام میں کالا صاحب کہتے، سیاہ سوٹ میں ملبوس پیدل سائیکل لے کر چلتے کہ سائیکل انھیں چلانا نہ آتی تھی۔ وہ اس سے شخصی وجاہت میں اضافہ کا کام لیتے تھے۔ تب یہ باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھیں۔ اب ان واقعات کو تقسیم ہند کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو اس عہد کا ناقابل بیان کرب اور اس کا احساس ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتا ہے۔ آزادی کے نام پر انسانی تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی عمل میں آئی۔ کوئی ڈیڑھ کروڑ لوگ اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ دس سے بیس لاکھ کے قریب بہیمانہ قتل و غارت گری کا شکار ہوئے اور پھر نفرت کی آگ کچھ اس طرح لگی کہ اسے آنے والے دنوں میں بھی مختلف انداز سے سلگتے رہنا تھا۔ بھلا عام گوشت پوست کے انسان اس درندگی کو کہاں سہار پاتے، سو کوئی مجذوب بنا، کسی نے تصوف کے دامن میں پناہ لی، کوئی موت کی لذت آمیز تمنا میں جیتا رہا اور کسی نے اپنے زخموں پر مغربی طرزِ معاشرت کا پردہ ڈال لیا۔

ہندوستانی مسلمانوں پر کچھ اس انداز سے غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹا کہ بڑے بڑوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ ابھی ۱۸۵۷ء کے سقوط دہلی کے اسرار و عواقب کا پوری طرح اندازہ نہ کر پائے تھے کہ ۱۹۲۴ء

میں عثمانی خلافت کے سقوط کا سانحہ پیش آ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر خلافت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن یہاں بھی انھیں مایوسی اور محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا، اور اب تقسیم ہند کے سانحہ نے تو ان کی جڑوں پر ہی تیشہ چلا دیا تھا۔ ان کی ملّی اور عددی قوت پاش پاش ہوکر رہ گئی تھی۔ گویا ہندوستانی مسلمان کئی نسلوں سے ایک تعذیب مسلسل اور فکری بحران کی کیفیت میں جی رہے تھے۔ شاید ہی ایسا کوئی خاندان ہو جو صوفی، مجذوب یا دیوانہ کے وجود سے خالی رہ گیا ہو۔ ایک اضطراب مسلسل نے ہمارے خاندان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دادا مرحوم اس ذہنی الجھن کے شکار رہے کہ بچوں کو کس ڈھب پر ڈالا جائے۔ کبھی وہ انھیں بیرسٹر بنانے کی سوچتے اور کبھی تمسک بالدین کے خیال سے مولوی بنانا انھیں بہتر آپشن لگتا۔ بڑے ابّا اس کشمکش کی تاب نہ لاکر جامعہ ملیہ میں تعلیم کے لیے نکل آئے۔ راستہ پھر بھی کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس صورت حال نے دادا کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا، وہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ پائے۔ مشرقی علم و ورع کے اس روایتی خاندان میں تاریخ و ثقافت پر خاصا زور تھا۔ الیاس چچا نے اپنی ساری توانائی عہد اسلامی کے ہندوستان اور خاص طور پر بہار میں اس کے اثرات پر صرف کر رکھی تھی۔ صاف ستھری خوبصورت نثر میں ان کی تحریریں ہمارے ہاں موضوعِ بحث رہتیں۔ ان بحثوں کو اس وقت نئی مہمیز مل جاتی جب ہماری رشتہ کی ایک پھوپھی مہینہ دو مہینہ کے لیے ہمارے ہاں مہمان ہوتیں۔ ان کے شب و روز ایک خاص قسم کی روحانیت سے مملو ہوتے۔ صبح سے شام تک اوراد و وظائف میں مصروف رہتیں۔ حزب الاعظم، مجربات دیربی اور اس قسم کی دسیوں کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتیں۔ بعض کتابوں میں مختلف قسم کے وفق اور نقوش بھی ہوتے، دشمن کو زیر کرنے کا طریقہ، دعا کی قبولیت کے مجرب لمحات، ان جیسی باتوں پر مشتمل بعض مجلد بیاضیں بھی انھوں نے تحریر کر رکھی تھیں۔

ایک بار شہر میں ہندو مسلم فساد کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ہم لوگ جس علاقہ میں رہتے تھے وہاں مسلمان کم اور ہندو زیادہ تھے۔ عام مسلمان خوف زدہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ بھی مسلم علاقوں میں فوری طور پر منتقل ہوجائیں۔ صورت حال سنگین تھی مگر والد صاحب نقل مکانی پر آمادہ نہ ہوئے، ان کا کہنا تھا کہ اس طرح ہماری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اس دوران ہماری پھوپھی پر اطمینان کی عجیب کیفیت طاری رہی، وہ ہم لوگوں سے کہتیں فکر نہ کرو کچھ بھی نہیں ہوگا اور خود وظائف کے اہتمام میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ لگ جاتیں۔ یہ ان کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ چھوٹی عمر میں میرا تعارف نافع الخلائق اور نقش سلیمانی جیسی کتابوں سے ہوگیا۔ اس قبیل کی اور بھی بہت سی کتابیں تھیں جو خوبصورت چرمی جلدوں میں ہماری دسترس میں رہتیں۔ بالعموم کئی مختلف کتابوں اور رسالوں کو ایک ضخیم مجلد کا حصہ بنا دیا جاتا، لہٰذا قصیدہ بوصیری کی ورق

گردانی کرتے ہوئے داستان یوسف زلیخا سے بھی تعارف حاصل ہوجاتا۔ وفق ونقوش کی کتابوں میں میری غیرمعمولی دلچسپی دیکھ کر ایک دن والد صاحب نے تادیباً فرمایا: یہ کیا اخوربخور پڑھتے رہتے ہو، مگر منع بھی نہیں کیا، اچھا خیر! کہہ کر بات ختم کردی۔ ابا کی روحانیت عقل و دانش سے مملو تھی، جبکہ پھوپھی اس روایت کی امین تھیں جو انھیں ہمارے خاندانی بزرگ سید بشارت کریم سے منتقل ہوئی تھی۔ بشارت کریم کی کرامتوں اور خرق عادت واقعات کا علاقے میں چرچا تھا۔ لوگ ان کی قبر کی مٹی کو خاک شفا سمجھ کر لے جاتے تھے۔ اس عقلی اور روایتی طرز فکر میں ایک کشمکش تو ضرور محسوس ہوتی تھی لیکن تصادم کی کیفیت نہ تھی۔

مقامی کالج میں ریاضی کے ایک پروفیسر تھے جو تقریباً ہر روز ہمارے مکتبہ میں آتے۔ ملّی اور قومی مسائل پر ان کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی۔ کبھی وہ حالات کی تبدیلی کے لیے پرعزم دکھائی دیتے اور کبھی ان کی گفتگو یاس و محرومی سے مملو ہوجاتی۔ احیائی تحریکوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور کبھی ان کے اقدامات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے، ارے اس سے کیا ہوگا۔ اکثر گفتگو کے دوران ان کی آنکھیں نمناک ہوجاتیں۔ والد صاحب دلاسہ دیتے، ہمت بندھاتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کبھی ایک بزرگ ترکی ٹوپی اور سیاہ اچکن میں ملبوس آوارد ہوتے۔ اہل تشیع کے حلقہ میں ان کا بڑا نام تھا، ان کے شعری مجموعے شعلۂ ندا کی شعر و سخن کی دُنیا میں بڑی دھوم تھی۔ بعد میں وہ کسی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بھی ہوگئے تھے۔ انھوں نے بھی تکلّفات کے پردہ میں اپنے کرب کو چھپا رکھا تھا۔ وہ بہت کم کھلتے مگر جب کھلتے تو ان کے بیان میں آبشار کی سی روانی ہوتی، ایسا لگتا جیسے اجڑتے مکان اور جلتے سائبان کی تپش آپ کے دامن تک آپہنچی ہو۔

صبح کے جھٹپٹے میں ایک صاحب اکثر ہمارے ہاں دستک دیتے اور والد صاحب کو ساتھ لے کر صبح کی سیر کو نکل جاتے۔ چند ایک بار میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ ایک طرح کی سیمابیت ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔ عزم و ارادے کے دھنی تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے منصوبے بناتے رہتے۔ صبح کی سیر ان ہی باتوں سے مملو ہوتی۔ اس وقت تو یہ باتیں کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آتیں، بعد میں پتا چلا کہ وہ کئی ملّی اداروں کے سرپرست تھے۔ آگے چل کر جمعیت اہل حدیث کے آل انڈیا صدر بھی ہوگئے تھے۔ زخم خوردوں کی یہ کہکشاں جسے والد صاحب نے اپنے اردگرد سجا رکھا تھا، گویا ایک (continuing discourse) تکبیر مسلسل سے عبارت تھی اور اس صورت حال میں جاڑے کی آمد سے پہلے جب یادوں کے صندوقچے نکالے جاتے اور پاکستان جانے والے عزیز و اقارب کی امانتوں کو دھوپ دکھائی جاتی، چچا کی اچکن، بہنوں کے غرارے اور چچی کے طلائی سنگاردان کو صاف کر کے دوبارہ ان صندوقچوں میں واپس ڈالا جاتا، تب ابّا کا غم بھی بالآخر چھلک پڑتا۔ کہتے: 'پتہ نہیں جیلانی بھائی آئیں گے بھی یا نہیں'۔ انھیں آبدیدہ دیکھ کر والدہ تسلی دیتیں: 'ہاں

ہاں کیوں نہیں، چاہے رہنے کے لیے نہ آئیں، ملاقات کے لیے اور اپنا سامان لینے کے لیے تو ضرور آئیں گے۔ امانتوں کے یہ صندوقچے تو اگلی برسات تک کے لیے بند ہوجاتے، لیکن ان سے نکلنے والی عزیز و اقارب کی خوشبو ہر سال زخموں کو ہرا کر دیتی۔

ابا کی زندگی میں ویسے تو عقلی رویے کو بڑا دخل تھا، لیکن ان کے اکثر فیصلے وجدان اور اشاروں کے تابع ہوتے۔ ان کے ہاں عقل اور وجدان ایک دوسرے کے مخالف نہ تھے، بلکہ باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔ ایک شب انھوں نے کوئی خواب دیکھا۔ صبح کے جھٹپٹے میں گاؤں کے سفر کی تیاری ہونے لگی۔ اس زمانہ میں ٹرین کا سفر اور وہ بھی بال بچوں کے ساتھ بڑی جوکھم کا کام سمجھا جاتا تھا۔ ابتداًء تو اس بات کا اندازہ نہ ہوا کہ اچانک اس طرح بیٹھے بٹھائے گاؤں کے سفر کی کیا حاجت پیش آگئی۔ والد صاحب مہر بلب تھے، والدہ بھی کوئی شافی جواب دینے سے گریزاں تھیں۔ البتہ ٹرین جب اگلے اسٹیشن پر پہنچی تو گاؤں سے آرہے ایک فرستادہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان میں کسی کی موت ہوگئی ہے اور مرنے والے نے والد صاحب کے لیے جنازہ پڑھانے کی وصیت کی ہے۔ اس زمانہ میں موبائل یا انٹرنیٹ کا رواج نہ تھا، اہل دل اسی طرح کے اشاروں سے کام چلایا کرتے تھے۔ دوسرے پہر ٹرین منزلِ مقصود کو پہنچی۔ اسٹیشن پر بیل گاڑی موجود تھی جس پر بانس کی کھپچیوں سے ایک مختصر سا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ ہم بچوں کے لیے یہ بڑا دلچسپ سفر تھا۔ سڑک کے دونوں طرف تا حد نظر کھیت، کھلیان اور باغات کا سلسلہ، البتہ والد صاحب نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ غالباً اس زمانہ میں مردوں کے لیے سفر کی اس آسائش کو مناسب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ بیل گاڑی کا یہ لطف زنانہ سواریوں اور بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ گھر پہنچے تو دیکھا یہاں سب کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ مردان خانہ اور زنان خانہ ہر جگہ لوگوں کا ہجوم ہے۔ آنگن کے ایک گوشہ میں سفید کفن میں ملبوس ایک جنازہ رکھا ہے، جس کی ہر نیا آنے والا باری باری زیارت کررہا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ ماں کا جنازہ ہے۔ دراصل یہ ہماری رشتہ کی دادی تھیں جنھیں خاندان کے تمام بچے فرطِ محبّت میں ماں کہتے۔ ان کی اپنی چونکہ کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ ہم بچوں پر جان چھڑکتیں اور ان سے اپنی حقیقی اولاد کی طرح پیار کرتیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تو نہ تھا کہ میں گاؤں کے اس سفر میں ماں کو اس طرح دیکھوں گا، لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ لوگ آخر افسردہ کیوں ہیں، رو کیوں رہے ہیں، بلکہ غصہ اس بات پر تھا کہ ماں اس طرح ہمیں اکیلی چھوڑ کر کیوں چلی گئی ہیں۔ منشی ایوب کی مجلسوں میں بیٹھ کر یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ ماں اس وقت موت کے پردے میں مزے کررہی ہیں۔ خود تو نور کے ہالے میں گھری فرشتوں پر حکم چلا رہی ہیں، عالم ملکوت میں ان کے استقبال کی دھوم ہے، خادمان کے ہٹو بچو میں ہم بچوں کو وہ اس طرح بھول جائیں گی، مجھے اس بات کی

ان سے توقع نہ تھی۔ اسی دوران کسی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: دیکھیے یہ تو رویا بھی نہیں۔ اس پر کسی بڑی بوڑھی نے طرح لگائی: ہائیں بیٹا بچہ ہے، اسے کیا پتہ موت کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن مجھے تو اس بات کا غصہ تھا کہ وہ سرنگ کے اس پار نورانی دُنیا کا لطف لینے اکیلی کیوں چلی گئیں، یہ تو بڑی خودغرضی کی بات تھی اور ماں سے مجھے اس کی توقع نہ تھی۔

کچھ دن عزیز واقارب کی ہماہمی رہی، تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا، پھر رفتہ رفتہ جب معمول کی زندگی واپس آئی تو پتہ چلا کہ اب کچھ عرصہ تک ہم لوگوں کو گاؤں میں ہی رہنا ہے۔ مجھے ایک طرف تو والد صاحب کی مجلسوں کے چھوٹنے کا غم تھا اور دوسری طرف گاؤں کی نامانوس زندگی۔ لیکن جلد ہی اپنے ہم عمروں اور خاندان کے دوسرے بچوں کے شوق جگانے پر ان کے ساتھ مدرسے جانے لگا۔ دو چار دنوں تک تو کسی نے توجہ نہ دی، خوب تفریح رہی۔ جب چاہا مدرسے سے گھر واپس آگئے۔ پھر ایک دن داخلہ ٹسٹ ہوا اور اساتذہ کے لیے یہ ایک معمہ بن گیا کہ مجھے کس کلاس میں داخل کیا جائے۔ اُردو کی کتابیں، قصے کہانیاں فرفر پڑھتا اور سمجھتا تھا۔ پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی تمام جماعت کی کتابیں پڑھوالی گئیں، لیکن جب اِملا لکھنے کا وقت آیا تو ہر حرف الگ الگ لکھا۔ ریاضی اور دوسرے مضامین کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ کسی نے کہا کہ دوسری جماعت میں ڈال دو، کسی نے اعتراض کیا کہ نظم ونثر تو چوتھی جماعت کی پڑھ لیتا ہے مگر ریاضی تو پہلی جماعت کی بھی نہیں آتی، سو کچھ دنوں تک اسی مخمصے کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس طرح میری دعا سلام کئی جماعت کے طالب علموں سے ہوگئی۔ ایک دن والدہ نے اناج کے تلف شدہ دانوں کو جلا کر روشنائی بنائی اور لکڑی کی ایک نئی تختی مدرسے جاتے ہوئے میرے حوالے کی۔ شاید یہ میرے باقاعدہ داخلے کا عندیہ تھا۔ مجھے چاول کی روشنائی سے تختی پر لکھنا اور پھر اسے سبزہ زاروں پر گھس کر صاف کر دینا بڑا بھلا لگتا تھا۔ خاص طور پر جب بچے اپنی اپنی تختیوں کو سبزہ زاروں سے گھستے ہوئے آپس میں ریس لگاتے تو انبساط کی ایک کیفیت پیدا ہوجاتی۔ مجھے توقع تھی کہ میرا ہم جلیس عاصم اس نئی تختی کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا جس کی تختی سے میں کبھی کبھی ریس لگالیا کرتا تھا، لیکن آج وہ کسی مسرت کے اظہار کے بجائے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا: جانتے ہو قیامت قریب آگئی ہے، مسلمانوں پر بہت برا وقت آنے والا ہے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ معراج والی مسجد میں آگ لگادی گئی ہے، اب کوئی بڑی اَنہونی ہونے والی ہے۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہ آیا لیکن جب کئی دنوں تک بچوں کی زبان پر معراج والی مسجد کی بابت تشویش ناک باتیں سنتا رہا تو والدہ سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کی سیاست تو زیادہ سمجھ میں نہ آئی لیکن بچوں کی مجلسوں میں تشویش کی لے مسلسل تیز ہوتی گئی تب گاؤں کی مسجد میں بعض جوشیلی تقریریں ہوئیں اور

طلبا کی مجلسوں میں اہل یہود سے نپٹنے کے لیے خیالی منصوبے بنائے جانے لگے۔

یہ مدرسہ جس کے لوح پر درس گاہ اسلامی کمہر ولی کندہ تھا، ہمارے گھر سے بالکل متصل تھا۔ مدرسے کے اردگرد خالی میدان اور اس سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے قدرے بلندی پر گاؤں کی مسجد تھی، جس کے احاطہ میں خاندان کے بزرگوں کی قبریں واقع تھیں اور دوسری طرف اشیائے ضروریہ کی دکانیں۔ مسجد اور مدرسہ کو گاؤں کے قلب کی حیثیت حاصل تھی۔ مدرسہ کا سبزہ زار فارغ اوقات میں بھی بچوں کے کھیل کود اور ان کی سرگرمیوں سے معمور رہتا اور مسجد کے احاطہ میں بزرگوں کی مجلسیں آباد رہتیں۔ اب جو معراج والی مسجد میں آتش زنی کا واقعہ پیش آیا تو بچوں میں سراسیمگی اور بڑوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس زمانہ میں غالباً تجلی کے کسی شمارے میں سانحۂ مسجد اقصیٰ سے متعلق مولانا مودودی کا کوئی مفصل مضمون شائع ہوا تھا۔ والد صاحب جب اختتامِ ہفتہ پر گاؤں آئے تو اپنے ساتھ یہ شمارہ بھی ساتھ لائے۔ بزرگوں کے حلقہ میں بڑی بحثیں ہوئیں۔ ایک دن مردان خانہ میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا کہ کسی نے پوچھا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا ہم مسلمانوں کو اہل یہود کے ہاتھوں کیوں ذلیل کر رہا ہے۔ اہل یہود تو راندۂ درگاہ ٹھہرے، ان پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ مسلمانوں کی تذلیل اور وہ بھی اس مغضوب علیہم قوم کے ہاتھوں؟ کیا خدا نے اپنا دستِ شفقت ہم مسلمانوں سے اٹھا لیا ہے؟ اس وقت ان سوالوں کی چبھن کا کچھ اندازہ نہ ہوا۔ اب جو غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ سانحۂ اقصیٰ نے اس عہد کے مسلمانوں کی الٰہیاتی فکر میں کس قدر اتھل پتھل پیدا کر دی تھی۔

۲

ایں ہم برسرِ علَم

گاؤں کی زندگی ایک تفریحِ مسلسل سے عبارت تھی۔ بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ کبھی پیرا کی کا پروگرام بنتا، کبھی گنّے کے کھیتوں میں جانکلتے، کبھی چڑیوں اور مچھلیوں کے شکار کی سوجھتی اور کبھی موسم کے پھلوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے باغوں کا رخ کرتے۔ نوعمر بچوں پر تمام گھروں کے دروازے کھلے ہوتے اور پھلدار درختوں پر ان کا مشترکہ حق سمجھا جاتا۔ اکثر گھروں میں اخبار و رسائل پڑھنے کا رواج تھا۔ اس زمانہ میں ماہنامہ مولوی، ماہنامہ مخزن اور ماہنامہ نگار جیسے رسالوں کی بڑی دھوم تھی۔ بیشتر گھروں میں اس کی فائلیں محفوظ ہوتیں۔ گوکہ یہ بڑوں کے رسالے تھے، لیکن ہم بچوں کے لیے بھی ان میں دلچسپی کی کوئی نہ کوئی چیز نکل آتی تھی۔ غالباً مخزن کا کوئی شمارہ تھا جس میں فارسی محاوروں کا سیاق وسباق بتایا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں محاورے ذہن نشین ہوجاتے۔ ایک آدھ قصہ تو ذہن سے ایسا چپکا کہ آج بھی یاد ہے۔ مثال کے طور پر ’ایں ہم برسرِ علَم‘۔ سیاق اس کا یوں ہے کہ ایک مولوی صاحب چوری کے خلاف وعظ کہہ رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا: چوری صرف یہ نہیں کہ باقاعدہ نقب لگائی جائے، ڈاکہ ڈالا جائے بلکہ بعض چوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی شناعت کا ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً اسی درزی کے پیشہ کو لیجیے جو بڑے شوق سے کپڑے بچاتے ہیں اور اسے اپنی کاریگری اور فنکاری پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ قیامت کے دن جب انھیں ان کا علم تھمایا جائے گا تو چوری کے یہ تمام ٹکڑے حتیٰ کہ معمولی کترنیں بھی اس کے علم پر لٹک رہی ہوں گی۔ اس وقت اس سے اپنی یہ ذلت ورسوائی چھپائی نہ جائے گی۔ سخت افسوس ہوگا کہ ان معمولی کترنوں کے طفیل اس نے اپنی آخرت خراب کرلی۔ کہتے ہیں کہ اس مجلس میں ایک درزی بھی تھا، وہ اس وعظ سے متاثر ہوکر تائب ہوگیا اور اس نے یہ طے کیا کہ اب وہ اس حرکت سے باز رہے گا۔ ایک عرصہ گزرا، درزی اپنے عہد پر قائم رہا۔ جب بھی کپڑے کی چوری کا خیال آتا اس کی نگاہوں میں آخرت کا علم اور اس پر ٹنگے چوری کے رنگ برنگے کپڑے جھلملانے لگتے اور وہ اس عمل سے باز رہتا۔ اتفاق سے ایک دن ایک ایسا تھان آیا جس نے اس کے ارادے میں لرزش پیدا کردی۔ وہ بار بار تھان کو چھوتا، پھر اس خیال سے رکھ دیتا کہ وہ

چوری کرکے اپنی عاقبت خراب نہیں کرے گا۔ دو چار دن اسی طرح کپڑے کی سلائی ملتوی کرتا رہا۔ اب گاہک کے آنے کے دن قریب آ گئے تھے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنی فنکاری دکھانے کی ٹھان لی۔ بولا، 'ایں ہم برسرِ علم' یعنی جس علم پر اتنے سارے کپڑے لٹک رہے ہوں گے اس پر ایک اور سہی۔

اسی طرح کا ایک محاورہ، جو شاید اب اُردو میں کم مستعمل ہے، 'رو میں روا ہے' تھا۔ سیاق اس محاورہ کا یہ بتایا گیا تھا کہ ایک مولوی صاحب کے پڑوس میں مرغیاں پلی تھیں جو اکثر ان کے گھر آ جاتیں۔ جا بجا آنگن میں غلاظت کر دیتیں، گھر میں رکھے اناج کے ڈھیر سے حسب مقدور چگ لیتیں۔ مولوی صاحب تو خیر سے کام پر نکل جاتے۔ مرغیوں نے ان کی بیوی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ایک دن بیگم صاحبہ کو غصہ آیا اور انھوں نے بڑی ترکیب سے ایک مرغی کو دھر دبوچا۔ ذبح کے بعد پروں کو احتیاط سے آنگن میں دفن کیا اور بوٹیاں چولھے پر چڑھا دیں۔ دل ہی دل میں کہتی جاتی تھیں، ان مرغیوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا، یہ مجھے تپاتی تھیں، آج میں انھیں پکا رہی ہوں۔ شام میں جب مولوی صاحب گھر آئے تو انھیں گوشت کی خوشبو معلوم ہوئی۔ پوچھا خیریت ہے کیا پکایا ہے؟ بولیں کیا کرتی مرغیوں نے تنگ کر رکھا تھا، میں نے غصہ میں آ کر پڑوسی کی ایک مرغی ذبح کر ڈالی۔ مولوی صاحب بہت غضبناک ہوئے بولے، خدا کی بندی تم نے یہ کیا کیا، یہ تو سراسر حرام ہے۔ میں تو یہ حرام مال نہیں کھا سکتا۔ بیوی بولیں، ہے ہے تمھارا فتویٰ بھی عجیب ہے۔ ان مرغیوں نے اب تک نہ جانے ہمارا کتنا غلہ چٹ کر ڈالا، اس پر سے گندگی الگ۔ اب اگر ایک مرغی میں نے ذبح ہی کر ڈالی تو وہ حرام کیسے ہوئی، ویسے رہنے دو اگر تم اس کا گوشت نہیں کھاتے تو میں تمھارے لیے لہسن اور مرچ کی چٹنی پیسے دیتی ہوں۔ یہ سن کر مولوی صاحب ذرا سٹپٹائے، بولے: ارے خدا کی بندی گوشت تو رہنے دے، وہ تو ہم نہیں کھائیں گے لیکن اس میں پانی اور مصالحہ تو ہمارا لگا ہے، ایندھن تو ہمارا خرچ ہوا ہے، ہم اس کا شوربہ پی لیں گے۔ اب مولوی صاحب کی بیوی نے ایک کٹورے میں شوربہ انڈیلنا شروع کیا۔ ساتھ میں بوٹیاں بھی آنے لگیں تو انھوں نے چمچہ سے روکنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب بولے، خدا کی بندی چمچہ نہ لگاؤ جو خود سے آ رہا ہے آنے دو 'رو میں روا ہے'۔ یہ سن کر مولوی صاحب کی بیوی کی ہنسی نکل گئی۔

جب ایک عام درزی سے لے کر علم و ورع کے حاملین تک طمع دُنیا میں اس طرح غوطے لگا رہے ہوں اور جب عامی سے لے کر عالم تک فکر و عمل کے تضاد میں اس طرح مبتلا ہو تو اس احساس کا پیدا ہونا فطری ہے کہ اہل ایمان کی روحانی زندگی کا کس بل نکل چکا ہے۔ پھر بھلا انھیں خدا کے لمس شفقت سے کیا واسطہ؟ ایک عمومی محرومی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

ہر سال عید قرباں کے موقع پر گاؤں میں ایک اجتماع عام ہوتا۔ مدرسے کے احاطے میں بڑی بڑی دیگیں چڑھتیں، ایک جشن کا ماحول ہوتا۔ امیر غریب، بوڑھے بچے، خواتین وحضرات سبھی اس اجتماعی کھانے میں شریک ہوتے۔ بچوں کے لیے تو اس کی اہمیت ایک سیر وتفریح سے زیادہ نہ تھی، البتہ بڑے بزرگ رات ڈھلے قندیلوں کی روشنی میں مختلف مسائل پر بحث ومباحثہ کرتے۔ مدرسہ کی تعلیمی صورت حال، گاؤں کی عمومی فلاح و بہبود اور ملت اسلامیہ کو پیش آنے والے مسائل پر غور وخوض ہوتا۔ جلسہ تو اس دفعہ بھی منعقد ہوا لیکن اس میں جشن کی وہ کیفیت نہ تھی۔ سانحۂ مسجد اقصیٰ کے سبب ایک عمومی افسردگی اور حزن کی کیفیت چھائی رہی۔

مدرسے کا سالانہ جلسہ بڑے تزک واحتشام سے منایا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں کو انتظار ہوتا۔ ان جلسوں کی خاص بات یہ تھی کہ پورا گاؤں خود کو اس سے متعلق محسوس کرتا۔ مدرسے کے صحن میں ناظرین کے لیے کرسیاں اور جازم بچھادی جاتیں اور اس کے پیچھے تا حد نظر چارپائیوں سے باڑ بنادی جاتی، جس کے چلمن سے خواتین جلسہ کی کارروائی کا مشاہدہ کرتیں۔ اپنے بچوں اور ناتی پوتوں کے تعلیمی مظاہروں کو دیکھ کر ان کا دل خوشی سے نہال ہوا جاتا۔ سچ کہیے تو مدرسہ کی مرکزیت نے پورے گاؤں کو ایک معنویت کے احساس سے جوڑ دیا تھا۔ چارپائیوں کی باڑ کے پیچھے سے پروگرام کے مشاہدے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ مردوں کی صفوں میں بیٹھ کر ایک طرح کے ڈسپلن اور شرافت کا مظاہرہ ضروری سمجھا جاتا تھا، جبکہ عورتوں کے خیمہ میں بچوں کی اچھل کود، شور شرابے اس تفریحی شام میں چار چاند لگادیتے تھے۔ تقریری مقابلوں کے بعد تمثیلی مشاعروں کا دور شروع ہوا۔ ایک طالب علم نے جوتر کی ٹوپی اور سیاہ اچکن میں نظیر اکبرآبادی کا روپ دھارے ہوئے تھا، کچھ اس شان سے قوالوں کے انداز میں نغمہ سرائی شروع کی کہ سماں بندھ گیا۔

’ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

گانے والا جب اس شعر پہ پہنچا:

قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن، دولت، ناتی، پوتا کیا، اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو میں نے محسوس کیا کہ اکثر بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری رہ جاوے گی
ایک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تونے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بٹیا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا۔ . . . .

تمثیلی شاعر کے ساتھ طلبا کی ایک ٹولی بڑی خوبصورتی کے ساتھ بند کے مصرعے میں کچھ اس طرح اپنا حصّہ ڈالتی کہ ایسا لگتا جیسے روانگی کا نقارۂ عام بج چکا ہو اور صور اسرافیل اب چند ہی ثانیے کی بات ہو۔ ایک صاحبزادے جن کی آنکھوں پر کھلونوں والا چشمہ اور سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی تھی، کوئی عظیم آبادی شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ جب وہ اس مصرع پر پہنچا:

تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

تو ماحول پر ایک پراسرار سناٹا طاری ہو گیا۔

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں پاس اپنے بلالے بہتر ہے
اب درد جدائی سے ان کی اے آہ بہت بیتاب ہیں ہم

تو ایسا لگا کہ یہ شاعر کا شخصی درد نہ ہو بلکہ وہ ہماری ملّی صورت حال پر تبصرہ کر رہا ہو۔ اور خاص طور پر اس مصرع نے کہ

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پر پہنچتے ہیں دو ایک

ایسا لگتا تھا ہماری ملّی سفر کی ناکامیوں کی تکلیف دہ یادیں پھر سے تازہ کر دی ہوں۔

مدرسہ کا سالانہ جلسہ یوں تو عمومی جشن کی حیثیت سے منایا جاتا، لیکن مضامین کے انتخاب، نظموں کی پیشکش اور موضوعات کی ترتیب شاید غیر ارادی طور پر کچھ اس طرح ہو جاتی کہ جشن کے ان مواقع پر بھی ایک عمومی حزن کی کیفیت کا واضح احساس ہوتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دُنیا کی بے بضاعتی اور فنا کے استعاروں سے مذہبی زندگی کچھ اس طرح مملو تھی کہ حزن کو ہماری نفسیاتی اور قومی شناخت کے علاوہ ایک مستند مذہبی علامیے کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ کچھ تو ہے کہ خدا نے اس قوم کو حالات کے رحم و کرم پر اس طرح چھوڑ دیا ہے، ان دنوں بڑی بوڑھیوں کے وظیفوں میں 'میری بار کیوں دیر اتنی کری' کی تکرار کثرت سے سننے کو ملتی۔

گو کہ گاؤں میں ایک عمومی خوشحالی کا ماحول تھا۔ لوگوں کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ اجناس اور اشیائے خور و نوش موجود تھیں۔ باہمی لین دین اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کو تحسین کی نگاہ

سے دیکھا جاتا۔ تعلیم عام تھی اور بہت سے لوگ کلکتہ، بمبئی جیسے شہروں میں تجارت کی غرض سے جا بسے تھے۔ بعضوں نے خلیجی ممالک حتیٰ کہ یورپ اور امریکہ میں بھی اپنے مستقر بنا لیے تھے۔ عید، بقرعید کے سالانہ جلسوں میں ان حضرات کی شرکت اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے ایک عمومی بیداری کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، لیکن اس مرفہ الحالی کے باوجود ایک مہیب خلا کا احساس ہوتا۔ بڑے ابّا جب بھی شہر سے آتے مدرسہ کے دالان میں ایک جلسہ ضرور منعقد ہوتا، جس میں وہ اس گاؤں کو ایک مثالی بستی میں تبدیل کرنے کا منصوبہ پیش کرتے۔ درس گاہ (مدرسہ) کا قیام ان کی ہی تحریک پر عمل میں آیا تھا، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کو تعلیم و ترقی کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ مدرسہ کی حیثیت گاؤں کے ٹاؤن ہال کی تھی جہاں گاہے بگاہے اہم بیرونی شخصیات کی تقریریں بھی ہوتی رہتیں۔ ایک بار غالباً لکھنؤ سے کوئی بڑے عالم تشریف لائے تھے، انھوں نے سانحۂ مسجد اقصیٰ کے مجرم ڈینس کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بتائی تھیں۔ اس وقت یہ باتیں تو کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئیں کہ ڈینس اگر ذہنی مریض تھا تو اس نے مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کیوں کی۔ مسجد کی تباہی سے حضرت مسیحؑ کے ظہور کا کیا تعلق ہے، البتہ یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز معلوم ہوئی کہ ڈینس کو خیالی آوازیں آتی تھیں۔ کوئی اس سے کہتا تھا کہ تم یہودی ہو اور تمھیں مسیحؑ کی آمد سے پہلے ایک اہم رول کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ بسا اوقات اسے ایسا محسوس ہوتا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح خدا اس سے ہم کلام ہوا۔ اس کا کہنا تھا آتش زنی کا یہ حکم اسے خدا کی طرف سے ملا تھا جسے اس نے امر ربی سمجھ کر انجام دے ڈالا ہے۔ جلسہ کے خاتمہ پر جب وہ عالم ہمارے گھر تشریف لائے تو میں نے سوچا کہ ان سے پوچھوں کہ اجنبی اور نامانوس آوازیں تو ہمارے پروفیسر صاحب کے کانوں میں بھی آتی رہتی ہیں۔ تو کیا وہ بھی ہمیشہ امر ربی کے گرداب میں رہتے ہیں بلکہ پروفیسر تو یہ بھی کہتے ہیں کہ انھیں کوئی اشارہ کرتا ہے۔ وہ اکثر اپنی دعوتوں کا تعین ان ہی اشارات کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ سوچا یہ بھی پوچھوں کہ غیبی آوازوں کو سننے اور اشاروں کو سمجھنے کا صحیح طریقہ کیا ہوسکتا ہے، لیکن مردان خانہ میں لوگوں کے اژدہام اور بزرگوں کی نہ ختم ہونے والی گفتگو نے مجھے ان سوالوں کے جواب سے محروم رکھا۔

گاؤں میں مسجد سے کسی قدر متصل منگل شاہ کا مزار بھی تھا، مگر یہاں نہ چراغ جلتے اور نہ ہی اگربتی کی خوشبو پھیلتی۔ ایک ویرانی نے یہاں بھی حزن کا ماحول طاری کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں لوگ عام طور پر کسی اہل دل کے ہاتھوں پر بیعت ہوجاتے۔ مسلم دل و دماغ پر پے بہ پے حوادث نے جو نفسیاتی زخم لگایا تھا، اس کی تلافی کا ایک مقبولِ عام نسخہ تصوف کو سمجھا جاتا تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ بڑے ابّا کے مثالی بستی کے پروجیکٹ نے صرف منگل شاہ کے مزار پر ہی خاک نہیں اڑائی تھی بلکہ اہلِ دل کے سلسلۂ بیعت کی اثر

آفرینی بھی جاتی رہی۔ خلافت کے سقوط کے بعد مثالی بستی کا قیام ایک نفسیاتی تدبیر تھی اس خلا کو پُر کرنے کی جس کی شدت کا واقعی ادراک شاید ہی کسی کو تھا۔ مجروح دل و دماغ ماضی گزینی میں پناہ لیتے۔ اچھے دنوں کی یادیں تازہ کی جاتیں، بزرگوں کے جاہ وحشم کی داستانیں بیان ہوتیں۔ ایک دن میرے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، جنھیں ہم لوگ بھائی جان کہتے، آئینۂ ترہُت کا ایک بوسیدہ نسخہ کہیں سے لے آئے۔ ابھی ہم لوگ اس کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہے تھے کہ والد صاحب کا گزر ہوا، پوچھا یہ کون سی کتاب ہے؟ میں نے کہا کہ آئینۂ ترہت ہے، سنا ہے کہ اس میں اپنے بزرگوں کے واقعات ہیں، خاندان کا تذکرہ ہے اور اس کے تفصیلی کوائف موجود ہیں۔ یہ سن کر ان کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے حسرت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ بولے بیٹا ان باتوں کی اب کیا اہمیت ہے۔ اب تو یہ دیکھو کہ تم خود کیا ہو؟ پدرم سلطان بود سے اب کچھ ہونے کو نہیں۔

ہفتہ کے اختتام پر جب والد صاحب گھر آتے تو مردان خانہ کی چہل پہل میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا۔ البتہ معراج والی مسجد میں آتش زنی کے بعد مردان خانے کو گاؤں کے چوپال کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، جہاں اس سانحہ کے اسرار وعواقب پر کچھ اس طرح گفتگو جاری رہتی کہ کبھی جنگ عظیم اوّل کی تفصیلات زیر بحث آتیں اور کبھی ترک ناداں کے خلافت کی قبا چاک کرنے پر ایک نوحۂ دلگیر بلند ہوتا۔ ایسا لگتا تھا کہ مصائب وآلام کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ بالآخر ہمارے وجود کو ملیا میٹ کردے گا۔ سراسیمگی کے اس ماحول میں اندرون ملک سے بھی تشویشناک خبریں آنے لگیں۔ ابتداً تو میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہیں آیا کہ احمد آباد میں بلوائیوں نے جس منظم طریقہ سے مسلم آبادی، مساجد، درگاہوں اور مسلمانوں کی املاک پر حملہ کیا ہے اس کے اثرات ہم تک کیسے پہنچیں گے، لیکن جب ان تشویشناک خبروں کے سلسلے نے طول کھینچا تو ہمارا وجود لرز کر رہ گیا۔

'محبوب بھائی! احمد آباد کا یہ فساد محض ہندو مسلم فساد نہیں بلکہ یہ ہماری جڑوں کو اکھیڑ پھینکنے کی منظم اسکیم ہے۔ آپ نے بلراج مدھوک کی وہ تقریر نہیں سنی، وہ تو صاف کہتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا بھارتیہ کرن کرنے کی ضرورت ہے'، ابّا نے تشویش ظاہر کی۔

جی ہاں، ان کی تنگ نظری سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

'یہ ہم سے قیامِ پاکستان کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری ازلی وفاداری پاکستان کے ساتھ ہے۔ حالانکہ ہمارے لیے نظری طور پر قومی سرحدیں تو کچھ بھی معنی نہیں رکھتیں اور نہ ہی نیشن اسٹیٹ کے لیے اسلام میں کوئی جگہ ہے، ہمارے لیے تو ہر ملک ملک ما است ملک خدائے ما ست'، عبدالاحد صاحب نے لقمہ دیا۔

اچھا کچھ پتہ چلا اتنے بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ماسٹر مرتضیٰ صاحب نے تفصیل جاننا چاہی۔

بولے: ویسے تو بہت سی باتیں کہی جارہی ہیں، اس وقت گائے کے تقدس کے حوالے سے ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف فضا بنائی جارہی ہے۔ احمد آباد میں بھی بنیادی تنازع گائے کے حوالے سے ہی شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کے بعد ملک گیر سطح پر جو مسلمانوں نے احتجاجی جلوس نکالے اسی سلسلے کا ایک مظاہرہ احمد آباد میں بھی ہوا، جس میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس جلوس میں جو بہت سے نعرے لگائے جارہے تھے اس میں ایک نعرہ یہ بھی تھا کہ 'جو ہم سے ٹکرائے گا مٹی میں مل جائے گا'۔ مظاہرے نے تنگ دل ہندوؤں کو جو کسی ایسے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے اس پروپیگنڈے کا موقع دیا کہ مسلمان پھر سے متحد اور مضبوط ہورہے ہیں۔ جلوس کے چار پانچ دن بعد ہی رام لیلا کی تقریب نکل آئی، جہاں ایک مسلم انسپکٹر کے ہاتھوں رامائن کی بے حرمتی کی کہانی عام کی گئی۔ پھر مت پوچھیے آناً فاناً ہندو دھرم رکشا سمیتی بن گئی۔ ہزاروں کا جلوس رامائن کے دفاع کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ پھر دیکھتے دیکھتے مسلمانوں کی بستیاں جلائی جانے لگیں اور عین سرکاری سرپرستی میں آزاد ہندوستان کا سب سے بھیانک فساد برپا ہوگیا۔

'دیکھیے ہندو ذہن علامتوں کی تلاش میں ہے۔ اسے اس بات سے سخت کوفت ہوتی ہے کہ الاقصیٰ کا سانحہ مسلمانوں کو متحد کردیتا ہے۔ مسلمان خود کو ایک عالم گیر امت سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو باہم متحد کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ اب اس رامائن کو ہی لیجیے، بظاہر تو انھوں نے اسے قرآن کی سی عظمت دینے کی کوشش کی ہے، شاید آپ کو معلوم ہو کہ ابھی کچھ دنوں پہلے پیر بخاری صاحب کے عرس کے موقع پر کتابوں کا ایک ٹھیلہ پولیس کی دھکا مکی میں گر گیا تھا۔ جب مسلمانوں کو یہ پتہ چلا کہ اس ٹھیلے پر قرآن مجید کا کوئی نسخہ بھی تھا تو ان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ دفعتاً چار پانچ ہزار کا مجمع اکٹھا ہوگیا اور پولیس والوں کو معافی تلافی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ہندو ذہن یہی کام رامائن سے لینا چاہتا ہے، لیکن اسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ ان مذہبی شہ پاروں میں نسل پرستی جس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس سے کسی عمومی علامت کا کام نہیں لیا جاسکتا'۔

'پھر ان کے پاس اپنی قوم کو متحد کرنے کا نسخہ کیا ہے؟' ماسٹر مرتضیٰ نے سوال کیا۔

بولے: اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ مسلم دشمنی اور پاکستان کے خیالی دشمن کو اپنی گفتگو کا محور بنائیں۔ آپ نے گولوالکر کی حالیہ تقریر نہیں سنی، احمد آباد ہی کی تو بات ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کو دستوری تحفظات حاصل ہیں اور اقلیتوں کے لیے خصوصی قوانین موجود ہیں، لیکن ہندوؤں کے لیے کسی دستوری تحفظ کی بات نہیں کی گئی ہے۔ بقول گولوالکر ہندوؤں کا تحفظ تو ہندو راشٹر

میں ہی ہوسکتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں مسلم دشمنی کی یہ لے مزید تیز ہوگی۔ والد صاحب یہ کہہ کر تفکرات میں ڈوب گئے۔

پھر اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے کیا راستہ رہ جاتا ہے؟ عبدالاحد صاحب نے محبوب عالم صاحب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ماسٹر مرتضیٰ صاحب نے مداخلت کی۔ بولے: ابھی پچھلے سال احمد آباد میں جمعیۃ علما کے جلسہ میں اسعد مدنی صاحب نے تو جن سنگھ اور آر ایس ایس کی خوب خبر لی۔ انھوں نے میرٹھ فسادات کا انھیں ذمہ دار ٹھہرایا، کانگریس میں جو اُن کا اثر ہے تو آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ حکومت انتہاپسندوں کی سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

'عزیزم آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کیا جمعیۃ علما والے واقعی اتنے ہی سادہ لوح ہیں کہ وہ اب بھی کانگریس کی حکومت سے کسی خیر کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ گجرات میں اوپر سے نیچے تک، محکمۂ پولیس کے اہلکاروں سے لے کر سیاست دانوں تک اور خود مرکز میں جن ہاتھوں میں زمام کار ہے یہ سب کے سب تو کانگریس کے ہی لوگ ہیں۔ ٹرکوں میں بھر کر مسلمانوں کی لاشیں اجتماعی تدفین کے لیے آسمانوں سے تو نازل نہیں ہورہی ہیں۔ سنگھیوں اور کانگریسیوں کی یہ نوراکشتی جمعیۃ علمائی مولویوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی'۔ عبدالاحد صاحب جو اب تک کسی گہرے تفکر میں ڈوبے تھے، انھوں نے کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

حافظ صاحب! کانگریس کو جب تک اس ڈھب کے مولوی ملتے رہیں گے اس ملک میں مسلمانوں پر کوئی نئی صبح طلوع نہیں ہوسکتی؛ محبوب عالم صاحب کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی۔

بولے: ہمارے مولویوں کی مت ماری گئی ہے۔ جو سنگھی حکومت سے باہر مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کررہے ہیں، ان کی مذمت میں تو ہماری زبانیں خوب چلتی ہیں، البتہ حکومت کے اندر کانگریسی سنگھیوں کی مسلم دشمنی پر ان کی زبانوں سے ایک لفظ نہیں نکلتا، بلکہ اُلٹا ان مجرموں کے حق میں یہ جمعیۃ علمائی مولوی الیکشن کی مہمیں چلاتے ہیں۔ خدا ان کی آنکھوں پر بندھی پٹیاں کھول دے۔

'یہی تو سب سے بڑا سانحہ ہے'، والد صاحب نے اپنے کرب کا اظہار کیا۔ بولے: ان مولوی نما سیاست دانوں کی شکل وصورت پر نہ جائیے، ان کے نماز و روزے سے دھوکہ نہ کھائیے، یہ دراصل ظالم کانگریسی آقاؤں کے سیارچے ہیں جو عین مسلم معاشرے کے مدار میں اس اذیت ناک صورت حال کو برقرار رکھنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ حالات خواہ کیسے بھی ناگفتہ بہ ہوں۔ کانگریس سے ان کی وفاداری پر کوئی حرف نہیں آئے گا، یہ ایک عجیب مکروہ طلسم ہے۔ ایک طرف سنگھی ذہنیت کی ریشہ دوانیاں اور دوسری

طرف سنگھی کانگریسیوں کی مسلم نسل کشی کا منظم منصوبہ۔ مولوی پہلے کو دشمن اور دوسرے کو دوست بتاتا ہے۔
یاللعجب!

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

والد صاحب نے یہ مصرع کچھ اس انداز سے پڑھا کہ مجلس پر ایک مضطربانہ خاموشی چھا گئی۔

'جی ہاں حافظ صاحب آپ صحیح کہتے ہیں'، محبوب صاحب نے ہلا مارنے والی خاموشی سے نکلنے کی کوشش کی۔ بولے: 'حالات واقعی سنگین ہیں، انتہا پسند ہندوؤں کی نئی نئی تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں، چار پانچ سال پہلے وشوا ہندو پریشد کا قیام عمل میں آیا تھا، سنا ہے شیوسینا کے نام سے بمبئی میں جو نئی تنظیم بنی ہے اس کا مقصد وحید بھی مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا ہے اور سب سے تشویش کی بات تو یہ ہے کہ حالیہ الیکشن میں جن سنگھ ایک سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی ہے، صاف لگتا ہے کہ ملک کا قبلہ تیزی سے بدل رہا ہے'۔

'جی ہاں نوشتۂ دیوار تو یہی ہے کہ آنے والے دنوں میں حالات سخت تر ہوتے جائیں گے، کاش کہ کانگریسی مولوی مسلمانوں کو جھوٹی تسلیاں دینے اور تھپکیاں دے کر سلانے کے بجائے اصل صورت حال سے مقابلہ کے لیے آمادہ کرتے'، عبدالاحد صاحب نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

'حیرت ہے کہ اس بہیمانہ قتل و غارت گری کو مذہبی رنگ دیا جا رہا ہے، دھرم یدھ کی بات کی جا رہی ہے، بربریت کے ان لرزہ خیز واقعات کے خلاف بڑے بڑے ہندو مٹھوں اور ان کی روحانی شخصیات کی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، ایسا لگتا ہے جیسے اہل ہنود کے اجتماعی ضمیر کی موت ہو چکی ہو'۔ ابّا نے کہا۔

'جی ہاں! احمد آباد سے جو رپورٹیں آ رہی ہیں اُسے پڑھ کر تو ایسا ہی لگتا ہے کہ اب ان لوگوں کے درمیان زندہ رہنا شاید زندگی کی توہین ہے۔ معصوم بچوں کو جس طرح ان کی ماؤں کے سامنے قتل کیا گیا، خاندان کے بڑوں کے سامنے جس طرح بہو بیٹیوں کی عصمت دری اور پھر انھیں انتہائی بہیمیت کے ساتھ مار ڈالا گیا، آبادی کی آبادی خالی ہو گئی حتیٰ کہ پولیس کی پناہ میں آنے والے رفیوجی مسلمان بھی پناہ گزیں کیمپوں میں پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں قتل کر دیئے گئے۔ معصوم بچوں کی آہ و بکا اور چیخ پکار بھی ان پتھر دل فسادیوں پر بے اثر ثابت ہوئیں'، محبوب عالم صاحب نے افسوس کا اظہار کیا۔

ہاں آپ صحیح کہتے ہیں، آزادی کے وقت تو چلیے لوگوں پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا، لیکن اب بیس بائیس سال بعد تو حالات ٹھہرے ٹھہرے ہیں، اب اسے محض پاگل پن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب کچھ ایک منظم سوچی سمجھی سازش ہے۔ عبدالاحد صاحب نے پھر اپنی رائے دی، بولے: ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے۔ احمد آباد کے اس فساد میں مسجدوں اور درگاہوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ دراصل یہ ہماری ہر

علامت کو اس ملک سے مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔

انھیں شاید معلوم نہیں کہ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے۔ اس سے پہلے کہ مرتضیٰ صاحب اپنا شعر پورا کرتے گاؤں کی مسجد سے عشا کی اذان بلند ہوئی۔ والد صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکلا: واللہ المستعان۔ اور مردان خانہ کی یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

کھانے کے بعد والدہ کی خدمت میں، میں نے مردان خانہ میں ہونے والی گفتگو کی روشنی میں احمد آباد فساد کا اپنا ورژن پیش کیا، خاص طور پر معصوم بچوں کے حوالے سے صورت حال پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی بے ساختہ یہ بھی پوچھ بیٹھا کہ امّاں فسادی کیا گاؤں میں بھی آنے والے ہیں، کیا وہ ہم لوگوں کو بھی واقعی مار ڈالیں گے؟ یہ سنتے ہی والدہ نے مجھے فرطِ محبّت سے گود میں بھینچ لیا، پیشانی چومتے ہوئے بولیں: بیٹا! اللہ تمھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، ہم لوگوں کا محافظ تو خدا ہے نا، وہ ہم لوگوں کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔

والدہ کی ان باتوں سے کسی قدر تسلی تو ضرور ہوئی، لیکن ایک خوف تھا جو ایسا لگتا تھا اندرون میں سرایت کر گیا ہو۔ چاندنی رات میں آنگن کے اس حصے سے جہاں کیاریوں میں گلاب کے پھول کھلے تھے، میں نے غیر ارادی طور پر ایک پھول توڑا۔ اس کی خوشبو میں آج بھی نشاط کا وہی احساس تھا۔ ان کیاریوں کی دیکھ ریکھ منگلا کے ذمہ تھی جو کبھی بڑے چاؤ سے مجھے پھول پیش کرتا، کبھی درختوں سے پھل توڑ کر لاتا اور فصل کے موقع پر تو اس کا پورا خاندان کچھ اس طرح مصروف ہوتا کہ ہم بچوں کے لیے بہت سے تفریحی مشاغل ہاتھ آجاتے۔ گاؤں کی زندگی میں فصلوں کی کٹائی کے موقع پر ویسے بھی ایک جشن کا سماں ہوتا تھا۔ منگلا مذہباً ہندو تھا لیکن جب اذان کی آواز سن کر بڑی بوڑھیاں اپنے پلّو درست کر رہی ہوتیں اور بزرگوں کی مجلسوں میں سکوت طاری ہوجاتا تو منگلا بھی بڑی عقیدت کے ساتھ اذان کے بول کو اس طرح سنتا جیسے وہ ایک ایک لفظ کو اپنے اندر جذب کرتا جارہا ہو۔ منگلا ہم بچوں پر اپنی جان لٹاتا۔ وہ ہمارے شب و روز کا حصہ تھا۔ کبھی کبھی ایک اجنبیت کا احساس تو ہوتا جب وہ مذہب کے حوالے سے اپنے ناؤنوش کا اہتمام الگ کر لیتا، لیکن یہ خیال کبھی نہ آتا کہ وہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہے۔ اب جو احمد آباد کے فسادات کے حوالے سے ہندوؤں کے بہیمانہ ظلم کے تناظر میں مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا تو یہ گتھی لاینحل معلوم ہوتی۔

٣

معراج والی مسجد

گاؤں سے کوئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہندوؤں کی ایک تاریخی زیارت گاہ اہیلا استھان کے نام سے واقع تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہاں سیتا کے قدموں کے نشانات موجود ہیں۔ بعضے کہتے کہ اہیلا دراصل گوتم رشی کی بیوی تھیں جو کسی کی بددعا سے پتھر میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ رام چندر جی جب اپنے قافلہ کے ساتھ اِدھر سے گزرے تو انھوں نے اپنا قدمِ مبارک پتھر زدہ اہیلا پر رکھا جس کے طفیل وہ پھر سے اپنی اصل انسانی شکل میں واپس آگئیں۔ یہ خیال عام تھا کہ مندر کے قریب جو تالاب ہے وہاں غوطہ لگانے سے جلد کی بیماریاں زائل ہوجاتی ہیں۔ اہیلا کے اس مندر میں بیگنوں کی بہت توقیر تھی۔ زائرین خاص طور پر بیگنوں کا نذرانہ پیش کرتے۔ ایک سہ پہر غالباً رام نومی کے موقع پر جب اہیلا استھان کا سالانہ میلہ اپنے شباب پر تھا میں خاندان کے دوسرے بچوں کے ساتھ میلے میں جا نکلا۔ ہزاروں کا مجمع تھا، طرح طرح کے کھلونے، مختلف اشیا کی دکانیں، لذت کام و دہن کا وافر انتظام، گویا جشن کا ایک سماں تھا۔ مندر کے قریب پرشاد لینے والوں کا ہجوم، پجاریوں نے دیکھا کہ ہم بچوں کے قدم اس ہجوم کی طرف نہیں اٹھ رہے ہیں تو وہ خود بڑھ کر ہماری طرف آیا اور ہمارے ہزار تکلف کے باوجود یہ کہتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں مٹھائیاں رکھ دیں کہ بھگوان کی کرپا ہے، یہ سب بہوئے سب کے لیے تو ہے۔ واپسی پر جب ہم لوگوں نے گھر میں بڑی بوڑھیوں سے مفت کی مٹھائی کا واقعہ بتایا تو وہاں یہ بحث چل نکلی کہ اس کا کھانا ہمارے لیے حلال تھا یا نہیں۔

اس مندر کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پجاری کے عہدے پر ایک خاتون متمکن تھیں اور ہزاروں برس سے اس مندر کی یہی روایت چلی آتی تھی۔ ازمنۂ قدیم کی مختلف داستانوں اور رامائن کے مختلف حوالوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے اہیلا استھان کا یہ مندر معبد سے کہیں زیادہ اس علاقے کا ایک ثقافتی مرکز تھا۔ سیتا کا میکہ یہاں سے قریب تھا۔ رام چندر جی یہیں سے ہوکر گزرے تھے جن کے قدموں کے طفیل گوتم رشی کی کٹیا میں زندگی پھر سے لوٹ آئی تھی۔ ہر سال زندگی کی مسرتوں کے اس جشن میں بلاتفریق مذہب وملت لوگ میلے کی بہاریں دیکھنے آتے۔ ہندومت کا یہ تصور بھی مانوس سا لگتا۔ پھر وہ کون سے لوگ ہیں اور کیسے ہندو ہیں جو

مسلمانوں کو اس ملک سے فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد بھی بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔

لہریا سرائے میں والد صاحب کے ساتھ صبح کی سیر کو جاتے ہوئے مندر کے لاؤڈ اسپیکر سے کچھ دعائیہ نغمے جب سماعت سے ٹکراتے تو ایک عجیب مسرت کا احساس ہوتا۔ ایسا لگتا جیسے کوئی مقامی زبان میں حمد و منقبت کے نغمے گا رہا ہو۔

شری رادھے گووندا　　من بھجلے ہری کا پیارا نام ہے
گو پالا ہری کا پیارا نام ہے
نندلالہ ہری کا پیارا نام ہے
شری رادھے گووندا　　من بھجلے ہری کا پیارا نام ہے
مور مُکٹ سر گلبن مالا　　کیسر تلک لگائے
ورنداون کی کنج گلی میں　　سب کو ناچ نچائے
سب کو ناچ نچائے
من بھجلے ہری کا پیارا نام ہے
شری رادھے گووندا

شجر و حجر کی جابجا پرستش دیکھ کر ایک طرح کی الجھن تو ضرور ہوتی اور کبھی کالی کے مندر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی شعلہ بار زبان کو دیکھ کر وحشت بھی ہوتی، لیکن چھٹھ کے میلوں میں خواتین کی بھیگی اور عبودیت میں لت پت تپسیا دیکھ کر اور جابجا بھجن کیرتن کے ہاؤ ہو سے ایک عمومی تاثر یہی پیدا ہوتا کہ حق ناشناسوں کے یہ طائفے بھی اپنے انداز سے روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ گوشت پوست کے یہ عام ہندو جن سے ہمارے حواس آشنا تھے اپنی تمام تر تہذیبی اجنبیت کے باوجود ایک طرح کی مانوسیت کا احساس دلاتے۔ میری نگاہوں میں صبح کا وہ منظر بھی گھوم جاتا جب پھولوں کی ٹوکری لیے محلہ کا برہمن ہماری قیام گاہ کے سامنے سے نارائن نارائن کی صدا لگاتے گزرتا تو ایک لمحہ کے لیے رک کر والد صاحب سے دعا سلام کرتا، خیریت پوچھتا، مسکراہٹیں بکھیرتا اور پھر نارائن نارائن کا نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ میں نے بہت سوچا یہ سب بھی تو آخر ہندو ہی ہیں، پھر احمد آباد میں ان کے ہم قوموں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے درپۓ آزار ہیں اور انھیں اس ملک سے اکھیڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔

ایک دن خیال آیا کیوں نہ اس بارے میں چچا بشیرا سے پوچھا جائے، آخر وہ بھی تو دُنیا جہان کا علم رکھتے ہیں۔ جب دیکھو اخبارات کی ورق گردانی میں مصروف یا پھر ریڈیو کی سوئی پر ان کی انگلیاں گردش کرتی

رہتی ہیں۔ چچا بشیرا کو جب بھی دیکھا انھیں ایک نعرۂ الست سے سرشار پایا۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر۔ بارگاہِ رسول ﷺ میں جب وہ اپنی پرسوز آواز میں ''یا رسول خدا آسرا دیجیے'' کا نغمہ الاپتے تو سننے والوں پر بے خودی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی۔ بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔

یا رسولِ خدا آسرا دیجیے ورنہ اشکوں کے موتی بکھر جائیں گے
اب عنایت نہ ہوگی تو مر جائیں گے
یہ زمانے کے غم یہ ہزاروں ستم،
یا نبی تم سہارا نہ دوگے اگر، کس کو آواز دیں گے کدھر جائیں گے؟

چچا بشیرا زیادہ تر مردان خانہ میں ہی پڑے رہتے۔ بعض لوگ ان پر بمبیا حاجی کی پھبتی کستے۔ یہ شاید اس لیے کہ وہ حاجیوں کے کسی قافلہ کے ساتھ بمبئی تک گئے تھے اور وہیں سے واپس لوٹ آئے تھے۔ گاہے منقبت گاتے ہوئے خود کو تسلی دیتے کہ ابھی اذن نہیں ہے، مگر ایک دن سرکار مدینہ کا بلاوا ضرور آئے گا۔ ''غم اٹھاتے رہو مسکراتے رہو'' کی لَے وہ اس وارفتگی سے بلند کرتے جیسے سبز گنبد اب چند منزل کے فاصلہ پر ہو ؎

نعت پڑھتے رہو گنگناتے رہو
آفتیں ان کے صدقہ میں ڈھل جائیں گی
درد و غم آئیں گے اور گزر جائیں گے

اس زمانے میں ریڈیو سیلون سے قوالی میں ڈھلی ایسی نعتیں کثرت سے نشر ہوتیں تب یہ بات سمجھ میں کم آتی تھی کہ منقبت سماعیوں اور قوالیوں میں دکھے دلوں کی مداومت کا کتنا سامان پنہاں تھا۔

پہلے تو چچا بشیرا نے ٹالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے میری آمد کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ وہ شاید کسی اور ہی دُنیا میں کھوئے تھے۔ ریڈیو کی سوئی غوں غاں کی آواز کے بعد اب ایک جگہ ٹھہر گئی تھی جہاں کوئی مغنیہ غم و اندوہ سے ڈوبی سحر انگیز آواز میں یہ نغمہ گا رہی تھی:

کیسے چلے گی ہم سے یہ زندگی کی نیّا
کیوں چھوڑکر چلے ہو طوفان میں کھویّا
منجدھار میں ہماری نیّا نہ ڈوب جائے
ڈوبا گگن میں سورج لو چھا گیا اندھیرا
نہ جانے زندگی میں کب آئے گا سویرا

مجھے ایسا لگا جیسے یہ غم انگیز نغمہ ہماری اپنی محزون ملّی زندگی پر تبصرہ ہو۔ اب تک ان ریڈیائی نغموں کو

میں محض لہو ولعب میں شمار کرتا تھا، آج چچا بشیرا کی صحبت میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے اس نوحہ خوانی سے ہماری اپنی زندگی کے تار جڑے ہوئے ہوں۔ اس سے پہلے کہ چچا بشیرا کی انگلیاں ریڈیو کی سوئی پر پھر سے چلنے لگتیں اور کسی اسٹیشن سے کوئی نیا نغمہ یا قوالی جاری ہو جاتا، میں نے چچا بشیرا کی طرف تازہ اخبار بڑھاتے ہوئے کہا کہ اخبار بعد میں پڑھیے گا، پہلے یہ بتایئے کہ احمد آباد سے مسلمانوں کے قتل وخون کی جو خبریں آرہی ہیں اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ اچانک ان ہندوؤں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیں اس ملک سے دربدر کر دینا چاہتے ہیں۔

بولے: سیاست ہے، مذہب کا تو بس حوالہ ہے۔

کیا مطلب؟ میری سمجھ میں کچھ بات نہ آئی، میں نے پوچھا۔ آخر ہمارے گاؤں کے اطراف میں بھی تو ہندو رہتے ہیں اور اپنا منگلا اور اس کا سارا خاندان بھی تو ہندو ہے، کتنا پیارا ہے وہ۔

میرے ان معصومانہ سوالات کو سن کر چچا بشیرا کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہویدا ہوئی، بولے: بیٹے! عام ہندو ہمارے خلاف نہیں، ان سے تو ہمارا صدیوں کا میل ملاپ رہا ہے، البتہ ہندوؤں کا مقتدر طبقہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ان کی بالادستی کو چیلنج کیا جائے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں ہزاروں سال سے نیچی ذات کے ہندوؤں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام کی تعلیم مساوات سے متاثر ہو کر ان میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا اور اب آزادی کے بعد دستور میں نہ صرف یہ کہ مساوات، انصاف، حریت اور مواخات کی ضمانت دی گئی بلکہ نیچی ذات کے ہندوؤں کو ریزرویشن جیسی مراعات بھی عطا کر دی گئیں۔ ہندوؤں کا مقتدر طبقہ اس سماجی اور نظری انقلاب کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ ان کی بعض تنظیمیں یہ سمجھتی ہیں کہ جب تک مسلمان اپنے نظری پیغام کے ساتھ اس ملک میں موجود ہیں اونچی ذات کے ہندوؤں کی بالادستی مستحکم نہیں ہو سکتی۔

اس وقت چچا بشیرا کی یہ توجیہ کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئی، ہاں اس بات کا اندازہ ضرور ہوا کہ ہندو دراصل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے ہندوؤں میں اپنا منگلا اور مندر کا چھوٹا پجاری جو اکثر چچا شبراتی کے ساتھ گپیں مارتا دکھائی دیتا اور جس نے میلے کے موقع پر ہم بچوں کو مٹھائیاں کھلائی تھیں، البتہ برے ہندوؤں کا اب تک میرا کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا، ان کے دلدوز مظالم کی داستانیں ہمیں اخبارات کے ذریعہ پہنچی تھیں۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت اپنے سر پر پانی کا ایک گھڑا لیے چلی آرہی ہے، اس کے ساتھ اس کا سات آٹھ سالہ بچہ ہے۔ ارے یہ تو احمد ہے، ہمارے کھیل کا ساتھی۔ اچانک تیز ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے، اس کی ماں اپنا توازن کھو دیتی ہے، گھڑا اس کے سر سے گرتے ہی ایک چیخ بلند ہوتی ہے اور احمد کا سر ایک فٹ بال کی طرح اس کے شانے سے لڑھک کر دور جا گرتا ہے۔ کٹے سر کے بچہ کے ساتھ وہ آگے بڑھتی

ہے۔ اس کے قدم نہیں رکتے۔ اچانک شور سنائی دیتا ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہاتھوں میں نیزے اور زبان پر جیے بجرنگ بلی کے نعرے۔ مندر کا پجاری، ارے ہاں اور وہ اپنا منگلا اور اس کے ہاتھوں میں گرز بالکل ویسا ہی جیسا طلسماتی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ گرز کی نوک سے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ میری طرف بڑھتا ہے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو، میری چیخ نکل جاتی ہے۔ والدہ مجھے جھنجھوڑ کر اٹھاتی ہیں۔ کیا کوئی خواب دیکھ رہے تھے، ڈراؤنا خواب۔ میں کہتی ہوں کہ سوتے وقت طلسماتی کہانیاں نہ پڑھا کرو۔

اب انھیں میں کیسے بتاتا کہ یہ خطرہ حقیقی ہے۔ احمدآباد میں بے شمار ماؤں پر جو قیامت گزری ہے اس کے چیدہ چیدہ واقعات کا سلسلہ اب بھی اخبار و رسائل میں جاری تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے اطراف میں جہاں باغات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، ہرن قلانچیں بھر رہے ہیں، آسمان بادلوں سے ڈھکا ہے، بچے طرح طرح کے کھیلوں میں مگن ہیں اور اسی اثنا اچانک گھوڑے پر سوار ایک شخص ہاتھ میں تلوار لیے ہماری طرف بڑھتا ہے۔ ارے اس کے ہاتھ میں تو وہی ذوالفقار ہے جو ہمارے گھر میں بڑے افتخار و اہتمام سے آویزاں رہتی ہے اور یہ شہسوار کون ہے؟ یہ تو منگلا سے مشابہ لگتا ہے، ارے یہ تو وہی ہے۔ وحشت کے مارے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں نے سوچا، اپنا منگلا تو ایسا نہیں، پھر یہ خواب میں تلوار سونت کر میری طرف کیوں بڑھتا ہے۔

ایک شب سوتے ہوئے معراج والی مسجد میں جا پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد کے طاق میں جو شمع روشن ہے اسے کچھ لوگ خاموش کرنے کے درپے ہیں۔ یہ لوگ جیسے ہی شمع بجھا کر جاتے ہیں، میں اسے پھر سے روشن کر دیتا ہوں۔ جلنے بجھنے کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ خوابوں کا یہ سلسلہ جو دراز ہوا تو اب دن کے وقت بھی اپنے گرد و پیش پر ایک طلسماتی دُنیا کا گمان ہوتا۔ برآمدے میں دیواروں پر بارہ سنگھے، نیل گائے اور دوسرے شکار کردہ جانوروں کے سر مدت سے نمائشی طور پر آویزاں چلے آتے تھے، اب ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب کون سا طلسم انھیں دوبارہ متحرک کر دے۔ کھیت و کھلیان اور ہرے بھرے پھلدار درختوں کے لامتناہی سلسلے، جابجا تالابوں میں تیرتے بطخ اور مرغابیاں جو کبھی فرحت و انبساط کا احساس دلاتیں، فطرت کی گود میں چڑیوں کی چہچہاہٹ لوریوں کا سا لطف دیتی، اب ان ہی سبزہ زاروں اور باغات سے وحشت ہونے لگی۔ اندیشہ لگا رہتا کہ نہ جانے کب کس جھاڑی کے پیچھے سے دشمن تلوار سونت کر سامنے آ جائے۔ کٹے سر والا احمد میرے چشم تصور میں پھر سے آ موجود ہوتا۔ ایک دن عین دوپہر کی دھوپ میں گھر کو لوٹتے ہوئے، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو خدا حافظ۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ آگے بڑھا پھر وہی آواز آئی۔ میں نے جب والد صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے اس واقعہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ کہنے لگے خدا حافظ ہی تو کہہ رہا تھا، اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔

ان دنوں گاؤں میں جن بھوت کی کہانیوں کا بھی بڑا چرچا رہتا۔ کچھ کہانیاں تو شاید بڑی بوڑھیوں کے تخیل کی پیداوار تھیں، جو بچوں کو شام ڈھلے گھر میں مقید رکھنے کے لیے ازراہ تنبیہ سنا دیا کرتیں۔ پھر ان کی مستقل روایت اور تخیل کی تخم ریزی سے بچوں کو قابو میں کرنا آسان ہوجاتا اور چھوٹے بچے ان کہانیوں کے خوف سے نوالے بھی بلا چوں چرا اور جلد کھا لیتے۔ البتہ میرا تجربہ ان کہانیوں سے ذرا مختلف تھا۔ ابتداًء جب میں گاؤں میں آیا تھا تو یہاں کی بتول فطرت ہرے بھرے پھلوں سے لدے درخت اور مرغزاروں کا سرسبز و شاداب سلسلہ ایک ناقابل بیان حظ کا احساس دلاتے۔ گھر سے مدرسے جاتے ہوئے مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی میں بے کیف اور بوجھل چلا ہوں گا۔ وہی ہرنوں والا انداز جیسے چلتے نہ ہوں قلانچیں بھرتے ہوں۔ تب میرے لیے اس عمل کی عقلی توجیہہ مشکل تھی، اب جو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ فطرت کی گود میں جہاں ہر طرف زندگی اپنی اصل ابعاد پر قائم ہو، فطرت مسخ نہ کی گئی ہو اور انسانوں کے دل و دماغ کو رنگ و نسل، امیر و غریب اور ہندو مسلمان کے امتیازات نے آلودہ نہ کیا ہو اور اس پر سے بچپن کی معصومیت، تو بھلا فطرت کی ایک ایسی وادی میں کون نہ اترائے چلے گا۔ لیکن معراج والی مسجد میں آگ زنی کا واقعہ اور احمد آباد میں مسلمانوں کی خانہ بربادی کے نہ تھمنے والے واقعات نے سچ پوچھیے تو مجھ سے میرا بچپن چھین لیا تھا۔ وہی کھیت و کھلیان جہاں کبھی میں اکیلا دور تلک نکل جاتا، اب مجھے ان سے وحشت ہونے لگی۔ یہ جھاڑیاں اور یہ درخت جب خوابوں میں مجسم ہوتے تو ان کی وحشت ناقابل بیان ہوجاتی۔

ایک دن اچانک جو آنکھ کھلی تو ایسا لگا کہ خوابوں کے وحشت ناک مناظر عالم بیداری سے جڑ گئے ہوں۔ ارے وہ دیکھو پکڑو۔۔۔ آگ، دھواں، نیزہ۔۔۔۔۔ اور اس کے ہاتھوں میں تو ذوالفقار بھی ہے، میں نے چیخ پکار کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کہاں؟ کوئی نہیں، لوگوں نے مجھے جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ میں مختلف سمتوں میں اشارے کرتا رہا۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں، وہاں صحن میں۔ ارے یہ تو منگلا ہے۔ اب جو حواس بحال ہوئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ منگلا پھولوں کی کیاریوں کو پانی دے رہا ہے۔ مجھے وحشت زدہ دیکھ دانت نکوستے ہوئے بولا: 'ننیا میں ڈر گیئل'۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں تازہ گلاب تھما دیا۔ خوابوں کا یہ سلسلہ طویل ہوا تو والد صاحب کو فکر ہوئی کہ صاحب زادے کب تک طلسماتی کہانیوں میں گم رہیں گے۔ اب ان کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے، سو ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ شہر لے آئے۔ عام طور پر اختتامِ ہفتہ پر رخصت ہوتے ہوئے والد صاحب ڈیوڑھی پر رک کر شیروانی کے بٹن درست کرتے، والدہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے الوداعی پان قبول کرتے، حالانکہ وہ پان کے رسیا نہ تھے۔ اس دفعہ پان کے ساتھ والدہ نے مجھے بھی مختصر زادِ راہ کے ساتھ ان کے حوالے کر دیا۔

۴

یہ وہ سحر تو نہیں

گاؤں چھوٹنے کا ابتداً تو کوئی افسوس نہ ہوا، شاید یہ اس لیے بھی کہ میرا یہ سفر آناً فاناً ترتیب پایا اور مجھے اس کے اسرار وعواقب پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا، لیکن ٹرین نے جب چلنے کی سیٹی بجائی اور کھڑکی سے لہلہاتے کھیت اور درختوں کے قطار الوداع کہنے لگے تو گاؤں کی مسرت بھری زندگی، ہم عمروں کی مجلسیں اور مردان خانے کی صحبتیں بہت یاد آئیں۔ مگر پھر اس خیال سے تسلی ہوئی کہ وہاں شہر میں طرح طرح کی دلچسپ کتابوں کے انبار ہوں گے، اخبارات ورسائل کی فراوانی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکتبہ کے علمی چوپال میں حاضری کا موقع رہے گا۔ ویسے بھی ادھر کچھ دنوں سے ہم جلیسوں کی صحبت میں خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کرتا ہو، کھیت وکھلیان کی وسعت سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی، سو یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ شہر میں اس وحشت سے پیچھا تو چھوٹ ہی جائے گا۔

ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک صبح اچانک دروازہ پر دستک ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عالم رکشے والا کچھ کہتے کہتے فرطِ جذبات میں رو پڑتا ہے۔ والد صاحب اسے تسلی تو دے رہے ہیں، لیکن اس عمل میں خود ان کی اپنی آنکھیں بار بار نم ہوجاتی ہیں۔ پتہ چلا کہ احمد آباد کے جس فساد کا تذکرہ ہم لوگ اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں، اس آگ کی لپٹ عالم رکشے والے کے گھر تک آ پہنچی ہے۔ عالم رکشے والے اپنی محنت اور ایمانداری کے لیے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ ان دسیوں لوگوں میں تھے جو والد صاحب کے پاس اپنی امانتیں اور پس انداز کی ہوئی رقمیں جمع کرتے رہتے تھے تاکہ آنے والے دنوں میں کسی مناسب کاروبار کا ڈول ڈال سکیں۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے والد صاحب نے خود کو بینکر بنا رکھا تھا۔ عالم رکشے والے نے بھی شب وروز کی محنت کے بعد ایک معقول رقم پس انداز کر لی تھی، لیکن احمد آباد کے فساد نے ان کی امنگوں کا خون کر دیا تھا جہاں ان کے بھائی فساد میں مارے گئے اور ان کا آدھا خاندان بھی تباہ ہو گیا تھا۔

اب بچا ہی کیا ہے، آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ کہتے ہوئے عالم رکشے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

حوصلہ سے کام لو، اب اپنے بھائی کے بچوں کی کفالت بھی تمھیں کرنی ہے اور ان کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام بھی، اب پہلے سے کہیں زیادہ ہماری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہے، ورنہ دشمنوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔

عالم رکشے والے تو اپنی روداِدِغم سنا کر چلے گئے لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ احمد آباد میں مسلمانوں کو جس سنگین صورت حال کا سامنا ہے وہ محض دور دراز کی خبر نہیں بلکہ بیتا اور محسوس تجربہ ہے، جس نے عالم رکشے والے کی مستقبل کی ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیا ہے۔

اگلے دن ذکی صاحب نے احمد آباد کے فساد کا ذکر دوبارہ چھیڑ دیا۔ ویسے تو ذکی صاحب مقامی کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے، لیکن ہم نے انھیں ہمیشہ امت کے سود و زیاں کا حساب لگاتے دیکھا۔ وہ اکثر کالج سے لوٹتے ہوئے مکتبہ میں کچھ دیر کے لیے رکتے، حالات حاضرہ پر اظہار خیال کرتے یا کسی علمی موضوع پر گفتگو چھیڑ دیتے۔ آج ان کی آنکھوں میں ایک طرح کی فکرمندی، بلکہ مایوسی نظر آئی۔

بولے: حافظ صاحب، حالات بہت خراب ہیں، بس یہ سمجھیے کہ ایک بار پھر سقوط دہلی والی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ پھر کہنے لگے، احمد آباد کے فسادات کی جو تفصیلات اب چھن چھن کر آ رہی ہیں اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ایک قیامت تھی جو گزر گئی۔ کیا نادر شاہ کے حملے کو لوگ یاد کرتے ہیں۔

جی ہاں اللہ خیر کرے صورت حال بہت سنگین ہے۔ والد صاحب نے تشویش کا اظہار کیا، فرمایا: دراصل سینتالیس کے بعد یہاں ہر روز ایک سقوط کا سامنا ہے۔ سقوط دہلی تو وقائع نگاروں کو نظر آ جاتا ہے، لیکن اس سقوط کا علم عام طور پر لوگوں کو کم ہی ہوتا ہے جس سے ہم سینتالیس کے بعد سے دوچار ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہر روز مسلسل کوئی چیز ٹوٹتی بکھرتی جاتی ہو اور یہ سلسلہ رکنے کا نہیں رکتا؟

ہاں بات تو درست ہے۔ ذکی صاحب نے تائید کی۔ بولے: ہم لوگ تو یہ سمجھتے تھے کہ تقسیم کا زخم جلد ہی مندمل ہو جائے گا اور زندگی معمول پر لوٹ آئے گی، لیکن احمد آباد کے فسادات نے تو خطرہ کی گھنٹی بجا دی ہے۔ کانگریسی مسلمانوں میں بھی سراسیمگی ہے۔ مولانا عبدالعلیم کل بھائی صاحب کے پاس آئے تھے، اس سے پہلے ہم نے ان کو کبھی اس قدر وحشت زدہ نہیں دیکھا۔ کہتے تھے کانگریس نے مسلمانوں سے منہ پھیر لیا ہے۔ اندرا گاندھی کو مسلم مسئلہ پر اپنے رفقا کی مخالفت کا سامنا ہے۔ ایسے وقت میں مولانا کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم پر طعن و تشنیع کے بجائے ان کا ساتھ دیا جائے۔

'عجیب'! والد صاحب نے حیرت کا اظہار کیا، بولے: یہ مولانا لوگ آخر کب سمجھیں گے؟

پھر آگے کیا ہونے والا ہے، حافظ صاحب؟

ذکی صاحب نے سوال کی دھار صیقل کرتے ہوئے پوچھا۔

میرے خیال میں ایک نسل تو صرف اس فریب کاری کو سمجھنے میں گزر جائے گی۔اور جب آنکھ کھلے گی تو پتہ چلے گا کہ کہاں کی آزادی اور کیسی جمہوریت؟

وہ کہا ہے نا فیض نے 'وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں'۔شاداں فاروقی صاحب جو بظاہر کسی کتاب کے خاموش مطالعہ میں مصروف یہ گفتگو سن رہے تھے، انھوں نے مداخلت کی۔ بولے: مایوسی تو سرحد کے دونوں طرف ہے، مسلمانوں کے لیے تو یہ آزادی تقسیم بن کر طلوع ہوئی جس نے ان کی عددی قوت کو تین جغرافیائی حصوں میں تقسیم کر دیا اور یہ جو آپ سقوطِ دہلی کی بات کہہ رہے تھے تو یہ سچ ہے کہ اس کا نفسیاتی زخم ابھی تک تازہ ہے اور اس زخم سے اب تک خون رِس رہا ہے۔

ان بزرگوں کی باتیں کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہ آئیں۔ میں نے سوچا پتہ نہیں یہ کون سا زخم ہے جس سے خون رِستا بھی ہے اور دکھائی نہیں دیتا۔شاداں صاحب بے سر والے بچے کی بات تو نہیں کر رہے ہیں، جو مجھے خوابوں میں نظر آتا اور پھر ایک قسم کی سراسیمگی مجھے کئی دنوں تک اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔ بچے کے سر کا اچانک جسم سے الگ ہو کر لڑھک جانا اور شہہ رگ سے بہتے خون کے دھارے میری نگاہوں میں پھرنے لگتے۔ میں نے سوچا عالم رکشہ والے سچ ہی تو کہتے تھے۔ انھوں نے کتنے جتن اور کتنی مشقت سے کچھ رقم پس انداز کی تھی، ان کا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی احمد آباد سے اپنے بھائی کو بلائیں گے اور پھر اس کے ساتھ اسی شہر میں کسی چھوٹے سے کاروبار کی کوشش کریں گے۔ مجھے ان کا بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا اور یہ کہنا کہ کیا مسلمانوں کو اس ملک میں ایک باعزت اور پرامن زندگی کا حق حاصل نہیں؟ ان کا یہ جملہ مجھے بار بار یاد آتا، لیکن سقوط کا زخم اور اس کا مسلسل رِسنا، بے سر کا بچہ اور خون کے بہتے دھارے، یہ سب مل کر بھی کوئی واضح تصویر پیش کرنے سے قاصر رہتے۔

مکتبہ میں روز ڈاک سے کچھ نہ کچھ ضرور آتا۔ طرح طرح کے اخبارات ورسائل، پوسٹ کارڈ اور لفافے، نئی کتابوں کی فہرست، فاتحہ کرانے کے اشتہاری خطوط، قل اور نیاز کے پیسے بھیجنے کے لیے مختلف خانقاہوں کے مطبوعہ منی آرڈر فارم۔ بعض دفعہ ان لفافوں سے قل کے شکر پارے بھی برآمد ہوتے، جو بطور تبرک اس خیال سے بھیجے جاتے کہ شاید ان کی برکتوں سے لوگوں میں رقم ارسال کرنے کا داعیہ پیدا ہو۔ ایک دن منادی نام کے رسالہ پر میری نگاہ اٹک کر رہ گئی جس میں ایک نئی کتاب 'اعمال حزب البحر' کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ لکھا تھا کہ 'اعمال حزب البحر' کے اس نئے ایڈیشن میں ان خاص اعمال کو درج کیا گیا ہے جن کو مشائخ برسوں خدمت لیے بغیر ظاہر نہیں کرتے اور سب سے اہم بات یہ کہ تقدیر بدلنے کا عمل بھی اس میں

موجود ہے، جو حضرت خواجہ نے خاص محرم راز اشخاص کے لیے قلمبند کیا تھا اور ان سب خوبیوں کے باوجود اس کتاب کا ہدیہ صرف تین روپے پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک۔ اشتہار پڑھ کر کتاب میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسی رسالہ میں خواجہ صاحب کی ایک اور کتاب کا اشتہار بھی شائع ہوا تھا، لکھا تھا: اسرار کلام اللہ واسم اعظم (نیا ایڈیشن)۔ لیکن شرط یہ تھی کہ یہ کتاب رازداری کا تحریری اقرارنامہ بھیج کر ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ لکھا تھا کہ یہ شرط اس لیے ہے کہ اس میں کلام اللہ اور اسم اعظم کے نہایت خفیہ راز درج کیے گئے ہیں، جن کا نااہل لوگوں تک پہنچنا مناسب نہیں۔ (ہدیہ تین روپے)۔ اگلے صفحہ پر سترہویں شریف میں شرکت کا بلاوا کے عنوان سے قارئین کو باخبر کیا گیا تھا کہ اس موقع پر حل مشکلات کے لیے ہمیشہ کی طرح خاص ختم بھی پڑھوائے جائیں گے، سو حاجت مندوں سے گزارش کی گئی تھی کہ عرس سے قبل مطلع فرمادیں کہ کس کام کے لیے ختم پڑھوانا ہے یا دعا کرانی ہے۔ نیچے ٹیلی فون نمبر کے ساتھ تار اور ڈاک کے پتے بھی درج تھے۔

میں نے سوچا کیوں نہ اس نسخہ کو بھی آزمایا جائے۔ کیا عجب کہ حل مشکلات کا یہ تیر اپنے نشانے پر جا لگے، البتہ دل میں ایک طرح کا شبہ بلکہ وسوسہ باقی رہا۔ بالآخر تجسس کا داعیہ غالب آیا اور میں نے ایک پوسٹ کارڈ حجرۂ قدیم، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین کی خدمت میں ارسال کرنے کی ٹھان لی۔ چند دن خاموشی رہی، پھر ایک دن ایک اشتہاری لفافہ قل کے سفید شکر پاروں کے ساتھ موصول ہوا، ساتھ میں پانچ روپے کا ایک مطبوعہ منی آرڈر فارم مکتوب الیہ کے مکمل پتہ کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ یہ پہلی برکت تھی جو میرے قلم سے ظاہر ہوئی۔ والد صاحب کو جب یہ پتہ چلا کہ میں نے حل مشکلات اور تقدیر بدلنے کے خیال سے خواجہ حسن ثانی کی خدمت میں پوسٹ کارڈ ارسال کیا تھا جس کے جواب میں یہ شکر پارے موصول ہوئے ہیں تو وہ صرف زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔

جاڑے کی آمد آمد تھی اور نئے سال کی ابتدا سے ارشد بھائی جو مجھ سے عمر میں دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے، انھیں اسکول میں باضابطہ داخل کرنے کی تیاری چل رہی تھی۔ ایک استاد انگریزی اور ریاضی کی تعلیم اور خوش خطی کی تربیت کے لیے ہر دن آیا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب کی تحریر بڑی خوش خط تھی، جب وہ سفید دبیز کاغذ پر بانس کی کھپچیوں سے تراشے گئے قلم سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تو میں بس محو حیرت ان کی انگلیوں کی جنبش اور فن کے کمال کو دیکھتا رہتا۔ ایک دن ماسٹر صاحب کی خدمت میں چائے کی پیالی لے کر آرہا تھا کہ کواڑ سے لٹکی ہوئی چھڑی پر نظر پڑ گئی۔ ایک نادر خیال میرے تصور میں کوند گیا۔ ماسٹر صاحب فرش پر چٹائی بچھا کر آلتی پالتی بیٹھتے۔ بڑے تقطیع کا کاغذ ان کی گود میں ہوتا اور وہ فرش پر رکھے ہوئے دوات میں قلم کو ڈبوتے اور فن کی تخلیق میں محو ہو جاتے۔ میں نے چھڑی کے دستہ کو الماری کے پیچھے سے چھپ کر کچھ اس

طرح جنبش دی کہ چشم زدن میں دوات اُلٹ گئی۔ ماسٹر صاحب کا انہماک جاتا رہا۔ ارشد بھائی اُٹھ کھڑے ہوئے، لیکن اس سے پہلے کہ لوگ اس افتاد کو سمجھ پاتے میں منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ گھر میں یہ خبر پھیلی تو لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ شرارت بھلا مجھ سے کیسے سرزد ہوسکتی ہے۔ چھڑی کا دستہ نشانہ پر لگا تھا سو ایک لمحہ کے لیے تو مجھے خوشی ہوئی، لیکن جلد ہی پشیمانی نے اپنی حصار میں لے لیا۔ والد صاحب نے سرزنش کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ جسے خدا عصا جیسی چیز دیتا ہے اس کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت اس قول کے فلسفیانہ پہلو پر توجہ نہ گئی، آج جب سوچتا ہوں تو ان کے اس طرز تربیت کی قدر نگاہوں میں بڑھ جاتی ہے۔

ابھی اسکول میں میرے داخلہ کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ تیاری تو بڑے بھائی کو کرائی جارہی تھی، میں ان کے ساتھ اسکول جانے کے لیے مصر ہوگیا۔ وہاں ماحول کچھ مانوس مانوس سا لگا۔ ایک بات تو یہ دیکھی کہ اسکول کے زیادہ تر اساتذہ کچھ جانے پہچانے سے ہیں، جن کی گاہے بہ گاہے مکتبہ میں آمدورفت رہتی ہے۔ ماسٹر انس صاحب جو چھٹی جماعت کے کلاس ٹیچر تھے، طلبا کو ڈرائنگ کی تعلیم دے رہے تھے۔ انھوں نے پنسل کی نوک سے سفید کاغذ پر کچھ اس طرح لکیریں کھینچیں کہ پہلے تو ایک خوبصورت سا اسٹول طلوع ہوا اور پھر دیکھتے دیکھتے اس اسٹول پر طشتری اور چائے کی پیالی وجود میں آگئی۔ اب انھوں نے پیالی کے اوپر آڑی ترچھی پنسلوں کو کچھ اس طرح حرکت دی کہ پیالی سے بھاپ اُٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ مجھے یہ پورا عمل بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ میں نے سوچا اگر چھٹی جماعت میں پڑھائی کا یہی انداز ہے پھر تو یہاں لطف و انبساط کا بڑا سامان رہے گا۔ میرے غیر معمولی اصرار پر ارشد بھائی کے ساتھ ہی چھٹی جماعت میں میرا بھی داخلہ ہوگیا۔

اسکول سے گھر کا فاصلہ کوئی ڈیڑھ دو کلومیٹر کا تھا۔ راستہ میں کچھ اور بھی اسکول پڑتے تھے اور گھر سے کسی قدر قریب شہر کا سب سے بڑا سرکاری اسکول بھی واقع تھا، لیکن اس اسکول کا انتخاب اس بنا پر کیا گیا تھا کہ یہاں نسبتاً ایک دینی ماحول تھا اور غالب اکثریت مسلم طلبا و اساتذہ کی تھی۔ شہر کے بالکل آخری سرے پر ایک عیسائی مشنری اسکول بھی تھا، مگر وہاں مسلمان اپنے بچوں کا داخلہ کرانا بمنزلۂ گناہ سمجھتے تھے یا کم از کم وہاں بھیجنے کو معیوب تو سمجھا ہی جاتا تھا۔ اسکول میں اُردو زبان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں صرف ذریعۂ تعلیم ہی اُردو نہ تھا بلکہ بزمِ اُردو کی ہفت روزہ سرگرمیوں کے علاوہ ہر کلاس میں کتب و رسائل کا ایک چھوٹا سا کلب متحرک رہتا تھا۔ یہیں مجھے طلبا کی زبانی پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ مسلم معاشرہ اشراف اور اجلاف کے دو مختلف طبقات پر منقسم ہے۔ یہیں میں نے پہلی بار عبدالقیوم انصاری کا نام سنا۔ طلبا کی اکثریت

جو شہر کے مسلم اکثریتی علاقوں سے آتی تھی ان کے نام کے دیوانے تھے۔ عبدالقیوم مومن کانفرنس کے قائد تھے اور ان کے ماننے والے اندرا گاندھی کو مسلمانوں کا ہمدرد و غمگسار سمجھتے تھے۔ نہ تو ان طلبا کے پاس کانفرنس کی حمایت کے لیے کوئی عقلی دلیل تھی اور نہ ہی میری سیاست پر کوئی ایسی نظر کہ میں اس قضیہ کا فیصلہ کر پاتا۔ بس ذہن پر یہ تاثر قائم ہوا کہ احمد آباد میں جہاں کانگریس کی حکومت میں مسلمانوں پر قیامت صغریٰ برپا ہوئی اور جس کی تفصیلات سے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی کانگریس کو اپنا دشمن قرار دینے کے سلسلے میں مسلمانوں میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

ایک دن پتہ چلا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی شہر میں آنے والی ہیں۔ پولو میدان جہاں انھیں عوامی مجمع سے خطاب کرنا تھا، ہمارے گھر سے دور نہ تھا، بلکہ اس زمانہ میں جب دور دور تک غیر آباد زمینیں ہوا کرتی تھیں، مکتبہ سے پولو میدان صاف نظر آتا تھا۔ یہ ایک نادر موقع تھا۔ میں نے والد صاحب سے اجازت لی اور ان کی انتخابی ریلی میں جا پہنچا۔ شہر میں جب بھی کوئی بڑے سیاسی لیڈر یا علمی و مذہبی شخصیت کی آمد ہوتی تو ایسے موقعوں پر ہم لوگوں کو وہاں جانے کی اجازت مل جاتی۔ مسز گاندھی کی آمد پر بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کی تقریر جوش و جذبہ سے خالی مگر التجا اور گذارش سے پُر تھی۔ آواز میں ایک طرح کا نسوانی سحر تھا، جس سے سننے والے کے اندر یہ داعیہ پیدا ہوتا کہ یہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہو، اسے ووٹ دینے میں کوئی حرج نہیں اور اگر انھیں بھاری اکثریت مل گئی تو وہ اس ملک سے غربت کا نام و نشان مٹا ڈالیں گی۔ واپس آکر جب میں نے والد صاحب کو یہ رپورٹ پیش کی کہ اندرا گاندھی اس ملک سے غریبی ہٹانا چاہتی ہیں تو انھوں نے میری سادگی پر تبسم فرمایا، بولے: وہ دراصل غریبی کو نہیں بلکہ غریب ہی کو ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

مسز گاندھی کے انتخابی دورے نے شہر میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ غریبی ہٹاؤ کے دلفریب نعرے نے عام لوگوں کے درمیان ان کی مقبولیت بڑھا دی تھی، لیکن احمد آباد کے فسادات کے زخم ابھی تازہ تھے جو خود کانگریس کی حکومت کے زیر انصرام انجام پائے تھے۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک طرح کا کنفیوژن تھا۔ فساد نے ان کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ تو کیا مسلمان پھر کانگریس کو ہی ووٹ دیں گے؟ مجھے پولو میدان میں مسز گاندھی کی شیریں مقالی یاد آتی۔ کتنی فکرمندی تھی ان کے لب و لہجہ میں، غریبوں اور کمزوروں کے لیے۔ پھر والد صاحب کا رویہ ان کی طرف ناقدانہ بلکہ مخالفانہ کیوں ہے؟ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا۔ والد صاحب کا معمول تھا کہ وہ اکثر روزنامہ اخبارات ہم بھائیوں سے پڑھوا کر سنتے۔ گاہے بہ گاہے یہ خدمت میرے حصہ میں بھی آتی۔ ایک دن میں نے انھیں خبروں کے حوالے سے بتایا کہ

مومنین کی جماعت نے متحدہ طور پر اندرا گاندھی کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے اور مسلمانوں سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ گائے بچھڑے کے انتخابی نشان پر مہر لگائیں۔ بولے: اخبار لے کر آؤ کون سی خبر ہے۔ میں نے درمیانی صفحہ کھول کر دکھایا جس پر آل انڈیا مومن کانفرنس کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اچھا یہ جماعت مومنین نہیں بلکہ مومن کانفرنس ایک سیاسی بلکہ ثقافتی تنظیم ہے۔ الملتمس کے نیچے لکھا تھا عبدالقیوم انصاری۔ ارے یہ تو وہی عبدالقیوم انصاری ہیں جن کا تذکرہ اسکول کے بعض بچے بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا، مگر پھر بھی یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ اندرا گاندھی جیسی شائستہ خاتون جنھیں غریبوں اور کمزوروں کی اس قدر فکر ہے، انھوں نے احمد آباد میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے ظلم و ستم کو خود اپنے حکومتی انصرام میں کیوں کر روا رکھا۔

ایک دن اخبار 'دعوت' کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ مکتبہ میں ایک بزرگ تشریف لائے۔ سفید کرتے پاجامے اور بنڈی میں ملبوس، روشن چہرہ، بڑے فریم سے جھانکتی ہوئی بارعب آنکھیں، میں ان بزرگ سے واقف تھا۔ یہ اخبار 'دعوت' کے استحکام کی مہم میں اکثر ملک گیر دورے پر رہا کرتے۔ ابّا کے حلقۂ احباب میں تھے اور ہمارے رشتے کے نانا بھی لگتے تھے۔ والد صاحب موجود نہ تھے، سو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے دانشوروں کے سے انداز میں ان سے سوال کر ڈالا۔

نانا! کیا آپ بھی اپنا ووٹ اندرا گاندھی کو دیں گے؟

میرے اس برجستہ سوال پر وہ مسکرائے، بولے: بیٹا ہم لوگ کسی کو اپنا ووٹ نہیں دیتے۔ ہم تو اپنا ووٹ اللہ میاں کو دے چکے ہیں۔ اس وقت تو بات زیادہ سمجھ میں نہ آئی، بعد میں پتہ چلا کہ جماعت اسلامی سے وابستگان نظامِ کفر کو اپنے ووٹوں سے مستحکم کرنا خلافِ ایمان جانتے تھے۔ اسی اثنا والد صاحب تشریف لے آئے۔ میرا سوال تو ادھورا رہ گیا، لیکن ان دونوں کی باہمی گفتگو سے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ مسز گاندھی کی شیریں بیانی ہمارے بزرگوں کو رام کرنے میں ناکام رہی ہے۔

۵

علامہ خورش

جمعہ کے دن مکتبہ میں بڑی چہل پہل رہتی۔ اطراف کے گاؤں اور قصبات سے صبح ہی سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ لگا رہتا۔ کوئی اپنی شمپنی میں آتا، یہ ٹم ٹم کے قسم کی ایک سواری تھی جس کے آگے گھوڑے جتے ہوتے، لیکن لکڑی کے بند دروازوں کے اندر آسائش کا پورا سامان ہوتا۔ شمہ چچا جب اپنی شمپنی سے اترتے تو لطیف خوشبوؤں کا ایک جھونکا اطراف کو معطر کر جاتا۔ نواب پیغمبر پور اکثر چھڑی ٹیکتے ہوئے آتے۔ کوئی سواری کی بابت پوچھتا تو کہہ دیتے کہ ڈاکٹروں نے انھیں پیدل چلنے کا مشورہ دیا ہے۔ شرفا جانتے تھے کہ اس قسم کے عذر دراصل اپنی تنگ دستی پر پردہ ڈالنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ایک صاحب تھے جو ہمیشہ عالم جذب میں رہتے۔ نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا، لیکن لوگ انھیں علامہ خورش کہتے۔ ویسے تو ان کی بینائی جاتی رہی تھی، لیکن اچھے دنوں میں انھوں نے کیا کچھ نہ پڑھ ڈالا تھا۔ ان کی گفتگو فارسی اور اُردو کے برمحل اشعار سے مملو ہوتی، لیکن جب سے جذب و مستی نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا وہ اکثر خاموش رہتے۔ جب طبیعت آمادہ ہوتی تو علم و معرفت کے دریا بہاتے البتہ کبھی کبھی ان کی طلاقت لسانی لکنت کا شکار ہو جاتی، الفاظ ٹوٹتے بکھرتے، انھیں اپنے اوپر قابو نہ رہتا۔ ایک تشنج کی کیفیت ان کے چہرے پر طلوع ہوتی جیسے کسی نے ان کی گویائی سلب کر لی ہو اور پھر وہ نمناک آنکھوں سے دور خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر ان کی بےبسی دیدنی ہوتی۔ آج اتفاق سی جمعے کی مجلس میں علامہ خورش کے ساتھ پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ پروفیسر جہاں پر تکلف کھانوں کے عادی تھے وہیں کھانے کی طرف علامہ خورش کا رویہ بے نیازانہ تھا۔ خوشی خوشی ماحضر تناول فرماتے اور کبھی کوئی کلمۂ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ آج ان کی طبیعت خلاف معمول رواں تھی۔ کہنے لگے: پتہ نہیں کب ہندوستانی مسلمانوں کو جمعہ کی نماز نصیب ہوگی، یہ سب تو رسم ہے جس میں ہم لوگ پھنس گئے ہیں، روح سے خالی۔ محکومی میں تو ہر جمعہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہو۔

ہاں اب ان باتوں کو سمجھنے والے لوگ کہاں رہے۔ شمہ چچا نے تائید کی، بولے: اب تو سیکولرازم کے

استحکام کو ہی ملی ہدف قرار دے دیا گیا ہے۔ دیکھیے کیسے بڑے بڑے جغادری اندرا کانگریس کی حمایت کو عین اسلامی فریضہ قرار دینے پر مصر ہیں۔

لیکن کیا بھی کیا جائے مسلمانوں کے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہیں۔ کانگریس بھلی بری جیسی بھی ہے، مسلمانوں کی ہمدردی میں دو جملے بولتی تو ہے۔ نواب صاحب نے رائے دی۔

ایسے خالی بول کا کیا فائدہ، ویسے بھی اب یہ نہرو گاندھی والی پارٹی نہیں رہی۔ گاؤکشی کے مسئلہ کو ہی لیجیے، گاندھی عوامی دباؤ کے باوجود گاؤکشی پر پابندی لگانے کے خلاف رہے۔ نہرو نے بھی گاؤکشی کے خلاف قانون سازی کی اجازت نہیں دی، البتہ مستقبل کے رہنما اصولوں میں گاؤکشی کی ممانعت کو قبول کرلیا۔ لیکن اندرا تو ایسا لگتا ہے کہ احیا پرست ہندوؤں سے بھی مقابلہ میں آگے نکل جانا چاہتی ہے۔ شحمہ صاحب نے اپنے کرب کا اظہار کیا۔

اندرا بھی کیا کرے، آپ نے دیکھا نہیں کس طرح لاکھوں لوگوں نے گاؤکشی کے خلاف پارلیمنٹ کا محاصرہ کرلیا۔ تین شنکراچاریہ مظاہرین کی حمایت میں نکل آئے۔ خود وزیر داخلہ گلزاری لال نندا کی ہمدردی مظاہرین کے ساتھ تھی، بلکہ بعضے تو کہتے ہیں کہ وہ اندر سے ملے ہوئے تھے، پھر بیچاری اندرا کرتی بھی تو کیا کرتی۔ اس نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر کوئی سیاست داں کرتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ملک کا مزاج بدل رہا ہے۔ شحمہ صاحب نے اپنے موقف کو مدلل کرنے کی کوشش کی، بولے: اور یہ جو احمد آباد کا فساد ہے اس کے پیچھے بھی تو کانگریس کی اندرونی چپقلش ہے۔ مرار جی ڈیسائی کا گروپ اندرا کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور اس عمل میں انھیں احیا پرست ہندوؤں کی حمایت حاصل ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں اندرا مسلمانوں کا جھنڈا نہیں اٹھاسکتی۔

پھر یہ علما کی انجمنیں، مومن کانفرنس کے قائدین اور مسلمانوں کی سرکردہ شخصیات کانگریس سے یہ کیسے امید لگائے بیٹھی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے تحفظ اور ان کی بہبود کا کام انجام دے گی۔ نواب صاحب نے اعتراض وارد کیا۔

خالم مخول ہیں یہ لوگ خالم مخول۔ پروفیسر نے فتویٰ صادر کیا۔

تم درست کہتے ہو، مولویوں کی انجمنیں ہوں یا مسلمانوں کے سیکولر سیاست داں، ان بے چاروں کو اس بات کا سرے سے اندازہ ہی نہیں کہ ان کے ساتھ یہاں کون سا حادثہ پیش آیا ہے۔ اگر آپ کو اس بات کا پتہ ہی نہ چلے کہ آپ سے کیا چیز چھن گئی ہے تو آپ ایک حیرانگی کے عالم میں خوف و دہشت کے اسیر ہوجاتے ہیں۔ ہر روز کچھ نیا چھنتا ہے اور اس سے پہلے کہ آپ اس حادثۂ فاجعہ کو اپنی گرفت میں لائیں یا اس

کے تدراک کی کوشش کریں، ایک نیا حادثہ مزید کچھ چیزوں سے آپ کو محروم کر دیتا ہے۔ ایک ورطۂ حیرت، خوفِ مسلسل اور کرب بے کنار، یہ ہے ہماری کہانی۔ دہ۔ ہ ہ۔۔۔ شت، منجمد خووووو۔۔۔ ف جس پر وقت کا مرہم بھی بے اثر ہو۔ تم کیا جانو یہ کیا ہے یہ دہ۔۔ ہ۔ ہ۔۔ شت۔ یہ کہتے ہوئے علامہ خورش کی زبان لکنت کا شکار ہوگئی۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کرب کو اگلی نسلوں کو منتقل کر پائیں گے یا نہیں۔ کیا انھیں پتہ چل پائے گا کہ ان کے آبا و اجداد کبھی اس ملک میں کھلے آسمان کے نیچے بلاخوف جیا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ علامہ خورش نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ اسی دوران جامع مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور مجلس برخاست ہوگئی۔

آج، مسجد کو جاتے ہوئے، علامہ خورش کا یہ جملہ بار بار یاد آتا کہ کوئی چیز ہے جو کھو گئی ہے اور کھونے والوں کو اس گمشدگی کا احساس بھی نہیں۔ آخر وہ چیز ہے کیا؟ مال و دولت اگر کھو جائے تو اس کا حصول ممکن ہوتا ہے، لیکن جب کھونے والوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اس کی گانٹھ سے کیا نکل گیا ہے تو پھر وہ اس کی بازیافت کیسے کر سکتا ہے؟

علامہ خورش آخر اتنی پیچیدہ بات کیوں کرتے ہیں۔ وہ آسان زبان میں بھی تو کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ ایک دن شاعرانہ ترنگ میں تھے، کہنے لگے: میرے سجدوں کو سر نہیں ملتا۔ میں نے سوچا کتنی خلافِ عقل بات ہے۔ پتہ نہیں ان کا اشارہ مومن کی متاعِ گمشدہ کی طرف تو نہیں یا ان کی مراد کھلے آسمان کے نیچے بلاخوف جینے سے ہے، جو بقول ان کے اب منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ممکن نہیں رہا۔ مگر پھر بھی مسلمان کانگریس کی طرف مائل ہیں۔ میں اس امر پر جتنا بھی غور کرتا مجھے حیرت ہوتی۔ مسز گاندھی کتنی شائستہ اور مہذب خاتون ہیں، بولتی ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں، کتنا درد تھا ان کی تقریر میں غریبوں اور کمزوروں کے لیے۔ پھر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف عین حکومتی سرپرستی میں منظم فسادات کو کیسے روا رکھا ہوا ہے۔ گاؤکشی کے مسئلہ پر وہ ہندو انتہاپسندوں کے ساتھ کیسے کھڑی ہوگئی ہیں۔ کیا اپنے اقتدار کی خاطر انسان اتنا سفاک ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بستیاں تاراج کر دے، مظلوموں کی آہیں اور کراہیں، بے بس عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار اس کی شقاوت اور سنگ دلی کے آگے بے اثر ہو جائے۔ میرے لیے سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ جب مسز گاندھی مسلمانوں سے مسلسل اعراض برت رہی ہیں، ان کی حکومت انھیں ہر دن ایک نئے فساد کا تحفہ دیتی ہے جس کی سنگینی پچھلے فساد سے بڑھ کر ہوتی ہے تو پھر مسلمان ان کی حمایت سے ہاتھ کیوں نہیں کھینچ لیتے۔ ہمارے عمائدین خواہ وہ جمعیۃ العلمائی مولوی ہوں یا

عبدالقیوم انصاری جیسے لوگ، یہ اندرا گاندھی کی حمایت میں اتنی پرشور تحریکیں کیوں چلاتے ہیں۔ کیا ان کی عقل واقعی خبط ہوگئی ہے یا آگ وخون کے مسلسل بڑھتے سایے نے انھیں دہشت زدہ کر دیا ہے۔ میں جتنا زیادہ سوچتا مجھے علامہ خورش کی یہ بات درست لگتی کہ حالات کی سنگینی کے آگے مسلم قائدین کی عقلیں منجمد ہوگئی ہیں۔ پھر خیال آتا ابّا سچ ہی تو کہتے ہیں اندرا کی کانگریس جیتے یا مرارجی کی، کمیونسٹوں کو کامیابی ملے یا حزب اختلاف کی دوسری پارٹیاں حکومت بنائیں، ہمارے حصے میں محرومی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ آنے کو نہیں۔

آخر وہی ہوا، 'غریبی ہٹاؤ' کے نعرے نے مسز گاندھی کو غالب اکثریت سے کامیابی دلا دی۔ الیکشن کے خاتمہ کے ساتھ ہی عوامی ڈسکورس سے مسلم مسئلہ بھی غائب ہوگیا، البتہ اسکول میں باہمی مباحثے کی مجلسوں نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ بزم اُردو کے جلسوں میں جو ہفتہ عشرہ پر منعقد ہوتا تھا، عام طور پر ادبی و ثقافتی موضوعات ہوا کرتے تھے، اس دفعہ منتظمین نے جو موضوع تجویز کیا تھا اس کا عنوان تھا ''ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل''۔ میں نے سوچا موضوع جانا پہچانا ہے، کیوں نہ طبع آزمائی کی جائے۔ کسی تقریری مقابلہ میں شرکت کا کوئی تجربہ تو نہ تھا، لیکن اسی موضوع پر طفیل احمد منگلوری کی کتاب 'ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل' مکتبہ میں آویزاں دیکھ چکا تھا۔ ابوالکلام آزاد کی خطابت کا بھی بڑا شہرہ سن رکھا تھا۔ والد صاحب کہتے تھے کہ وہ جب جنگل میں تقریر کرتے تو چرند پرند، حجر شجر انھیں سنا کرتے۔ اقبال کی نظموں اور حالی کی مسدس سے بھی کسی قدر واقفیت تھی۔ جو کچھ جہاں سے ملا اسے کام پر لگایا،

کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

تقریر کی ابتدا اس شعر سے کی۔ کچھ اس میں آزاد کی خطابت ڈالی، کچھ مولانا منگلوری کی رجائیت۔ پھر خیال آیا کیوں نہ اس شئے پر توجہ کی جائے جسے ہندوستانی مسلمانوں نے کھودیا ہے اور جس کا انھیں احساس بھی نہیں اور جس کا تذکرہ علامہ خورش جب بھی کرتے ہیں ایک سماں باندھ دیتے ہیں اور پھر اقبال کا یہ شعر ٹانک دیا جائے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

'لوگو! اگر تمھیں پتہ چل جائے کہ وہ چیز ہے کیا جو کھوئی گئی تو تمھیں بڑی حیرت ہوگی۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے علما و قائدین بھی اس بات سے واقف نہیں۔ میں آج اس راز سے پردہ اٹھانے والا ہوں'، اسی طرح

کے خطابیہ (rhetoric) سے پوری تقریر مملو تھی۔ آخر میں اقبال کے اس شعر کو کام پہ لگایا گیا تھا:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

تقریر پر دوبارہ نگاہ ڈالی، نوک پلک درست کی مگر یہ خلش باقی رہی کہ وہ چیز جس کے کھونے کا اس پرشور انداز سے تذکرہ کیا گیا ہے اس کے بارے میں آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ وہ شئے ہے کیا۔ پھر سوچا علامہ خورش بھی تو اسی بلند آہنگی سے کسی گمشدہ شئے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی باتوں سے تو اہل مجلس پر رعب و دبدبہ طاری ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی تقریر کے بعد سوال و جواب کا کوئی موقع تو ہوتا نہیں، سو اس سوال کو مبہم چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب اسکول کے مرکزی ہال میں تقریری مقابلہ کی محفل سجی۔ جب میری باری آئی اور میرا نام پکارا گیا تو ایسا لگا کہ کسی نے اچانک مجھے محشر میں پیش کردیا ہو۔ پورے اسکول کی نگاہیں آج میری طرف تھیں، میں اس صورت حال سے بچنے کے لیے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ تقریر اسی کرّ وفر اور بلند آہنگی کے ساتھ جاری رہی، لیکن جہاں سامعین سے نگاہیں ملاتا اوسان خطا ہونے لگتے۔ جیسے تیسے تقریر ختم ہوئی، البتہ میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ماسٹر ظفیر صاحب نے تائید میں اپنا سر ہلایا اور برجستہ بولے، یہ ہوئی تقریر۔ ظفیر خان صاحب فزکس کے ٹیچر تھے، لمبے چوڑے، قوی ہیکل، دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں لیے دیئے رہتے۔ کلاس میں جب کبھی ایک بار نو نوائز (No Noise) کہہ دیتے تو سناٹا طاری ہوجاتا۔ ان کی برملا تائید کا مطلب تھا کہ میری تقریر اسکول کے سالانہ جلسہ کے لیے منتخب کر لی گئی تھی۔

ان ہی دنوں مولانا مودودی کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا جس میں انھوں نے اپنے بچپن کے حالات و کوائف لکھے تھے۔ 'میرا بچپن' کے عنوان سے یہ مضمون غالباً کسی درسی کتاب کا حصہ تھا۔ مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ کس طرح ان کی پیدائش سے پہلے ان کے گھر کوئی فقیر آیا جس نے ان کے والدین کو ابوالاعلیٰ نام رکھنے کا مشورہ دیا۔ مضمون پڑھ کر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا خاندانی سلسلہ بڑے بزرگوں بشمول سرسیّد احمد خان سے جاملتا تھا۔ ان کے بچپن کی شرارتوں میں، اپنے حصے کی چیز کھانے کے بعد بڑے بھائی کے حصہ میں مال غنیمت تلاش کرنا، یہ اور اس قسم کے دسیوں واقعات جس میں خاندانی تفاخر کی آمیزش شامل تھی، ایسا لگا جیسے میری اپنی ذاتی کہانی سے مملو ہو۔ اس کو پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں بھی اپنی سوانح حیات لکھ ڈالوں۔ کیا عجب کہ اس طرح بڑا آدمی بننے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ شرافت و نجابت، روحانیت اور تصوف کا مسالہ تو خاندان میں پہلے سے موجود تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ بڑا آدمی بننے

کے لیے چالیس اشرفیوں کے ساتھ سفر کیا جائے اور راستہ میں ڈاکوؤں کا ڈر اور جان کا دھڑکا لگا رہے۔ تقریری مقابلہ میں کامیابی سے یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ اگر علامہ خورشؔ کی فکرمندی اور ان کے کرب انگیز بیان میں مولانا آزاد کی بلند آہنگی اور اقبال کے اشعار کا آمیزہ لگا دیا جائے تو سامعین کی داد وصول کی جاسکتی ہے۔ اور ایسے اساتذہ بھی جو عام دنوں میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، ان کے سر تائید میں ہل جاتے ہیں۔ پھر کیوں نہ مودودی صاحب کی طرح اپنے بچپن کے بیان کو اس طرح مرصع کیا جائے کہ اس پر کسی بڑے آدمی کی سوانح کا گمان ہو۔

اب دل ہی دل میں اپنی سوانح مرتب کرنے کا پروگرام بنانے لگا۔ اسکول میں اپنے استاد شاداں فاروقی صاحب کو اکثر دیکھتا کہ وہ سفید تقطیع پر پہلے خوبصورت بارڈر بناتے اور پھر خوشخط الفاظ میں اپنی نظمیں کچھ اس طرح لکھتے جاتے کہ اس پر مطبوعہ ہونے کا گمان ہوتا۔ خیال آیا کہ اس مقصد کے لیے ایک مجلد کاپی خریدنی چاہیے، بالکل ویسی ہی جیسی شاعروں کے پاس ان کی بیاض ہوتی ہے۔ کچھ پیسے اپنے پاس تھے، کچھ والدہ سے لے کر سوا روپے میں ایک خوبصورت کاپی خرید لایا۔ صفحات بڑے دبیز، چکنے اور سفید تھے۔ ہاتھ پھیرنے پر لکھنے کا جی چاہتا۔ گھر میں طرح طرح کے قلم اور خوشخط لکھنے کا سامان موجود تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ میری اپنی تحریر نہایت بدخط اور گنجلک تھی۔ سو اس کا حل یہ نکالا کہ اپنے بڑے بھائی شکیب ارشد صاحب کو کتابت کے لیے آمادہ کیا اور ان سے یہ قول وقرار بھی لے لیا کہ یہ انتہائی خفیہ پروجیکٹ ہے، جب تک تکمیل کو نہ پہنچے اس بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔ اب کام اس طرح شروع ہوا کہ میں بولتا جاتا اور وہ کمالِ احتیاط کے ساتھ کاپی میں لکھتے جاتے۔ اس دوران کبھی جملہ کی ساخت اور اسلوبِ بیان پر کچھ اختلاف بھی ہوتا، لیکن باہمی مشاورت سے حل نکل آتا۔ دو چار دن انتہائی رازداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ایک دن نہ جانے کس بات پر اختلاف ہوا کہ انھوں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں لکھتا۔ میرے خیال میں اسے اس طرح لکھا جانا چاہیے۔ اس سے پہلے وہ میری بہت سی باتیں مان چکے تھے، شاید اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جھگڑا جب آگے بڑھا تو بات والد صاحب تک پہنچی۔ انھوں نے معاملہ فہمی کے لیے کاپی منگوائی، اُلٹ پلٹ کر دیکھا، میری اس معصوم جسارت پر مسکرائے، بولے: بیٹا! ابھی تم نے کیا ہی کیا ہے، ابھی تمھاری سوانح عمری کون پڑھے گا، پہلے کچھ بن جاؤ پھر سوانح عمری لکھ لینا۔

شخصی اور خاندانی علو مرتبت کے اظہار پر والد صاحب نے روک لگادی، البتہ دانشورانہ بلند آہنگی اختیار کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ تقریری مقابلہ میں نہ صرف یہ کہ اوّل انعام کا حقدار قرار پایا بلکہ ججوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ نے مجھے پاس بلا کر تحسین کے کلمات بھی کہے۔ پوچھا: کس کے

بیٹے ہو؟ اور اگلے ہی دن گھر تشریف لے آئے۔ پتہ چلا کہ ان کا نام ماسٹر محمد یعقوب ہے، والد صاحب کے پرانے شناساؤں میں ہیں اور اب سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد شہر میں مسلم لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کے قیام واستحکام میں مصروف ہیں۔ انھوں نے میری پڑھائی کے بارے میں کچھ رسمی سوالات کیے۔ والد صاحب کے سامنے میری تقریر کے حوالے سے حوصلہ افزا کلمات کہے، بولے: میں راشد میاں کو اپنی شاگردی میں لینا چاہتا ہوں۔ صبح کے وقت کچھ لڑکوں کو پڑھاتا ہوں، ان کا جی چاہے تو یہ بھی آ سکتے ہیں۔ یعقوب صاحب ویسے تو ریاضی پڑھاتے تھے لیکن ادب، فلسفہ اور مشرقی علوم پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک کلاسیکی استاد تھے۔ سائنس ہو یا تاریخ، سیاست ہو یا دیگر امور ملّی، جب ان کی گفتگو شروع ہوتی تو ہم طلبا شوق وجستجو کی تصویر بنے کچھ اس طرح سنا کرتے جیسے ان کی سحر الکلامی نے ہمیں پتھر کے بے جان مجسّموں میں تبدیل کر دیا ہو۔ ادق سے ادق مسائل کو دلچسپ اور آسان بنانا اور اس میں حکایات وقصص کو کام پر لگانے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ نہ جانے ان کے بیان میں کیا جادو تھا کہ سننے والوں کی بشاشت میں کمی نہ آتی۔ ایک دن کچھ پریشان سے تھے، کہنے لگے: جانتے ہو ملک میں جنگ کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بڑا قتل وخون ہو رہا ہے، حالات اگر بے قابو ہو گئے تو ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک بار پھر جنگ چھڑ جائے گی اور جنگوں سے تباہی کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔

تو کیا ہم اس خطرے کو نہیں روک سکتے؟ ایک طالب علم نے اپنی سی پیشکش کی۔

بولے: ہاں کیوں نہیں مگر تم لوگ ابھی بہت چھوٹے ہو، ان باتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

ایسا لگا جیسے ہماری طفلانہ معصومیت ان کی گہری باتوں کی شاید متحمل نہ ہو۔ میں نے اسپین کے مورسکو مسلمانوں کے بارے میں کچھ واقعات پڑھ رکھے تھے کہ کس طرح والدین اپنے بچوں کو انتہائی رازداری کے ساتھ اس بات سے آگاہ کرتے کہ وہ دراصل مسلمان ہیں، ان کا تعلق کبھی مسلمانوں کی نسل سے رہا ہے، لیکن اندلس میں مسلم ریاست کے خاتمہ کے بعد محض اپنی جان بچانے کے لیے انھوں نے مجبوراً عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ میں نے اپنی کچی پکی معلومات کو کام پر لگاتے ہوئے کہا: اسپین میں بھی تو مسلمانوں کے ساتھ کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی تھی۔ میرے اس سوال پر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند ثانیے خاموش رہے، جیسے ادق اور پیچیدہ تاریخی حقائق کے بیان کے لیے کوئی آسان اسلوب تلاش کر رہے ہوں، بولے: جانتے ہو مسلمانوں کا اس ملک میں سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

یہ کہ ان کی اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہیں۔ مجاہد نے جواب دیا۔

یہ تو مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے، یہ چھلکا ہے مغز نہیں۔

انھیں اپنے فرضِ منصبی کا احساس نہیں۔

بولے: اس سے بھی بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔

میرے خیال میں فسادات سے بڑا کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک دوسرے طالب علم نے رائے دی۔

بولے: اس سوال کا کوئی ایک جواب تو نہیں ہوسکتا، البتہ ایک زخم جو بڑا گہرا ہے اور مسلسل رِس رہا ہے، اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں، یوں سمجھو کہ تمھارے رشتہ داروں کو کسی نے قتل کیا ہو، تمھیں معلوم ہو کہ قاتل کون ہے، وہ تمھاری نگاہوں کے سامنے رہتا ہو، لیکن تم اس کے اقدام کی تعریف کرنے اور اس کے ساتھ نباہ کرنے پر خود کو مجبور پاؤ، اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ رہنا، اس کی تعریف کیے جانا اور ہر مصیبت میں اس کی طرف دیکھنا حالانکہ اس کے دل میں تمھارے لیے آج بھی اتنی ہی نفرت بھری ہو، اس صورت حال میں اگر کوئی شخص پھنس جائے تو تم لوگ اس کے بارے میں کیا خیال کروگے؟

ہماری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ معاملہ پیچیدہ ہے، مورسکو مسلمانوں سے بھی زیادہ سنگین۔

بولے: اس ملک میں عرصہ سے مسلمانوں پر منافقت اور مداہنت کا عذاب مسلط ہے۔ قاتل کو قاتل کہنے سے ان کی زبانیں انکاری ہیں، اب ان ہی فسادات کے مسئلہ کو لو، مسلمانوں نے اپنا سب کچھ کانگریس کے حوالے کر رکھا ہے اور یہی کانگریس فسادات میں مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ بلوائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے بلکہ حکومتی مشنری بھی بلوائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہوجاتی ہے۔ ان سب کے باوجود مسلم قائدین کانگریس کی حمایت میں تشہیری مہمیں چلاتے ہیں، اس سے اپنے تحفظ کی بھیک مانگتے ہیں اور کانگریس کی مسلم دوستی کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔

منافقت کے لفظ سے تو میں واقف تھا، میں نے پوچھا: یہ مداہنت کیا چیز ہوتی ہے؟

بولے: جان بوجھ کر کلمۂ حق سے اعراض کرنا، حقیقت پر پردہ ڈالنا۔ ہندوستانی مسلمان خوب جانتے ہیں کہ ان کے خون سے کس کے دامن رنگین ہیں۔ ہمارے قائدین بزبانِ عمل یہی کہتے ہیں کہ اب رہنا ان ہی کے ساتھ ہے تو نباہ کی کوئی صورت نکالنی ہوگی، ظالم کے ساتھ نباہ کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ اس نے ظلم و جور سے توبہ نہیں کی ہے، ایک ایسا عذاب ہے جس کے تذکرے سے جہنم کا بیان بھی خالی ہے۔

پھر ہم سب مل کر کچھ کرتے کیوں نہیں؟

بولے: مسلمان فرقوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، مثلاً انصاری برادران کانگریس کو ووٹ دیتے ہیں تاکہ ان کو چھوٹی موٹی سرکاری مراعات ملتی رہیں اور ان کے دو چار لوگ پارلیمنٹ اور اسمبلی میں لے لیے جائیں۔ جمعیۃ العلمائی مولوی بھی یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں میں کوئی انڈپینڈنٹ سیاسی فکر پیدا ہو، کانگریس

انھیں بھی مراعات کے چند ٹکڑے ڈال دیتی ہے۔ اب رہے عام مسلمان تو وہ ان سیاسی اور مذہبی قائدین کے ذریعہ یرغمال بنالیے گئے ہیں۔

اور مسلم لیگ بھی تو ہے نا، پھر مسلمان اسے ووٹ کیوں نہیں دیتے؟

مسلم لیگ کی مسلمانیت بھی ہمارے کام کی نہیں۔

مگر مسلمان تو پہلے ہی کانگریس اور مسلم لیگ میں بٹ گئے تھے، میں نے اپنی معلومات کو پھر کام پہ لگایا۔

بولے: کرتے بھی کیا، مسلم لیگ طبقۂ اشراف کے مفادات کے تحفظ کے لیے سامنے آئی تھی۔

'شرفا؟'

ارے ہاں جنھیں اونچی ذات کا مسلمان کہا جاتا ہے، حالانکہ سب آدم کی اولاد ہیں اور خدا کی نظر میں تو سب برابر ہیں، پھر نیچی ذات والے مسلمان کیا کرتے، انھوں نے کانگریس کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی۔

مگر مولانا آزاد تو بہت بڑے آدمی تھے، وہی قول فیصل والے مولانا، میں نے اپنی کتب آشنائی کا سکہ جماتے ہوئے کہا۔

بولے: ہاں ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی اپنی سماجی حیثیت کے باوجود خاندانی اعتبار سے اعلیٰ نسب نہ تھے، سو مسلم لیگ میں انھیں قیادت کا عالی مقام نہیں مل سکتا تھا، ان کے لیے کانگریس کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں رہ گیا تھا۔

آ آں! میرے منہ سے حیرت سے بلاساختہ نکلا۔

بولے: تمھیں حیرت ہوگی کہ بڑے بڑے اللہ والوں کے دامن بھی اس خباثت سے آلودہ رہے ہیں۔ بہشتی زیور میں تو میل جول اور برابر کے لوگوں کے بارے میں باقاعدہ عنوان باندھا گیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے مولانا زکریا جن کی کتاب تبلیغی نصاب کا نام شاید تم نے سنا ہو وہ بھی ذات پات کے قائل ہیں، بلکہ انھوں نے تو اپنے ایک خواب کے ذریعہ تیسرے امیر مولانا رحمت اللہ کو صرف اس بنا پر معزول کرادیا کہ ان کا تعلق نیچی ذات کی تیلی برادری سے تھا۔ اچھا خیر! بات کہاں سے کہاں نکل گئی، چلو اس قصہ کو یہیں رہنے دو۔ یہ کہتے ہوئے یعقوب صاحب نے مجلس برخاست کردی۔

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ مسلم معاشرے میں ذات پات کے حوالے سے اتنا تضاد موجود ہے۔ مجھے اسکول کے دوستوں کی وہ گفتگو یاد آئی جب انھوں نے میرے نام کے آگے یا پیچھے خان، سید یا انصاری

نہ دیکھ کر پوچھا تھا کہ تم کیا ہو؟ میرا جواب تھا مومن۔ اس پر وہ سب خوب ہنسے، بولے: مومن تو تم ہو نہیں سکتے کہ تمھارے نام کے آگے انصاری کا لاحقہ نہیں ہے۔ اب میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ ایک دن جب میں نے اپنی رشتہ کی پھوپھی، جن کے زہد و ورع کا والد صاحب بھی احترام کرتے تھے، ان سے یہ جاننا چاہا کہ ہم لوگ خاندانی اعتبار سے کیا ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ بیٹا جب تم سے کوئی یہ سوال کرے تو بس یہ کہو کہ ہم مومن ہیں۔ مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ میرا مومن ہونا اسکول کے دوستوں کے نزدیک معتبر نہیں تھا۔

ایک دن اپنے چند ہم جماعتوں کے ساتھ مسلم محلہ میں جا نکلا۔ کھیل کود کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔ اذان سنتے ہی ایسا لگا جیسے اچانک کسی نے چلتی پھرتی زندگی پر حکم امتناعی جاری کر دیا ہو۔ دیکھتے دیکھتے محلہ کی مسجد نمازیوں سے پٹ گئی۔ کیا بوڑھے، کیا بچے اور کیا جوان جسے دیکھو وضو کے اہتمام میں سرگرداں ہے۔ دوران نماز ادھر امام نے سورۂ فاتحہ کی قرأت ختم کی، ادھر نمازیوں کی صف سے آمین کا مترنم کورس بلند ہوا۔ کسی آمین بالجہر والی مسجد میں نماز پڑھنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ گھر آکر میں نے والدہ کو بتایا کہ کس طرح وہاں مغرب کی نماز میں بھی عیدین کی بھیڑ بھاڑ جیسا سماں تھا۔ بولیں: ہاں کیوں نہ ہو، یہی تو سبب ہے کہ وہ لوگ ہم سے دین اور دُنیا دونوں میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ اتنے سچے پکے مسلمانوں کا محلہ، جن کے آمین کی صداؤں سے دلوں پر ایک ایمان افروز تاثر قائم ہوتا ہے، اتنے بھلے لوگ آخر مدت سے کانگریس کی حمایت میں کیوں کھڑے ہیں؟

٦

دوسری ہجرت

الیکشن میں مسز گاندھی کی شاندار فتح کے بعد احمد آباد کے فسادات کی باتیں پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ اب تشویشناک خبریں مشرقی پاکستان سے آرہی تھیں۔ ایک دن والد صاحب کو یہ کہتے سنا کہ بھئی انصاف تو یہ ہے کہ مجیب کو حکومت سازی کا حق ملنا چاہیے تھا، یہ جو بھٹو نے اِدھر ہم اُدھر تم کا ماحول پیدا کیا ہے اس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا ہوگا۔ ہندوستانی اخبارات تصویر کا صرف ایک رخ دکھاتے تھے۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہاں واقعتاً ہو کیا رہا ہے۔ اسی دوران چٹاگانگ سے جیلانی چچا کا ایک خط موصول ہوا جس نے پورے گھر کو سراسیمہ اور متوحش کر دیا۔

۲۳ر جون ۱۹۷۱ء　　　　کالر گھاٹ، چٹاگانگ

مشرقی پاکستان

عزیزی، سیدی حافظ محمد نورالہدیٰ صاحب زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ تمام اہل خانہ بعافیت ہوں گے۔ اِدھر مشرقی پاکستان کے حالات انتہائی دھماکہ خیز ہوتے جارہے ہیں۔ مسلمان مسلمان کے خون کا پیاسا بنا ہے۔ کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ جائیں تو جائیں کہاں؟ تقسیم کے وقت تو یہ سمجھ کر یہاں آئے تھے کہ سابق دارالاسلام ہندوستان سے نئے دارالاسلام مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اب اِدھر کچھ دنوں سے مغربی پاکستان جانے کی راہ تلاش رہے ہیں۔ ہمارے ایک دوست جو پاکستانی فوج میں اعلیٰ عہدے پر ہیں، انھوں نے انتظام کا وعدہ کر رکھا ہے۔ بعض خاندان جو ہماری ہی طرح بہار اور یوپی سے ہجرت کر کے آئے تھے، ہندوستان واپسی کی کوششوں میں ہیں، لیکن یہ راستہ بھی خطرناک ہے۔ اکثر مسافروں کے لوٹ مار اور قتل وخون کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ہم لوگ دوبارہ دارالکفر کی طرف واپسی کی سوچ بھی نہیں سکتے۔

تمھاری بھابھی کی بڑی خواہش ہے کہ ایک بار ہندوستان جا کر عزیز و اقارب سے مل آئیں۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ ہم لوگ اپنا کھیت کھلیان چھوڑ کر اپنی آنکھوں میں پاکستان کا خواب سجائے یہاں آئے تھے، لیکن اب یہ زمین ہم پر تنگ ہوتی جارہی ہے۔ بنگالی مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ مغربی پاکستان کی اشرافیہ نے انھیں غلام بنا رکھا ہے۔ ان کا رویہ بنگالی زبان و ثقافت کی طرف حقارت کا ہے، جبکہ ملک کا سارا زرمبادلہ مشرقی پاکستان کما کر دیتا ہے، جس کا ذریعہ چائے اور کپاس کی پیداوار ہے۔ بنگالیوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر ہم اپنے فطری وسائل مشرقی پاکستان میں ہی خرچ کریں تو ہمارے ہاں خوشحالی آجائے گی۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اُردو بولنے والے کلیدی مناصب پر قابض ہو گئے ہیں۔ اب بہت سے بنگالی دانشور برملا یہ کہنے لگے ہیں کہ اسلام کے نام پر ہم سے دھوکہ کیا گیا۔ اب پتہ نہیں دھوکہ کس کے ساتھ ہوا۔ ہم جیسے مہاجرین پر تو یہ بات اب واضح ہوتی جارہی ہے کہ ہم لوگ اب تک ایک سراب کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔

اِدھر چند مہینوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تاراجی کے اتنے واقعات دیکھے اور سنے ہیں کہ اب تحریک آزادیٔ ہند کے قائدین سے ایمان اٹھ گیا ہے۔ کیا جناح پر یہ بات واضح نہیں تھی کہ پاکستان کے دو خطوں کو انتظامی طور پر سنبھالنا کتنا مشکل ہوگا۔ کتنی جانیں تباہ ہوئیں، تقسیم اور ہجرت کے خونیں سمندر میں لاکھوں انسان غرق ہو گئے۔ ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ ہم لوگ پہلے مہاجرین کہلاتے تھے اور اب ہمارا شمار محصورین میں ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی لگتا ہے کہ جناح، گاندھی اور جنگ آزادی کے تمام بڑے لیڈران ہمارے بہی خواہ نہیں بلکہ دراصل انگریزوں کے آلۂ کار تھے، جنھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں اور اقتدار کے لیے برصغیر کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ اللہ ہم لوگوں کو نیک عمل کی توفیق دے۔
خدا کرے ہم لوگ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ زندگی اور موت میں فاصلہ اب بہت تھوڑا ہے۔

خیراندیش م۔ک۔جیلانی

ابّا اب زیادہ تر خاموش رہنے لگے تھے۔ ان کا دایاں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے ہوتا اور وہ کسی گہری فکر میں ڈوبے ہوتے، پھر ایک عالم اضطراب میں یہ کہتے ہوئے خود کو تسلی دیتے کہ اللہ مسبّب الاسباب ہے۔ یہ ایک طرح سے ان کا تکیۂ کلام تھا، خاص طور پر جب وہ کسی پریشانی میں ہوتے اور ان کی نگاہیں آسمانوں کی

طرف اٹھتیں تو شدید بے بسی کے عالم میں ان کی زبان سے یہی نکلتا کہ اللہ مسبّب الاسباب ہے۔

ایک دن مکتبہ میں اپنے دوست ذکی صاحب سے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ حالانکہ مکتبہ میں گفتگو کا انداز چوپال جیسا ہوتا جہاں ہر شخص کو حسب مراتب شرکت کی اجازت ہوتی، کہہ رہے تھے کہ جیلانی بھائی کا خط آیا ہے، پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔ خط تو چار مہینے پرانا ہے، شاید سینسر کی وجہ سے دیر سے پہنچا۔

کہاں سے لکھا ہے انھوں نے، سننے میں تو یہ آ رہا ہے کہ محصورین کے الگ کیمپ بنا دیئے گئے ہیں۔

چٹا گانگ سے لکھا ہے، پتہ نہیں مغربی پاکستان جانے کی کوئی سبیل پیدا ہوئی یا نہیں، والد صاحب نے تشویش ظاہر کی۔

بڑے افسوس کی بات ہے، اب پاکستان میں بھی امان نہ ملے تو آدمی کیا کرے۔ ذکی صاحب نے شکوہ کیا، پھر تسلی کے انداز میں بولے: ویسے جیلانی بھائی مجاہد آدمی ہیں، انھوں نے کوئی راستہ ڈھونڈ نکالا ہوگا۔

جیسے جیسے مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی فوجی اور نیم فوجی ٹکڑیوں کا عمل دخل بڑھتا جاتا، ابّا کے اضطراب اور ہمارے گھر میں حزن و ملال کی کیفیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا۔ طرح طرح کی خبروں میں یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا کہ ظلم کون کر رہا ہے، پاکستانی فوج یا ہندوستانی نیم فوجی دستے یا بنگلہ قومیت کے علم بردار۔ البتہ یہ بات طے تھی کہ یہ سب لوگ مل کر جیلانی چچا اور ان جیسے لاکھوں شریف النفس لوگوں کو جنھوں نے ایک ایمانی بستی کا خواب آنکھوں میں لیے ہجرت کی تھی، یہ سب مل کر ان معصوم اور بے گناہ مہاجرین کے درپئے آزار ہو گئے ہیں۔ ایک دن پاکستانی افواج کی طرف سے بمباری کی خبریں آئیں، پھر اچانک شہر میں اعلان ہوا کہ شام ڈھلے شہر کی روشنی گل کر دی جائے، ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کوئی بم کہاں آ گرے۔ ابّا ریڈیو کے کبھی شوقین نہ تھے، لیکن ان دنوں ریڈیو پاکستان اور بی بی سی سے نشر ہونے والی خبروں کا ہندوستانی سرکاری پروپیگنڈے کی روشنی میں تجزیہ کرتے اور جب ہندوستانی نشریہ سے ڈھاکہ اور چٹا گانگ پر بمباری کی اطلاع آتی تو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ کر رہ جاتے۔ پورا گھر ذہنی طور پر اس قضیہ میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ ہندوستانی فضائیہ کا ہر بم ایسا لگتا جیسے جیلانی چچا کے عین اوپر گر رہا ہو۔ ایک طرف ہندوستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی افواج ہماری ہیں، ہمیں ان کی معرکہ آرائیوں اور فتوحات پر فخر کرنا چاہیے، دوسری طرف ان معرکہ آرائیوں کی زد میں خود ہمارا اپنا خاندان آ رہا تھا۔ پھر جیلانی چچا سے صرف ہمارا خونی رشتہ نہ تھا بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے صدقِ دل

سے اسلام کے لیے ہجرت کی تھی۔ ایک طرف اپنا دین اور اپنا خاندان تھا اور دوسری طرف اپنا ملک اور اس کی حوصلہ مند افواج۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ مجھے کس کی طرف داری کرنا چاہیے۔ اسلام کی حمایت سے، ایسا لگتا تھا جیسے مجھ پر ملک سے بے وفائی کا الزام آتا ہو۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ مشرقی پاکستان میں ہندوستانی افواج کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوگئی ہے۔ ہندوستان میں جشن کا سماں تھا۔ مسز گاندھی نے پارلیمنٹ میں یہ خوش خبری سنائی کہ ڈھاکہ اب ایک آزاد ریاست کا آزاد دارالحکومت بن چکا ہے۔ یہ خبر ابّا پر بجلی بن کر گری۔ ایسا لگا جیسے کوئی چیز ہمارے اندرون میں ٹوٹ گئی ہو۔ پورا گھر سکتے میں تھا۔ مکتبے کی علمی مجلس ویران تھی۔ ابّا زیادہ تر خاموش لیٹے رہتے۔ ویران آنکھوں سے خلا میں تکا کرتے۔ اب انھیں نہ تو جیلانی بھائی کی فکر تھی اور نہ ہی ان کے کسی تازہ خط کا انتظار، جیسے ایک طویل بے چینی کو قرار آگیا ہو۔ والدہ ہم بچوں کو تسلی دیتیں کہ انھیں اختلاج کی شکایت ہے، ان شاء اللّٰہ جلد ہی ٹھیک ہوجائیں گے۔ اب اس درد کو کس کس سے بیان کیا جاتا کہ ان پر دراصل کیا گزر رہی ہے۔ مجھے سقوط دہلی والی بات بار بار یاد آتی، سوچتا ابّا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں پر سقوط دہلی کا سلسلہ نہیں رکتا، سقوطِ ڈھاکہ بھی تو اسی کا تسلسل ہے۔

ایک دن لکھنؤ سے نکلنے والے 'صدقِ جدید' کا تازہ شمارہ آیا۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح ابّا کی طبیعت بہل جائے، میں نے اخبار کا ایک حصہ پڑھ کر سنانے کی کوشش کی۔ بولے: کیا ہے؟ صدقِ جدید۔ پھر بڑی بے دلی سے پوچھا: کیا لکھا ہے؟ میں نے چند ابتدائی سطریں پڑھ کر سنائیں، لکھا تھا '۱۹۲۴ء میں کسی غیر مسلم نے نہیں بلکہ مصطفی کمال نے خلافت کے باوقار ادارے کا خاتمہ کر دیا اور پوری مسلم دُنیا بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔ ۱۹۴۸ء میں صرف تین دنوں کی مزاحمت کے بعد سلطنت آصفیہ کا چراغ گل ہوگیا۔ اسی سال اسرائیل کی ریاست وجود میں آگئی اور اب اسی سلسلہ کی اگلی کڑی بنگلہ دیش کا قیام اور متحدہ پاکستان کے خاتمہ کی شکل میں سامنے آئی ہے۔' اس سے پہلے کہ میں آگے پڑھتا، میں نے دیکھا کہ ابّا کی آنکھیں نمناک ہوگئی ہیں۔ بولے: رہنے دو، اب ان باتوں پر ماتم سے کیا فائدہ۔ مجھے فکرمند دیکھ کر تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، مجھے اختلاج کا عارضہ ہے، کبھی کبھی دورہ کی کیفیت ہوجاتی ہے۔ جب میں تمھاری عمر کا تھا، ایک بار دوڑتے ہوئے سڑک پر سینے کے بل گر گیا تھا تب سے قلب پر جو زور پڑا تو اس کا اثر اب بھی کبھی کبھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ مجھے اس بات کا تو اندازہ تھا کہ ابّا فطرتاً رقیق القلب واقع ہوئے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو بھی وہ اپنے سامنے ذبح ہوتا ہوا نہیں دیکھ پاتے تھے۔ مشرقی پاکستان سے آنے والی قتل وخون کی خبریں انھیں مضطرب کیے رکھتیں، پھر بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری، لیکن اب جو مسلمانوں کی وحدت ملّی پر

حملہ ہوا تو وہ اپنے حواس برقرار نہ رکھ پائے اور اب کتنی معصومیت سے اپنے اس درد کو بچپن میں گر جانے اور سینے پر چوٹ لگنے کے واقعات کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ابّا کی علالت کی خبر جب ذرا عام ہوئی تو ایک دن ماسٹر یعقوب صاحب مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ ابّا ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی آمد پر اٹھ بیٹھے۔ علیک سلیک کے بعد دونوں بزرگ چند لمحے ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہے۔ ایک بوجھل خاموشی نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کے درد سے واقف ہوں۔ پھر یعقوب صاحب نے خاموشی توڑی، بولے: 'حافظ صاحب میں تو تین چار دنوں تک بستر سے نہ اُٹھ پایا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بغداد اور غرناطہ کے سقوط کی تاریخ پڑھی تھی، اب پتہ چلا کہ کتنا سفاک ہے یہ تاریخی عمل، لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے چاہے یہ لوگ جتنے بھی شادیانے بجالیں بنگلہ دیش ایک مسلم اکثریت کا ملک ہے، وہ جلد ہی اپنی اصل پر لوٹ آئے گا'۔

'یہ بات درست ہے پاکستان کے دولخت ہونے سے بھی دُنیا میں ایک نئے مسلم ملک کا اضافہ ہو گیا ہے۔ دیر یا سویر دشمنوں کو جب اس بات کا احساس ہوگا تو ان کی امیدوں پر اوس پڑ جائے گی'۔

'لیکن ابھی تو وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے پاکستان کو دولخت کرکے ہزار سالہ مسلم حکمرانی کا انتقام لے لیا ہے۔

'ہاں بڑا زہر ہے اس کی باتوں میں، ویسے تو خود کو مسلمانوں کا بڑا ہمدرد کہتی ہے مگر دیکھیے اپنے دل میں کیا کیا خباثتیں چھپائے بیٹھی تھی۔ نہرو کی بیٹی سے اس قدر منافقت کی توقع نہ تھی، مگر اس کا بھی کیا قصور جب خود ہمارے درمیان تالی پیٹنے والے موجود ہوں تو وہ تکلف سے کام کیوں لے۔ اب دیکھیے نا اُردو اخبارات کے مدیروں کا جو جلسہ اس نے اپنی حمایت میں طلب کیا تھا اس میں کتنے بڑے بڑے جغادری اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے'۔

'ایسے لوگ تو ہر زمانے میں مل جاتے ہیں، مگر مؤثر اُردو اخبارات کے مدیران تو اب بھی نظر بند ہیں۔ حکومت کو اس بات کا اندازہ ہے کہ مسلمان خواہ جتنے بھی کمزور ہوں وہ اپنی وحدت ملّی پر کسی حملے کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے'۔

'بڑی عجیب صورت حال ہے، کاش کہ مسلمانوں میں محمد علی جیسا شخص ہوتا جو اس موقع پر ملت اسلامیہ کو سہارا دینے کے لیے سامنے آتا'۔ یہ کہہ کر یعقوب صاحب خاموش ہو گئے۔ مجلس میں ایک بار پھر گھٹن آمیز خاموشی طاری ہوگئی۔ چند ثانیے توقف کے بعد بولے: 'ندائے ملت' کا تازہ شمارہ دیکھا ہے، ایک

عجیب رپورٹ شائع ہوئی ہے۔

نہیں اِدھر کہاں کچھ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

بولے: رابطہ عالم اسلامی کے حوالہ سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ تین صہیونی ایجنٹوں کو اسرائیل نے مشرقی پاکستان میں اس کام پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ بنگالی عوام کو مغربی پاکستان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ رحمان سبحان جو مشہور بنگالی اکانومسٹ ہیں، انھوں نے پیرس میں ڈینیل کوہن سے ایک خفیہ ملاقات بھی کی تھی۔ 'ندائے ملت' نے اس پر اپنا کوئی تبصرہ تو نہیں لکھا ہے لیکن اس سے اس بات کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے کہ اس سازش کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔

'اور وہ 'شبستاں' میں بھی تو مضمون شائع ہوا ہے'۔

کون سا؟ یعقوب صاحب نے میرے شوقِ مداخلت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پوچھا۔

'وہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئیوں والا'۔

اچھا! یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ میں نے بزرگوں کی گفتگو میں مخل ہو کر بے ادبی کی ہے۔ اس خفت کو مٹانے کے لیے چائے کی پیالیاں سمیٹیں اور مجلس سے نکل آیا۔

۷

جشنِ سیمیں

ایک طرف سقوط ڈھاکہ پر مسلمانوں کے دل سخت مجروح تھے اور دوسری طرف ملک بھر میں جشن کی لَے مسلسل بڑھتی جاتی تھی۔ اندرا گاندھی جب فتح کے اعلان کے لیے پارلیمنٹ پہنچیں تو ان پر تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ اٹل بہاری واجپائی نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر انھیں دُرگا کا اوتار قرار دیا۔ البتہ مسلمان خود کو پہلے سے کہیں زیادہ الگ تھلگ محسوس کر رہے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ اس ملّی سانحہ پر منعقد ہونے والے جشن میں کیسے شریک ہوں۔ اسی دوران ایک دن اسکول میں یہ اعلان ہوا کہ اس سال حکومتی سطح پر جشن آزادی کی سلور جوبلی منائی جائے گی۔ سقوط کا زخم ابھی تازہ تھا، سخت غصہ آیا، کون سا جشن، پھر خیال آیا کہ کیا عجب کہ اس میں کوئی گہری بات ہو جو میری سمجھ میں نہ آتی ہو۔ دل و دماغ کنفیوژن کا شکار تھا۔ ایک دن 'صدقِ جدید' کے تازہ شمارہ میں یہ بات پڑھنے کو ملی کہ 'مسلمانوں کے غم و غصے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عام طور پر بنگلہ دیش کی آزادی اور پاکستان سے اس کی علیحدگی کے واقعہ کو مسلمانوں کے خلاف فتح کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف تحقیر آمیز اور اشتعال انگیز نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ناراضگی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ انھیں لگتا ہے کہ یہ جنگ بنیادی طور پر پاکستان کی سالمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے لڑی گئی ہے۔ ہماری وزارت اطلاعات جو ہر طرح کے پروپیگنڈے کا بروقت ازالہ کرتی ہے اس نے مسلمانوں کے غم و غصے کے تدارک کے لیے کوئی بروقت قدم نہیں اٹھایا۔' میرے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ یہ جنگ تو لڑی ہی اسی لیے گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کاٹ دیا جائے تاکہ ہزار سالہ مسلم حکمرانی کا انتقام لیا جا سکے، پھر وزارت اطلاعات اس تاثر کو کیسے زائل کرتی۔ کبھی سوچتا شاید ان باتوں میں کوئی گہرا نکتہ ہو۔ پھر یہ بھی خیال آتا کہ ہمارے اساتذہ بھی تو ملت کے تئیں کم درد نہیں رکھتے، سو اس خیال سے سلور جوبلی کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں شامل ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق سال بھر اسکول میں مسابقہ کے چھوٹے بڑے پروگرام ہونے تھے، کلاس روم کو سجایا جانا تھا اور پھر ایک دن وقت موعود پر ساتویں جماعت کے تمام طلبا کو شہر اور قصبات

کے دوسرے اسکولوں کے طلبا کے ساتھ ایک خاص یونیفارم میں آزادی کے پریڈ میں شریک ہونا تھا۔

میں چونکہ اس وقت اتفاق سے ساتویں جماعت میں تھا جسے پریڈ کے حوالے سے پورے اسکول میں مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اب ہم لوگوں کا زیادہ تر وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں صرف ہوتا۔ طلبا کے چھوٹے چھوٹے غول نئی نئی اسکیمیں بنانے میں مصروف رہتے۔ اسی دوران ایک دن کسی نے اطلاع دی کہ روٹری کلب میں بنگلہ دیش سے لوٹ کا بہت سا سامان آیا ہے جو بہت ارزاں قیمتوں پر فروخت ہورہا ہے۔ جانتے ہو کرکٹ کا بالکل نیا بلّا شانو صرف آٹھ آنے میں لے کر آیا ہے اور اس کے ساتھ چمڑے کی چمچماتی ہوئی گیند مفت، خورشید نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ طرح طرح کے سامان ہیں، ابھی شاید کم لوگوں کو معلوم ہے ورنہ بڑی بھیڑ ہوتی۔ بلّے میں تو میری دلچسپی نہ تھی لیکن لوٹ کا مال اور وہ بھی بنگلہ دیش سے، یہ سن کر میری رگِ تجسس پھڑک اٹھی۔ روٹری کلب ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ شام کے وقت ہم دو تین بچے وہاں جا پہنچے۔ برآمدے میں کپڑوں کے کھلے گٹھر جس میں طرح طرح کی گھریلو اشیا اور استعمال کے سامان بکھرے پڑے تھے۔ شاید کام کی زیادہ چیزیں لوگ لے جا چکے تھے۔ میری نظر کریم کلر کی ایک اچکن پر پڑی، میں چونک اٹھا۔ ارے یہ تو جیلانی چچا کی اچکن لگتی ہے، بالکل ویسی ہی جسے ہم لوگ دھوپ دکھا کر ان کی یادوں کی امانت کے طور پر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے کمال وارفتگی سے اسے اٹھایا، اُلٹ پلٹ کر دیکھا جیسے اس سے انسیت کا کوئی رشتہ ہو، لیکن یہ کیا، ارے اس پر تو خون کے دھبّے ہیں۔ میرے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے ہم کسی مقتل میں نکل آئے ہوں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والی ہولناک کہانیاں نگاہوں میں پھر سے مجسم ہوگئیں۔ تین پہیے کی سائیکل اور وہ گلابی فراک اور ایک پیر کا چھوٹا سا موزہ۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا مگر ہمت جواب دے گئی۔ خیال آیا نہ جانے یہ کس کی سائیکل ہو، کتنے چاؤ سے اس نے خریدی ہوگی، شاید اس گلابی فراک والی بچی کی ہو، پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ لاکھوں لوگ مارے گئے ہیں، وہ کچھ نہ کچھ تو پہنتے اوڑھتے ہوں گے، ان میں معصوم بچے بھی ہوں گے۔ انھوں نے ضد کر کے اپنے والدین سے طرح طرح کی چیزیں خریدوائی ہونگی۔ یہ تو چند چیزیں ہیں جو یہاں برآمدے میں بکھری ہیں۔ نہ جانے ان کے استعمال کرنے والے اب کہاں کس حال میں ہوں گے۔ شاید ان کے بارے میں دُنیا کو کبھی کچھ پتہ نہ چل سکے۔ ان بوڑھوں اور بچوں کی کہانیاں جن کے سامان یہاں عالم بے سروسامانی میں بکھرے ہیں، ان کی کہانیاں کون لکھے گا۔ جب تک اخباروں میں یہ پڑھتا تھا کہ نو ماہ کی خونریزی میں اتنے لوگ مارے گئے، تعداد کی کثرت بھی ایک عددی کھیل معلوم ہوتی تھی، آج جو مرحومین کی اشیا نگاہوں کے سامنے آئیں تو وہ اپنے اصل مالکوں پر بیتے مصائب کا قصہ کچھ اس

طرح سنانے لگیں کہ مشرقی پاکستان کی خون آلودہ سرزمین پھر سے چشم تصور میں جھلملانے لگی۔

اسکول میں جیسے جیسے جشن آزادی کی تیاریاں آگے بڑھتی جاتیں، کلاسوں کا نظام ڈھیلا پڑتا جاتا۔ اسکول کے کیمپس سے ملحق شہر کا مشہور میڈیکل کالج تھا۔ ایک دن چند احباب کے ساتھ کالج کی سیر کو جانکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نیم تاریک کمرے میں دو حنوط شدہ لاشیں رکھی ہیں۔ کمرے میں کیمیکل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اس طرح بے یار و مددگار پڑا دیکھ کر خوف و دہشت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ سوچا پتہ نہیں یہ کون لوگ ہوں جو شومئ قسمت سے یہاں پڑے ہیں۔ پھر اچانک روٹری کلب کی وہ اشیا یاد آئیں، پھر سے وحشت کے وہ دن واپس آگئے جب میں خواب میں کٹی گردن کا بچہ دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ اب حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ پورا مقتل آباد ہوگیا، پھر سے کانوں میں مبہم اور پراسرار آوازیں آنے لگیں۔

اس دوران ابّا کی بیماری نے طول پکڑا۔ ایک دن نزلہ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ عام طور پر اس قسم کی بیماری کا علاج خود ہی کر لیتے تھے، لیکن بخار جب تیز ہوا تو ہم لوگوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ انھیں اس طرح بستر پر لیٹے دیکھنے کے ہم لوگ عادی نہ تھے۔ طے پایا کہ باقاعدہ علاج ہو۔ ابّا اس تجویز کی مخالفت کرتے رہے، انھیں شاید پتہ تھا کہ یہ معمولی نزلہ زکام کا حملہ ہے، لیکن گھر والوں کے مسلسل اصرار پر ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ طرح طرح کی رنگ برنگی دواؤں کے اثر سے بخار تو اتر گیا لیکن اپنے پیچھے نقاہت اور دوسری پیچیدگیوں کا ایک سلسلہ چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر پھر آئے، اب کی انھوں نے انواع و اقسام کی دواؤں سے پوری میز آباد کردی۔ جاتے جاتے وہ بڑی رازداری کے ساتھ گھر والوں کو کچھ ایسی نصیحتیں کر گئے کہ پورے گھر پر سراسیمگی کی ایک چادر تن گئی۔ ابّا سمیت ہم بچے اس راز سے ناواقف تھے۔ پھر بھی مجھے کسی نہ کسی طرح یہ سن گن لگ گئی کہ مرض خطرناک ہے اور زندگی کے دن بس گنے چنے ہیں۔ ابّا بار بار کہتے رہے کہ انھیں کچھ نہیں ہوا ہے، لیکن گھر والوں کے اصرار پر دوائیں کھاتے رہے۔ دواؤں نے اُلٹا اثر دکھایا، ان کے جسم پر جابجا زخم نکل آئے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے دوائیں موقوف کر دیں اور زندگی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کہنے لگے مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرض کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔

چند دنوں میں یہ زخم رسنے لگے، سینہ اور پیٹھ اور کلائیاں ہر طرف زخم ہی زخم۔ ان زخموں کی تکلیف انھیں ہر کل بے چین کیے رکھتی۔ سقوط ڈھاکہ سے ان کے دل پر جو زخم لگا تھا اسے تو وہ کسی طرح چھپانے میں کامیاب ہوگئے تھے، لیکن ان زخموں کی تکلیف ان سے چھپائے نہ چھپتی تھی۔ طرح طرح کے مرہم آزمائے

گئےلیکن سب بیکار۔ایک دن گرمی کی دوپہر میں جب وہ بےکلی کے عالم میں یا ’’مسبّب الاسباب‘‘ کی صدا لگارہے تھے، ایک اجنبی شخص مکتبہ میں وارد ہوا۔دیکھنے میں وہ کوئی دہقانی لگتا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں مختصر سی گٹھری جس سے ایک لوٹا بندھا تھا۔اس نے والد صاحب کو اس تکلیف میں دیکھ کر تسلی دی، کہنے لگا فکر مت کیجیے، ان زخموں پر سرخ مرچ کی لیپ لگائیے، چند دنوں میں یہ زخم ہوا ہوجائیں گے۔کھلے زخموں پر سرخ مرچ کی لیپ؟ پہلے تو ہم لوگوں کو اس خیال سے ہی وحشت ہوئی، لیکن کرتے بھی کیا وہ خدائی فرستادہ یہ نسخہ تھما کر جاچکا تھا۔لیپ لگاتے ہی ابّا کی تکلیف میں غیر معمولی کمی آگئی، انھیں ایسا لگا جیسے کسی نے ان کے زخموں پر پھاہا رکھ دیا ہو۔چند دنوں میں زخم مندمل ہونے لگے۔مکتبہ میں معمول کی زندگی لوٹ آئی۔

اُدھر اسکول میں بالآخر وہ وقت موعود آپہنچا جس کے لیےمہینوں سے تیاری ہورہی تھی۔تقریری اور تحریری مقابلوں میں تو انبساط کا سامان رہتا۔کھیل کود کے مسابقے بھی اکثر لطف دے جاتے،لیکن پریڈ میں شرکت کا معاملہ بالکل الگ تھا، اس کے تصور سے ہی پولیس لائن میں جوانوں کی میکانکی لیفٹ رائٹ، قدموں کے پٹخنے کی دھمک اور کیپٹن کی پاٹ دار آواز کا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا جس سے میں ایک خاص قسم کی اجنبیت محسوس کرتا۔اب جو سفید شرٹ اور نیلی نیکر کےمخصوص یونیفارم میں صبح صبح اسکول پہنچا تو یہ دیکھ کر وحشت ہوئی کہ میری طرح کلاس کے سبھی طالب علموں نے یہی لباس پہنا ہوا ہے، ایسا لگا جیسے میری انفرادیت جاتی رہی ہو۔ ہمارے اسکول میں یونیفارم کا رواج نہ تھا۔ ہر شخص خدا کا دیا اپنی پسند کا لباس پہنتا۔البتہ صبح سیر کو جاتے ہوئے کبھی کبھی جیل کے قیدیوں کے چھوٹے چھوٹے غول ایک خاص یونیفارم میں لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے۔آزادی کے یونیفارم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم لوگوں کو کلاس رول نمبر کے حساب سے قطار میں کھڑا کیا گیا اور اس خیال سے کہ بچوں کو پولو میدان تک پیدل جانا ہے اور وہاں ہزاروں بچوں میں یہ کھو نہ جائیں، ہر طالب علم کی پشت پر ان کے نمبر چپکا دیئے گئے۔ ہر طالب علم کو اسی ترتیب میں اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔کچھ اساتذہ اس بات پر مامور تھے کہ وہ ان نمبروں کی ترتیب پر نگاہ رکھ سکیں۔میرا رول نمبر تیرہ تھا، پہلے تو اس بات پر کوفت ہوئی کہ پہلی بینچ پر بیٹھنے والے طالب علم کو قطار میں تیرہویں نمبر پر جگہ ملی ۔ جب کبھی قطار میں میرے قدم سست پڑ جاتے تو آواز آتی، ارے تیرہ نمبر کہاں پیچھے رہ گیا، ذرا تیز چلو۔کبھی آواز آتی: ارے اس تیرہ نمبر والے لڑکے سے کہو وہ قطار سے باہر نہ چلے۔ اسکول میں اساتذہ مجھ سے خاص شفقت فرماتے، والد صاحب کی مجلسوں میں بھی جب کبھی میری طالب علمانہ شوخی سوئے ادب تک جاپہنچتی، اس پر مجھ سے کوئی مواخذہ نہ کرتا۔لیکن آج مجھے یہ جان کر سخت کوفت

ہوئی کہ آزادی کی اس پریڈ میں، میں محض 'تیرہ نمبر والالڑکا' بن کر رہ گیا ہوں۔

جیسے تیسے آزادی کے قیدیوں کا یہ جلوس پولومیدان پہنچا۔ وہاں طلبا و طالبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے غبارے اور جھنڈوں کی بہار تھی۔ لوگوں کے چہرے مسرت سے سرشار تھے۔ اس تماشہ میں تیرہ نمبر والے لڑکے کو کون پوچھتا۔ بادل نخواستہ ایک قطار میں جگہ لی۔ پرچم کشائی کی رسم کے بعد چھوٹی بڑی کچھ تقریریں ہوئیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہ آئیں، البتہ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ بھارت اب ایک مہان دیش بن چکا ہے۔ گزشتہ چند مہینوں سے بھارت کی اس مہانتا اور اس کی فوجی قوت کا ہر طرف چرچا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد یہ لَے جس طرح بلند ہوئی تھی اس نے مسلمانوں کو ایک مخمصے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ بنگلہ دیش کی آزادی کے جشن میں قومی دھارے سے کٹ کر رہ گئے تھے یا یہ کہیے کہ قومی دھارا اب اس ملک میں مسلمانوں کے جذبات اور ان کی حمیّتِ ملی کے خلاف بہنے لگا تھا۔ ان بے کیف تقریروں سے زِچ ہو کر تیرہ نمبر کا یہ لڑکا بجھے دل کے ساتھ گھر واپس آیا۔ اسے ایسا لگا جیسے جشن آزادی کی یہ تقریب دراصل اس کے زخم خوردہ غیرت ملّی پر نمک پاشی کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ اسے اس غم کے اظہار کی اجازت بھی تو نہ تھی، مبادا اس کا شمار آزادی کے مخالفین میں کر لیا جائے۔ آج اس نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا، اس نے سوچا جیلانی چچا نہ جانے اب کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے، زندہ بھی ہوں گے یا نہیں اور چچی اور ان کے وہ بچے جن کے اس نے صرف نام سن رکھے تھے، پتہ نہیں ان لوگوں پر کیا گزری ہوگی۔ کاش انھیں کوئی بتا سکتا کہ جشن کے اس ہنگامے میں ہمیں ان کے مصائب پر آنسو بہانے کی بھی اجازت نہیں۔

۸

لکھنؤ والے ڈاکٹر صاحب

جشنِ سیمیں کے ہنگاموں سے فارغ ہوا تو پتہ چلا کہ اس دوران ملک میں ایک بڑی تبدیلی آچکی ہے۔علی گڑھ، فیروز آباد اور بنارس سے فسادات کی جو خبریں آئی تھیں وہ محض مسلم مخالف فسادات نہ تھے، بلکہ مسلمانوں پر مسلح پولیس کا راست حملہ تھا۔اس خطرے کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک مقامی کانگریسی لیڈر، جو مکتبہ میں کبھی کبھی ملاقات کے لیے آجاتے تھے، ایک دن متوحش نظر آئے، کہنے لگے: فیروز آباد اور بنارس میں جو کچھ ہوا وہ پولیس کی یک طرفہ کارروائی تھی۔ چرن سنگھ نے تو صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اسے ہندو مسلم فساد کا نام دیا جانا غلط ہے۔ یہاں تو نہتے مسلمان مظاہرین پر پولیس نے یک طرفہ کارروائی کی۔ اس میں دوسرا فریق جسے الزام دیا جاتا ہے وہ تو سرے سے شامل ہی نہیں تھا، یہ کہتے ہوئے چچا عباس کی آواز میں لرزش آگئی، ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انھوں نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا: حافظ صاحب! اب کیا کیا جائے، جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

’اندرا کو اس بات پر بڑا غصہ ہے کہ مسلمانوں نے مشرقی پاکستان پر حملہ کی پوری طرح تائید کیوں نہ کی‘۔مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے صورتِ حال کے تجزیہ کی کوشش کی۔

اب اس سے زیادہ اور کیا کرتے؟ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین اس سانحۂ عظمیٰ کی لیپا پوتی میں لگے رہے۔ اگر کسی نے ہمت بھی جٹائی تو بس اتنا کہا کہ مشرقی پاکستان میں مسائل کے حل کے لیے وزیر اعظم کو پاکستانی صدر سے براہ راست گفتگو کرنی چاہیے تھی، کسی نے کہا کہ اگر مشرقی پاکستان علیحدہ نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا اور کسی نے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ایسا نہ ہو کہ جس طرح ہم نے مشرقی پاکستان کے مسئلہ میں مداخلت کی ہے، یہ عمل بیرونی قوتوں کے لیے تامل ناڈو میں اُٹھنے والی تحریک کو سہارا دینے کا جواز فراہم کر دے۔

’یہی تو جرم ہے ہم مسلمانوں کا۔حکومت ہم سے غیر مشروط وفاداری چاہتی ہے، اسے مسلمانوں کی صف سے ویر عبدالحمید چاہیے اور جب پھل کھانے کا وقت ہو تو انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ تمھیں کلیدی

عہدے اس لیے نہیں دیئے جاسکتے کہ اس سے اکثریت کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی'۔

یہ سن کر چچا عباس نے اپنی سفید گاندھی ٹوپی درست کی، بولے: آپ کا اعتراض بالکل صحیح ہے۔ بہار میں مسلم وزیراعلیٰ کی جب بھی بات آئی، عبدالقیوم انصاری اور ڈاکٹر محمود جیسے لوگ اپنی تمام تر خدمات کے باوجود حاشیہ پر چلے گئے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ہے، مگر کریں بھی کیا، مسلمانوں کے لیے کوئی اور راستہ بھی تو نہیں'۔

راستہ نکلے گا مگر آپ لوگ ساتھ تو دیں۔ اب دیکھیے وہ ہیں نا لکھنؤ والے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر فریدی کی بات کر رہے ہیں آپ؟

'جی ہاں عبدالجلیل فریدی، اللہ انھیں قائم رکھے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں وہ'۔

ڈاکٹر فریدی کے لیے توصیفی کلمات سن کر چچا عباس کچھ جز بز ہوئے، جیسے کسی نے ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ بولے: ہمارے اکابرین ہمت نہیں جٹا پا رہے ہیں، ہم چھوٹے لوگ ہیں، ہم کر بھی کیا سکتے ہیں، فیصلہ تو بڑوں کو لینا ہے۔

'بڑے کیا کریں گے، وہ تو ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اب ان ہی عبدالقیوم انصاری کو دیکھیے، اتنا قدآور لیڈر کہ جب مسٹر کرپس نے نہرو سے یہ پوچھا تھا کہ جناح کے مقابلہ میں مسلمانوں کے وہ کون قدآور لیڈر ہیں جو کانگریس میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں تو نہرو نے خان عبدالغفار خان، حسین احمد مدنی اور عبدالقیوم انصاری کا نام لیا تھا۔ اب اتنے اہم لیڈر کا حال یہ ہے کہ انھیں بہار میں ٹکٹ سے محروم کیا گیا۔ وہ ناراض بھی دکھائی دیئے لیکن پھر راجیہ سبھا کی رکنیت مل جانے کے بعد ان کی ناراضگی رفع ہوگئی۔ اگر ان جیسے لیڈران بھی ڈاکٹر فریدی کی طرح جرأت کا مظاہرہ کریں تو کانگریس کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔

چچا عباس نے کہا: ' آپ کی بات درست ہے۔ کانگریس کو مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی اس بے چینی کا احساس بھی ہے اور شاید اسی لیے وہ ان کے سر اٹھانے سے پہلے ہی ان کی ہمتیں توڑ دینا چاہتی ہے۔ یہ جو مسلم مظاہرین پر علی گڑھ، فیروز آباد، بنارس اور دوسری جگہوں پر پولیس آپریشن کا حربہ آزمایا گیا ہے اس کا مقصد یہی پیغام دینا ہے کہ مسلمانوں کو بلا چوں چرا کانگریس کی قیادت میں اپنا سیاسی سفر جاری رکھنا ہے ورنہ اس سے سرتابی کی انھیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

'قیمت چاہے جو بھی ادا کرنی پڑے، مسلمانوں کے لیے اب ڈاکٹر فریدی کے راستے پر چلے بغیر کوئی چارہ نہیں، اللہ انھیں قائم رکھے'۔ یہ کہتے ہوئے ان بزرگ کی آواز میں ایک ملتجیانہ ارتعاش پیدا ہوا، انھوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، جیسے خدا کی بارگاہ میں اپنی بے بسی کا مقدمہ رکھ رہے ہوں۔

ڈاکٹر فریدی کے مداحوں میں ایک اور بزرگ جو اکثر مکتبہ کی شبینہ مجلس میں حاضر رہتے، ان کے نام سے تو ہم لوگ واقف نہ تھے، البتہ سب لوگ انھیں کمپاؤنڈر صاحب کہتے۔ وہ ریلوے کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد شہر کے ایک مسلم علاقہ میں اپنا مطب کرتے تھے۔ دن میں مطب ہوتا اور شام میں مکتبہ کی مجلسوں میں شرکت۔ حسِ مزاح اور بذلہ سنجی سے قدرت نے انھیں خاص طور پر نوازا تھا۔ لو بھئی عبدالمنان پیدل حج کو چلے، اب انھیں اس کبر سنی میں پیدل جانے کی کیا سوجھی، دیکھو بیٹے اخبار والے نے کیا سرخی لگائی ہے، پھر کہتے ہیں یہ کاتب کی ستم ظریفی ہے، بیدل کو اضافی نقطے لگا کر پیدل کر دیا۔ اب جو بات سے بات نکلتی تو حضرت کاتب کی ستم ظریفی کے لطائف کے انبار لگا دیتے۔ ایک دن ایک حضرت مولانا قسم کے مولوی صاحب سے یہ پوچھ بیٹھے کہ کیوں صاحب آپ کا مرز بوم کہاں ہے؟ یہ سنتے ہی مولوی صاحب ہتھّے سے اکھڑ گئے۔ پھر جب انھیں یہ پتہ چلا کہ وہ دراصل حضرت کی جائے پیدائش کے بارے میں استفسار فرما رہے تھے تو جھینپ سے گئے۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ میں 'قائد' اخبار کی کوئی کاپی دبی ہوتی، چھوٹتے ہی کہتے: ارے بھئی دیکھیے 'قائد' نے کیا کہا ہے۔ شروع میں تو مجھے یہ سمجھنے میں خاصی دشواری ہوتی کہ ان کی مراد قائد اخبار سے ہے یا وہ اپنے ممدوح ڈاکٹر فریدی کی بات کر رہے ہیں۔ ایک دن بڑے غصے میں تھے، کہنے لگے: 'پچھلے دنوں فیروز آباد میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اب تو یہ آگ پھیلتی ہی جا رہی ہے'۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اخبار کے اندر سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر سرخ قلم سے کچھ اعداد و شمار لکھ رکھے تھے۔ بولے: 'اب دیکھیے ستمبر کے مہینہ میں دادری میں مسلمانوں کے گھر جلائے گئے، نوناری میں نومبر کے مہینہ میں ۲۷ مسلم گھروں کو زمیں بوس کر دیا گیا، دسمبر کے مہینہ میں سنجنی اور رانی مئو میں، جنوری میں درگا جوت اور فروری میں گونڈا اور بستی میں عین ریاستی سرپرستی میں مسلمانوں کو تاراج کیا گیا۔ آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے؟ کیا یہ ہر مسلم علاقے پر مشرقی پاکستان کی طرح چڑھائی کرنا چاہتی ہے؟ یہ دُرگا آخر کتنا خون پیے گی؟'

کمپاؤنڈر صاحب کو اس قدر طیش میں دیکھ کر تعجب ہوا۔ وہ اکثر بذلہ سنجی کی باتیں کرتے اور سنجیدہ علمی ماحول میں بھی اپنے نکاتِ دل پذیر سے ظریفانہ رنگ بھر دیتے۔ آج ان کے غصہ میں خوف کی جھلک نظر آئی۔ بولے: 'شہر کے حالات بھی خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی نے ذرا آواز کیا اٹھائی، اس عورت نے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا۔ جب سے کمان اس کے ہاتھ میں آئی ہے صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے'۔

'صورت حال تو پہلے بھی اچھی نہیں تھی، لیکن ہاں جب تک نہرو اور آزاد جیسے لوگ زندہ تھے ایک بھرم باقی تھا، آنکھوں میں مروّت کا پانی تھا اور اب تو بڑی بے شرمی کے ساتھ ان ہی مسلمانوں پر ظلم کیا جا رہا

ہے،جن کے ووٹ پر کانگریس جیت کر آئی ہے‘۔ ذکی صاحب نے صورت حال پر اپنا تجزیہ پیش کیا۔

’آزادتو ویسے بھی آخری دنوں میں خود کو ایک شکست خوردہ انسان سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ان کی سنتا کون ہے، انھوں نے دارالمصنفین کو جب پچاس ہزار روپے کی سرکاری اعانت دی تھی تو اس پر بھائی لوگوں نے کتنا شور مچایا‘، والد صاحب نے اظہار خیال کیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے: ’بے چارے آزاد کرتے بھی کیا؟ منقسم ہند میں ان کی حیثیت ایک صدائے گم گشتہ کی ہوگئی تھی۔ کیا سحر انگیز نعرے تھے یاد ہے آپ کو، یہ کہتے ہوئے انھوں نے کمپاؤنڈر صاحب کی آنکھوں میں جھانکا، بولے: ’پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللّٰہ، مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ، وحدت کے ترانے شوق سے گا۔ لوگ اس فریب کو نہ سمجھ پائے کہ پاکستان کا یہ غیر فطری منصوبہ جغرافیائی طور پر اسلامیان ہند کو تین حصوں میں تقسیم کردے گا اور اس طرح آنے والے دنوں میں ان کی ہوا اکھڑ جائے گی‘۔

’جی ہاں کسے پتہ تھا کہ منقسم ہندوستان میں مسلمانوں پر ایک دن ایسا بھی آئے گا جب انھیں اپنی زبان اور اپنی شناخت کی حفاظت کے لیے احتجاج کرنا پڑے گا‘، ذکی صاحب نے کہا۔

مگر یہ احتجاج ہی تو اسے پسند نہیں، یہ محترمہ اسی بات پر تو ناراض ہیں کہ مسلمانوں کو احتجاج کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ یہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ کمپاؤنڈر صاحب نے مزید وضاحت کی۔ بولے: ’ڈاکٹر فریدی نے تو بڑی وضاحت سے یہ بات لکھی ہے، انھوں نے تاریخ، مقام اور اس میٹنگ تک کا حوالہ دیا ہے جس میں مسز گاندھی نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ الیکشن جیتنے کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار اور اُردو زبان کے تحفظ کو یقینی بنائے گی، لیکن اب کیا کیا اس نے؟ بالکل اُلٹا، یونیورسٹی وزارتِ تعلیم کے ماتحت کردی گئی اور جب مسلمانوں نے اپنے غصہ کے اظہار کے لیے عوامی مظاہرے کا راستہ اپنایا تو ان پر گولیاں چلوا دیں۔ بھلا بتایئے صرف فیروز آباد میں چھیاسٹھ لوگ پولیس کی گولیوں سے مارے گئے۔ ظلم ہے ظلم‘۔ کمپاؤنڈر صاحب نے خفگی کا اظہار کیا۔

’ہمارے خیال میں نہتے مظاہروں سے خود مسلمانوں کا نقصان ہوگا‘۔

’پھر کیا کرنا چاہیے؟‘ کمپاؤنڈر صاحب نے پوچھا۔

’ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوت کا‘۔ ذکی صاحب نے جو اخبار ’دعوت‘ کے مستقل قاری تھے اور جن کی ہمدردی جماعت اسلامی کے ساتھ تھی، انھوں نے کمپاؤنڈر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بولے: ’دعوت‘ سے کسے انکار ہے، لیکن راستہ تو ’قائد‘ دکھائے گا نا! یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے ہاتھ میں مڑے اخبار ’قائد‘ کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر فریدی کے خلوص میں شبہ نہیں، وہ دبنگ آدمی ہیں۔ انھوں نے مسلم مجلس کے قیام سے پہلے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کی فریب کاریوں کا مشاہدہ کیا ہے، لیکن خطرہ ہے کہ ان کے گرد جو مولوی لوگ جمع ہیں وہ انھیں پھر سے کانگریس کے ذریعہ ڈسے جانے پر مجبور کر دیں گے۔ کانگریسی ڈسیں تو خیر سے تکلیف کا پتہ تو چلتا ہے، مولوی ڈسے تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ حادثہ کب اور کیسے پیش آ گیا۔ یہ کہتے ہوئے کمپاؤنڈر صاحب نے رخصت کی اجازت لی۔

* * *

یوپی کے اطراف واکناف میں ہونے والے فسادات کی لپٹ اب شہر میں محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر روز ایک نئی افواہ سننے کو ملتی کہ ہندوؤں کے فلاں فلاں محلے میں مسلمانوں پر حملہ کے لیے منصوبہ بندی ہو رہی ہے، اسلحے اکٹھے کیے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں کی رہائش مکتبہ سے ملحق پچھلے حصے میں تھی۔ یہ بازار کا علاقہ تھا جہاں ضلعی انتظامیہ اور پولیس کے دفاتر تھے، لیکن خطرہ تو پولیس والوں سے ہی تھا جنھوں نے یوپی کے مختلف شہروں میں مسلمانوں پر یا تو راست حملہ کیا تھا یا حملوں کی سرپرستی کی تھی۔ اطراف میں غیر مسلموں کے مکانات تھے، گویا ایک اعتبار سے ہم لوگ پہلی صف کے معرکہ آراؤں میں تھے۔ شہر کے مسلم محلوں میں مقابلہ کی تیاری تھی، لیکن مسلح پولیس کے آگے ان کے ڈنڈے اور لاٹھیاں کیا کر پاتیں۔ شہر کے احباب نے بہت زور ڈالا کہ ہم لوگ مسلم محلے میں منتقل ہو جائیں، لیکن والد صاحب کا کہنا تھا کہ اس طرح ہمارے محاذ کو چھوڑ کر بھاگ جانے سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ سو یہ طے پایا کہ یہیں رہ کر حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ گھر میں بزرگوں کے جو آثار تھے اس میں ایک قدیم طرز کے جرمن لیمپ کے علاوہ ذوالفقار جیسی تلوار کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اب اس موقع پر تلوار کی افادیت سمجھ میں آئی۔ کوئی ذوالفقار کو صیقل کرنے میں لگا تو کسی نے روزمرہ کے استعمال کی چھری چاقو اور اس جیسی اشیا کی فہرست بنانی شروع کی۔ تاریخی ناولوں میں جنگوں کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا تھا اس کی روشنی میں مدافعتی جنگ کا منصوبہ ترتیب دیا جانے لگا۔ یہ تو ہم بچوں کی تیاری تھی۔ اُدھر ابّا کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ وہ کبھی ہم لوگوں کی ہمت بندھاتے کہ ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا اور کبھی عالم جذب میں کہتے کہ یا اللہ تو ہی مسبّب الاسباب ہے۔ اِدھر ذوالفقار کی چمک میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہماری آنکھوں میں بھی چمک بڑھتی جاتی۔ ہمارے بھائیوں میں کوئی اس کی اساطیری عظمت کا بیان کرتا تو کوئی قرونِ اولیٰ کے سورماؤں کا حوالہ دیتا اور ہم لوگ چشمِ تصور میں خود کو میدان کارزار میں پاتے۔ ایک ذوالفقار اور اتنے سارے علی، ایسا لگتا جیسے ہمارا پلڑا بھاری پڑ رہا ہو۔

ہر روز نئی نئی افواہیں سنائی دیتیں۔ کبھی پتہ چلتا کہ آج کی شب شہر کے شمالی حصہ سے حملہ آوروں کے

غول نکلیں گے۔ جمعہ کی شب حملے کی خبر عام تھی۔ اب جو رات ڈھلی تو پتہ چلا کہ شام غریباں واقعی کتنی طویل ہوتی ہے۔ مغرب سے عشا کا ایک ایک لمحہ، ایسا لگا جیسے صدیوں پر بھاری ہو، بڑی مشکل سے عشا کی اذان ہوئی، لیکن آج اس میں وہ دم خم نہ تھا۔ مومنین کو فلاح کی طرف بلانے والی دعوت، ایسا لگتا تھا جیسے مسلسل ڈوبتی جارہی ہو، جیسے یہ آخری اذان ہو، آج کی رات کے بعد اس شہر کو خدا کی کبریائی کی دعوت دینے والے لوگ شاید باقی نہ رہ سکیں۔ پھر بھی دل کے ایک گوشہ میں یہ امید کہیں باقی تھی کہ خدا ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ رات گزرتی رہی، اس کی خاموشی سے بھی ڈر لگتا اور جب دور سے چیخ و پکار کی آواز سنائی دیتی تو ہمارے معصوم دل دہل جاتے۔ جیسے تیسے یہ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ چند دن بیم و رجا کی اس کیفیت میں رہ کر ایک ذوالفقار اور ربِّ ذوالفقار کے سہارے ہم لوگ اس خطرے سے نکل آئے۔ ایسا لگا جیسے دشمنوں کے حوصلے پست ہوگئے ہوں اور انھوں نے حملے کا ارادہ ترک کردیا ہو۔

شہر میں فسادات کا خطرہ توٹل گیا لیکن دس بارہ دن زندگی جس اذیت میں گزری اس نے ہمارے قلب و روح کو بری طرح مجروح کردیا۔ دن کی روشنی میں بھی گھر سے باہر نکلتے ہوئے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب کس ہاتھ سے خنجر بلند ہو اور کس رخ سے بندوق کی کوئی زناٹے دار گولی ہمارا کام تمام کردے۔ جب بھی ذوالفقار پر نظر پڑتی یہ خیال آتا کہ اس بوسیدہ تلوار کے سہارے آخر ہم کب تک اپنی راتیں صبح کرتے رہیں گے۔ اس دفعہ تو کسی طرح بچ نکلے، لیکن اگر حالات اسی رخ پر چلتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب اس ملک میں صبح ہمارے بغیر ہی ہوا کرے گی۔

مجھے مسلم محلہ کی وہ مجلس یاد آئی جہاں ایک بزرگ مسلمانوں کے اتحاد پر گفتگو فرمارہے تھے۔ قصہ اس تقریب کا کچھ یوں ہے کہ ایک شادی میں شرکت کے لیے والد صاحب نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ میرے لیے یہ بالکل ہی نیا تجربہ تھا کہ میں کسی سماجی تقریب میں والد کی نمائندگی کروں۔ پہلے تو لوگوں کا اژدہام دیکھ کر وحشت ہوئی، ایسا لگتا تھا جیسے پورا محلہ ہی اُلٹ آیا ہو، لیکن جب اہل خانہ کی مجھ پر نظر پڑی تو انھوں نے خصوصی اکرام کا معاملہ فرمایا اور بزرگوں کی طرح مجھے بھی خصوصی مدعوئین کی مجلس میں لا بٹھایا۔ یہاں محلہ کے سرکردہ افراد جمع تھے اور بات مومنین کے اتحاد کی چل رہی تھی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اہل مجلس کے پیش نظر دراصل مومنین کی سربلندی کے بجائے مومن کانفرنس کی شیرازہ بندی ہے۔ ایک سفید ریش بزرگ جنھوں نے کھادی کے کرتے پر رہنمایانِ قوم والی بنڈی پہن رکھی تھی اور جن کی گاندھی ٹوپی اور محدب عینک سے جھانکتی بارعب آنکھیں اس بات کا عندیہ دیتی تھیں کہ انھوں نے عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ ملّی اور قومی کاموں میں صرف کیا ہے۔ نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا، البتہ لوگ انھیں ڈاکٹر صاحب کے نام سے

پکارتے تھے۔ جب وہ بولتے تو مجلس میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں۔ فرما رہے تھے کہ ہمیں اپنے اتحاد کو برقرار رکھنا ہوگا، یہ ہمارا اتحاد ہی ہے جس نے حکومت کو ہماری طرف ملتفت ہونے پر مجبور کیا۔ اب بنکروں کے لیے نئی اسکیمیں بنائی جارہی ہیں، حکومت نے پاور لوم کے لیے قرض کے منصوبے منظور کیے ہیں۔ پسماندہ طبقوں کے لیے ریزرویشن سے ہمارے لیے نئے راستے کھلیں گے۔ اب ہم لوگ اس بات کی بھی کوشش کررہے ہیں کہ حکومت براہ راست ہم سے بعض مصنوعات خریدے۔ خاص طور پر دری کی سپلائی پولیس اور فوج میں بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہے۔ اس سے ہماری معاشی حالت میں سدھار آئے گا، لیکن حکومت اسی وقت تو ہمارے لیے کچھ کرے گی جب اسے یقین ہو کہ ہم بھی اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے، یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ ہمارا ووٹ اکٹھے کانگریس کی جھولی میں جائے۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ووٹ دینے کا آخر فائدہ بھی کیا ہے۔ کچھ لوگ کانگریس کے بارے میں بددلی پھیلا رہے ہیں۔ ارے بھئی! آپسی لین دین میں کچھ اونچ نیچ ہوجاتی ہے۔ ہمارے اکابرین ان مصالح سے خوب واقف ہیں، ہر ایرے غیرے کا کام نہیں کہ وہ رہنمائی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لے۔

گفتگو جب ذرا طویل ہوئی تو ایک صاحب نے بڑے ادب سے کانگریس کی سردمہری بلکہ مسلمانوں کے سلسلے میں اس کے بدلتے رخ کا شکوہ کیا۔

بولے: کہا تو یہ باتیں ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں، ہمارے اکابرین اس صورت حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ہم تو آگے کے لیے سوچیں، حکومتی منصوبوں سے فائدہ اٹھائیں، اب چادریں اور لنگیوں کے بجائے آپ لوگ دری بنائیں دری، کوالٹی کا خیال رکھیے تا کہ ہماری کوآپریٹیو سوسائٹی اچھی قیمت پر براہ راست محکمہ پولیس کو سپلائی کر سکے۔

کس کے لیے حضور؟ ایک منہنی سے شخص نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے پوچھا۔ کہنے لگا: ڈاکٹر صاحب! آپ کس کے لیے دری بنوا رہے ہیں، وہی پولیس والے نا جو موقع ملتے ہی ہمارے خون کے پیاسے ہوجاتے ہیں؟ وہ ہماری بنائی ہوئی دریوں پر استراحت فرمائیں تا کہ نشاط اور تازگی کے ساتھ ہم پر حملہ کر سکیں۔ کیسی عجیب اسکیم لائے ہیں آپ؟

ڈاکٹر صاحب اس اعتراض کے لیے شاید تیار نہ تھے، بولے: ارے بھئی تم سمجھتے نہیں ہم ان کے لیے دری بنا رہے ہیں، کوئی بندوق تو نہیں۔

لیکن ہم تو انھیں بندوق سے زیادہ خطرناک اسلحہ یعنی اپنا قیمتی ووٹ ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ اس طرح ہم انھیں اپنے اوپر برضا و رغبت حکمرانی کا اختیار عطا کردیتے ہیں۔ جب ایک بار آپ نے اپنے

اموران کے حوالے کر دیئے تو پھر وہ کیوں نہ آپ کی غیرتِ ملّی سے کھیلیں، آپ کو جب چاہیں لہولہان کر دیں اور آپ اس صورت حال پر احتجاج بھی کریں تو انھیں گراں گزرے۔

ارے بھئی اس بات سے ہم لوگ بھی دکھی ہیں، ہمارے بڑے خالی نہیں بیٹھے ہیں، آخر میری بھی تو زندگی گزری ہے، سیاست میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے،

مگر فیروز آباد کے مسئلہ پر آپ نے مسز گاندھی کا بیان نہیں پڑھا۔ ۶۸ مسلمان پولیس کی گولیوں کا شکار ہوئے۔ این۔ جی۔ گورے جو رکن پارلیمنٹ ہیں، انھوں نے مسز گاندھی کو صاف لفظوں میں لکھا تھا کہ فیروز آباد کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے ہر حربے آزمائے گئے، لوٹ مار، گولہ باری، آتش زنی، مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور سب سے شرمناک بات یہ تھی کہ اس پورے تماشے میں حکومتی مشینری غنڈوں کی معاون بنی رہی۔ لیکن پتہ ہے مسز گاندھی نے کیا کہا؟ وہ بڑی معصومیت کے ساتھ کمشنر اور انسپکٹر جنرل آف پولیس کی اس صفائی پر ایمان لے آئیں کہ پولیس پر یہ الزامات درست نہیں ہیں۔ کس قدر تحقیر ہے اس کے لہجہ میں مسلمانوں کے تئیں، وہ تو ہماری آہ وفغاں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی اور آپ کہتے ہیں کہ مسلمان اکٹھے انھیں ووٹ دیتے رہیں۔ بس روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے؟ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔

خیر چلیے یہ موقع نہیں، کھانا لگ چکا ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کو اپنے خلاف جاتے ہوئے دیکھ کر لگام دینے کی کوشش کی۔

میں نے سوچا ڈاکٹر صاحب گو کہ جہاں دیدہ ہیں اور اہل محلہ پر ان کا بڑا دبدبہ ہے، لیکن اس منہنی سے شخص نے جو بات پھینکی تھی وہ ان کی مصلحت اور حکمت کے تمام مواعظ کو چشم زدن میں عصائے موسیٰ کی طرح نگل گئی۔

۹

ما تعبدون من بعدی

مجھے خفیہ پولیس کا وہ آفیسر بھی آج بہت یاد آیا جو فساد کی بو سونگھتا ہوا ایک دن مکتبہ میں آیا تھا۔ اس نے اپنے تئیں والد صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ ہم لوگ اس نازک صورت حال میں بھی کہیں منتقلی کا ارادہ نہیں رکھتے۔ پھر حالات کنٹرول سے باہر ہو گئے تو آپ کیا کریں گے، اس نے پوچھا۔ مرگ انبوہ جشن دارد، والد صاحب نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔ یوں تو خفیہ پولیس کے اہلکار اکثر مکتبہ کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض ہماری صحبتوں کے طفیل بھلے مانس بن جاتے یا کم از کم بھلے مانس بنے رہنے کا ڈرامہ رچاتے۔ ایک بات البتہ شدت سے محسوس ہوتی کہ ہماری حرکات وسکنات پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ حالانکہ مکتبہ کی مجلسوں میں حریت فکری اور بلندئ افکار کے علاوہ اور ہوتا بھی کیا تھا، لیکن یہ باتیں ان کے لیے خطرناک حد تک ناقابل برداشت تھیں، جو چاہتے تھے کہ مسلمان اب اس ملک میں آزادانہ طور پر کچھ بھی نہ سوچیں۔ خفیہ پولیس کے تعاقب سے تنگ، بہت دنوں بعد، بڑے ابّا نے بالآخر ذاکر صاحب سے شکایت کی جو ان دنوں صدرِ جمہوریہ کے منصب پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کی مداخلت کے بعد پولیس والوں کے رویّے میں وہ پہلی سی جراحت نہ رہی۔

والد صاحب کی بیماری کے موقع پر اس بات کا کسی قدر اندازہ ہو چکا تھا کہ ابّا کے گرد دردمند مسلمانوں کا ایک بڑا نیٹ ورک دور دراز کے علاقوں تک قائم ہے۔ کوئی دن نہ جاتا جب ان کی مزاج پرسی کے لیے ایسے لوگ حاضر نہ ہوتے جن کے بارے میں ہم لوگوں کو کچھ زیادہ پتہ نہ ہوتا۔ ان میں مختلف مسالک ومشارب کے لوگ ہوتے جن کا درد ایک تھا، وہ یہ کہ کسی طرح دین وایمان کو بچائے رکھا جائے۔ یہی وہ جرم تھا جس کے سبب ہم لوگوں پر نگرانی کا عذاب مسلط کر دیا گیا تھا۔ منقسم ہندوستان میں آزادی کا یہ مفہوم صرف ان لوگوں کو معلوم تھا جو اس صورت حال سے خود گزر رہے تھے۔

والد صاحب کا معمول تھا کہ وہ اکثر قرآن مجید کے تراجم اور تفسیری حواشی ہم بچوں سے پڑھوا کر سنتے۔ شاید یہ ان کے اپنے مطالعہ وتحقیق کا طریقہ تھا یا اس سے ہماری تربیت مقصود تھی۔ ایک دن سورۃ البقرہ

کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچا: **إذا حضر یعقوب الموت۔۔ ما تعبدون من بعدی** (سورۃالبقرہ:133)، تو انھوں نے آگے پڑھنے سے روک دیا، خاموش کچھ سوچنے لگے، ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ میں نے ترجمہ پڑھ کر سنایا، بولے: رہنے دو۔ پھر ایک آہ بھری، فرمایا: بہت بڑی امانت ہے۔ میں نے سمجھا یقیناً کوئی گہری بات ہے جو شاید ابھی پوری طرح میرے لیے سمجھنا مشکل ہو۔ اس زمانے میں بچوں کی تفسیر کے نام سے قرآن مجید کے بعض اجزا شائع ہوئے تھے تب بھی چھوٹے سے ذہن کے لیے قرآن مجید کے معارف سے آگہی مشکل ہی بنی رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس طریقہ سے قرآن مجید پڑھنے کے سبب میرے لیے قرآن مجید کا 'ختم' کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ آگے چل کر یہی خلش اس کتاب کے راست مطالعہ پر ابھارتی رہی۔ میں نے سوچا کہ شاید والد صاحب ہماری سلامتیٔ فکر وایمان کے حوالے سے فکرمند ہیں۔

ان ہی دنوں اسپین کے مورسکو مسلمانوں کے سلسلے میں کوئی تاریخی ناول پڑھی تھی جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ میری ہی عمر کا ایک لڑکا اپنے والدین کے بعض افکار وخیالات کے سلسلے میں حیرانی کا شکار ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے والدین اپنی بعض باتیں اس سے چھپاتے ہیں۔ گھر کے اندرونی حصے میں ایک کمرہ ہے جس میں والد صاحب رازدارانہ طور پر جاتے ہیں۔ ایک دن والد صاحب نے اسے کمرے میں بلایا، بولے: بیٹا! اب تم بلوغ کی منزل کو پہنچنے لگے ہو، میرے دل پر ایک بوجھ ہے، میں چاہتا ہوں کہ تمھیں اس سے آگاہ کردوں، بشرطیکہ تم اسے صیغۂ راز میں رکھنے کا وعدہ کرو۔ 'یسوع مسیح کی قسم ابّا جان میں اسے کسی کو نہیں بتاؤں گا'، لڑکے نے اطمینان دلایا۔ یہ سن کر اس کے والد کی آنکھیں نم ہوگئیں، بولے: 'بیٹا! یہ جو ہم نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے یہ ہماری اصل مذہبی شناخت نہیں، یہ تو نظام کا جبر ہے جس کے سبب ہم عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، ورنہ اندر سے ہم مسلمان ہیں اور اب شاید وقت آگیا ہے کہ دین حنیف کی یہ امانت تمھیں منتقل کردوں'۔ میں نے سوچا کہ والد صاحب کہیں اسی امانت کی طرف اشارہ تو نہیں کررہے ہیں۔

اسپین اور ہندوستان دونوں جگہ مسلمانوں نے کم وبیش سات سو سال تک بڑی شان وشوکت سے حکمرانی کی۔ اندلس کی تاریخ سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کا کیا رشتہ ہے۔ اور یہ جو اُردو زبان کو ختم کرنے کے درپے ہیں تو کیا اس کے پیچھے بھی اسپین سے عربی زبان کے انخلا جیسی تاریخ کارفرما ہے؟ میں نے سوچا کیوں نہ ماسٹر یعقوب صاحب سے پوچھا جائے، جو بزرگوں والے سنجیدہ موضوعات میں بھی کہانی کا لطف پیدا کردیتے ہیں۔ ماسٹر یعقوب صاحب سے گوہر مطلوب حاصل کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا۔ پہلے تو وہ موضوع سے متعلق طالب علم کی معلومات کا اندازہ لگاتے، پھر اسی مناسبت سے اسے مناسب جواب تھمادیتے۔ البتہ اگر طالب علم موضوع آشنا ہوتا تو ماسٹر صاحب کا چہرہ کھل اٹھتا۔ ان کی گفتگو میں آبشار کی

سی کیفیت پیدا ہوجاتی۔

سوال سن کر ماسٹر صاحب نے پہلے تو مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی، پوچھا: آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے ان کے سامنے مورسکو مسلمانوں کے حوالے سے ان مشکل حالات کا تذکرہ کیا جب انھیں اپنی اصل اسلامی شناخت چھپانا پڑی تھی تو ماسٹر صاحب کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دکھائی دیئے۔ بولے: اسپین کے مسلمانوں پر سقوطِ غرناطہ کے بعد بڑا سخت وقت گزرا۔ انھیں سرکاری حکم نامہ کے زور پر جبراً عیسائی بنایا گیا۔ بظاہر تو وہ عیسائی بن گئے، مگر اندر سے مسلمان ہی رہے۔ ان کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ عربی زبان سے ان کے تعلق میں بھی کمی نہ آئی۔ حکومت نے بار بار یہ احکامات جاری کیے کہ مسلمانوں کی کوئی بھی دینی یا ثقافتی علامت قابل مواخذہ ہوگی، لیکن تمام خطرات کے باوجود ایک نسل دوسری نسل کو ایمان کی امانت منتقل کرتی رہی۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب عربی کتابیں گھروں میں رکھنا، ان کی تعلیم دینا بھی جرم قرار پایا۔ خفیہ پولیس والے گھروں کی تلاشی لیتے۔ اگر عربی زبان میں کوئی کتاب برآمد ہوجاتی تو وہ فی الفور ضبط کرلی جاتی۔ لیکن مسلمان اپنی علمی و دینی وراثت کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والے کہاں تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عورتیں اس مہم میں سب سے آگے تھیں۔ وہ قرآن مجید کے صفحات کو گدوں اور لباس کے اندر سل دیتیں اور اگر اچانک چھاپہ پڑتا تو ان مسودات کو اپنے لباس میں چھپا لیتیں۔ لیکن ان سب سے دلچسپ ایک بات تمھیں بتاتا چلوں، تمھیں حیرت ہوگی، یعقوب صاحب نے گفتگو کو اب ایک دلچسپ کہانی کا رخ دینے کی کوشش کی۔ بولے: جانتے ہو مسلمانوں نے عربی زبان کے تئیں ان کی نفرت کو کیسے لگام دیا۔ یہ کہتے ہوئے یعقوب صاحب نے تھوڑی دیر توقف کیا، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، پھر بولے: غرناطہ کی لیڈ بکس (Lead Books) کا نام سنا ہے تم نے۔ پھر خود ہی بولے: یہ قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ مسلمانوں نے لیڈ کے اسکرول پر عربی زبان میں حضرت مسیح کی تعلیمات پر مشتمل کچھ صحیفے تیار کیے۔ یہ سمجھو اسلامی نقطۂ نظر سے ہم حضرت مسیح کو جس جلالت کا مستحق سمجھتے ہیں اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ اسکرول تیار کیے گئے، یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے بائبل کی تعلیمات کندہ کی گئیں اور یہ بھی لکھا کہ حضرت مریم نے جب بلنسیا کی طرف اپنا مشن بھیجا تو انھوں نے اپنے عرب حواریوں کے لیے عربی زبان میں بائبل کی یہ تعلیمات نقل کروائیں۔ یہ اسکرول اس طرح تیار کیے گئے کہ دیکھنے میں صدیوں پرانے معلوم ہوں۔ انھیں قریب کے غاروں سے اچانک اس طرح برآمد کیا گیا کہ اسپین میں عربی زبان میں عیسائی اسکرول کی دریافت سے ایک غلغلہ انگیز کیفیت پیدا ہوگئی۔ عیسائیوں کو ایسا لگا کہ عربی زبان کے یہ اسکرول اسپین کی عیسائی ثقافت کا خاصہ ہیں۔ ان اسکرول پر باقاعدہ تحقیق کے لیے اب عربی جاننے والوں کی ضرورت نکل آئی اور سب سے بڑی بات یہ کہ عربی زبان کے سلسلے

میں جو سخت نفرت پیدا ہو چلی تھی، اس کا بڑی حد تک ازالہ ہو گیا۔

مگر عیسائی دُنیا نے اس پر کوئی واویلا نہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: واویلا کرنے سے کیا ہوتا، روم کے عیسائی علما تو بار بار یہ کہتے رہے کہ یہ اسکرول اپنی تعلیمات کے اعتبار سے اصلی نہیں ہو سکتے، لیکن جب کوئی بات عوام میں چل پڑتی ہے تو اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ معاملہ اسپین کے قومی تفاخر سے بھی جڑا تھا۔ عام عیسائی دُنیا کے مقابلے میں غرناطہ کے عیسائیوں کے پاس اب حضرت مریمؑ کا ایک خاص پیغام تھا جو انھوں نے بزبان عربی ارسال کیا تھا۔ Lead Books کی سیاست نے عربی زبان کے سلسلے میں ان کے رویے میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔

تو کیا اُردو والوں کو بھی کوئی ایسی ہی ترکیب سوچنی چاہیے؟

بولے: اُردو زبان کا معاملہ الگ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ ہماری واحد مذہبی زبان نہیں، دوسرے یہ کہ اُردو دراصل ہماری مشترکہ زبان ہے۔ ہندو شعرا اور ادبا کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

پھر یہ کیوں اُردو زبان کو ختم کرنے کے درپے ہیں؟ چکبست، فراق گورکھپوری، دیا شنکر نسیم اور تاریخ زبان اُردو والے رام بابو سکسینہ آخر یہ لوگ انھیں نظر کیوں نہیں آتے؟ میں نے اپنی کتب شناسی کو کام پر لگاتے ہوئے کہا۔

بولے: تعصب ہے، تنگ نظری ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ان کم بختوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ دراصل اس کے پیچھے اصل محرک معاشی وجوہات ہیں۔ اب دیکھو آزادی کے بعد اُردو اسکول رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ اس سے بنیادی نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ ہندو ہندی رسم الخط سے واقفیت کے سبب سرکاری نوکریوں اور اداروں میں ہر طرف چھا گئے، مسلمان بے چارہ پیدل ہو گیا۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ اُردو زبان میں اسلام پر جو وقیع سرمایہ ہے اس سے ہماری نئی نسل تہی دست ہو جائے۔

پھر مسلمانوں نے ابتدا میں ہی اس سازش پر کیوں نہ بند باندھا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: کوشش تو کی تھی لیکن ان کے مکروفریب کے آگے مسلم قائدین کی ایک نہ چلی۔

اور مولانا آزاد؟

مولانا آزاد بیچارے کیا کرتے، ان کی سنتا کون تھا۔ پہلے تو مہاتما گاندھی نے یہی یقین دلایا تھا کہ نئے ہندوستان کی قومی زبان نہ اُردو ہوگی اور نہ ہندی، بلکہ ہندوستانی ہوگی، جو دونوں رسم الخط یعنی عربی اور دیوناگری میں لکھی جائے گی، مگر ہوا کیا، اُردو کو دیس نکالا دیا گیا اور ہندی کو سرکاری سرپرستی عطا کر دی گئی۔

اور یہ جو اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی تحریک چل رہی ہے؟

بولے: دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ مسلمان بہرحال آسانی سے ہار ماننے والے نہیں۔ انھیں اس ملک میں ایسے منافقوں سے واسطہ ہے جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ پہلے اُردو میڈیم کے اسکولوں کو ختم کیا، سرکاری دفاتر سے اُردو کو بے دخل کیا اور اب کہتے ہیں کہ ہماری حکومت اُردو زبان کا فروغ چاہتی ہے۔ منقسم ہندوستان میں اُردو کا مسئلہ بے وفائی اور دھوکہ دھڑی کی المناک داستان ہے۔

یعقوب صاحب کی مجلس سے نکلا تو مجھے پھر سے تاریخی ناول کی وہ باتیں یاد آئیں جس میں میری عمر کے اس لڑکے پر چند ہی برسوں میں مصائب کے وہ پہاڑ ٹوٹے جن کو پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے بار بار آنسو ڈھلک جاتے تھے۔ سقوطِ غرناطہ کے بعد ڈیڑھ دو سو سال تک مسلمان اپنی سلامتیِ ایمان کی جنگ لڑتے رہے۔ پہلے انھیں جبراً عیسائی بنایا گیا، پھر انھیں ان کی زبان وثقافت سے محروم کرنے کے لیے قوانین وضع کیے گئے۔ عربی بولنا، عربی کتابوں کا گھر میں رکھنا، عربوں جیسی وضع قطع کے ساتھ باہر نکلنا، عربی لباس پہننا، حتیٰ کہ عربوں کی طرح روز روز کا نہانا یہ سب کچھ غیر قانونی قرار پایا۔ زندگی جب اجیرن بن گئی تو انھیں مال کے عوض ہجرت کی اجازت دی گئی، لیکن ظالموں نے شرط یہ لگادی کہ وہ اپنے کمسن بچوں کو سرکار کی تحویل میں دے کر ہجرت کریں۔ ظالموں کی دلیل یہ تھی کہ یہ بچے چونکہ سرکاری طور پر عیسائی ہیں، بپتسمہ کے عمل سے گزرے ہیں اس لیے ریاست اپنے ننھے عیسائی شہریوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری مسلمان والدین پر نہیں ڈال سکتی۔

میرے ذہن میں پانچ سال کی معصوم بچی فاطمہ کی تصویر ابھر آئی جسے اس کے والد آخری بار **فاطمہ مع السلامہ** کہتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے تھے، ان کی آواز رندھ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ اب آج کے بعد کوئی اسے اس عربی نام سے بلانے والا نہ ہوگا۔ ناول پڑھتے ہوئے بار بار میں اپنے آنسو خشک کرتا رہا۔ سوچتا ان والدین پر کیا گزری ہوگی۔ بہت سی ماؤں نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ خودکشی کرلی۔ بہتوں نے علم بغاوت بلند کیے، لیکن سب بے سود۔ اندلس کے عیسائی حکمراں مسلمان بچوں کی ایک ایسی نسل اٹھانا چاہتے تھے جو اپنی تاریخ اور شناخت سے ناواقف ہوں۔ میں نے سوچا یعقوب صاحب سچ ہی تو کہتے ہیں کہ نئے ہندوستان کے حکمراں اُردو زبان کو اس لیے مٹانا چاہتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کو ان کے عظیم الشان تاریخی ورثہ سے یکسر منقطع کرسکیں۔

اُردو زبان کا خیال آتے ہی مجھے ٹاؤن ہال میں منعقد ہونے والی وہ کانفرنس یاد آئی جس میں اپنی صغرسنی کے باوجود مجھے عمائدین کے ساتھ فرشی اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ رات گئے تک شعلہ بار تقریریں ہوتی رہیں۔ 'اُردو کا حق لے کے رہیں گے' جیسے نعروں سے دیر تک فضا معمور رہی۔ جلسہ کے خاتمہ پر مجھے بھی مہمانوں والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ شعیب منزل میں عشائیہ کا نظم تھا۔ اتفاق سے میرے پہلو میں غلام سرور

ایڈیٹر'روزنامہ سنگم' فروکش تھے۔ بزرگوں کی اس مجلس میں بھلا مجھ جیسے نووارد کی موجودگی کا نوٹس کون لیتا۔ اب جو گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو پتہ چلا کہ دربھنگہ کی یہ کانفرنس دراصل پورے صوبہ میں اُردو بیداری کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ غلام سرور صاحب کی جیل کی ڈائری' گوشہ میں قفس کے' میں اُلٹ پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور ان کے اخبار'سنگم' کا تو میں مستقل قاری تھا۔ آج ٹاؤن ہال میں ان کی شعلہ بیانی سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس زمانہ کے بیشتر کامیاب مقررین کی طرح ان کی تقریر میں بھی مترادفات کی کثرت دیکھنے کو ملی۔ ہر دو منٹ بعد شاید عمداً وہ کچھ اس طرح کے اسما کا ذکر کرتے اور پھر ناموں کی ایک طویل فہرست کچھ اس طرح فٹ کرتے چلے جاتے کہ دو چار دس ناموں کے بعد سامع کو یہ محسوس ہوتا کہ اس شخص کے پاس اسما و الفاظ کا ایک لامتناہی خزانہ ہے، جسے وہ اگر لٹانے پر آئے تو سننے والوں پر حیرت کی کیفیت پیدا کر دے۔ مثلاً اس خوبصورتی سے باتوں باتوں میں کبھی دریا کا ذکر لاتے تو ملک و بیرون ملک کے سارے دریاؤں کے نام گنا دیتے، کبھی پھول کا تذکرہ آتا تو اس خوبصورتی سے پھولوں کے نام گناتے چلے جاتے کہ سننے والا عش عش کر اٹھتا، مجمع سے واہ واہ سبحان اللہ کی صدا بلند ہوتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے نثر میں مشاعرہ پڑھ رہے ہوں۔

اب جو اس تقریر کے بعد انھیں عشائیہ کی مجلس میں قریب سے سننے اور دیکھنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ تقریر بھی ایک فن ہے اور عوامی تقریر کے لیے تو خاص طور پر مقررین کو ایک الگ قسم کا جتن کرنا پڑتا ہے۔ سرور صاحب تو واپس پٹنہ چلے گئے، البتہ اپنے پیچھے بڑے بڑے منصوبے اور انقلاب انگیز اسکیمیں چھوڑ گئے۔ شہر میں ہر طرف کانفرنس کا تذکرہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ اُردو والے اب آسانی سے ماننے والے نہیں۔ اگلا منصوبہ شہر میں ایک بڑے احتجاجی جلوس کا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ یومِ مطالبۂ اُردو کا جلوس نکلتا بھائی جان اچانک گرفتار کر لیے گئے۔

یہی کوئی مغرب کا وقت ہوگا۔ شب برأت کا موقع تھا، محلے میں حلوے کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ چھوٹی عمر کے بچے ایک دوسرے کے گھروں میں حلوے کی تقسیم کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے، چہل پہل کا سماں تھا۔ ہمارے گھر میں حلوہ بننے کا رواج تو نہ تھا، لیکن اس خیال سے کہ بچے اِدھر اُدھر محلہ پڑوس کے کھانے کی خوشبوؤں کی طرف نہ لپکیں ایسے موقع پر والدہ پلاؤ زردہ کا اہتمام کر دیتیں۔ والدہ کے ہاتھوں کے شامی کباب کا لطف ہی کچھ اور ہوتا اور جب گھر میں مظافر کی خوشبو پھیلتی تو بڑی بے صبری سے کھانے کے وقت کا انتظار ہونے لگتا۔ لیکن بھائی جان کی اس اچانک گرفتاری نے مزیدار کھانوں کی اس معصومانہ شام کو ایسا بے رونق کیا کہ اب کسی کو کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ پولیس اسٹیشن چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ ہم لوگ وقفہ وقفہ سے اس کا چکر لگاتے رہے، لمحہ لمحہ کی رپورٹ والدہ کو لا کر دیتے۔ رات آنکھوں میں کٹی، یہ اندیشہ لگا رہا

کہ پتہ نہیں آگے کیا ہو۔ والد صاحب کی زبان پر یا مسبّب الاسباب کا ورد جاری رہا۔ خدا خدا کر کے دوسرے دن رہائی نصیب ہوئی۔

بھائی جان اس وقت انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے اور 'توازن' کے نام سے اُردو کا ایک ضخیم ادبی مجلہ نکال چکے تھے۔ دربھنگہ میں منعقد ہونے والی آل بہار اُردو کانفرنس کے پیچھے بھی ان ہی کا ہاتھ تھا۔ اب جو اچانک ان کی گرفتاری ہوئی تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اس ملک میں اپنی زبان وثقافت کے فروغ کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا خطرے سے خالی نہیں۔ والد صاحب سے ۱۹۶۷ء کے رانچی کے فساد کا تذکرہ سن رکھا تھا، جو اُردو تحریک کو کچلنے کے لیے ہی برپا کیا گیا تھا۔ میں اس بات کا تو قائل تھا کہ دین کے لیے بڑی سے بڑی صعوبت برداشت کی جاسکتی ہے، قربانیاں دی جاسکتی ہیں، لیکن زبان کے لیے آدمی جیل جائے، اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ یعقوب صاحب سے اس بارے میں استفسار کیا جائے کہ کیا زبان کا واقعی ہم پر اتنا حق ہے کہ اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی جائیں۔

ایک دن یعقوب صاحب از خود مکتبہ میں تشریف لائے، شاید وہ اسی واقعہ کے پس منظر میں اظہار ہمدردی کے لیے آئے تھے، کہنے لگے زبان بھی تو ہماری شخصیت کا حصہ ہے۔ زبان، ثقافت، افکار ونظریات اور مذہب، یہ سب مل کر انسان کی شخصیت بناتے ہیں۔ کسی آدمی سے اس کی زبان چھین لی جائے تو بس یہ سمجھو کہ وہ آدمی ادھورا رہ گیا۔ اب اگر ثقافت اور دین بھی اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر اس کے پاس بچا ہی کیا، خالی خولی میکانکی آدمی تو جانوروں کی مانند ہے۔ اور ہاں ایک بات اور سمجھ لو، زبان کا تعلق شہریت سے بھی ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: یہ ذرا ادق موضوع ہے، سردست بس اتنا سمجھو کہ زبان کے بغیر جب آدمی ادھورا ہے تو وہ شہری بھی تو ادھورا ہی ہوا۔ زبان ہمیں اختلاف کرنے کا فن سکھاتی ہے، ہم اس کے ذریعہ سوچتے ہیں اور پھر جو چیز ہمیں پسند نہیں آتی ہم اس کی مخالفت کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔ اگر انھوں نے ہماری زبان چھین لی تو ہم سوچنے اور بولنے سے محروم ہو جائیں گے۔

یعقوب صاحب کی باتیں اس وقت کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئیں، ہاں یہ اندازہ ضرور ہوا کہ اُردو زبان کی لڑائی سے ہماری ملّی اور دینی شخصیت کا بھی کوئی گہرا تعلق ہے۔ والد صاحب اکثر کہتے کہ بیشتر لوگ حالات کے جبر کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں، مگر ہر شخص ایسا نہیں ہوتا۔ بعضے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ڈٹ جاتے ہیں، مقابلہ کرتے ہیں اور بالآخر حالات کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کا تعلق

آخرالذکر کے قبیل سے ہو۔

اُردو تحریک کے حوالے سے شہر میں ہمارے اسکول کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جغرافیائی طور پر ہمارا اسکول شہر کے قلب میں واقع تھا اور یہ واحد اُردو میڈیم اسکول تھا جسے مسلمان اپنے انتظام وانصرام میں پوری دینی شناخت کے ساتھ چلا رہے تھے۔ بزم اُردو کے سالانہ جلسوں کے موقع پر مسلم محلوں میں چہل پہل کا سماں ہوتا۔ تحریری اور تقریری مقابلوں کے انعامات کا انتظام شہر کی مسلم آبادی بڑے ذوق وشوق سے کرتی۔ شہر کی سرکردہ شخصیات تحریری مقابلوں کے لیے اپنی پسند کے موضوعات متعین کرتیں اور ان موضوعات پر اپنی طرف سے وقیع انعامات کا پیشگی اعلان بھی کر دیتیں۔ گویا اسکول کے معاملات سے شہر کی مسلم آبادی خود کو متعلق محسوس کرتی۔

اسکول میں سائنس کے مضامین بھی خالصتاً اُردو میں پڑھائے جاتے، حتیٰ کہ علم کیمیا کی تجربہ گاہ میں تطہیر اور تقطیر جیسے تجربہ کے لیے جب ضروری اشیا کی فہرست بناتے تو اس میں تھرمامیٹر طلب کرنے کے لیے آلۂ مقیاس الحرارت لکھا جاتا۔ گو کہ زبان کی اس پاسداری کے سبب بورڈ کے امتحان میں طلبا کو اس وقت دشواریاں پیش آتیں جہاں غیر اُردو داں حضرات سائنسی آلات کے اُردو ناموں سے سرے سے واقف ہی نہ ہوتے، لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود اسکول کے اس جزیرے میں اُردو زبان پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ تھی۔

اب جو یومِ مطالبۂ اُردو کی تجویز سامنے آئی تو پورا اسکول اس انقلابی مہم کی تیاری میں لگ گیا۔ طے پایا کہ اس موقع پر ہزاروں لاکھوں خطوط صدر جمہوریہ کو ارسال کیے جائیں اور ان سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ صوبہ بہار میں جہاں بڑی تعداد میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول باقی ہیں، اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کر دیا جائے۔ اب طلبا کی چھوٹی چھوٹی ٹیمیں پوسٹ کارڈ کے گٹھڑوں کے آگے بیٹھ گئیں۔ پہلے تو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہماری خطوط نویسی اور خطوط کی ہزاروں، لاکھوں کی تعداد صدر جمہوریہ کو ایک انقلابی فیصلہ لینے پر مجبور کر دے گی۔ لیکن عبدالرشید نے یہ کہہ کر ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ اگر محض خط لکھنے سے اتنی بڑی تبدیلی ممکن ہوتی تو اُردو کب کی سرکاری زبان بن چکی ہوتی۔ 'انھیں تو سب معلوم ہے کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں۔ یہ جو تم لوگ خط لکھ کر حکومت کو اُردو کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو تو یہ تمھاری سادہ لوحی ہے۔ اب دیکھو یہاں بھی تو حکومت ہی کا فائدہ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں خطوط کی ترسیل سے فائدہ تو محکمۂ ڈاک کو ہی حاصل ہوگا اور تم لوگ اپنی سادہ لوحی میں سارا جوش ان خطوط میں انڈیلے دیتے ہو، میرے خیال میں تو ان طفل تسلیوں کا کچھ بھی حاصل نہیں'۔

'ارے ہاں! بات تو تم صحیح کہتے ہو، فائدہ تو یقیناً ڈاک خانہ والوں کا ہے، ہم لوگ شاید یہاں بھی بے وقوف بن رہے ہیں'، مہتاب نے تائید کی۔

میں نے خطوط کی اس مہم کو بے دلی اور مایوسی کا شکار ہوتے دیکھ کر یہ کہا کہ 'ارے بھئی ہر چیز کا فائدہ اور نقصان پیسوں کے جوڑ گھٹاؤ میں نہیں دیکھا جاتا۔ اب جو یہ ہزاروں لاکھوں خطوط مختلف شہروں سے مختلف ہاتھوں میں ہوتے ہوئے صدر جمہوریہ کو پہنچیں گے تو چھوٹے سے ڈاک خانہ سے لے کر دلی کے بڑے ڈاک خانہ تک ایک ہلچل مچ جائے گی۔ لوگ سوچیں گے کہ آخر اچانک کیا بات ہوگئی کہ صدر جمہوریہ کو ہر روز ہزاروں لاکھوں خطوط پہنچ رہے ہیں اور ہر پوسٹ کارڈ ایک علیحدہ طرز تحریر کا حامل ہے، جہاں ہم لوگوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان میں ہمارا مطالبہ بھی ہے اور غصہ بھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُردو والے اب سوچنے اور بولنے لگے ہیں۔ انھیں اپنے جمہوری حقوق کا ادراک ہوگیا ہے۔ ہمارے اندر زندگی لوٹ آئی ہے۔ عبدالرشید ہمارے یہ خطوط کاغذ کے بے جان ٹکڑے نہیں بلکہ یہ حوصلوں کے چراغ ہیں جو جل اٹھے ہیں، اب انھیں کوئی نہیں بجھا سکتا'۔ میں نے مقرروں والے انداز میں اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

بولا: چلو مانے لیتے ہیں، اصل امتحان تو بدھ کو ہے، دیکھتے ہیں جلوس میں کتنے لوگ آتے ہیں۔

بدھ کے دن اسکول میں طلبا کی ایک اسمبلی ہوئی جس میں جلوس کی اہمیت، اس کے راستے اور دوسری حفاظتی تدابیر سے آگاہ کیا گیا۔ کون سے نعرے لگانے ہیں اور کس نعرے کے جواب میں کیا کہنا ہے۔ جب ان باتوں کی کسی قدر آگہی ہوگئی تو ہم لوگ خاموش جلوس کی شکل میں مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ پہنچے جہاں مختلف اطراف واکناف سے محبان اُردو کے جلوسوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آتا تھا۔ جوش وخروش سے معمور۔ 'اُردو کا حق لے کے رہیں گے' کا عزم بڑے بڑے بینروں پر آویزاں۔ کہیں 'سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے' جیسے مصرعے۔ پر جوش تقریروں اور فلک شگاف نعروں کے جلو میں محبان اُردو کا یہ جلوس کلکٹریٹ کی طرف روانہ ہوا۔ جن راستوں سے اس جلوس کو گزرنا تھا ان میں بیشتر حصہ تو مسلم آبادی کا تھا، البتہ بعض غیر مسلم آبادی میں جلوس پر حملے کا خطرہ تھا، لیکن اب اُردو والے اس شرانگیزی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ جب جلوس مکتبہ کے قریب سے گزرا تو مائک میرے ہاتھوں میں تھا اور میں پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنے ہم جماعتوں کے بیچ نعرے بلند کررہا تھا، تبھی میری نظر والد صاحب پر پڑی، وہ شوق وحیرت کا مجسمہ بنے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے شرما کر کچھ خفت بھرے انداز میں مائک اپنے ساتھی کے حوالے کیا اور خود جلوس سے نکل کر مکتبہ میں گھس گیا۔ کلکٹریٹ کی عمارت قریب ہی تھی، میرے حصہ کا جلوس یہیں اختتام کو پہنچا۔

۱۰

سنگینوں کا پہرہ

ملک ایک ہنگامی صورتِ حال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی آزادی کا بخار اب بڑی حد تک اتر چکا تھا۔ ایک عمومی بے چینی ملک کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ ایک طرف جنگ کے اخراجات، دوسرے ملک میں قحط سالی اور پھر مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم، فسادات کا سلسلہ، نتیجہ یہ ہوا کہ کل تک جو لوگ مسلم دشمنی میں مسز گاندھی کو دُرگا کا اوتار کہتے نہیں تھکتے تھے وہ اب ان کے خلاف کھل کر سامنے آ گئے۔ ہر طرف ہڑتال اور چکا جام کی صورت پیدا ہوگئی، ضروری اشیا کی قلت نے ذخیرہ اندوزی کو جنم دیا۔ اب اسکول سے گھر آتے ہوئے راستے میں کچھ اس طرح کے مناظر دکھائی دیتے: کہیں مٹی کے تیل کا ٹینکر کھڑا ہے اور اس کے پیچھے دو تین سو لوگوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ پتہ چلتا کہ ابھی یہاں تیل فروخت ہونے والا ہے۔ ایک دوسری جگہ صابن کے لیے قطار لگی ہوئی ہے۔ کہیں ماچس کی ڈبیہ مل رہی ہے تو کہیں سگریٹ کے پیکٹ۔ اب ہر طرف شہر کا یہی منظرنامہ تھا۔ قطار کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس لاٹھی چارج کرتی۔ اشیائے ضروریہ کا حصول جب آسان نہ رہا تو لوگوں نے قطار بننے سے پہلے ہی ٹرکوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ملک میں ایک عام انارکی کی صورت حال تھی۔ رات آٹھ بجے گھروں سے ڈھول تاشے بجنے کی آوازیں آتیں، لوگ چمچہ، تھالی بجاتے۔ یہ سب عوامی احتجاج کا طریقہ تھا جس کی قیادت بزرگ رہنما جے پرکاش نارائن نے سنبھال رکھی تھی۔ ملک میں سمپورن کرانتی کی یہ لَے مسلسل بلند ہوتی جاتی تھی۔ ہر طرف سے ایک ہی آواز آتی تھی: راج سنگھاسن خالی کرو کہ جنتا آتی ہے۔

اِدھر اسکول میں ششماہی امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ آج پہلا پرچہ تھا۔ صبح اٹھا تو والد صاحب کو غیر معمولی طور پر فکرمند پایا۔ پتہ چلا کہ ملک میں ایمرجنسی لگ چکی ہے۔ اسکول جاتے ہوئے راستے میں جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں کچھ راز و نیاز کے انداز میں تبادلۂ خیال کرتی نظر آئیں۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ایمرجنسی ہوتی کیا ہے، پھر ذہن پر امتحان کا بوجھ بھی تھا۔ گھر واپس آیا تو دیکھا کہ مکتبہ میں اُردو اور انگریزی کے کئی اخبارات رکھے ہیں۔ ایک اخبار کی شہ سرخی تھی: Emergency Declared۔

چند دنوں بعد یہ خبر آئی کہ چھبیس جماعتوں کو کالعدم قرار دیا گیا ہے، جس میں جماعت اسلامی کا نام بھی شامل ہے۔ بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے ہیں۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ ابّا نے یا مسبّب الاسباب کا آوازہ بلند کیا اور ایسا لگا جیسے ان کی فکرمندی پر سکینت غالب آ گئی ہو۔

چند دن اسی طرح گزرے، پھر خبر آئی کہ بڑے ابّا میسا کے تحت گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ ابّا کی فکرمندی کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔ اس حادثہ پر دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دن میرے عم زاد محترم جمیل اختر اسکول میں آئے، میں امتحان گاہ میں تھا۔ مجھے باہر بلا کر یہ اطلاع دی کہ ابّا گرفتار ہو گئے ہیں اور مکتبہ بھی پوری طرح سیل کر دیا گیا ہے، اس لیے تم لوگ امتحان سے فراغت کے بعد گھر جانے کے بجائے اسلام نگر آ جانا۔ والد کی گرفتاری میرے لیے غیر متوقع تھی۔ ابّا اور گرفتار ہو جائیں، ہم سے الگ کر دیئے جائیں، میرے لیے یہ خبر ایک صدمۂ جانکاہ تھی۔ میرے تصور میں جیل کی وہ بلند و بالا دیواریں ابھرنے لگیں جن کے قریب سے میں اکثر صبح کی سیر کے دوران گزرا کرتا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دوستوں نے تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن میرے چشم تصور میں کبھی والد کا فکرمند چہرہ ابھرتا اور کبھی جیل کی بلند اور مہیب دیواریں میرے اور ان کے بیچ میں حائل ہوتی نظر آتیں۔ اسلام نگر اسکول سے قریب ہی واقع تھا جہاں ہماری والدہ بڑے ابّا کی گرفتاری پر اہل خانہ کی مزاج پرسی کے لیے آج صبح ہی گئی تھیں۔ بدبختوں نے ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مکتبہ اور اس سے متصل ہماری رہائش گاہ کو مکمل طور پر سیل کر دیا تھا۔ والدہ پریشان تھیں پھر بھی مجھے تسلی دیتی رہیں۔ ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے، پریشان مت ہو، حالات بدلیں گے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک یہ سب ہوا کیسے۔ کیا انھیں اس بات کا انتظار تھا کہ والدہ گھر سے باہر قدم نکالیں اور وہ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر مکتبہ کے ساتھ ہماری رہائش گاہ کو بھی مقفل کر دیں۔

ششماہی امتحان کے کچھ پرچے ابھی باقی تھے، مگر اب امتحان کی کسے فکر تھی۔ کتابیں بند، کپڑے مقفل، ایسا لگا جیسے اچانک ہم خانماں برباد لوگ کھلے آسمان کے نیچے آ گئے ہوں۔ نہ جانے ابّا کس حال میں ہوں۔ یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا۔ میری آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے، پھر خود کو سمجھاتا کہ راہِ حق کے مسافروں کو دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ خیال آیا ابّا رات کی تاریکی میں جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں تو خدا ان کی سن لیتا ہے، پھر وہ انھیں کیوں کر ضائع ہونے دے گا۔ یہ سوچ کر دل کو تھوڑا قرار آتا، پھر اگلے لمحہ اندیشوں کی دھند دبیز ہو جاتی۔

مغرب کے وقت بھائی جان کی آمد ہوئی، انھوں نے والدہ کو ابّا کی گرفتاری اور مکتبہ کی مقفلی کی تفصیلات سے آگاہ کیا، بولے، ابھی تھانہ میں ہیں کل کورٹ میں پیشی کے بعد جیل میں منتقل ہو جائیں گے۔

چاہوتو ملاقات کے لیے چل سکتے ہو۔ عشا کے وقت ہم لوگ تھانہ پہنچے۔ ابّا ایک تخت پر مصلّٰی بچھائے عشا کی نماز میں مصروف تھے۔ خشوع وخضوع کا وہی عالم جیسے تہجد کی نماز میں ہوں اور اپنے رب سے سرگوشی کرر ہے ہوں۔ سلام پھیرا، ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی اشارے سے قریب بلایا، بولے، گھبراؤ نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی مسبّب الاسباب ہے، اپنی پڑھائی کی طرف سے غفلت مت برتنا، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا، حالات یکساں نہیں رہتے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے میری پیٹھ پر اپنا دست شفقت پھیرا، ایسا لگا جیسے ان کے لمس نے اچانک میرے اندر غیر معمولی توانائی بھر دی ہو۔ غم واندوہ کے بادل چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب تک میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو کیا ہوا تھا، مگر ان کی یہ باتیں سن کر میری آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے اچانک نکل آئے، جسے میں نے بڑی ہوشیاری سے چپل ٹھیک کرنے کا بہانہ بنا کر جھکتے ہوئے اپنی آستین سے کچھ اس طرح پوچھا کہ ابّا کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور پھر صبر کی چٹان بن کر ان کے سامنے کچھ اس شان سے بیٹھا کہ انھیں ہماری حوصلہ مندی سے قوت ملتی رہے۔

رات بھر دل ودماغ پر مختلف قسم کے وساوس کا ڈیرہ رہا۔ کبھی قید وبند کی صعوبتوں کے خیال سے دل ڈوبتا اور کبھی تھانہ کی اس ملاقات سے اطمینان ہوتا، جب میں نے ابّا کے چہرے پر ثبات وسکینت کی غیر معمولی جھلک دیکھی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب ایک درخت کے نیچے ایک تخت پر متمکن ہیں، ان کے ہاتھ میں حمائل شریف کا وہی نسخہ ہے جس سے وہ اکثر تلاوت کیا کرتے ہیں۔ اردگرد خدام کھڑے ہیں اور مرصع کرسیوں پر خوبصورت لباسوں میں بہت سے لوگ فروکش ہیں، ان میں سے بعض شناسا چہرے بھی دکھائی دیئے جو اکثر مکتبے میں آیا کرتے تھے۔ یہ پرفضا مقام کسی آبشار کے قریب واقع تھا۔ طلوع آفتاب سے چند لمحے پہلے کا یہ منظر مجھے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہی وقت ہوتا جب ابّا تلاوت سے فارغ ہوکر اپنا مصحف لپیٹتے اور میں ان کے ساتھ صبح کی سیر کے لیے چل پڑتا۔ والد صاحب کو صبح کے اس لمحہ میں اس پرفضا مقام پر دیکھ کر میرا دل خوشی سے مچل اٹھا۔ میں نے سوچا آج سیر میں بہت لطف آئے گا۔ بے ساختہ ان کی طرف دوڑا، لیکن اس سے پہلے کہ ان تک پہنچتا میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی صبح ہونے میں خاصا وقت تھا۔ بڑی کوشش کی مگر پھر نیند نہ آسکی، البتہ اس خیال سے اطمینان ہوا کہ ابّا مسرور ومطمئن ہیں اور حمائل شریف کی معیت میں پرفضا مقام کے باسیوں میں مقام علیا کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ شاید وہ اپنا خاص نسخۂ قرآن طلب کرر ہے ہوں۔ اس خیال سے صبح مکتبہ کا چکر لگایا لیکن یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ مکتبہ مقفل ہے اور وہاں ایک بندوق بردار سپاہی پہرہ دے رہا ہے جو

کسی کو قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اگلا دن بڑے ذہنی انتشار میں گزرا۔ ایک طرف والد صاحب کی عدالت میں پیشی جہاں ان پر ملک میں بدامنی پھیلانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور دوسری طرف ہماری خانماں بربادی کا یہ منظر کہ ہم چھ بھائیوں کو تعلیمی انقطاع کا خطرہ لاحق تھا۔ اب تک ایمرجنسی کے اسیران کی مدد کے لیے جو کوئی بھی سامنے آیا تھا خود اسے گرفتاری کا خطرہ لاحق ہوجاتا تھا۔ ڈر اور خوف کے اس ماحول میں اکثر عزیز و اقارب نے نگاہیں پھیر لینے میں عافیت جانی تھی۔ ابھی ہم آگے کا لائحۂ عمل ہی بنا رہے تھے کہ ایک روح فرسا خبر یہ آئی کہ چھوٹے ابّا بھی گرفتار کر لیے گئے ہیں، گویا دائرہ اپنے اتمام کو پہنچا۔

گھر کے تمام مرد پابند سلاسل تھے، اب مدد کے لیے دیکھیں تو کس کی طرف دیکھیں۔ جب سارے زمینی سہارے ٹوٹ گئے تو قدرت کی اپنی اسکیم سامنے آئی۔ ہمارے ایک پڑوسی جو والد صاحب کے قدردانوں اور دوستوں میں تھے، انھوں نے اپنے گھر کی چابی اس اصرار کے ساتھ بھجوائی کہ جب تک مکتبہ مقفّل ہے ہم لوگ یہاں منتقل ہوجائیں اور بغیر کسی تحفظ ذہنی کے اسے اپنی ہی رہائش گاہ سمجھیں۔ ہمارے لیے مکتبہ کے پہلو میں پھر سے آ کر آباد ہوجانے کا خیال ہی بڑا حوصلہ انگیز تھا۔ ہم لوگ فی الفور یہاں اٹھ آئے۔ لیکن اٹھ کیا آتے، ساتھ میں کوئی ساز و سامان یا لاؤلشکر تو تھا نہیں۔ ضروریات زندگی کی ساری چیزیں تو مکتبہ اور اس سے ملحق رہائش گاہ میں بند تھیں جہاں صبح و شام سنگینوں کا پہرہ تھا۔ زندگی اشیائے ضروریہ کے بغیر کیسے بسر کی جاتی ہے، پہلی بار اس کا تجربہ ہوا۔ والدہ نے نئے گھر کا نقشہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا کہ اس بے سروسامانی میں بھی صبر و شکر اور تعلیم و تعلّم کا ماحول پیدا ہوگیا۔ ہفتہ عشرہ اس تقلیبِ ذہنی میں لگے۔ اس دوران جیل سے والد صاحب کی خبریں مختلف ذرائع سے چھن چھن کر آتی رہیں۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ (DIR) ڈی آئی آر کے قیدیوں سے ملاقات کے لیے بدھ کا دن مخصوص کیا گیا ہے۔

بدھ کے دن ہم لوگ مقررہ وقت پر جیل پہنچے۔ یہی کوئی ڈھائی تین بجے کا عمل ہوگا، برسات کی گرمی اپنے عروج پر تھی، فضا میں حبس کی کیفیت تھی۔ جیل کے صدر دروازے سے ملحق تین دروازہ نما کھڑکیاں تھیں جس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں آویزاں تھیں۔ ان دروازوں سے کچھ دوری پر ایک دیوار کچھ اس طرح کھینچی گئی تھی کہ قیدی اور ملاقاتی کے بیچ دس بارہ فٹ کا فاصلہ حائل رہے۔ دیوار کی اونچائی یہی کوئی تین چار فٹ رہی ہوگی۔ دیوار کے باہر ملاقاتیوں کا ہجوم اور اندر آہنی جھروکوں میں قیدیوں کی بھیڑ بھاڑ۔ جہاں اتنے سارے لوگ ایک ساتھ ملاقات کر رہے ہوں اور انھیں مخاطب تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بلند آہنگی کا سہارا لینا پڑتا ہو، وہاں آوازوں کا ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجانا اور ناقابل فہم بن جانا فطری تھا۔ ہماری

آنکھیں ابّا کو تلاش کر رہی تھیں، وہ کہیں نظر نہ آئے۔ کھلے آسمان کے نیچے گرمی کی شدت میں کچھ دیر امید بھری نظروں سے ان جھروکوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ دفعتاً ابّا کی جھلک دکھائی دی۔ سلام کی آواز آئی، ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں، لیکن اس شور شرابے میں ان کی آواز کچھ سنائی نہ دی یا پھر گلے میں رندھ کر رہ گئی ہو۔ پریشاں حالی ان کے چہرے سے نمایاں تھی، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے بے خوابی کا شکار ہوں۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ ملاقات کے لیے آتے وقت مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی، سوچا تھا کہ آج میں ان سے مل کر لپٹ جاؤں گا، انھیں ہمت دلاؤں گا اور انھیں یہ بتاؤں گا کہ ان کی غیر موجودگی میں ہم لوگوں کی تعلیمی سرگرمیاں ان کی توقع سے بھی کہیں بڑھ کر کس طرح جاری ہیں۔ سوچا تھا کہ وہ یہ سب سن کر فرطِ مسرت سے ہمیں گلے لگا لیں گے، میری پیٹھ تھپتھپائیں گے اور میری پیشانی پر اپنا دستِ شفقت کچھ اس طرح رکھیں گے کہ اس لمسِ پدری سے میرے اندر زندگی کی نئی امنگ جاگ اٹھے گی۔ لیکن یہاں تو ملاقات کے نام پر ایک اذیت تھی۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں عزیزی شاہد سلمہ اور مرشد سلمہ کو گود میں اٹھا کر ان کی شکل دکھائی۔ دونوں طرف حسرت بھری نگاہوں کا تبادلہ تھا، محرومی تھی، بے بسی تھی اور ایک ناقابل بیان کرب تھا، جو کبھی ہماری آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑتا اور کبھی والد صاحب کی رندھی ہوئی آواز میں باہر آجاتا۔ کچھ دیر ہم لوگ ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھتے رہے۔ والدہ حسرت و یاس کا مجسمہ بنی نقاب کے اندر سے اس رقت آمیز منظر کا مشاہدہ کرتی رہیں کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ملاقات کے دوران بھی باپ کے لمس سے محروم کر دیئے گئے ہیں، وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن شور شرابے کے اس ماحول میں کیا کہتیں۔ زنداں کی پہلی ملاقات اس طرح بے بسی اور محرومی کا شدید احساس دلاتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچی۔

واپسی پر ذہن سخت پراگندہ تھا۔ ابّا کی بے خواب آنکھیں جو غالباً کثرتِ گریہ سے سوجی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، بار بار نگاہوں کے سامنے آجاتیں۔ دل ہی دل میں ان کے لیے دعا کرتا جاتا، یا اللہ! ابّا پر زنداں کی صعوبتیں آسان کر دے۔ ابّا ہمارے شب و روز کا حصہ تھے، ان کے گرد پوری فیملی حتیٰ کہ بڑا مشترکہ کنبہ بھی کچھ اس طرح مربوط تھا کہ وہ اس کے مرکز میں بیٹھ کر عزیز و اقارب کی خبر گیری کرتے اور اپنی وسعت سے کہیں بڑھ کر ان کی داد رسی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ خاندان سے باہر کمزور، بے سہارا مسلمانوں، حوصلہ مند نوجوانوں اور زندگی میں کچھ کر گزرنے کا عزم رکھنے والوں کے لیے بھی ان کی حیثیت ایک محور کی تھی۔ دسیوں لوگ ان سے اپنے خانگی اور سماجی معاملات میں مشورہ لیتے۔ اب ان کے اچانک اس طرح پسِ زنداں چلے جانے سے یہ غیر محسوس نیٹ ورک بحران میں آگیا۔ کسی کی امانت تو کسی کو دی جانے

والی ممکنہ اعانت، یہ سب اچانک رک گئی۔ حکومت نے تو ان پر ملک میں بدامنی پھیلانے کا الزام عائد کیا تھا، لیکن مزاج پرسی کے لیے آنے والے، ان کے حسنِ سلوک اور ان کی خاموش مدد کا جس طرح تذکرہ کرتے تو اس سے ابّا کی ایک ایسی فرشتہ صفت تصویر ابھرتی جس کا کسی قدر اندازہ تو ہم لوگوں کو ضرور تھا، لیکن اتنی صراحت کے ساتھ ان باتوں کا علم ہمیں ان کے جیل جانے کے بعد ہی ہوا۔ ان دہقانوں اور دور دراز سے آنے والے شناساؤں اور ناشناساؤں کو سن کر ایسا لگتا جیسے یہ سب ابّا کے ساتھ کسی مضبوط روحانی رشتے میں بندھے ہوں۔ ابّا اتنی بڑی فیملی کے کفیل تھے اور ان کا خاندان اتنا بڑا تھا اس کا اس سے پہلے ہم لوگوں کو اس قدر اندازہ نہ تھا۔

ملاقات سے واپسی پر مجھے اس بات کا شدید افسوس تھا کہ میں نے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے تو یہ سوچا تھا کہ ان سے پیکر ثبات بن کر ملوں گا، اپنے عزم اور حوصلے سے انھیں یہ اطمینان دلاؤں گا کہ ہم لوگوں نے اس صدمہ کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ راضی برضا ہیں، ہم ٹوٹنے والے نہیں، لیکن ان کی صورت دیکھتے ہی جذبات کچھ اس طرح بے قابو ہوئے کہ آنسو کے چند قطرے آنکھوں سے ٹپک ہی پڑے۔ میں نے عزم مصمم کیا کہ اب اگلی ملاقات میں ان کے پاس بے بسی کی تصویر بن کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ابّا کی یہ بات بھی یاد آئی، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ زندگی اعلیٰ مقاصد اور ارفع خیالات کے بغیر موت ہے۔ انسان اور جانوروں میں یہی تو فرق ہے کہ جانور کھا پی کر خوش اور مسرور رہتے ہیں، انسان خیالات کے بغیر جانوروں کے مثل ہے۔ وہ اکثر کہتے کہ ہم عام لوگ نہیں، خیر امت ہیں، خدا کے برگزیدہ نفوس، ہم اس آسمانی ذمہ داری سے، جو خدا نے مسلمان کی حیثیت سے ہم پر ڈالی ہے، منہ نہیں موڑ سکتے۔ ابّا اس جرم کی پاداش میں پس دیوارِ زنداں ہیں، یہ تو اعزاز کی بات ہے، مگر یہ کیسا اعزاز ہے کہ خدا سے خاص تعلق رکھنے والے لوگ اس قدر مجبور اور بے بس بنا دیئے گئے ہیں۔ اے خدا! ابّا کسی اور سے تو مانگتے نہیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ مشکل اوقات میں ان کی نگاہیں ہمیشہ آسمان کو تکا کرتی ہیں، پھر تو نے انھیں کس کے بھروسے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے حالی کے وہ اشعار بے ساختہ یاد آئے جن کی مسدس کے بند کے بند خوش الحانی کے ساتھ سنا کر میں اپنے بزرگوں سے انعام وصول کیا کرتا تھا:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے　　امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

مکتبہ پر سنگین بردار پولیس کا پہرہ اب بھی جاری تھا۔ میں جب بھی قریب جانے کی کوشش کرتا، پہرے پر تعینات سپاہی اپنے بوٹ کو کچھ اس طرح زمین پر مارتا کہ اس سے ٹک ٹک کی کریہہ آواز پیدا

ہوتی۔ اس کا چہرہ کسی تاثر سے خالی ہوتا جیسے کوئی میکانکی روبوٹ ہو۔ حالانکہ پولیس کی ٹکڑیاں اکثر اس علاقے میں گھومتی رہتیں کہ انتظامیہ کے دفاتر اور پولیس لائن کا علاقہ یہاں سے قریب تھا اور ہم لوگ بھی کبھی کبھی کھیل کود کے لیے اور کبھی پیرا کی کے لیے ان کے کیمپس میں جانکلتے۔ تب ان کا رویہ عموماً ہم بچوں سے خوش اخلاقی کا ہوتا، لیکن ایمرجنسی نے انھیں بنیادی انسانی جوہر سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اس کے بوٹ کی ہر کر یہہ ٹک کے نیچے ایسا لگتا جیسے میرا دل کچلا جاتا ہو۔ مکتبہ جس سے میرے شب و روز کی یادیں وابستہ تھیں، جو میری مجلس تھی اور میری درسگاہ بھی، جہاں میرے شب و روز مسرت اور بصیرت سے مملو ہوتے، جس کی خاطر میں نے گاؤں کی جشنِ مسلسل جیسی زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا، اس مکتبہ سے آج ہم لوگ بے دخل کر دیئے گئے تھے۔ میں ان ہی خیالات سے نبرد آزما ایک حسرت بھری نگاہ سے مکتبہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے اسکول کا پرانا دوست سمیر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اسے آواز دی، اس نے ایک لمحہ مڑ کر دیکھا، لیکن نہ جانے کیوں رکنے کے بجائے اس نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔ میں نے پھر آواز دی، اس کی طرف لپکا لیکن وہ جان چھڑانے پر مصر تھا۔ بولا، ابّا نے منع کیا ہے، تمھارے گھر نہیں جانا ہے۔ سمیر میرا پرانا دوست تھا، عبدالقیوم انصاری کا مداح۔ کبھی تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا اور کبھی ملّی مسائل پر پرجوش گفتگو کرتا، آج اچانک اس کے اس طرح آنکھ پھیر لینے پر بڑی حیرت ہوئی، ایسا لگا کہ میری روح اس کی طوطا چشمی کے خنجر سے بری طرح مجروح ہوگئی ہو۔ لیکن سمیر اپنے اس رویے میں تنہا نہیں تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ نے اچانک ہمارے لیے گرد و پیش کی دُنیا اجنبی بنادی تھی۔ لوگ زیر لب ہمدردی کے الفاظ بولتے، کوئی ہمت والا دل کڑا کر کے والد صاحب کی خیریت بھی پوچھ لیتا، لیکن عملی طور پر ان کا کردار تماش بینوں کا تھا۔ وہ ہمارے بدخواہ نہیں تھے، لیکن وہ خیرخواہ بننے کی ہمت سے بھی خالی تھے۔ مجموعی طور پر ہمارا سابقہ تماش بینوں سے تھا، جو اپنے تئیں ہمدردی اور نیک جذبات کے ساتھ آج ہمارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گو وہ حق کے مخالف نہیں تھے مگر حق کے ساتھ بھی تو نہیں تھے۔ اب انھیں کون سمجھاتا کہ حق کا ساتھ نہ دینا ہی دراصل اس کی مخالفت ہوتی ہے۔

جیل کی دوسری اور تیسری ملاقات بھی کچھ انھی کیفیات سے مملو رہی۔ احساسِ بے بسی کی شدت میں تو کمی واقع نہ ہوئی البتہ یہ سب کچھ معمول کا حصہ لگنے لگا۔ اسی دوران ایک دن برسات کی حبس زدہ گرمی میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک صاحب ہمارے گھر تشریف لائے۔ وضع قطع سے کوئی سکہ بند عالم لگتے تھے۔ اس سخت گرمی کے دنوں میں بھی وہ جبہ و دستار سے مرصع تھے۔ ان کی سائیکل مختلف قسم کے سامانوں سے لدی تھی۔ ایک طرف ناشتہ دان بندھا ہے تو دوسری طرف چرمی بیگ، کہیں کپڑوں کا تھیلا لٹک رہا ہے تو پیچھے

کیریئر پر کتابوں کا کوئی پیکٹ۔ خضاب زدہ داڑھی پر بھاری فریم کے چشمے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں نے ان کی شخصیت میں ایک دبدبہ پیدا کر رکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جیل میں امام ہیں، شاعر بھی ہیں، راہی تخلص کرتے ہیں اور ابھی ابھی جمعہ کی نماز میں ابّا سے مل کر آئے ہیں۔ ہم لوگوں کو ایسا لگا جیسے خدا نے اچانک کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ ہم لوگ انھیں گھیر کر بیٹھ گئے۔ ابّا کی صحت اور ان کے معمولات کی ایک ایک تفصیل پوچھی۔ بولے، صحت تو اللہ کے فضل سے بہتر ہے، البتہ کثرتِ گریہ سے آنکھوں کی بینائی متاثر ہوگئی ہے۔ شاید موتیابین کا پانی اتر آیا ہے۔ انھوں نے روشن خطوں والا قرآن مجید کا ایک نسخہ طلب کیا ہے۔ اتنی دیر میں بھائی جان شربت کا گلاس لے آئے۔ اب تک وہ ہم لوگوں سے کسی قدر مانوس ہو چکے تھے۔ کہنے لگے، ارے بھئی عجب زمانہ آ گیا ہے، کیسے کیسے شریف الطبع لوگ قید خانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ میں نے اسی موقع کی مناسبت سے ایک نظم کہی ہے، انھوں نے چند اشعار سنائے۔ ہم لوگ شوق و حیرت کا مجسمہ بنے انھیں دیکھتے رہے۔ دل میں سوچا یہ تو اچھے خاصے شاعر لگتے ہیں، ان کا ترنم بھی کمال کا ہے۔ انھوں نے جیل کی زندگی کی کچھ دلچسپ باتیں شاید اس خیال سے بتائیں کہ جیل کے بارے میں ہم لوگوں کی اجنبیت اور وحشت میں کمی آ جائے۔ بولے: ارے بھئی میرے اوپر تو ابھی بھی انکوائری چل رہی ہے۔ پھر بولے آج کل تو قیدی زیادہ ہیں، باقاعدہ جمعہ کی نماز ہوتی ہے، البتہ عام دنوں میں کبھی کوئی جمعہ پڑھنے والا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ولیمہ میں شرکت کے لیے گاؤں جانا تھا، میں نے جمعرات کو ہی جمعہ کی نماز پڑھا ڈالی، کہاں انتظار کرتا۔ ان کی اس اجتہادی ظرافت کا سن کر ہم لوگ حیران رہ گئے۔ جمعرات کو جمعہ کی نماز؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ بولے: ارے بھئی جیل میں جمعہ کیا اور جمعہ کی نماز کیا، یہ تو بس ایک رسمی کارروائی ہے بلکہ واقف کار تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جمعہ کا قیام غیر اسلامی حکومتوں میں بالکل بے محل اور بے جوڑ ہے۔

اب جمعہ کو راہی صاحب کا یہ معمول بن گیا کہ وہ جیل سے لوٹتے ہوئے ہمارے گھر ضرور آتے۔ قدرت نے ان کے توسط سے جیل سے ایک روزن عین ہمارے گھر میں کھول دیا تھا۔ ابّا کو روشن خطوں والے قرآن کا نیا نسخہ پہنچ جانے سے ان کا انحصار اس حافظی حمائل شریف سے ختم ہوگیا تھا، جس نے شاید ان کے فہم قرآن پر بند باندھ رکھا تھا۔ اب فرصت کے لمحات نے انھیں تمام سابقہ فکری چوکھٹوں سے ماورا ایک نئے طرح کے ذوقِ تلاوت اور شوقِ فکر کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ان کے شب و روز خدا کے کلام اور خدا سے کلام جیسے مشاغل سے مملو رہتے۔ شاید ان کی اسی گریہ وزاری کا اثر تھا کہ ان کے غیاب میں بھی ہم لوگوں کو ایسا لگتا جیسے کسی نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے رکھا ہو، جیسے خدا کی رحمت ہر لمحہ ہم پر سایہ فگن ہو۔

ایک دن ڈاکیہ ڈھیروں خطوط اور اخبار و رسائل کے پیکٹوں کا ایک انبار لے آیا۔ یہ پچھلے تین چار ہفتوں کی ڈاک تھی۔ ان میں بعض تاجروں کے خطوط اور ان کتابوں کی فہرستیں بھی تھیں جو ٹرانسپورٹ سے بھیجی گئی تھیں اور وصولی کی منتظر تھیں۔ اس سے پہلے بھی ریلوے مال گودام سے کتابوں کے بنڈلوں کی اطلاع ملتی رہی تھی۔ خیال ہوا کیوں نہ مکتبہ کے پہلو میں ایک نئے مکتبہ کا تجربہ کیا جائے۔ رہائش گاہ کے باہری حصہ میں دیکھتے دیکھتے کتابوں کی ایک نئی دکان سج گئی۔ ہم لوگ باری باری سے ڈیوٹی دینے لگے۔ اسکول سے واپسی پر اب ایک نیا مشغلہ گاہکوں سے لین دین کا تھا۔ دکان کھلنے کی دیر تھی کہ فرشتے آنے لگے۔ عجیب بات یہ دیکھی کہ جو کتاب موجود ہوتی اسی کو طلب کرتے ہوئے لوگ آتے، خاص طور پر دوپہر کے بعد، جو ہمارے اسکول سے واپسی کا وقت ہوتا، گاہکوں کا تانتا لگ جاتا۔ ایسا لگتا کہ یہ خودنہیں آتے بلکہ اللہ میاں نے انھیں کام پر لگا رکھا ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس مختصر سی دکان نے نئے مکتبہ کی شکل لے لی۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا لگتا جیسے ایمرجنسی نے ہم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ اسی دوران اچانک ہماری دھوبن کپڑوں کی گٹھریاں لے کر نازل ہوگئی۔ ارے تو کہاں غائب ہوگئی تھی، والدہ نے ڈانٹ لگائی۔ خفت مٹاتے ہوئے بولی، ہم کیا کرتے، ہم نے تو سنا تھا کہ جو آپ لوگوں سے ملنے جاتا ہے اسے پولیس پکڑ لیتی ہے۔ دھلے دھلائے کپڑوں کی گٹھریاں دیکھ کر والدہ نے سکون کا سانس لیا۔ بولیں، یہ سب اللہ کا انتظام ہے۔ نئے مکتبہ کے تجربہ نے ہمارے اندر ایک نیا اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ اب پھر سے گھر میں تعلیم وتعلّم کی باتیں اور اسلام کی سربلندی کی گفتگو اسی ذوق وشوق سے جاری ہوگئیں۔ والدہ نے اپنے حسنِ انتظام سے انتہائی کم وسائل میں سفید پوشی کا بھرم کچھ اسی طرح قائم کر دیا تھا۔ صبح صبح ان کی تلاوت کی آواز ایک خاص قسم کی مترنم سمفنی میں گونجتی تو ایسا لگتا جیسے پہلے والی معمول کی زندگی واپس آگئی ہے۔ والد صاحب اس منظرنامہ سے غائب ضرور تھے لیکن اللّٰہنے ہمارے لیے امامِ جمعہ کے توسط سے جیل میں جو روزن کھول دیا تھا اس سے بڑی باریک بینی سے ہم انھیں دیکھ سکتے تھے۔

۱۱

بے مزہ آزادی

اب تک ہم لوگ ایمرجنسی کے شب و روز کے عادی ہو چکے تھے۔ اب جیل کی سلاخیں اور سنگینوں کے پہرے دلوں میں خوف پیدا نہیں کرتے، بلکہ اس فکر پر آمادہ کرتے کہ اس شب تاریک کا پردہ کیسے چاک کیا جائے۔ اسکول میں چند احباب کے ساتھ مل کر ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہ تھا کہ سوچ سمجھ کر انتہائی رازداری کے ساتھ کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ یومِ آزادی کے موقع پر اسکول میں پرچم کشائی کا ایک رسمی سا پروگرام ہوتا تھا۔ ہم لوگوں نے طے کیا کہ پندرہ اگست کو کچھ سویرے اسکول پہنچ جائیں تاکہ پرچم کشائی سے پہلے ہمیں باہمی گفتگو کے لیے خاطر خواہ وقت میسر آجائے۔ حسب پروگرام اسکول پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ NCC کے طلبا مشقی پریڈیں کر رہے ہیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب چند اساتذہ کے ساتھ اپنے دفتر سے متصل برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ ٹیبل پر ایک ٹرانسسٹر رکھا ہے اور لوگ بڑے اشتیاق سے لال قلعہ سے نشر ہونے والی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی تقریر سماعت فرما رہے ہیں۔ میں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اشارے سے سلام کیا اور وہیں پڑی ایک تپائی پر ادب سے بیٹھ گیا۔ مسز گاندھی فرما رہی تھیں کہ ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی ہم لوگ یہاں یعنی لال قلعہ پر پرچم کشائی کے لیے جمع ہوئے ہیں، لیکن اس دفعہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس پروگرام کو صرف وہی لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں جو یہاں موجود ہیں بلکہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ پورا ملک اس پروگرام میں شریک ہے۔ انھوں نے قومی پرچم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک ورودھی دَل کے نیتا نے ایک دفعہ کہا یہ جھنڈا کیا ہے، کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، یہ کپڑے کا ٹکڑا ضرور ہے لیکن کپڑے کا وہ ٹکڑا ہے جس کے لیے لاکھوں سوتنترا سینانیوں (مجاہدین آزادی) نے اپنی جانیں دیں، اپنی زندگی برباد کی۔ یہ ٹکڑا بھارت کی طاقت کا پرتیک ہے، اس لیے ہم کپڑے کے اس ٹکڑے کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اس کپڑے کے ٹکڑے کی شان ہمیں ہمیشہ اونچی رکھنی ہے، یہ جان سے زیادہ پیارا ہے ہم کو۔ انھوں نے مزید کہا کہ آزادی کوئی جادو نہیں کہ اس سے تُرنت غریبی دور ہو جائے۔ آزادی سے کیول (صرف) ایک دروازہ کھلا، صدیوں کی گھٹن دور ہوئی۔ انھوں نے آزادی کے مناقب بیان کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ سب من مانی

کرسکیں، بلکہ جواپنا کرتویہ (فرض) ہے وہ کرنے کا ہمیں موقع ملا ہے۔

ان کی تقریر ابھی جاری ہی تھی کہ میرے ذہن میں ایک کوندسی پیدا ہوئی۔ ارے محترمہ یہ کیا کہہ رہی ہیں، صدیوں کی گھٹن دور ہوئی، کیا مطلب؟ صدیوں سے اس ملک میں کیسی گھٹن تھی۔ انگریز تو صرف نوے سال لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرا کر چلے گئے، پھر صدیوں کی گھٹن سے ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ ابھی چند سال پہلے انھوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے موقع پر بھی ہزار سالہ مسلم حکمرانی کے انتقام کی بات کی تھی۔ اب یوم آزادی کو صدیوں کی گھٹن کے ازالہ سے تعبیر کررہی ہیں، کہیں وہ آزاد ہندوستان کو Spanish Reconquestia کے تناظر میں تو نہیں دیکھتیں؟ میرے ذہن میں مسلم اندلس کے اس ناول کے وہ مناظر پھر سے تازہ ہو گئے کہ کس طرح غرناطہ کے سقوط کے بعد ابتداً تو مسلمانوں کو اس بات کی ضمانت دی گئی کہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کی آزادی ہوگی، لیکن چند ہی سالوں میں صورت حال اتنی بدل گئی کہ انھیں ان کی ثقافت اور مذہب سے تہی دست کرنے کا ظالمانہ سرکاری حکم نامہ سامنے آگیا، اور اس طرح سوا سو سال کے اندر اندر اندلس سے مسلمانوں کا مکمل صفایا ہوگیا۔ تب اسپین کی شہزادی ایزابیلا اس کام پر مامور تھی، آج پنڈت نہرو کی بیٹی ہندوستان کے مسلم عہد زرّیں کو صدیوں کی گھٹن کا نام دے رہی ہے۔

اسکول میں پرچم کشائی کے دوران بار بار میرا ذہن اس ناول کی طرف منتقل ہوجاتا اور مجھے مسز گاندھی کے پیکر میں ایزابیلا کے تیور صاف دکھائی دیتے۔ میں نے سوچا یہ کیسی عجیب آزادی ہے کہ ابّا جیل میں ہیں بلکہ خاندان کے سبھی بڑے بزرگ محبوسِ زنداں ہیں اور ہم پر یہ تبلیغ کی جارہی ہے کہ اپنا جو کرتویہ (فرض) ہے بس وہ ہم کرتے رہیں۔ ان کی سمجھ میں آخر یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جس آزادی کا اتنا شور ہے وہ بعض لوگوں کے لیے اگر بھارت کی اکھنڈتا کی قیمت پر ملی ہے تو ہمارے لیے تو اس کا زخم کہیں گہرا ہے کہ اس سے ہماری ملّی وحدت تین حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی ہے۔ خون میں نہائی اس آزادی کا جشن وہ لوگ کیسے منا سکتے ہیں جن کے عزیز و اقارب آج کے دن بھی پابند سلاسل ہوں۔

گزشتہ تقریباتِ آزادی کے مقابلہ میں اس دفعہ اسکول میں بھیڑ کچھ زیادہ تھی۔ شاید یہ ایمرجنسی کا اثر تھا۔ تقریب کے خاتمہ پر بعض طلبا کرکٹ کے کھیل میں لگ گئے، بعض نے فٹ بال کا پروگرام بنایا، اب بھلا اس بھیڑ بھاڑ میں ہماری خفیہ میٹنگ کیا ہوتی۔ احتیاط کا تقاضہ تھا کہ اسے کسی مناسب موقع کے لیے موخر کردیا جائے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے ابھی راستہ ہی میں تھا کہ معلوم ہوا کہ صدر بنگلہ دیش شیخ مجیب الرحمٰن پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اسکول کے راستہ میں ایک چھوٹا سا چرچ تھا جس کے احاطے میں لوگوں کی بھیڑ لگی تھی اور لوگ ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے۔ پتہ چلا کہ فوجی بغاوت کے نتیجے میں شیخ مجیب سمیت ان کے پورے خاندان کو تہہ تیغ

کر دیا گیا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات تھی، محض تین چار سال پہلے شیخ مجیب لندن سے براہ دہلی ڈھاکہ گئے تھے جہاں انھوں نے آزاد ریاست بنگلہ دیش کی کمان سنبھالی تھی۔ وہ بنگلہ بندھو کہلاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک اس بہیمانہ طریقہ سے انھیں قتل کیوں کیا گیا اور وہ بھی ٹھیک اس دن جب ہندوستان کی آزادی کی سالگرہ تھی۔

ایک دن یہ خبر آئی کہ ڈی آئی آر کے قیدیوں میں سے بعض کو ہائی کورٹ سے ضمانت مل گئی ہے۔ اپیل تو ہم لوگوں نے بھی دائر کر رکھی تھی، لیکن صرف تاریخ پر تاریخ پڑتی جاتی تھی، یہاں تک کہ رمضان کی ابتدا ہوگئی۔ اب ہائی کورٹ کے اس فیصلے سے یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید نچلی عدالتیں اسے نظیر بنا کر جلد ہی کوئی فیصلہ کر سکیں گی۔ اس امید پر رمضان کا بیشتر حصہ نکل گیا۔ رمضان کا آخری روزہ تھا، صبح آٹھ نو بجے کا عمل ہوگا، کسی نے یہ خبر دی کہ کل رات چاند نکلنے کی تصدیق ہوگئی تھی، اس لیے آج بعض محلوں میں عید کی نمازیں ہو رہی ہیں، کوئی آخری روزہ رکھنے پر مصر تھا۔ میں خبر کی تصدیق کے لیے جامع مسجد کی طرف جا نکلا جو ہمارے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ امام صاحب اپنے حجرہ سے باہر ایک کرسی پر فروکش ہیں، ان کے سامنے ایک ضخیم کتاب کھلی ہے، بظاہر مطالعہ میں غرق۔ آج انھوں نے پان کھا رکھا ہے، جس سے شاید یہ بتانا مقصود ہو کہ مومنین کے لیے آج کا روزہ مناسب نہیں۔ مسجد کے باہر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ جب آج روزہ نہیں ہے تو پھر عید کی نماز کیوں نہیں پڑھی جا رہی ہے۔ امام صاحب ان کج بحثیوں سے بے نیاز آنے والوں پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالتے اور پھر مطالعہ میں غرق ہوجاتے۔ مجھے دیکھا تو ابّا کی بابت دریافت کیا، پھر بولے کہ انھیں کون سمجھائے کہ چاند کی شہادت کے بعد روزہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا البتہ نماز کل ہوگی۔ میرے لیے ابّا کے بغیر عید کی نماز کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ اب جو اس باہمی اختلاف نے عید کے جشن کو تحلیل کیا تو ایسا لگا جیسے میری ہی طرح آج ان سبھوں کی عید بھی کُمھلا گئی ہے۔

مقدمات کی نئی تاریخیں پڑتی رہیں۔ ابتداً تو ایسا لگتا تھا کہ عنقریب ابّا کی رہائی کا فیصلہ آجائے گا، لیکن جب اس عمل میں کئی مہینے گزر گئے تو ہم ان موہوم امیدوں کے عادی ہوگئے۔ کوئی پوچھتا تو بڑی بے دلی سے کہہ دیتے کہ معاملہ زیر سماعت ہے، اب دیکھیے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ پھر اچانک یہ خبر آئی کہ کورٹ نے مکتبہ اور اس سے متصل ہماری رہائش گاہ کے کھولنے کے احکامات جاری کر دیئے ہیں اور عنقریب بعض رسمی کارروائیوں کے بعد ابّا کی رہائی کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ خدا خدا کر کے مکتبہ کھلا، لیکن اب یہ وہ مکتبہ نہ تھا۔ پچھلے دنوں سیلاب نے جو تباہی مچائی تھی اس نے مکتبہ اور ہماری رہائش گاہ کے ساز و سامان کو پوری طرح

تباہ کر دیا تھا۔ بیرونی دیواریں منہدم ہو چکی تھیں۔ کوئی چیز اپنی جگہ سلامت نہ تھی، مگر پھر بھی حکومت کے کارندوں کا یہ اصرار تھا کہ ہم انھیں سب کچھ محفوظ حالت میں بازیاب ہونے کی رسید عنایت کر دیں۔ عمومی ظلم کے ماحول میں اس کے علاوہ ہم لوگ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ پولیس والوں نے اپنی کارروائی مکمل کی اور ہم لوگوں نے ابّا کی رہائی پر اپنی مساعی مرکوز کر دی۔

ایک دن اسکول سے گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابّا صحن میں ایک کرسی پر خاموش بیٹھے ہیں۔ انھوں نے اپنی ٹھوڑی دائیں ہاتھ سے سہار رکھی ہے اور نگاہیں آسمانوں میں مرکوز ہیں۔ اچانک انھیں اس طرح گھر میں بیٹھا دیکھ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا استقبال کیسے کروں۔ میں نے سلام کیا اور وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے خیریت پوچھی، ویسے ہی جیسے جیل میں سلاخوں کے پیچھے سے رسمی طور پر پوچھتے تھے اور پھر خاموش آسمانوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگے۔ وہ شاید بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کچھ کہنے سے قاصر تھے۔ کبھی ایسا لگتا کہ شاید حیرت سے اپنے غیاب میں ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگا رہے ہوں، کبھی ایسا لگتا کہ وہ اپنے بچوں کی باتیں سن کر حیرت زدہ ہوں کہ زندگی کے بے رحم تجربوں نے انھیں اچانک اتنا حساس اور سنجیدہ کیسے بنا دیا ہے۔ ایسا لگتا کہ ایک نغمۂ خامشی ان کے لبوں پر جاری ہو جس کے زیر و بم سے گاہے آنکھیں بھیگ جاتی ہوں۔ میں ابّا کو اس طرح گُم سُم دیکھ کر ان کے قریب آیا کہ انھیں چھو کر دیکھوں، جیل میں یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ مجھے جیل کی وہ ملاقاتیں یاد آئیں، میں نے سوچا جیل کی ان ملاقاتوں کو بھلا کون بھلا پائے گا، جیل تو اب ہماری زندگی کا ناگزیر حوالہ ہے۔ اہلِ زنداں کے بچوں کو تعذیب بھی تو وراثت میں ملتی ہے، انھیں وہ کچھ نظر آتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ آگہی کا یہ عذاب غیر شعوری طور پر ہماری گفتگو میں اتنا نمایاں ہو چکا تھا کہ ابّا اس صورت حال پر حیرت زدہ تھے۔

ابّا زنداں سے نکل آئے لیکن زنداں ان کے اندر سے نہ نکل سکا۔ جیل نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ چند دن کی خاموشی کے بعد بالآخر ان کے بیان کی گرہ کھل گئی، انھیں پتہ چل گیا کہ رہائی کے بعد بھی دراصل وہ جیل میں ہیں، مابعد تقسیم کے زنداں میں محبوس۔ اب ان کی شخصیت امت کی صدا بہ صحرا آواز کا تسلسل معلوم ہوتی۔ ان کی گفتگو میں قتلِ عثمانؓ سے لے کر بغداد کی تاراجی اور سقوطِ استنبول سے لے کر سقوطِ دہلی اور پھر سقوطِ ڈھاکہ تک امت کے انتشار کی کہانی کچھ اس طرح سامنے آتی کہ اسے سننے میں داستان کا سا لطف آتا۔ جب وہ بولتے تو ایسا لگتا جیسے ان کے لفظ لفظ سے تاریخ رِس رہی ہو۔ ایک ایسی تاریخ جس کے لفظ لفظ بصیرت سے مملو ہوں۔

ابّا کی رہائی کی خبر عام ہوئی تو ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ پسِ دیوارِ زنداں

ماجرا کیا ہے۔ ایک صاحب جو تحریکی حلقہ میں خاصے معروف تھے، لیکن کسی سبب جیل جانے سے بچ گئے تھے، ایک دن تشریف لائے، چھوٹتے ہی کہنے لگے: اسوۂ یوسفی پر عمل پیرا ہونے کے لیے مبارکباد قبول کیجیے اور ہاں یہ جیل میں جھنڈے کے قضیہ کی حقیقت کیا ہے، سنا ہے کہ بڑا معرکہ برپا رہا۔

'مولوی صاحب! ایک بار جیل کی سیر کر آیئے، یوں باہر سے کب تک مشاہدہ کرتے رہیں گے'، ابّا نے ان سے لطف لیتے ہوئے کہا۔ پھر فرمایا: میں تو کہتا ہوں کہ انسان کو کم از کم زندگی میں ایک بار جیل ضرور ہو آنا چاہیے تاکہ اس کے دل سے جیل کا خوف جاتا رہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جیل میں مختلف الخیال قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے، کوئی کمیونسٹ پارٹی کا رہنما تھا تو کوئی خود کو سوشلسٹ کہتا تھا، کوئی آر ایس ایس کا جھنڈا بردار تھا تو کوئی جن سنگھ سے وابستہ۔ ابتداً تو سب اپنی اپنی دُنیا میں رہے، لیکن جب جیل کے شب و روز سے ایک طرح کی مانوسیت ہوگئی تو تفنن طبع کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے جانے لگے۔ ایک بار رات کے کھانے کے بعد یہ طے پایا کہ سب لوگ قومی ترانہ ذوق وشوق سے گائیں۔ میرے معمولات سے وہ لوگ واقف تھے، اب جو اجتماعی پروگرام میں شرکت کا معاملہ سامنے آیا تو ایک ٹسل کی کیفیت پیدا ہوگئی، کچھ لوگ شاید چاہتے بھی یہی تھے اور اس تجویز کے پیچھے بعض متعصبین کی شرارت بھی تھی۔ اب صورت حال یہ ہوگئی کہ پورا وارڈ ایک طرف اور میں اکیلا۔ ان کا کہنا تھا کہ قومی ترانہ کے دوران کھڑے نہ ہو کر میں اس کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا ہوں۔ معاملہ جب آگے بڑھا اور ایک جدال کی کیفیت پیدا ہوگئی تو ہمارے بعض مسلم احباب نے بھی یہ مشورہ دیا کہ معاملہ رفع دفع کیجیے، دو منٹ کی بات ہے، چند ثانیے کے لیے پروگرام میں شرکت سے آخر آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔ میں نے کہا کہ بات اصول کی ہے، میں اپنی آزادی کو یہاں جیل میں بھی ان لوگوں کے ہاتھوں رہن رکھ دوں تو یہ مناسب نہیں، میں اپنے طریقہ سے رہوں گا خواہ یہ بات کسی کو کتنی ہی ناگوار ہو۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ میں کسی طرح ٹس سے مس نہیں ہوتا تو سوشلسٹ پارٹی کے ایک رہنما نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی کہ مولوی صاحب اپنی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اگر وہ نہیں شریک ہونا چاہتے تو انھیں چھوڑ دیئے، کیوں خواہ مخواہ ٹکراؤ کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ کسی نے کہا، نہیں یہ کیا بات ہوئی، انھیں تو شامل ہونا ہی پڑے گا کہ یہ معاملہ قومی ترانہ کا ہے۔ یہ بات سن کر ایک طویل القامت شخص کو غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ میرے خیال میں آپ لوگوں کا یہ رویہ درست نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ ایک شریف، سجّن آدمی کو پریشان کر رہے ہیں۔ اگر وہ قومی ترانہ میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو یہ ان کا حق ہے، ہم انھیں کیسے مجبور کر سکتے ہیں، کیا آپ کو پتہ نہیں کہ جےَ پرکاش جی نے قومی علامتوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟ نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے دیش کے جھنڈے کی اگر کوئی بے حرمتی

کرے تو اسے گولی ماردینی چاہیے لیکن تب جےٓ پرکاش جی نے کہا تھا کہ جھنڈا تو کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، ہم ایک دوسرا جھنڈا بنالیں گے، لیکن دیش کے نوجوان کی جان قیمتی ہے اسے ہم نے کھودیا تو ہمیشہ کے لیے کھودیں گے۔کیا آپ کو پتہ نہیں کہ جب نہرو نے پٹنہ میں نوجوانوں پر ہونے والی پولیس فائرنگ کو دیش بھگتی میں چھپانے کی کوشش کی تھی تب جےٓ پرکاش کی باتوں نے نہرو کے اصل ارادوں کو بےنقاب کردیا تھا۔ہم لوگ تو جےٓ پرکاش کے آدرش پر چلنے والے لوگ ہیں،ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم جیل میں بند اپنے ہی ساتھی کو پریشان کریں؟ اس کی یہ گفتگو بڑی مؤثر رہی، میری مخالفت کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور بھی لوگ حمایت میں سامنے آئے۔ بعضوں نے کہا کہ اس پروگرام کو ہٹائیے جس سے آپس میں اختلاف پیدا ہوتا ہو،قومی علامتیں لوگوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے ہوتی ہیں،توڑنے کے لیے نہیں۔ ایک نوجوان جو غالباً کوئی اسٹوڈنٹ لیڈر تھا، کہنے لگا کہ جے پرکاش جی صحیح کہتے ہیں،قومی علامتوں کی سیاست نے دیش کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔بولا: ایک بار جے پی نے کہا تھا کہ حب الوطنی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا اظہار ہماری قومی خوبیوں، زندگی کے اقدار اورعوامی زندگی کی اعلیٰ اخلاقیات پر منحصر ہے۔ جب نہرو نے پٹنہ میں پولیس فائرنگ کے بعد یہ کہا تھا کہ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ دس ہزار یا دس لاکھ لوگ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے، وہ کسی بھی قیمت پر قومی جھنڈے کی بےحرمتی کی اجازت نہیں دیں گے، تب جے پی نے کہا تھا کہ نہرو کا یہ لب ولہجہ ایک آمرانہ لب ولہجہ ہے، جمہوریت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں جو کسی شخص کو قومی جھنڈے کی بےحرمتی یا اس کے جلانے پر گولی مارنے کی سزا دیتا ہو۔انھوں نے کہا تھا کہ اصل بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو قومی جھنڈے کی بےحرمتی پر کون مجبور کررہا ہے، یہ حالات آخر پیدا ہی کیوں ہورہے ہیں، اگر ہمارے نوجوانوں نے اس سسٹم میں انصاف کی امید کھودی تو ایک عمومی مایوسی اور انارکی جنم لےگی۔ ملک و قوم کے معماروں کو گہرائی میں جاکر صورت حال کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ایک صاحب کہنے لگے کہ آپ کون سی آزادی کا بھجن گانا چاہتے ہیں،کیا آپ کو پتہ نہیں کہ جےٓ پرکاش جی سے جب ایک امریکی صحافی نے پوچھا تھا کہ آپ کو یہ آزادی کیسی لگتی ہے؟ تو انھوں نے برملا کہا تھا کہ بالکل بےمزہ، tasteless صرف چندلوگوں کے علاوہ جنھوں نے اس آزادی کو ہائی جیک کررکھا ہے اس آزادی کی کوئی معنویت نہیں۔ جے پی کا کہنا ہے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ ڈرایا جارہا ہے کہ حیدرآباد خطرے میں ہے، کشمیر خطرے میں ہے، انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ دراصل ہماری آزادی خطرے میں ہے۔ اگر ہم آزادی کھودیں تو کشمیر اور حیدرآباد کا کیا کریں گے؟

ایک صاحب جو پرانے کمیونسٹ تھے، کہنے لگے ارے بھئی ہماری لڑائی اندرا جی سے ہے، نہرو مہان آدمی تھے، ان کو اندرا کے ساتھ مت ملایئے۔

'اتنے بھی مہان نہیں جتنا سرکاری پروپیگنڈے نے انھیں بنا رکھا ہے'، اس نوجوان نے پھر مداخلت کی، بولا: نہرو کو جےَ پرکاش جی کے سامنے رکھ کر دیکھیے تو وہ بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ہی تو ہمارے سروں پر اندرا گاندھی کو مسلط کیا ہے، یہ بات آپ کیوں بھولے جاتے ہیں، ہم تو جے پی کے آدرشوں پر چلنے والے لوگ ہیں جنھوں نے کبھی کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کی، اپنے لیے کچھ نہیں چاہا، ظلم جہاں بھی نظر آیا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذرا یاد کیجیے ناگالینڈ میں ہندوستانی فوج کی زیادتیوں کو کس نے قابو میں کیا، یہ ان ہی کی شخصیت تھی کہ ان کی مداخلت سے دس سال پرانی جنگ پُرامن معاہدے میں بدلی، انھوں نے شیخ عبداللّٰہ کو جیل سے نکالا جو گیارہ سال سے بلا وجہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے، انھوں نے مدھیہ پردیش میں ڈکیتوں کے گینگ کو اپنی اخلاقی عظمت سے قابو میں کیا، انھیں اصلاح کی راہ پر ڈالا اور جب ایک بار کسی نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا آپ ان ڈکیتوں کو پارلیمنٹ کا الیکشن لڑنے کا مشورہ دیں گے تو انھوں نے ازراہِ مذاق یہ کہا تھا کہ پارلیمنٹ میں انھیں اچھی صحبت نہیں مل پائے گی، اس لیے کہ یہ اصلاح شدہ ڈکیت ہوں گے۔ یہ سن کر قہقہوں کی آواز بلند ہوئی، کسی نے نعرہ لگایا لوک نائک زندہ باد، انقلاب زندہ باد۔ گویا قومی ترانے کے پروگرام کی مجلس جےَ پرکاش نارائن کے مناقب میں کچھ اس طرح بدلی کہ آئندہ کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ پھر اس قسم کے پروگرام کی سوچے، بلکہ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اب لوگ ہماری باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ جے پی کے تذکرے نے انھیں رسومِ آزادی سے کہیں آگے بڑھ کر فی نفسہٖ حقیقی آزادی کی جستجو میں لگا دیا۔

ایک دن یہی کوئی مغرب کے بعد کا عمل ہوگا، شہر کے ایک مشہور تاجر تشریف لائے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، پھر جب انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ مکتبہ میں ان کے علاوہ کوئی نہیں تو بڑے ہی رازدارانہ انداز میں والد صاحب سے کہنے لگے کہ حضرت کا کتابچہ شائع ہوگیا ہے، چند کاپیاں بھیجی ہیں۔ دوسرے دن والد صاحب کی ایما پر میں ان کے شوروم میں جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، اندرونی حصہ سے کتابچے کی ایک کاپی لے کر آئے اور بہت احتیاط سے یہ کہہ کر میرے حوالے کی کہ خاص امانت ہے، راستہ میں کسی کو اس کی ہوا نہ لگے۔ والد صاحب نے کتابچہ پر ایک نگاہ ڈالی، اُلٹ پلٹ کر دیکھا پھر میرے تجسس کے پیشِ نظر اسے میرے حوالے کر دیا۔ ابھی میں نے اس کتابچہ کے چند صفحات ہی پڑھے ہوں گے کہ ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے مکتبہ میں داخل ہوئے۔ میں ان کے لیے

ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آیا اور پھر کتابچہ کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ میرے اس غیر معمولی انہاک کو دیکھتے ہوئے انھوں نے پوچھا، میاں صاحب زادے کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بجائے اس کے کہ انھیں کوئی جواب دیتا کتاب کا سرورق ان کی نگاہوں کے سامنے کر دیا۔ بولے، اچھا تو یہ پڑھ رہے ہیں آپ 'اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی' کس نے لکھی ہے، پھر خود ہی فرمایا، اچھا منت اللہ رحمانی صاحب کا کتابچہ ہے۔ پھر والد صاحب کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے، ارے بھئی یہ مولانا لوگ، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرف ہیں۔ یہ اندرا گاندھی کے مخالفین میں ہیں یا حمایتیوں میں۔ اب دیکھیے نا ایک طرف تو خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت میں کتابچہ تحریر کیا ہے اور دوسری طرف ان کے صاحب زادے کانگریس پارٹی کے ایم ایل سی ہیں۔

مگر بیٹے کا حساب آپ باپ سے کیوں لے رہے ہیں؟ والد صاحب نے ان کی سرزنش کی۔

بولے: ارے بھئی بیٹے کی الگ سے کوئی حیثیت نہیں، اکتیس سال کے نوجوان کو ایم ایل سی کی نشست اسی لیے تو ملی ہے کہ وہ خانقاہِ رحمانیہ کے چشم و چراغ ہیں، منت اللہ رحمانی کے بڑے صاحب زادے ہیں، مگر تف ہے اس عقیدت مندی پر کہ مریدوں کے حلقے میں اس کتابچہ کی اشاعت کو جہادِ اکبر باور کرایا جا رہا ہے۔

چلیے جس کو جتنی توفیق ملے، انھوں نے کچھ تو اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی، والد صاحب نے معاملہ کو فرو کرنے کی کوشش کی۔

بولے: نہیں بھئی میں نہیں مانتا، میرے خیال میں تو ان حضرات کی پھسپھسی مدافعت سے ہی دین کا یہ حال ہوا ہے۔

ایک صاحب جو خاصی دیر سے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے، ان سے رہا نہ گیا، بولے: ارے بھئی بڑا مقام ہے منت اللہ رحمانی صاحب کا، ہمارے ہاں پورنیہ کے علاقہ میں تو ان کا ایسا سکہ چلتا ہے کہ ایک بار جب وہ وہاں تشریف لے گئے تھے تو حضرت سے پانی پر دم کرانے والوں کا تانتا بندھ گیا، کچھ دیر تو آپ برتنوں اور بوتلوں پر پھونکتے رہے پھر خلقت کا بڑھتا اژدہام دیکھ کر ایک گلاس پر پھونک ماری اور فرمایا کہ اس گلاس کو ٹیوب ویل میں اُلٹ دیا جائے۔ اب شام تک لوگ اس نل سے حضرت کا برکت شدہ پانی بھر بھر کر لے جاتے رہے۔ اتنے بڑے اہل دل کے بارے میں بھی اگر آپ شبہات وارد کریں گے تو عام مسلمان رشد و ہدایت کے لیے پھر کس کی طرف دیکھیں گے۔

یہ سن کر بزرگ کو غصہ آ گیا، انھوں نے جلال میں اپنی لاٹھی زمین پر پٹخی، بولے: ارے بھئی بزرگی پانی پھونکنے اور مرید بنانے کا نام نہیں، اصل بزرگی تو یہ ہے کہ آپ ظالم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا یارا

رکھتے ہوں، آپ کے اندر بلاخوف لومۃ لائم کلمۂ حق کہنے کی جرأت ہو، اب دیکھیے نا ملک بھر میں مسلمانوں کی جبراً نس بندی ہو رہی ہے، انھیں ان کے گھروں سے نکالا جا رہا ہے، پولیس جب چاہتی ہے مسلمانوں پر بندوق کے دہانے کھول دیتی ہے، لیکن سیاسی مسلمان ہوں یا کانگریسی علما، کہیں سے مخالفت میں کوئی آواز نہیں اٹھتی۔ دو بڑی خانقاہیں تو اسی بہار میں ہیں، مجیبیہ پٹنہ اور رحمانیہ مونگیر، یہاں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی بلکہ مسلمانوں کے بڑے علما خواہ وہ دیوبند یا ندوہ سے وابستہ ہوں یا جمعیۃ علما جیسی تنظیموں سے، کسی کی مجال نہیں کہ اندرا گاندھی کے اس صریح ظلم کے خلاف ایک لفظ کہہ سکے۔ میرے خیال میں اصل اصحاب عزیمت تو یہ غریب مسلمان ہیں جو خاندانی منصوبہ بندی کے اس پروگرام کی مخالفت میں سڑکوں پر اترے اور دینی فریضہ کے طور پر اپنی اگلی نسلوں کی حفاظت کے لیے پولیس کی گولیاں کھانا قبول کیا، یہاں تک کہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، برا مت مانیے گا، یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی لاٹھی ایک بار پھر زمین پر پٹخی، بولے: یہ جو آپ بڑے بڑے علما نما لوگ دیکھتے ہیں تو دراصل ان میں سے بیشتر لوگ کانگریس کا ہی کھیل کھیل رہے ہیں، یہ ہمارے نہیں، ان کے آدمی ہیں لیکن اس خیال سے کہ مسلمانوں میں ان کی ہوا بنی رہے وہ گاہے بہ گاہے کوئی ایسا بیان یا ایسی تحریر شائع کر دیتے ہیں تاکہ عامۃ الناس ان کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

پڑھو بیٹا پڑھو، تم اپنا کام جاری رکھو، ابھی تو تمھیں علم و معرفت کی بڑی منزلیں سر کرنی ہیں، لیکن ایک بات یاد رکھنا، مطالعہ کبھی عقیدت کی آنکھ سے مت کرنا، اندھے آدمی کو دن کی روشنی سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، یہ کہتے ہوئے بزرگ نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور چل دیئے۔

میں سوچتا رہا، بارالٰہا! یہ کیا ماجرا ہے، جس کتابچہ کو اتنی راز داری سے حاصل کیا گیا ہو، وہ بھی معتبر نہیں اور جس شخصیت کا پھونکا ہوا گلاس پورے ٹیوب ویل کو متبرک کر دیتا ہو وہ بھی شبہات سے ماورا نہیں، گویا پانی گہرا ہے اور چیزیں جیسی کہ نظر آتی ہیں شاید فی الواقع ویسی ہیں نہیں۔

۱۲

کہ سالک بے خبر

ایمرجنسی کی مدت جوں جوں طویل ہوتی جاتی تھی مسلمانوں کے اندر بے بسی اور بیچارگی کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے جبراً نس بندی کی خبریں آرہی تھیں۔ مسلمان اس مہم کا خاص نشانہ تھے۔ حکومت یہ سمجھتی تھی کہ مسلمانوں نے ضبط تولید کی مخالفت کو مذہبی مسئلہ بنا رکھا ہے۔ یہ قلعہ اگر فتح ہو جائے تو دوسری اقوام کی مخالفت خود بخود دم توڑ دے گی۔ لیکن یہ تو مسئلہ کا ظاہری پہلو تھا۔ دراصل جو لوگ اس مہم کی کمان کر رہے تھے ان کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ تھی کہ مسلمان اس ملک میں پوپولیشن بم کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی غربت انھیں افزائش نسل کے سلسلے میں کوئی منصوبہ بندی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ حکومت جبراً انھیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتی تھی۔ غریبی ہٹاؤ کا نعرہ، عملی طور پر، غربت کے خلاف جنگ کے بجائے غریبوں کے خلاف جنگ میں بدل گیا تھا۔ مختلف شہروں سے پولیس کے مظالم کی خبریں مسلسل وحشت میں اضافہ کا سبب بن رہی تھیں۔ اخبارات پر سنسر ہونے کی وجہ سے اصل صورت حال کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ ادھر اسکول میں ایمرجنسی کے خلاف مزاحمت کی جو کمیٹی ہم چند طلبا نے تشکیل دی تھی وہ چند خفیہ میٹنگوں کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی تھی۔ جمعرات کو عموماً اسکول آدھے دن کا ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو فیس کی وصولی کے بعد فوراً چھٹی ہو جاتی تھی۔ ہماری مزاحمت کمیٹی کے اراکین کلاس ٹیچر کی رہنمائی میں فیس وصولی کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ طے پایا کہ جمعرات کے دن ہم لوگ کچھ دیر اسکول میں رک کر وزیر اعظم ہند کے نام ایک محضر نامہ تیار کریں جس میں انھیں مسلمانوں پر ہو رہی زیادتیوں پر متنبہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں سنگین اقدامات کی دھمکی دی جائے۔ لیجیے محضر نامہ پر کام شروع ہوا، ہم لوگ کھلے آسمان کے نیچے تالاب کے کنارے درخت کے سایے میں بیٹھ گئے۔ کلاس روم میں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کون کب اچانک آدھمکے۔ ان دنوں کسی کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ حکومت کی طرف سے مخبری پر مامور ہے یا نہیں، سو ایک کھلی جگہ کا انتخاب ان ہی اندیشوں کے پیش نظر کیا گیا۔ اب ایک صاحب کو چوکنا رہنے کی ذمہ داری دی گئی اور ہم تین لوگ محضر نامہ کی تیاری میں لگ گئے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کی محنت

شاقہ کے بعد ایک خوشخط تحریر تیار ہوگئی۔ظفر جو اس پورے مرحلہ میں اب تک خاموش رہا تھا،محضر نامہ کی تکمیل پر بولا، ارے بھئی خط تو بہت عمدہ لکھا ہے البتہ اس میں ایک اور شعر کا اضافہ کردو تو بہت خوب رہے گا۔ وہ کیا؟ میں نے پوچھا۔ بولا: لکھ دو! گورے رنگ پر نہ اتنا گمان کر، گورا رنگ تو دو دن میں ڈھل جائے گا۔ یہ دراصل مسز گاندھی کے نسوانی حسن کی طرف راست اشارہ تھا۔ مجھے اور سجاد کو ظفر کی اس معصومانہ مداخلت پر خوب ہنسی آئی اور بات قہقہوں میں اڑ گئی۔ اگلے دن بڑی احتیاط کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے بڑے ڈاکخانہ کے مرکزی باکس میں خط کو سپرد ڈاک کردیا گیا۔ اس خط کا آگے کیا بنا یہ تو نہیں معلوم، البتہ خط کی روانگی کے بعد ہمیں ایسا لگا جیسے ہم نے بھی اپنے حصہ کی کوئی شمع روشن کردی ہو۔

ان ہی دنوں مولانا منت اللہ رحمانی نے دہلی کی جامعہ رحیمیہ مہندیان میں مسلم قائدین کی کوئی غیر رسمی میٹنگ منعقد کی تھی جس میں نس بندی کو خلاف اسلام بتایا گیا تھا۔ اس موقع پر بعض علما نے دبی زبان سے حکومت پر تنقید بھی کی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہاں بھی خوف کا وہی ماحول تھا جو ہماری مزاحمت کمیٹی کو محضر نامہ کی تیاری کے وقت درپیش تھا، یعنی ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب خفیہ پولیس والے اچانک حرکت میں آجائیں۔ بقول مولانا مجاہدالاسلام قاسمی جو خود بھی مہندیان کی اس میٹنگ میں شریک تھے، 'اس وقت ایسی فضا بن گئی تھی کہ ان تمام مسلم اکابرین کو سیدھے جیل جانا پڑسکتا تھا'۔ خط سپرد ڈاک کرنے کے بعد اپنی نوعمری اور معصومیت کے سبب ہم لوگ بھی کچھ اسی احساس سے دوچار تھے کہ گرفتاری کا خطرہ بس ہمارے قریب سے ہوکر گزرا ہے۔

ان دنوں ریڈیو پر اکثر مسز گاندھی کا یہ قولِ زرّیں نشر ہوتا رہتا تھا کہ 'نس بندی جبراً نہیں مگر لازمی ہے'۔ ابّا کہتے کہ ایک بار تقسیم کے نام پر سینتالیس میں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا، ان کی بنیادوں پر تیشہ چلایا گیا، اب دوبارہ ایمرجنسی میں انھیں ایک دوسری نسل کشی کا سامنا ہے۔ اخبارات سے کچھ پتہ نہ چلتا کہ ملک میں واقعی ہو کیا رہا ہے۔ اکثر اخبارات کے کالم سینسر کی کرم فرمائیوں کے سبب یا تو خالی ہوتے یا ان پر بھدے انداز سے سیاہی پوت دی گئی ہوتی۔ ملک بھر میں علمائے حق کی زبانوں پر تالے پڑے تھے۔

ابّا جن دنوں جیل میں تھے اسی دوران ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر شائع ہونے والا مولانا علی میاں کا خطبۂ استقبالیہ ایک کتابچہ کی شکل میں ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ میں نے بڑے التزام کے ساتھ اس کتابچہ کو اوّل سے آخر تک دیکھ ڈالا۔ مولانا سے ایک خاص عقیدت تھی۔ ان کی دربھنگہ آمد کے موقع پر بڑے ابّا کی معیت میں ان سے مل چکا تھا۔ میں نے بڑی امیدوں کے ساتھ کتابچہ کو پڑھنا شروع کیا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ پورا خطبہ ایمرجنسی کے ذکر سے یکسر خالی تھا۔ اس کو

پڑھ کر کہیں سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ یہ خطبہ ہمارے ملک میں ایک ایسے نازک وقت میں دیا جا رہا ہے جب مسلمانوں پر ہر طرف ظلم کا بازار گرم ہے۔ خطبے میں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی شکستہ حالی کا تفصیلی تذکرہ تھا، تحریکِ خلافت کا حوالہ تھا، لیکن منقسم ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا ہو رہا ہے اس کے ذکر سے، ایسا لگتا تھا، دانستاً پہلوتہی کی گئی تھی۔

ندوہ کی تقریب میں شرکت کے لیے بہت سے بیرونی مہمانوں کے ساتھ شیخ ازہر بھی تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ایمرجنسی کا تذکرہ کیا، مسلمانوں کی ایک تنظیم پر حکومتی پابندی کو نامناسب بتایا اور مسلمانوں پر ہونے والی ظلم و زیادتی کے لیے حکومت پر سخت تنقید کی۔ کہتے ہیں کہ علی میاں کی عین موجودگی میں مترجم نے شیخ کی تقریر کے ایمرجنسی والے بیان کو حذف کر دیا۔ البتہ جب سامعین میں بیٹھے کسی شخص نے اس بات پر احتجاج کیا تو بعض باتیں مترجم نے اجمالی طور پر شامل کر لیں۔ دیوبند کے قاری طیب صاحب صرف ادارے کے مہتمم ہی نہیں بلکہ پرسنل لاء بورڈ کے صدر نشیں بھی تھے، جس نے بظاہر ملک میں شریعت کا علم بلند کر رکھا تھا۔ ایک دن آل انڈیا ریڈیو سے ان کے بیان کی گونج بھی سنائی دی جس سے صاف لگتا تھا کہ ایمرجنسی کی ایک ہی یلغار نے ہمارے تمام فکری، علمی اور روحانی قلعے زمیں بوس کر دیئے ہوں۔ آنے والا ہر دن مسلمانوں پر مزید سخت ہوتا جاتا تھا۔ اسی دوران ترکمان گیٹ کا سانحہ پیش آیا اور پھر خبروں کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری رہا گویا ہر شب شبِ عاشورا اور ہر روز ایک نئی قیامت۔

ایک دن یہی کوئی صبح سات آٹھ بجے کا وقت ہوگا مکتبہ کے سامنے ایک رکشہ آ کر رکا۔ ایک صاحب جو میانہ قد، گورے چٹے، شیروانی پر اوورکوٹ اور ٹوپی، چشمہ میں ملبوس تھے، ہاتھوں میں ایک چھڑی لیے ہوئے رکشہ سے اترے۔ ارے یہ تو شبیر چچا ہیں، مفلر اور ٹوپی سے چہرہ کچھ اس طرح ڈھکا تھا کہ میں فی الفور پہچان نہ پایا، ابّا کے اچھے دوستوں میں تھے، پرانی دلّی کے علاقے میں جمال پرنٹنگ پریس کے منیجر تھے، راست دہلی سے تشریف لائے تھے اور اپنے گاؤں ململ جانے سے پہلے حسبِ معمول ابّا سے ملاقات کے لیے رک گئے تھے۔ شبیر چچا کی آمد ہمارے لیے ایک جشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ آناً فاناً مکتبہ نے ایک ڈرائنگ روم کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہم لوگ چائے ناشتہ کے اہتمام میں لگے اور بزرگوں نے اپنی محفل جمائی۔ خوب خوب تبادلۂ خیال ہوا۔ کبھی محفل پر فکرمندی چھا جاتی اور کبھی اچانک شبیر چچا کے ظریفانہ جملے اور قہقہے بلند ہوتے۔ کہنے لگے اب سنیے سالک صاحب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ پولیس والوں نے ان کے دفتر کی تلاشی لی، کاغذات اور رجسٹر اپنی تحویل میں لیے، پھر ایک سپاہی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ سامنے پڑے دیوانِ حافظ کے نسخہ کو اُلٹ پلٹ کر کہنے لگا، ذرا پڑھیے اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ شعر و شاعری کی کتاب ہے،

اس کا آپ کیا کریں گے؟ صاحب خانہ نے سمجھانے کی کوشش کی، بولا: ارے پڑھیے تو لکھا کیا ہے:

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا۔

کہنے لگا: میں نہ کہتا تھا سالک صاحب کے بارے میں اس کتاب میں کوئی اہم انفارمیشن ہے۔ یہ کہہ کر شبیر چچا نے قہقہہ بلند کیا اور محفل زعفران زار ہوگئی۔ چائے کے دوران کچھ اور عزیز و اقارب بھی جمع ہوگئے۔ گفتگو دہلی کے حالات پر چل نکلی۔ ایک صاحب نے پوچھا، کیا اندازہ ہے اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، ظلم و ستم کی یہ آندھی کب تک چلتی رہے گی؟ بولے: جس کروٹ بھی بیٹھے، بیٹھنا تو طے ہے، ولی عہد کو آخر قدرت کب تک چھوٹ دے گی، میرے خیال میں ان کا حشر اچھا نہیں ہوگا، بڑا ظلم کیا ہے ان ماں بیٹے نے۔ نادر شاہ کے حملوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ بلکہ ظلم کے پرانے واقعات کو پڑھ کر کبھی شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی انسان اپنے ہی جیسے انسانوں پر اتنا ظلم ڈھا سکتا ہے، لیکن دہلی کے واقعات تو ان گنہگار آنکھوں نے خود دیکھے ہیں، کیا بتائیں بیان سے باہر ہے، یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم اور آواز گلوگیر ہوگئی۔ بولے، یہ سمجھیے کہ ایک اور تقسیم کا عذاب جھیلا ہے دلّی والوں نے، مسلمانوں کی دلّی ایک بار ۴۷ء میں اجڑی، دوسری بار ۷۶ء میں پرانی دلّی سے مسلمانوں کے جبری انخلا کی منصوبہ بند کوشش کی گئی۔ سات لاکھ لوگ جو صدیوں سے دلّی کی ان گلیوں میں رہتے آئے تھے، انھیں غیر قانونی طور پر ان کے گھروں سے بے دخل کیا گیا، ان کی املاک کو تباہ کیا گیا، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ اچانک فقرا و مساکین میں تبدیل کر دیئے گئے، بس یہ سمجھیے کہ مسلمانوں کے لیے دلّی کچھ اس انداز سے اجڑی کہ آج وقائع نگار اس کی تفصیلات لکھنے سے گریزاں ہیں۔

'کہاں بھیجے گئے یہ لوگ؟ سنا کہ بڑا خون خرابہ ہوا'۔

کہاں جائیں گے؟ آزاد ہندوستان میں آزادی کا عذاب جھیل رہے ہیں، جمنا پار کے بعض غیر آباد علاقے جہاں خاک اڑتی ہے، شہری زندگی کی کوئی سہولت نہیں وہاں انھیں جبراً منتقل کیا گیا ہے۔ کوئی ترلوک پوری بھیجا گیا ہے تو کسی کو سیلم پور کی پرچی پکڑائی گئی تو کسی کو ویلکم میں جگہ دی گئی۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے لوگ اس نقل مکانی میں اپنا کاروبار کھو بیٹھے، انھیں چھوٹے چھوٹے پلاٹ بھی دیئے گئے تو نس بندی شرط ٹھہرائی گئی۔

'انھوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ سب لوگوں کو ایک ہی جگہ منتقل کیا جائے، کسی ایک ہی کالونی میں جگہ مل جائے'۔

بولے: ارے بھئی سارا جھگڑا تو اسی بات کا ہے کہ انھیں ہمارے ایک ساتھ رہنے سے چڑ ہے،

مسلمانوں نے بڑی کوشش کی، ان کا ایک وفد ڈی ڈی اے کے وائس چیئرمین جگموہن سے بھی ملا، پتہ ہے اس کمبخت نے کیا کہا۔

کیا؟ ایک صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا اور محفل ہمہ تن گوش ہوگئی۔

بولے: بدبخت کہنے لگا کہ کیا تم ہمیں پاگل سمجھتے ہو کہ ہم ایک پاکستان کو تباہ کرکے دوسری جگہ بھی پھر پاکستان آباد کریں گے؟

آں، یہ کون صاحب ہیں؟ ایک بزرگ نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے پوچھا۔ بڑا زہر ہے اس کی باتوں میں۔

بولے: یہ تو خیر ڈی ڈی اے کے نائب صدر ہیں، البتہ اس پوری کارروائی کے پیچھے اصل ہاتھ تو سنجے گاندھی کا ہے جس کا ذہن مسلمانوں کے سلسلے میں انتہائی پراگندہ ہے، وہ پرانی دلّی کی مسلم آبادیوں کو پاکستانی حامیوں کا گڑھ سمجھتا ہے، ترکمان گیٹ کی اس پوری کارروائی کی، سمجھیے اس نے خود ہی کمان کی۔ ایک صاحبہ ہیں رخسانہ سلطانہ، سنجے اکثر ان کے ساتھ اس علاقہ میں چکر لگاتے دیکھے گئے۔

یہ رخسانہ کون ہیں؟ ہم نے تو ان کی منکوحہ کا کچھ اور نام سنا ہے۔ ایک صاحب نے غالباً کار میں ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے جانے پر اعتراض وارد کیا۔

بولے: ارے بھئی سیاست میں منکوحہ ہونے کی شرط نہیں ہوتی اور اس طرح کے لوگ جو ہماری بنیادوں پر تیشہ چلائیں، یہ ہمارے درمیان بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں۔

اور ان کا کیا موقف ہے، یہ جو اپنے صدر جمہوریہ ہیں، ایمرجنسی تو ان ہی کی ایما پر لگائی گئی ہے، کیا فخر الدین علی احمد نے اس صریح ظلم پر کوئی احتجاج نہ کیا؟ ایک صاحب نے وضاحت چاہی۔

بولے: ارے بھئی فخر الدین چاہے صدر جمہوریہ ہی کیوں نہ ہوں، ہیں تو اندرا جی کے خادم، ان کے ہی مرہون منت، نوکر بھلا احتجاج کرتا ہے؟ شیخ عبداللہ کی طرح وہ بھی ترکمان گیٹ کے حادثہ پر بس دل مسوس کر رہ گئے۔ ان دونوں نے مسز گاندھی سے احتجاج بھی کیا مگر وہی تابع داروں والا، بے دم احتجاج۔ اوروں کو تو چھوڑیئے محمد یونس جو نہرو فیملی کے گھر کے آدمی ہیں، جن کی ساری زندگی نہرو اور اندرا کی خدمت میں گزری ہے، وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔ بقول شخصے صرف اتنا کہا کہ جگموہن خود کو شاہجہاں سمجھتا ہے، دلّی کی تنظیم نو کرنا چاہتا ہے۔ اس سے آگے ان کا بھی بس نہ چل سکا، سنجے کے آگے کسی کی ایک نہ چلی۔ ارے بھئی نوکروں کی چلتی بھی کب ہے۔

***

برسوں بعد شبیر چچا کی یہ باتیں مجھے اس وقت یاد آئیں جب نرسمہا راؤ کے عہد میں سونیا گاندھی عملی سیاست میں آنے کے لیے بے چین تھیں، ان کی یہ خواہش ان کے فیملی فرینڈ محمد یونس جو نہرو فیملی کی زندگی بھر خدمت کے سبب اب باپ بیٹی کے غیاب میں خود کو تیسری جنریشن کا سرپرست سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے، پر بہت شاق گزری۔ انھوں نے ازراہ شفقت اور وفاداری کے تقاضہ سے مجبور ہو کر یہ بیان دے ڈالا کہ راجیو کی بیوہ کے لیے سیاست کی گندگی میں اترنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کٹورہ لے کر دلی کی گلیوں میں بھیک مانگنے نکل پڑیں۔ محمد یونس کے دل و دماغ پر اندرا اور راجیو کی المناک موت کا زخم تازہ تھا۔ اب خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت سے وہ راجیو کی بیوہ کو سیاست کی پرخار راہوں میں خجل ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ سونیا کو یونس انکل کا یہ تبصرہ بہت گراں گزرا۔ انھوں نے اپنے ایک قریبی مشیر وی جارج کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کروادی کہ محمد یونس ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ جب محمد یونس کو سونیا کی اس حرکت کا علم ہوا تو انھیں سخت صدمہ پہنچا، بزرگی کا خمار اتر گیا اور بڑی تلخی کے ساتھ فرمایا: 'نوکر، نوکر ہی رہتا ہے'۔

مگر یونس تو ان کے گھر کے آدمی ہیں، سنا تھا کہ سنجے گاندھی کی شادی ان ہی کی رہائش گاہ سے انجام پائی تھی، ان کا لڑکا عادل شہریار، راجیو اور سنجے کا بچپن کا دوست ہے، پھر یونس صاحب کے جیتے جی مسلمانوں پر قیامت گزر جائے اور وہ بھی سنجے کے ہاتھوں؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک صاحب، جو نشیمن اور بلیٹز کی چٹخارے دار خبروں کو پڑھ کر تبصرہ کرنے کے عادی تھے، انھوں نے گفتگو میں ایک تحقیقی زاویہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بولے: آپ کا اعتراض درست ہے، یہ بات بہتوں کے لیے باعث حیرت ہے کہ اندرا اور اس کے بیٹے میں مسلمانوں کے تئیں اتنی نفرت کیسے رچ بس گئی۔ جب اندرا نے 'غریبی ہٹاؤ' کا نعرہ بلند کیا تھا تو کسی کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ وہ دراصل غریب مسلمانوں کو منظر عام سے ہٹانا چاہتی ہیں اور جب ان کے بیٹے سنجے نے دلی کی تزئین کاری کا منصوبہ بنایا تب بھی کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہ تھی کہ وہ دراصل دلی کے قلب میں مسلمانوں کے بے ہنگم مکانات اور ان کی گنجان آبادی کو ایک بدنما داغ سمجھیں گے اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہو جائیں گے۔

اندرا اور سنجے کے رویے میں اس اچانک تبدیلی کی آخر وجہ کیا ہے؟

بولے: ارے بھئی تبدیلی وبدیلی کچھ نہیں، برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی باہر آتا ہے۔ اب تک مسلمان ان لوگوں کو سیکولر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہے، حالانکہ ان لوگوں کے ہاتھوں مولانا آزاد کی جو درگت بنی وہ ہم سبھوں پر واضح ہے، کتنے بے دست و پا ہو گئے تھے مولانا، اب تو مولانا بھی نہیں رہے کہ

مروّت آڑے آتی، اب تو صرف خادم رہ گئے ہیں، کسی کو صدارت کی کرسی پر مامور کیا، کسی کو راجیہ سبھا کی رکنیت دی، کسی کو وزارت اور سفارت سے نوازا۔ خواہ اس کی شکل مولویوں والی ہو یا وہ سوٹ ٹائی پہنتا ہو۔ نوکروں کا یہ مقام نہیں کہ وہ ماں بیٹے کا احتساب کر سکیں۔ اب جو کچھ اندر تھا وہ باہر آ رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے شبیر چچا نے ابّا کی طرف دیکھا جیسے ان سے اپنے اس خیال کی توثیق چاہتے ہوں۔

جی ہاں درست فرمایا آپ نے، ابھی کچھ پہلے نس بندی کے مسئلہ میں شخصی آزادی کو پس پشت رکھنے کی بات بھی تو کہی تھی اس نے۔

بولے: جی ہاں ڈاکٹروں کے اجلاس کی بات کر رہے ہیں نا آپ؟ ارے بھئی اس عورت نے تو حد کر دی، کہتی ہے کہ ملک کی ترقی کے لیے شخصی حقوق کو پس پشت ڈالنا ضروری ہے کہ بقول اس کے انسانی حقوق سے ملکی حقوق مجروح ہوتے ہیں، ملک کی ترقی کا راستہ رکتا ہے اور چونکہ، اس خیال کے مطابق، ترقی کی راہ میں آبادی رکاوٹ ہے اس لیے حکومت پر لازم ہے کہ وہ جبراً آبادی پر بند باندھ دے اور یہ سارا نزلہ گر کدھر رہا ہے تو مسلمانوں کی طرف، گویا ہماری بڑھتی آبادی سے ہی آپ کی ترقی کا حال پتلا ہے۔

'مگر لطف کی بات تو یہ ہے کہ جس جبری نس بندی پر حکومت کا اس قدر زور ہے وہ دراصل صاحب زادے کے پانچ نکاتی منصوبہ کا حصہ ہے اور صاحب زادے کا حکومت سے کوئی رسمی تعلق بھی نہیں۔ اندرا کے بیس نکاتی پروگرام میں تو اس کا تذکرہ بھی نہیں۔

ہے کیسے نہیں، کرن سنگھ کی آنکھ سے پڑھیے تو یہ نکتہ سارے نکات پر بھاری ہے۔

یہ کون صاحب ہیں؟ ایک صاحب نے پوچھا۔

بولے: ارے آپ نہیں جانتے کرن سنگھ کو، کشمیر کے شہزادے ہیں جو ایک مدت سے اپنا کھویا ہوا تخت دلّی میں تلاش رہے ہیں۔ ان چاپلوسوں نے بیس نکاتی منصوبوں میں بڑے معانی دریافت کیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کو بیس نکاتی منصوبہ بندی میں شامل نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غیر اہم ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ اتنا اہم ہے کہ اسے محض ایک نکتہ کے طور پر درج کر دینا اس کی اہمیت کو کم کر دیتا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر لوگ رضا کارانہ طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے لیے آمادہ نہ ہوں تو حکومت کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری قانون بنائے، مگر یہ سب کہنا بھی تکلف ہے جہاں جنگل راج ہو وہاں قانون سازی کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بہت برا وقت ہے، بس اللہ مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ یہ کہتے ہوئے شبیر چچا نے پہلو بدلا، سامعین پر ایک نگاہ ڈالی اور خاموش ہو گئے۔

***

برسوں بعد جب ایک دن میں M.N.Buch کا مضمون The Dharmic State کا مطالعہ کر رہا تھا تو میری نگاہوں میں مکتبہ کی یہ مجلس اچانک جاگ اُٹھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہ بزرگ تحقیق کے جدید مناہج سے بظاہر بیگانہ نظر آتے ہوں اور ان کے پاس اپنے حق میں دلائل کو مرتب کرنے کی دانشورانہ تربیت کی خواہ بظاہر کمی نظر آتی ہو، واقعہ یہ ہے کہ وہ حالات کی سنگینی پر پوری طرح مطلع تھے۔ مذکورہ مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا تھا: 'مجھے اب تک دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں گزرے ہوئے اپنے وہ ایام یاد ہیں جب ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد جنتا حکومت برسرِاقتدار آ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے جامع مسجد کے علاقے میں مینا بازار اور دریبہ کلاں میں پائیں والے کے علاقہ میں دکانیں تعمیر کی تھیں، تاکہ ایمرجنسی میں اجڑے ہوئے دکانداروں کی آبادکاری کی جاسکے۔ سنجے گاندھی نے مجھ سے کہا کہ ایسا کرکے ہم لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ ایمرجنسی میں ان دکانوں کے اجڑنے سے دراصل پاکستان حامیوں کا گھونسلا تباہ ہوا ہے۔ نہرو کے نواسہ کے منہ سے مجھے یہ سب سن کر بڑی وحشت ہوئی۔'

ان ہی دنوں جان دیال اور اجے بوس کی ایک کتاب *For Reasons of State: Delhi under the Emergency* میرے ہاتھ لگی، میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ہمارے بزرگوں کا کرب اس بیانیہ میں کچھ اسی طرح متشکل ہو گیا تھا گویا آپ مکتبہ کی مجلس میں بیٹھے شبیر چچا کی زبانی ترکمان گیٹ کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال سن رہے ہوں۔ لکھا تھا:

> 'درگاہ فیض الٰہی مسجد کے امام حافظ محمد نے ابھی نماز ختم ہی کی تھی کہ پولیس آ گئی۔ انھوں نے پچھلے پندرہ منٹوں میں بڑی الحاح و زاری کے ساتھ یہ دعا مانگی تھی کہ خدا باہر ہونے والے قتل عام کو روک دے اور اس مسجد کے نمازیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھ۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ خدا نے فیض الٰہی مسجد اور اس کے امام کا ساتھ آج چھوڑ دیا تھا۔ مسجد کا صدر دروازہ ازراہِ احتیاط پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا تاکہ پولیس اندر نہ آسکے۔ امام محمد کو اس کی توقع بھی نہ تھی کہ پولیس مقدس مقام میں داخل ہو جائے گی۔ جب دروازہ پر زور کی دستک ہوئی تو امام محمد پہلے یہ سمجھے کہ پولیس انھیں خوف زدہ کرکے دروازہ کھلوانا چاہتی ہے، لیکن جب دروازہ سے آنے والی آواز بڑھتی گئی تو ان کی یہ غلطی فہمی ختم ہو گئی۔ پولیس دراصل دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہی تھی...... مسجد کے اندر لوگوں میں اضطراب تھا، بالآخر دروازہ ٹوٹ ہی گیا اور پولیس اندر داخل ہو گئی۔ 'رک جاؤ یہ خدا کا گھر ہے'، امام نے چیختے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر غصہ اور خوف نمایاں تھا، لیکن ان کی آواز ان تین سو لوگوں کی چیخ پکار میں دب کر رہ گئی جن پر پولیس نے اب دھاوا بول دیا تھا۔ مسجد کے

اندر اب کسی کو مفر نہ تھا۔ ایک ایک کر کے لوگوں کو گھسیٹ کر نکالا جانے لگا، پولیس کے لیے بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ لوگ اپنے بچاؤ کے لیے دیواروں اور کھڑکیوں سے چپکے ہوئے تھے۔ پولیس کے حملوں کے باوجود وہ باہر جانے کو تیار نہ تھے، اس لیے کہ باہر کے مقابلہ میں یہ جگہ اب بھی نسبتاً محفوظ تھی، تبھی ایک پولیس آفیسر نے کہا: 'ان حرامیوں پر گیس کے گولے داغو'۔ آنسو گیس کے دو گولے عین مسجد کے اندرونی حصے میں آگرے۔ ایک بند جگہ میں گیس کے گولے داغنے کا مطلب تھا قتل۔ لوگ اب مجبور ہو کر مسجد سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے، اسی طرح جیسے چیونٹیاں اپنے بلوں سے نکلنے لگتی ہیں۔ چند منٹ گیس کے اندر رہ جانے کا مطلب تھا کہ موت یقینی ہے۔ اس ہنگامہ میں ننھا عثمان اپنی ماں کو تلاش کر رہا تھا، وہ چونکہ چھوٹا تھا اس لیے اب تک پولیس کی لاٹھی اور گھونسوں سے محفوظ تھا، لیکن اب گیس کا وہ کیا کرتا، اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ مسجد میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا، لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ دروازہ کدھر ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ 'اماں جان تم کدھر ہو، مجھے بچاؤ' لیکن اماں جان تو خود گیس کے نرغے میں تھیں۔ اسی دوران عثمان پر کسی کا پاؤں آپڑا، وہ اب احساسات سے خالی تھا، گیس نے اس کی جان لے لی تھی۔

اسّی سالہ عبدالستار دہشت کے مارے دیوار سے لگا تھا، اسے یاد نہیں کہ وہ کتنے سالوں سے اس مسجد کی صفائی پر مامور تھا، لیکن اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا خلفشار نہیں دیکھا تھا۔ چیخ و پکار، لاٹھیاں، آنسو گیس اور خون۔ یہ سب دیکھ کر عبدالستار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس کی زبان پر اللہ کا نام تھا، لیکن جلد ہی گیس نے اسے بھی آلیا، وہ کھانستے ہوئے دروازہ کی طرف بھاگا لیکن اس سے پہلے کہ دروازہ سے باہر نکلتا ایک کانسٹیبل نے اس کی گردن پکڑ لی۔ 'میں ابھی آتا ہوں ذرا لیٹرین سے ہو لوں' عبدالستار چیخا، تبھی اس کے سر پر ایک شدید ضرب پڑی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب تک امام حافظ محمد مسجد کے ایک اندرونی حجرہ میں پناہ لے چکے تھے۔ 'اے اللہ! مومنین کی مدد کر۔' ان کے منہ سے بے اختیار نکلا: 'آخر کب تک یہ قتل عام چلتا رہے گا'؟ تبھی پیچھے سے آواز آئی 'کہاں ہے اللہ'۔ دو پولیس والے پیچھے کھڑے تھے، ان ہی میں سے ایک کی یہ آواز تھی۔ بولا: امام اپنے خدا کو بلاؤ اور دیکھو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں، آؤ آج دیکھ ہی لیں، اپنے خدا کو سامنے لاؤ، میں اس سے نمٹنا چاہتا ہوں...... اس امام کے کتے کو ذرا راستہ پر لاؤ، اس کی خدا کی محبّت ابھی ہوا ہو جائے گی۔' نہرو بریگیڈ والے آدمی نے کہا۔ امام

حافظ محمد خدا کو پکارتے رہے اوران پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش ہوتی رہی۔ 'اے خدا! تیری اور تیرے امام کی اس قدر توہین، خدا ان کی گرفت کر، ایسی گرفت کہ انھیں یاد رہے کہ مسجد میں اس طرح کرنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔' آدھے گھنٹہ کے اندر مسجد ایک مقتل میں بدل چکی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون تھا، ہوا میں آنسو گیس کی بدبو اور فضا میں زخمی نمازیوں کی آہوں اور کراہوں کی دلخراش چیخیں............۔'

چند ہی گز کے فاصلہ پر سلینہ بیگم کسی خونخوار بلّی کی طرح ایک کانسٹیبل سے لڑ رہی تھیں جو ان کے گھر میں گھس آیا تھا۔ وہ اپنے دانت اور ناخن سے وار کر رہی تھیں۔ 'یہ بڑی خطرناک کتیا ہے، میں اسے اکیلے نہیں جھیل سکتا، ارے کوئی میری مدد کرو۔' کانسٹیبل نے اپنے دوست کو آواز دی۔ اب ایک عورت کے مقابلہ پر دو کانسٹیبل تھے، لیکن سلینہ ہار ماننے والی نہیں تھیں۔ دانت کاٹتے، لات مارتے اور صلواتیں سناتے ہوئے کبھی وہ ان دونوں کو کمرے کے ایک کنارے پر لے جاتیں تو کبھی دوسرے کنارے پر مگر اپنے برقع پر ہاتھ نہیں آنے دیتیں۔ وہ بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ اب انہدام کی کارروائی کے بعد ساری توجہ ان گھروں پر تھی جو ترکمان گیٹ میں باقی رہ گئے تھے۔ بظاہر تو فائرنگ بند ہو چکی تھی لیکن پولیس والے اب اندر گلیوں میں چن چن کر نشانہ بنا رہے تھے۔'

'ساڑھے پانچ بجے شام کرفیو کا اعلان ہوا اور پھر اس کے بعد ایک منصوبہ بند طریقے سے لوٹ مار اور زنا بالجبر کی کارروائی شروع ہوگئی۔ بیشتر مرد یا تو گرفتار ہو چکے تھے یا اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔ اب ان گھروں میں بے آسرا عورتوں اور بچوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ رضیہ بیگم اپنے شوہر کا ایک گھنٹہ سے انتظار کر رہی تھیں، لیکن ان کا کوئی پتہ نہ تھا، تبھی دروازہ پر دستک ہوئی، انھوں نے بڑی امید کے ساتھ دروازہ کھولا لیکن وہاں ان کے شوہر نہیں بلکہ ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔ 'اپنے کان کی بالیاں اتارو' اس نے مطالبہ کیا۔ رضیہ نے اسے بالیاں دے دیں۔ 'اور زیورات کہاں چھپائے ہیں؟' بے چاری رضیہ نے اس صندوقچہ کی طرف اشارہ کیا جس میں اس کے زیورات اور برسوں کی جمع پونجی تھی۔ 'اور اب اپنے کپڑے۔' رضیہ نے بستر کے کنارے رکھے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ 'وہ کپڑے نہیں جو تمھارے سوٹ کیس میں ہیں بلکہ وہ جو تمھارے جسم پر ہیں۔' کانسٹیبل نے پان والے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ رضیہ کی آنکھوں میں خوف گھر آیا، اس نے دفعتاً ایک جست لگائی اور کانسٹیبل سے اپنی باہیں چھڑاتے

ہوئے باہر بالکنی میں نکل آئی۔ نیچے چالیس فٹ کی گہرائی تھی۔ 'ارے تم کیا کرنے جارہی ہو'۔ کانسٹیبل کے چیخنے کی آواز آئی۔ رضیہ بیگم نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کود گئیں۔ نیچے اس کے گرنے کی زوردار آواز سنائی دی۔

ترکمان گیٹ پر شام گہری ہوتی جاتی تھی۔ شفق پر ڈوبتے سورج کی لالی اب بھی باقی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی، جس میں کبھی آہ و کراہ اور نالوں کی آواز سنائی دے جاتی۔ آج یہاں کسی گھر میں روشنی نہیں تھی۔ بجلی کا کنکشن کاٹا جا چکا تھا، ٹیلیفون اور پانی کا کنکشن بھی منقطع کر دیا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ترکمان گیٹ کو حرف غلط قرار دے دیا گیا ہو۔ تبھی خاموشی میں بے ہنگم مشینوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ازلی عفریت ترکمان گیٹ کی قسمت پر ہنس رہا ہو۔ بلڈوزروں نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ دور سے ایسا معلوم پڑتا جیسے ٹینکوں کی کوئی قطار ہو۔ سولہ مہیب سایے رات کی تاریکی میں حرکت میں تھے، ان کے کریہہ تھوتھنے آگے بڑھنے کے لیے حرکت میں تھے، ان کی تو بس قسمت کھل گئی تھی، اب ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ انیس سالہ سلیمان جو اپنے ادھورے منہدم گھر میں چھپا بیٹھا تھا، اس نے بلڈوزر کی آواز سنی۔ اس نے یہاں پناہ لے رکھی تھی، وہ اپنے بھائی کے بارے میں فکرمند تھا جسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کل وہ اپنے بھائی کی ضمانت کی کوشش کرے گا۔ پہلے پہل تو سلیمان نے بلڈوزروں کی آواز کا کچھ نہ کیا، سوچا شاید یہ پولیس کے ٹرکوں کی آواز ہو، آواز قریب سے قریب تر آتی گئی۔ اچانک سلیمان کے ذہن میں یہ بات کوندی کہ شاید یہ ٹرک نہ ہو، ٹرک اس طرح کی آواز نہیں نکالتے، پھر یہ کیسی آواز ہے۔ اس سے پہلے کہ سلیمان کسی نتیجہ پر پہنچتا، آواز اور تیز ہوتی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ جھانک کر دیکھے لیکن اس خوف سے کہ کوئی گزرتا ہوا سپاہی اسے یہاں چھپا نہ دیکھ لے، اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ اب آواز اس گھر کے بالکل قریب آ گئی تھی جہاں سلیمان چھپا بیٹھا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ارے یہ تو بلڈوزر ہے، اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کی چیخ بلڈوزر کے شور میں دب کر رہ گئی، جس کا بارہ فٹ کا دہانہ گھر کو توڑتا ہوا اب سلیمان کے جسم کو ملبہ میں بدل گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں اچانک فلڈ لائٹ روشن ہو گئی اور ترکمان گیٹ ایک خرابے کا منظر پیش کرنے لگا۔ سولہ بلڈوزر اپنا کام کرتے رہے۔ اس رات یہ بلڈوزر مسلسل چلتے رہے بلکہ اگلے دن بھی اور اگلی رات بھی۔ بائیس اپریل تک بلڈوزر شب و روز حرکت میں رہے، یہاں تک کہ انھوں نے ترکمان گیٹ سے زندگی اور موت کی تمام نشانیاں مٹا ڈالیں۔

مکتبہ میں گفتگو کا رخ اب ترکمان گیٹ سے ہوتا ہوا ملک کے دوسرے حصوں میں پیش آنے والے حوادث کی طرف مڑ گیا تھا۔ ایک صاحب ہریانہ کے ایک گاؤں اٹاور کا تذکرہ کر رہے تھے، جہاں اخباری اطلاعات کے مطابق درجن بھر سے زائد لوگ نس بندی کے آپریشن کی تاب نہ لاکر داغ مفارقت دے چکے تھے۔

اٹاور میں بھی بڑا ظلم ہوا ہے، ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں، بعض رفقا خود دیکھ کر آئے ہیں، شبیر چچا نے وضاحت کی۔ بولے، اٹاور میوات اور پلول سے لگا ہوا ہریانہ میں مسلم اکثریتی علاقہ ہے۔ وہاں تو پولیس گھوڑوں پر آئی، بالکل فاتحین کے انداز میں۔

جی ہاں انھیں تو مسلم آبادی کا ہر علاقہ ایک پاکستان لگتا ہے، ایک صاحب نے لقمہ دیا۔

'عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ صبح تین بجے کا وقت ہوگا جب ہزاروں پولیس والوں نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا، انھوں نے بلندیوں پر مشین گنیں نصب کردیں، اعلان ہوا کہ گاؤں کے تمام مرد حضرات سرکاری اسکول میں جمع ہوں۔ دریں اثنا پولیس گھر گھر کی تلاشی لیتی رہی، ڈری سہمی عورتیں اور معصوم بچے بھلا کیا کرتے، کسی کی آبرو محفوظ نہ تھی۔ آٹھ سو مردوں میں کوئی ڈھائی سو لوگوں کو بسوں میں بھر کر ہاسپٹل لے جایا گیا، ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن کی ابھی شادیاں بھی نہیں ہوئی تھیں، بعض لوگوں نے فرضی طلاق نامے بنوار کھے تھے کہ شاید وہ اس طرح نس بندی کی زد سے بچ جائیں، لیکن یہ سب ترکیبیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ہر شخص کو ایک نمبر دیا گیا اپنی باری کا نمبر، اب یہ لوگ انسان نہیں بلکہ ہندسہ تھے۔

شبیر چچا نے ہندسہ کے لفظ پر کچھ اس طرح زور دیا جیسے انسان اپنے جیسے انسانوں سے نہیں بلکہ بے جان، بے حس اور بے روح ہندسوں سے برسر پیکار ہوں۔

اور مظفر نگر کی حقیقت کیا ہے؟ سنا ہے وہاں بھی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے، ایک صاحب نے خالہ پور میں پولیس فائرنگ کے حوالہ سے پوچھا۔

بولے: ایک صاحب ہیں وِدّیہ بھوشن، کانگریس کے لیڈر ہیں، سنجے گاندھی کے مقربین میں سے ہیں، ان کی نگاہِ التفات خالہ پور کے مسلم علاقے پر پڑ گئی۔ پولیس نے ایک گوشت فروش کو اس کے گاہک سمیت نس بندی کے لیے اٹھالیا۔ یہ خبر جیسے ہی عام ہوئی سیکڑوں مسلمان سڑکوں پر احتجاج کے لیے نکل آئے۔ پھر پی اے سی کی ٹکڑیوں نے مورچہ سنبھالا اور دیکھتے دیکھتے پینتیس (۳۵) لاشوں سے بازار پٹ گیا، ہر طرف خون ہی خون، پھر کرفیو لگا یا گیا اور جیسا کہ ایسے موقع پر ہوتا ہے۔ بے شمار مسلم نوجوان گھروں سے اٹھالیے گئے اور انھیں جھوٹے مقدمات میں گرفتار کرلیا گیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس ظلم کی کہیں کوئی

شنوائی نہیں، یہ کہتے ہوئے شبیر چچا کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوگیا، بولے: اللہ ہی ان ظالموں سے سمجھے۔

کہاں آ گئے ہم، یہ کیسی عجیب صورت حال ہے، موت اور موت میں سے ہی کسی ایک موت کا انتخاب کرنا ہے، یا تو پولیس کی گولیوں سے مریں یا ڈاکٹر کے نشتر سے اپنی نسل کشی کو قبول کرلیں، ابّا نے صورت حال کی سنگینی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

'یہ ہے آزاد جمہوری ہندوستان کا اصل چہرہ، اب کیا کیجیے گا، راستہ تو ان ہی حالات میں بنانا ہے، ظلم کی ہانڈی آخر کب تک چڑھی رہے گی، ماروتی کی ماں بھی ایک دن روئے گی۔ واللہ المستعان'، یہ کہتے ہوئے شبیر چچا اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شبیر چچا اپنی خوش خلقی اور بذلہ سنجی کے لیے معروف تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہرے پر ہمیشہ کھیلتی ہوتی۔ آج بھی وہ چہکتے ہوئے رکشہ سے اترے تھے، لیکن تھوڑی دیر مسائل حاضرہ کی گفتگو میں ان کی آنکھیں بار بار نم ہوتی دیکھی گئیں۔ آج مجھے اس بات کا کسی قدر اندازہ ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنی خوش خلقی کے پیچھے کتنے غموں کو چھپا رکھا ہے۔ شبیر چچا تو چلے گئے لیکن اپنے پیچھے آہوں اور کراہوں کا غبار چھوڑ گئے۔ میں نے سوچا کہ جس ملک میں صرف ایک سال کی مدت میں تراسی (۸۳) لاکھ لوگوں کو جبراً نس بندی کا نشانہ بنایا جاتا ہو، جہاں صرف ترکمان گیٹ میں بارہ سو بے گناہ مسلمان اپنی جان، مال اور گھر کے تحفظ کے جرم میں پولیس کی گولیوں سے شہید ہوجاتے ہوں، وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو نہیں کہا جاسکتا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ جو مسلمان پہلے سے اس دُنیا میں موجود ہیں وہ جیتے جی پولیس فائرنگ میں مارے جائیں اور جنھیں دُنیا میں ابھی آنا باقی ہے ان کا راستہ بزور بندوق روک دیا جائے۔ پھر خیال آیا کہ ترکمان گیٹ کے شہدا کو بارہ سو کی گنتی میں محصور کرنا بھی تو ظلم ہے۔ یہ صورت حال کی صحیح عکاسی ہرگز نہیں۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ تقسیم کے بعد ایک بار پھر دلّی کی ڈیموگریفی از سرِ نو مرتب کی گئی، دلّی سے مسلمانوں کا ایک بار پھر جبراً انخلا عمل میں آیا۔ ابّا صحیح کہتے ہیں انسانوں کو ہندسوں کی شکل میں دیکھنے سے جرم کی شناعت پر پردہ پڑ جاتا ہے، لوگ اسے بھلا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ترکمان گیٹ کے واقعہ کو بہت سے لوگوں نے جلیاں والا باغ سے مشابہ قرار دیا، مگر جیسے پچھلے فسادات ہمارے ذہن سے رفتہ رفتہ محو ہوگئے اسی طرح ایمرجنسی کے یہ مظالم بھی ہمارے قومی اور ملّی شعور سے محو ہوجائیں گے۔ مجھے علی میاں کا وہ مطبوعہ خطبہ بھی یاد آیا جو ایمرجنسی کے دنوں میں ندوہ کی پچاسی ویں (۸۵) یوم تاسیس پر ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کی موجودگی میں بڑے تزک و احتشام سے نشر ہوا، اُردو اخبارات نے اس کی سرخیاں جمائیں، لیکن ایمرجنسی کے ان نازک حالات میں دیا جانے والا یہ خطبہ ایمرجنسی کے ذکر سے یکسر خالی رہا۔ جو قوم خود اپنے حال کے تذکرے سے

گریزاں ہوا سے تاریخ کی کمک اور اس کی روشنی کیسے مل سکتی ہے؟

ترکمان گیٹ کے سانحہ پر چند ماہ بیت چکے تھے۔ گوکہ اب نس بندی کی مہم میں وہ پہلے سا جوش و خروش نہ تھا، لیکن فضا میں گھٹن اور زباں بندی کا احساس اسی طرح برقرار تھا۔ اس دوران اچانک یہ اعلان ہوا کہ مسلم محلہ میں ایک مشاعرہ منعقد ہونے جا رہا ہے۔ ہمارے پڑوسی جو شہر کے مشہور دندان ساز تھے، صاحب بیاض شعرا میں تھے۔ کہنے لگے کیا خیال ہے مشاعرہ میں چلوگے۔ سردی کی رات تھی۔ یتیم خانہ کے مرکزی لان میں شامیانے نصب کر دیئے گئے تھے۔ گیس کی روشنی سے مجلس بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اسٹیج پر کبار شعرا نے اپنی نشستیں سنبھال رکھی تھیں۔ مشاعرہ اپنی تمام آن بان کے ساتھ جاری تھا، البتہ اس کی آن کا اصل امتحان اس وقت ہوا جب صدر مجلس نے 'آن' کے عنوان سے اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔

ہے زباں بندی کی خاطر تاجداری آن کی

ابھی شاعر نے پہلا مصرع ہی پڑھا تھا کہ لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے والی زبانیں اچانک محتاط ہو گئیں۔ اگلے چند مصرعے احتیاط و التزام میں گزر گئے، پھر جب شاعر نے یہ شعر پڑھا:

سیکڑوں الزام قید و بند سادہ سا جواب
مانی پڑتی ہے ہم کو بردباری آن کی

تو سامعین کو اندازہ ہو گیا کہ اشعار خطرناک حد تک سیاسی نوعیت کے ہیں۔ اور جب شاعر نے مقطع کا شعر پڑھا:

اور بھی کچھ روز محسن کیجیے اس کا انتظار
آج یا کل ایک دن ہونی ہے خواری آن کی

تو لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایمرجنسی کے اس ماحول میں اس قسم کی شاعری پر عوامی جلسہ میں احتیاط کے ساتھ کیسے داد دی جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ صدرِ مجلس استاذ الاساتذہ تھے۔ وہ صرف شاعر نہ تھے، ماہر تعلیم بھی تھے۔ عوام و خواص میں ان کا بڑا احترام تھا۔ لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ اس کبرسنی میں ان کی یہ حق گوئی انھیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔ حفیظ میرٹھی کے جیل جانے کا واقعہ لوگوں کے ذہنوں میں تازہ تھا جو اپنے بعض اشعار کے سبب مشاعرہ گاہ سے ہی جیل بھیج دیئے گئے تھے۔

آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں
جو ہم پر ایمان نہ لائے چنوادو دیواروں میں
ہر ظالم سے ٹکر لی ہے سچے فنکاروں نے حفیظ
ہم وہ نہیں جو ڈرکر کہہ دیں ہم ہیں تابعداروں میں

مشاعرہ تو ختم ہو گیا، لیکن محسن صاحب کا احتجاج زباں بندی لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ ان دنوں امرت نہاتا کی فلم 'قصہ کرسی کا' کا بھی بڑا چرچا تھا، جس میں سنجے اور اندرا کے طرزِ حکمرانی کا لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا گیا تھا۔ حکومت نے چونکہ اس فلم کو لائسنس دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی اصل فلم کو بھی غیر قانونی طور پر ضائع کرنے کی مرتکب ہوئی تھی، اس لیے عوامی حلقوں میں یہ فلم موضوعِ بحث بن گئی تھی۔ فلم میں بتایا گیا تھا کہ ہماری غربت کا اصل سبب دراصل چھوٹے چھوٹے چوہے ہیں جو ہمارے سارے اناج کو موٹے موٹے بلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اس لیے غریبی ہٹانے کے لیے لازم ہے کہ ان چوہوں کا صفایا کر دیا جائے۔ ملک گیر سطح پر چوہے مارنے کی اسکیم بنائی گئی۔ لوگوں کو ہر چوہے کے مارنے پر دس روپے دینے کی ترغیب دی گئی۔ یہ تمثیل دراصل جبری نس بندی کی طرف اشارہ تھی۔ چوہے دراصل وہی غریب وغربا تھے جن میں سرِ فہرست مسلمانوں کو رکھا گیا تھا۔ ایمرجنسی کے حکمرانوں کا یہ عمومی خیال تھا کہ جب تک غریب مسلمانوں کی پیدائش پر روک نہیں لگائی جاتی، ملک میں خوشحالی نہیں آسکتی۔ آگے چل کر جب مجھے ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان علامتوں کے معانی کی شد بد ہوئی تو پتہ چلا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو مارنے سے پہلے انھیں جانوروں کی سطح پر لانا، dehumanize کرنا کیوں ضروری ہوتا ہے۔ مجھے ابّا کی مومنانہ فراست پر بھی خوشگوار حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح غریبی ہٹاؤ نعرہ کے پیچھے غریبوں کو فنا کر دو کے منصوبہ کا ابتدا میں ہی ادراک کر لیا تھا۔

۱۳

رُوح کا زخم

ایک دن اچانک بیٹھے بٹھائے مسز گاندھی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے الیکشن کا اعلان کرڈالا۔ حالانکہ خبر گرم تھی کہ موجودہ حکمراں اپنے عہدے سے دست برداری کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بعض حلقوں سے نئے دستور ساز اسمبلی کے قیام کی تجویز بھی آرہی تھی اور بعض ریاستوں نے تو باقاعدہ ایک نئی طرز حکمرانی کی حمایت میں تجاویز بھی پاس کردی تھیں۔ ایسے میں اچانک الیکشن کا بگل غیر متوقع ہی نہیں حیران کن بھی تھا۔ ہم لوگ اب تک الیکشن سے دور رہنے کے عادی تھے۔ ابّا کہتے بے ایمانوں میں سے ہی کسی بے ایمان کو ووٹ دینا یا حقِ حکمرانی سونپنا عقل وفہم کی نفی ہے۔ جب کوئی متبادل ہی نہ ہو تو بھلا ووٹ کسے دیں۔ لیکن اب ایک نئی صورت حال کا سامنا تھا۔ لوگوں کی پھنسی گردنوں کو نکالنے کے لیے سیاسی تبدیلی ناگزیر ہوگئی تھی۔ جماعت کے حلقوں میں بعض بزرگ شش و پنج میں تھے۔ بمبئی کے شمس پیرزادہ اور ناگپور کے عبدالحفیظ خان اس مسئلہ پر خاص طور پر اجتہاد کے طالب تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان بحثوں سے کوئی واضح موقف نکل کر سامنے آتا، ہمارے ارشد بھائی نے اپوزیشن کی حمایت میں سرگرم مہم چلانے کا اجتہاد کرڈالا اور پوری تندہی سے اس مہم میں لگ گئے۔ ابّا نے بھی ان سے کوئی اعراض نہ کیا اور ہم لوگوں کی ہمدردیاں پوری طرح اپوزیشن کے ساتھ ہوگئیں۔

اسی دوران ایک صبح صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی موت کی خبر سامنے آئی۔ میں اس دن امتحان ہال میں تھا۔ میٹرک کے امتحان کا آخری پرچہ تھا تبھی اساتذہ کو یہ کہتے سنا کہ فخر الدین علی احمد کا انتقال ہوگیا ہے۔ باہر آیا، واپسی کے لیے رکشے کی تلاش میں تھا کہ گاؤں کے ایک بزرگ پر نظر پڑی جو اپنے چھوٹے بیٹے کو امتحان دلانے کے لیے ساتھ آئے تھے۔ وہ بزرگ مجھے دیکھ کر بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ مجھے باصرار اپنے ساتھ رکشے میں بٹھالیا۔ رکشہ روانہ ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا انھوں نے خود ہی فرمایا: پتہ ہے فخر الدین علی احمد کا انتقال ہوگیا ہے۔

میں نے کہا: جی ہاں، ابھی امتحان ہال میں پتہ چلا۔

بولے: اچھا! بڑے باخبر رہتے ہو، پھر خود ہی کہنے لگے: پتہ نہیں موت کا سبب کیا ہے، بظاہر تو ہارٹ اٹیک بتایا گیا ہے۔

میں نے کہا: کوئی سازش بھی تو ہوسکتی ہے، شبیر چچا بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ وہ ترکمان گیٹ کے سانحہ پر سخت کبیدہ خاطر تھے، پتہ نہیں کس دباؤ میں رہے ہوں گے۔

میری اس تشویش پر وہ بزرگ مسکرائے، بولے: ارے بھئی ہر چیز میں سازش نہیں ہوتی، یہ تو بڑی صاف بات ہے، مسلمان اگر ذرا بھی مسلمان ہو، ایمان کی رمق اس کے دل میں باقی ہو تو وہ اس سسٹم میں فٹ نہیں بیٹھ پاتا، اس کا ضمیر مسلسل اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے، وہ خود کو بے بس محسوس کرتا ہے کہ اہم حکومتی عہدوں پر بیٹھ کر بھی وہ اپنی ہم قوموں کو انصاف دلانا تو درکنار، ان کے حقوق کی پامالی کو نہیں روک سکتا۔

سنا ہے کہ آخری دنوں میں مسز گاندھی سے ان کے مراسم اچھے نہیں رہ گئے تھے۔ پھر انھوں نے کوئی سخت فیصلہ کیوں نہ لیا، وہ تو حکومت کی سب سے اعلیٰ کرسی پر تھے، میں نے پوچھا۔

بولے: ارے بھئی ایک تو صدر جمہوریہ کے اختیارات محدود ہوتے ہیں دوسرے مسلمان صدر ان محدود اختیارات کا استعمال اس لیے بھی نہیں کر پاتا کہ وہ جس خدمت اور وفاداری کے مرحلے سے گزرتا ہوا ان مناصب تک پہنچتا ہے وہاں اس کے اندر آزادانہ فیصلوں کا کس بل نہیں رہ جاتا۔ اب دیکھو نا، ذاکر حسین صاحب کی ملّی خدمات سے تو سب لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے جامعہ کو نازک وقت میں سہارا دیا، آزادی کے بعد علی گڑھ کو جس غیر یقینی مستقبل کا سامنا تھا، اس سے نکالا، اُردو کے حق میں لاکھوں دستخطوں کی زوردار مہم چلائی لیکن جب خود صدارت کی کرسی پر متمکن ہوئے تو خاموشی اختیار کر لی۔

آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ میں نے پوچھا۔

بولے: ارے بھئی جن لوگوں نے انھیں صدر جمہوریہ بنوایا تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ ذاکر صاحب کی مسلم شبیہ ہمارے سیکولرازم کے لیے اسٹریجٹک اہمیت کی حامل ہے، مسلمان کو صدر بنانا جب سیکولرازم کے استحکام کا باعث سمجھا جاتا ہو تو کسی مسلم صدر کے لیے اس کرسی پر رہتے ہوئے اُردو زبان یا مسلمانوں کے دوسرے ملّی امور میں دلچسپی لینے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟

* * *

برسوں بعد جب مجھے شاہ کمیشن کی رپورٹ اور اس کے متعلقات دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہمارے یہ بزرگ صورت حال کا کس قدر حقیقی ادراک رکھتے تھے، حالانکہ اقتدار کے گلیاروں میں انھیں چلت پھرت کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ مرحوم فخر الدین علی احمد کے حوالہ سے سُبھدرا جوشی نے، جو اس

وقت پرانی دلّی سے کانگریس کی ایم پی تھیں، شاہ کمیشن کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ مرحوم صدر نے انھیں بتایا تھا: 'یہ لڑکا (سنجے گاندھی) بدمعاش ہے، پاگل ہے، اسے عام انسانوں کو، خاص طور پر مسلمانوں کو، تکلیف پہنچانے میں خوشی ہوتی ہے۔ہم نے مسز گاندھی سے بھی اس کی شکایت کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو شخص اس کی شکایت کرتا ہے یہ اسے گرفتار کروا دیتا ہے۔' مرحوم صدر نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ 'دہلی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا انھیں بہت افسوس ہے، لیکن وہ کر بھی کیا سکتے ہیں، ان کی کوئی نہیں سنتا اور سنجے نے تو ان پر فرقہ پرست ہونے کی پھبتی بھی کسی ہے۔' میں نے سوچا جب ملک کے سب سے اونچے منصب پر متمکن مسلمان خود کو اتنا بے بس محسوس کرتا ہو تو عام مسلمانوں پر کیا گزرتی ہوگی جنھیں چوہا سمجھ کر نشانہ بنایا جا رہا ہو۔

اس سیاق میں مجھے امریکہ کا ایک سفر بے اختیار یاد آ رہا ہے۔ ۱۹۹۶ء کی بات ہے۔ دسمبر کے آخری ایام تھے۔ کرسمس کی چھٹیوں کے سبب ہیتھرو ایئرپورٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ بورڈنگ کے لیے جب میں ورجن اٹلانٹک کی لابی میں داخل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مسافروں کی اغلب اکثریت سیاہ کوٹ پتلون اور ہیٹ میں ملبوس مذہبی یہودیوں کی ہے۔ پہلے تو ایک طرح کے لباس میں اتنے سارے یہودیوں کو دیکھ کر وحشت ہوئی، پھر خیال آیا سات گھنٹے کی اس طویل پرواز میں کیا پتہ اپنے ان ہم سفروں سے افہام وتفہیم کی کوئی گرہ ہی کھل جائے۔ قدرت کو بھی شاید کچھ یہی منظور تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اخبارات و رسائل اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک مضمون پر اٹک گئی، عنوان تھا 'The Jews in Hitler's Military'۔ اب تک گو کہ میں نے اہل یہود کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا، لیکن میرے لیے یہ معلومات چونکانے والی تھی۔ مضمون نگار نے ایک محقق Bryar Rigg کے حوالے سے لکھا تھا کہ جنگ عظیم دوم میں جب جرمن فوجیوں کے ہاتھوں اہل یہود پر قیامت گزر رہی تھی، عین ان ہی ایام میں اہل یہود کے خانوادے سے بہت سے لوگ ہٹلر کی فوج میں باضابطہ اس جرم میں اپنے ہی ہم قوموں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ بقول Rigg ہٹلر کی فوج میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد ایسے افراد موجود تھے جن کے تانے بانے اہل یہود سے جا ملتے تھے۔ ان میں دس جنرل اور دو فیلڈ مارشل بھی تھے جن کے پاس ایک لاکھ فوجیوں کی کمان تھی۔ ان میں سے کم از کم بیس لوگ ایسے تھے جنھیں اعلیٰ فوجی خدمات کے صلہ میں جرمنی کے سب سے اعلیٰ فوجی اعزاز نائٹس کراس (Knight's Cross) سے بھی نوازا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر (Mischlinge-Germans) مشلینگے جرمنس تھے، یعنی آدھے جرمن اور آدھے یہودی۔ Rigg نے کوئی بارہ سو سابق جرمن فوجیوں سے انٹرویو کی بنیاد پر، جن میں سے زیادہ تر کی عمریں اب ستر، اسّی سال سے اوپر تھیں، یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ یہ لوگ زندگی کے بقیہ ایام شکستہ دلی اور احساس جرم کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ گزار

رہے تھے۔ برسہا برس گزر گئے، انھوں نے اپنے ضمیر پر پڑے ہوئے اس بوجھ کو کریدنے کی کوشش نہیں کی، کسی سے تذکرہ کرنا مناسب نہ جانا، اب جورِگ (Rigg) نے ان سے ان ایام کی بابت سوال کیا تو جانیے بس ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بہت سے لوگ بے اختیار رو پڑے جیسے وہ مدت سے رونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ہٹلر کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس کی فوج میں یہودنژاد فوجی شامل ہیں اور بعض تو اہم عہدوں پر بھی تعینات ہیں، لیکن اسے تجربہ کار کمانڈروں کی ضرورت تھی خواہ وہ اہل یہود کے خانوادوں سے ہی کیوں نہ ملے۔ ایسے یہودی اس کے لیے بڑے کام کے تھے جو محض اپنی جان بچانے کے لیے یا چھوٹے سے مادّی فائدے کے لیے اپنی قوم کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے تیار ہوں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے بیشتر فوجیوں کو ان مجرمانہ خدمات کے عوض بھی زندگی کی ضمانت نہ مل سکی۔ جب وقت آیا تو یہ بھی تعذیب گاہوں کو جانے والی ٹرینوں میں بٹھادیئے گئے۔ بعض لوگ تو فوجی یونیفارم اور اعزازی میڈل کے ساتھ گیس چیمبر میں داخل کیے گئے۔ ایک فوجی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کا نسلی تعلق اہل یہود سے نہیں ہے، ایک تعذیب گاہ میں قید اپنی ماں کے پاس جا پہنچا، اب ماں کا بھی جگر دیکھیے کہ اس نے اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اپنے اوپر یہ تہمت قبول کر لی کہ اس کا یہ بیٹا اپنے یہودی باپ کے بجائے ایک جرمن کیتھولک کے نطفہ سے ہے۔ میں نے اخبار کو موڑ کر سامنے لگی میز پر رکھا اور سوچنے لگا کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ اپنی ہی قوم، خاندان بلکہ گھر والوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر کوئی شخص اپنی زندگی کا سودا کرسکتا ہے؟ اور ماں، یہ ماں کیا چیز ہوتی ہے جو اپنے بیٹے کی جاں بخشی کے لیے اپنی عصمت پر ایک تہمت گھڑنے کو بھی کچھ عار نہیں سمجھتی۔ لیکن تف تو اس بیٹے پر ہے جو صرف اپنی زندگی کی خاطر تعذیب گاہ میں بھی اپنی ماں کو ایک نئے ذہنی اور روحانی عذاب میں مبتلا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان یہودی مسافر کی طرف دیکھا جو اب تک بڑی خاموشی کے ساتھ میرے مطالعے کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ لندن کے جوئش کالج سے وابستہ تھا اور غالباً اس اخباری مضمون میں میری سنجیدگی کو بھانپ چکا تھا۔ بولا، کیسا لگا آپ کو یہ مضمون؟ ہے نا عجیب، حیرت انگیز! Rigg سے میں ملا ہوں وہ میرے کالج بھی آئے تھے۔ بڑے پرجوش محقق ہیں، یورپ اور امریکہ میں نہ جانے کتنے معمر یہودیوں سے انٹرویو کرتے پھر رہے ہیں۔

تمھارا کیا خیال ہے، میں نے اس کا تاثر جاننے کی کوشش کی۔

بولا: رِگ (Rigg) نے ہماری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ ہم دوسروں کو کیا الزام دیں اگر ہمارے اندر سے انھیں آلہ کار نہیں ملتے تو چھ ملین یہودیوں کو فنا کے گھاٹ اتارنا ان کے لیے ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہوئے نوجوان نے میری طرف دیکھا، پھر انگشتِ شہادت سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ہالوکاسٹ کی جڑیں ہمارے اندرون میں موجود تھیں، دشمن تو انھیں بس باہر لانے کا محرک بنا۔

رِگ (Rigg) نے جن واقعات کے بارے میں ذکر کیا ہے، کیا واقعی ان میں صداقت ہے؟

بولا: غیر متوقع کچھ بھی نہیں۔ یورپ میں تو ایک مدت سے یہودی اپنی شناخت پر پردہ ڈالنے کے عادی رہے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ جو بظاہر عیسائی شناخت کے حامل نظر آتے ہیں، انھیں اندر سے کریدیئے تو ان کی جڑیں اہل یہود کے خانوادوں سے جا ملیں گی۔ مگر اصل مسئلہ شناخت کی تبدیلی کا نہیں بلکہ ایسے لوگوں کی موجودگی کا ہے جو اپنے چھوٹے سے فائدے کے لیے اپنی قوم پر ذلت کا عذاب مسلط کرنے سے باز نہیں آتے، حالانکہ ملتا انھیں بھی کچھ نہیں ہے۔

اس طرح کے واقعات کو یہودی دانشور کس طرح دیکھتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

بولا: ایک بحث چل نکلی ہے، اپنے اندرون میں جھانکنے کی بحث۔ اچھی بات یہ ہے کہ جو لوگ پچاس پچاس سال سے جرم کا بوجھ لیے جیتے تھے ان کی زبانیں کھل گئی ہیں، وہ شرمندہ ہیں اور اپنے جرم کا برملا اقرار کر رہے ہیں۔ لوگوں میں یہ احساس بھی عام ہو رہا ہے کہ اپنی قوم سے بے وفائی کے صلہ میں اگر اپنی جان بچا بھی لی جائے تو وہ بچتی نہیں، یہ زخم ساری زندگی مسلسل رِستا رہتا ہے۔

چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں نے مضمون کا تراشہ بیگ میں رکھا، اپنی نشست کو بستر میں تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس خیال سے کہ سفر طویل ہے، نیند کی ایک جھپکی لے لی جائے، قدرے دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کیا آتی اخبار کا مضمون اب بھی ذہن پر حاوی تھا، میں نے سوچا، رِگ (Rigg) کی اس تحقیق نے اہل یہود کے فکر مند حلقوں میں ایک بے چینی کو جنم دیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی روح پہ لگے زخم کو اپنے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے ایمرجنسی کا وہ منظر نامہ یاد آیا جب ترکمان گیٹ کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی تھی۔ ہر طرف معصوم بچوں اور بے بس عورتوں کی آہ و بکا، پولیس کی گولیاں اور جبری انخلا اور سب سے بڑھ کر ان کی نسل کشی کے لیے نس بندی کے پختہ انتظامات اور اس پورے تماشہ میں ایک مسلمان صدر جمہوریہ کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں تازہ ہو جاتا۔ گو کہ وہ اس صورت حال سے خوش نہ تھے لیکن ایمرجنسی نافذ تو ان ہی کے دستخط سے ہوئی تھی۔ مجھے محمد یونس بھی یاد آئے جو اس وقت وزیر اعظم اندرا گاندھی کے خصوصی نمائندے کہے جاتے تھے جو ایک طرف اگر جگموہن کی پالیسی کے ناقد تھے تو دوسری طرف ان کا

کہنا تھا، جیسا کہ سلم کلیئرنس (Slum Clearence, demolition etc) کے وقائع نگار نے لکھا ہے: 'ان کا جی چاہتا ہے کہ جو لوگ امام جامع مسجد کی حمایت کرتے ہیں انھیں اس علاقہ سے کھدیڑ کر نکال دیا جائے اور شہر کے باہر پھینک دیا جائے'۔ مسز گاندھی بھی تو یہی چاہتی تھیں، جیسا کہ سراج پراچہ کے حوالہ سے وقائع نگار نے لکھا کہ جب تک جامع مسجد کے علاقہ سے مسلمانوں کی اکثریت تحلیل نہیں ہوتی یہ علاقہ مسلسل ان کے لیے دردِ سر بنا رہے گا۔ مجھے شہنواز خان بھی یاد آئے جو نہرو فیملی سے قربت کے سبب مختلف وزارتوں پر متمکن رہے اور جو ایمرجنسی کے دوران بھی اہم عہدوں پر فائز تھے۔ مظفر حسین برنی جنھوں نے وقف بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے عبداللہ بخاری سے ٹکر لی تھی اور سب سے بڑھ کر مولانا اسعد مدنی، جنھیں ۱۹۶۸ء میں پہلی بار مسز گاندھی نے راجیہ سبھا کی رکنیت سے نوازا تھا۔ ایم ایف حسین بھی یاد آئے جو ایمرجنسی کے پرجوش حامیوں میں تھے جنھیں بعد میں ملک چھوڑنا پڑا اور شفیع محمد قریشی جو اس وقت نائب وزیر ریلوے تھے اور شیخ محمد عبداللہ جو بچشم خود ترکمان گیٹ کی تباہی ملاحظہ کر آئے تھے۔ یہ سب کے سب اس وقت کیسا محسوس کرتے ہوں گے جب مسلمانوں کی آہ و فغاں سے پرانی دلّی اور ملک کے دوسرے مسلم اکثریتی علاقے لرزہ براندام تھے۔ میری نگاہوں میں سنجے گاندھی کا وہ قافلہ بھی جاگ اٹھا جو انہدام کے دنوں میں مسلسل پرانی دلّی کے چکر لگا تا رہا تھا۔ اس قافلہ میں ان کی مشیر خاص رخسانہ سلطانہ کی تصویر بھی ابھرنے لگی جنھوں نے پرانی دلّی میں انہدام اور نس بندی کے لیے بنیادی خدمات انجام دی تھی، وہ مسلم عورتوں سے، ان دنوں کہتی پھرتی تھیں کہ پردہ ترک کرو، میری طرح رہو کہ آخر میں بھی تو مسلمان ہوں۔ جی ہاں وہی رخسانہ سلطانہ جن کی بیٹی امرتا سنگھ نے آگے چل کر فلمی دُنیا میں بڑا نام کمایا۔ مجھے لطیف فاطمہ بھی یاد آئیں جو سنجے گاندھی کے قافلہ کا حصہ ہوتیں جو شہنواز خان کی متبنّیٰ بیٹی تھیں اور جن کے بیٹے شاہ رخ خان آج کل فلمی دُنیا کے بادشاہ کہے جاتے ہیں۔ تو کیا کانگریس کی مسلم دُشمن مہم میں اسے بھی مسلم جرنیلوں، رضا کاروں اور مسلم علما کی معاونت حاصل تھی؟ آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ کہاں گئے اور ان کا کیا بنا۔ محمد یونس تو یہ کہتے سنے گئے کہ ساری زندگی نہرو خاندان کی خدمت کے باوجود انھیں عزت کے دو بول نہ مل سکے، وہ اس احساس کے ساتھ دُنیا سے گئے کہ 'نوکر، نوکر ہی ہوتا ہے'۔ ذاکر حسین سے لے کر فخر الدین علی احمد تک اور شہنواز خاں سے لے کر برنی، مدنی اور ان جیسے دسیوں خادمین پر کیا گزری، انھیں اپنے آنسوؤں سے روح پر لگے زخم کو دھونے کا موقع ملا بھی یا نہیں۔

۱۴

ترکمان گیٹ

ایک دن مکتبہ میں امام جامع مسجد عبداللہ بخاری کا ذکر چل نکلا۔ وہ ان دنوں اپنی الیکشن اپیل کے سبب شہ سرخیوں میں تھے۔ بڑے دنوں بعد مسلمانوں کا کوئی امام سیاسی منظرنامہ پر اپنا وزن محسوس کرا رہا تھا۔ دہلی کی شاہجہانی مسجد سے شوکت اسلام کی جو یادیں وابستہ تھیں، ایسا لگتا تھا، کسی نے اس میں پھر سے جان ڈال دی ہو۔ غالباً بمبئی کے کسی جلسہ کی رپورٹ تھی جس میں عبداللہ بخاری نے ایمرجنسی کی زیادتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ کانگریس کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جنتا پارٹی کو اپنا ووٹ دیں۔ جگ جیون رام کے کانگریس چھوڑ دینے کے بعد عبداللہ بخاری کا اعلانِ جنگ کانگریس کے خلاف ایک بڑا اسٹریٹیجک وار سمجھا جارہا تھا۔ شاہجہانی مسجد کے منبر سے اٹھنے والی اس علامتی اپیل نے مسلمانوں میں ایک غلغلہ کی کیفیت پیدا کردی تھی۔

ایک صاحب کہنے لگے: اب کانگریس کی خیر نہیں۔ بمبئی کے ضیاء الدین بخاری، جو اب تک جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے خیمے میں تھے، انھوں نے بھی جنتا پارٹی کے حق میں مہم شروع کردی ہے اور عبداللہ بخاری کے کھل کر میدان میں آجانے سے وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جس کو کہتے ہیں نا، شیر آیا شیر آیا۔

واٹ نانسنس، خالم مخول! خالم مخول! آپ لوگ چیزوں کی حقیقت سمجھتے نہیں، فوراً جوش میں آجاتے ہیں، پروفیسر نے تنبیہاً کہا۔ بولے: ابھی زیادہ دن نہیں گزرے جب شیر کشمیر شیخ عبداللہ کا بڑا چرچا تھا، لیکن اب کانگریس نے انھیں کچھ اس انداز سے اپنے دام میں لیا ہے کہ اب وہ میمنہ بن کر رہ گئے ہیں۔ آپ لوگ عبداللہ بخاری سے نہیں واقف، ابھی چند سال پہلے ہی کی تو بات ہے جب انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں بیانات دیئے تھے، ان کی اپیلیں ان کی تصویروں کے ساتھ مسلم علاقوں میں آویزاں کی جاتیں، تب وہ حکومت کے منظورِ نظر تھے، حکومت نے انھیں ماسکو بھیجا اور وہ خلیجی ممالک کے دورے پر بھی گئے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ شاید اس طرح ان کی امامت کے عہدے پر وقف بورڈ کی طرف سے جو قضیہ چل رہا ہے اس کا حل نکل آئے، لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے اس موقف سے عوام میں ان کی ساکھ

گرتی جارہی ہے تو انھوں نے اپنی اسٹریٹجی تبدیل کرلی۔

اچھا! مجھے اس کا قطعی اندازہ نہ تھا، وہ صاحب اخبار بند کرتے ہوئے کسی قدر متحیر آنکھوں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ہاں آپ دوتین سال پہلے کے اخبارات دیکھ لیجیے، آپ کو خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں عبداللہ بخاری کی اپیلیں مل جائیں گی۔

پھر ان کے موقف میں یہ انقلابی تبدیلی کیسے آئی؟ انھوں نے پوچھا۔

بولے: دیکھیے ۱۹۷۳ء میں ان کے والد حامد بخاری صاحب نے عبداللہ بخاری کے حق میں امامت کا عہدہ خالی کردیا جو اس وقت نائب امام تھے۔ وقف بورڈ کے ذمہ داروں کو اس طرزِ تقرر پر اعتراض تھا۔ وہ امام جامع مسجد کو وقف بورڈ کا ایک ملازم سمجھتے تھے اور انھیں ان کی یہ حیثیت یاد دلانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقف بورڈ اور عبداللہ بخاری کے مابین ایک کشمکش کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اُدھر خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کے سبب ان کی عوامی مقبولیت میں بھی مسلسل کمی آرہی تھی، لوگ انھیں سرکاری امام کہتے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے کتراتے۔ تب عبداللہ بخاری نے اپنے موقف میں بنیادی تبدیلی پیدا کی۔ ان ہی دنوں اجمیر کے زائرین پر حملہ ہوا تھا اور صدر بازار میں مسلمانوں پر زیادتی کے واقعات پیش آئے تھے۔ عبداللہ بخاری نے مسلمانوں پر ہونے والی ان زیادتیوں کو اپنے خطبوں کا موضوع بنایا اور دیکھتے دیکھتے جامع مسجد میں نمازیوں کی بھیڑ امڈ آئی جو ذوق وشوق سے امام کا خطبہ سننے کے لیے کھنچے چلے آئے تھے۔

چلیے وہ صحیح راستے پر لوٹ تو آئے، اب دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اچھا پھر یہ امامت کا مسئلہ کیسے حل ہوا، انھوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

بولے: پھر ہوا یہ کہ ایک دن وقف بورڈ کی ایک اہم میٹنگ مرکزی وزیر شہنواز خان کی صدارت میں 'بچوں کے گھر' میں منعقد ہورہی تھی۔ امام کو جیسے ہی خبر ملی، انھوں نے اپنے حامیوں کو ساتھ لیا اور میٹنگ کو بھنگ کرنے کے لیے جا پہنچے۔ ہلڑ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ امام اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اِدھر جامع مسجد کے علاقہ میں کسی نے یہ افواہ اڑادی کہ امام کو گولی ماردی گئی ہے۔ بس کیا تھا لوگ غم وغصہ میں سڑکوں پر نکل آئے۔ پولیس سے ٹکراؤ ہوا، سات آٹھ لوگ مارے گئے، علاقے میں کئی دنوں تک کرفیو لگا رہا۔ کوئی دو ہفتے بعد امام کو رہا کیا گیا اور ثالثی کے لیے نائب وزیر ریل شفیع قریشی کو بیچ میں ڈالا گیا، تب جاکر امامت کا قضیہ حل ہوا۔

اچھا! مجھے ان باتوں کی خبر نہ تھی، مگر ایک بات تو پھر بھی ماننی پڑے گی کہ عبداللہ بخاری نے حکومت کی خوشامد کے بجائے عوامی طاقت کے بل بوتے پر اپنا مسئلہ حل کیا، انھوں نے اپنی قوت کے سرچشمہ کو

پہچانا، جبھی تو وہ آج اس پوزیشن میں ہیں کہ ایک مستحکم حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے بلاخوف لومۃ لائم میدان میں آ نکلے ہیں۔

بالکل مجھے اس بات سے اختلاف نہیں کہ وہ آج پہلے کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم بنیادوں پر کھڑے ہیں، مجھے تو اس دن سے خوف آتا ہے کہ وہ کسی مرحلہ میں کانگریس کے دام تزویر میں نہ آجائیں جو پہلے بھی اپنی ترکیبوں سے بڑے بڑے شیروں کو میمنہ بنا چکی ہے۔

افسوس کہ پروفیسر کا یہ اندیشہ ۱۹۸۰ء کے الیکشن میں درست ثابت ہوا جب عبداللہ بخاری نے کانگریس کی حمایت میں اپیل جاری کردی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی باتوں میں گھن گرج تو باقی رہی لیکن اخلاقی اور روحانی وزن سے خالی، حالانکہ سیاسی طور پر تو وہ وی پی سنگھ کے زمانہ تک مؤثر رہے، لیکن شاہجہانی امام کی عظمت وجلالت کا جو طلسم ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں قائم ہوا تھا، یہ صورت حال پھر قائم نہ ہوسکی۔

الیکشن میں مسز گاندھی کو شکست فاش ہوئی، ایمرجنسی کا خاتمہ ہوا اور ملک میں ایک نئی سیاسی تبدیلی کی ہوا چلنے لگی۔ نئی حکومت نے شاہ کمیشن کے قیام کا اعلان کیا جسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ایمرجنسی کے دوران ہونے والی زیادتیوں کی جانچ اور اس کے ممکنہ ازالے کی کوشش کرے۔ تحقیقاتی کمیشن تو پہلے بھی بٹھائے جاتے تھے لیکن بالعموم ان کا مقصد مسائل کو ٹالنا یا کم از کم ان کو وقت کی دبیز گرد میں دفن کرنا ہوتا تھا۔ اس دفعہ شاہ کمیشن نے ازالہ کی بات کی تھی اور متاثرین کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے نقصانات کی تلافی کے لیے ہرجانہ طلب کریں۔ بعض لوگ ایمرجنسی کے خاتمہ اور جنتا پارٹی کی کامیابی کو ایک نئی آزادی سے تعبیر کررہے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ بھی امید تھی کہ جس طرح ۱۹۴۷ء کے مجاہدین آزادی کو حکومت مراعات سے نوازتی ہے۔ شاید اسی نہج پر ایمرجنسی کے دوران قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والوں کے لیے بھی کوئی نئی اسکیم بنائی جائے گی۔ گویا نئی حکومت سے بہت سے انقلابی اقدامات کی توقع تھی۔ اس پس منظر میں شاہ کمیشن کی یہ دعوت کہ لوگ تلافیٔ مافات کے لیے اپنے اپنے خساروں کا تخمینہ جلد از جلد کمیشن کے دفتر کو ارسال کریں، ایک امید افزا بات معلوم ہوتی تھی۔

بھائی جان نے نقصانات کا تخمینہ لگانا شروع کیا۔ سرکاری مقفلی کے دوران مکتبہ پوری طرح تباہ ہوچکا تھی، حتیٰ کہ عمارت کی بیرونی دیواریں بھی سیلاب کی نذر ہوگئی تھیں، گویا ایک چلتے پھرتے مرفہ الحال کاروبار کی از سرِ نو ترتیب و تنظیم کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ کیا عجب کہ شاہ کمیشن سے ہمیں انصاف مل جائے۔ ابّا کو جب کمیشن کے قیام اور اس کے مقاصد کا علم ہوا تو انھوں نے حیرت سے تفصیلات سنیں، فارم کو اُلٹ

پلٹ کر دیکھا، زیر لب مسکرائے، بولے: ان باتوں سے کچھ ہونے کو نہیں۔ جب ہم لوگوں نے بتایا کہ حکومت تو ایمرجنسی کے اسیران کے لیے مجاہدین آزادی کے طرز پر ماہانہ الاؤنس کی بات بھی کررہی ہے تو کہنے لگے کہ دوسری آزادی سے ہم کیا توقع رکھیں، ہم مسلمان تو پہلی آزادی کے ثمرات کو نہیں جھیل پا رہے ہیں، ان سے انصاف کی توقع عبث ہے۔ وہ تو چلیے کہ ایمرجنسی کے ظالمانہ شب و روز سے نجات ملی، یہی اس کا اصل ثمرہ ہے، یہ مختلف الخیال لوگوں کی حکومت ہے، دیکھیے کب تک چل پاتی ہے۔ بہت کچھ ردّ وکد کے بعد انھوں نے بھائی جان کو شاہ کمیشن میں ہرجانے کے کاغذات داخل کرنے کی اجازت تو دے دی لیکن اس طرح کہ ان کی گفتگو سے ہماری خوش کن توقعات کا محل پہلے ہی زمیں بوس ہو گیا۔ ایک دن کہنے لگے کہ کمیشن تو ویسے بھی سیاسی مقاصد کے تحت بنائے جاتے ہیں، یہ نقصانات کی تلافی کیا کریں گے، مال و دولت، گھر زمین کے نقصانات کا اندراج تو ہوسکتا ہے اور مالی نقصانات کا تخمینہ بھی لگایا جاسکتا ہے، لیکن دلوں پر جو زخم لگے ہیں اور روحیں جس طرح مجروح ہوئی ہیں، ان کی تلافی بھلا کون کرسکتا ہے اور بعض نفسیاتی زخم تو ایسے ہیں جن کے مندمل ہونے میں برسوں لگ جائیں یا شاید کبھی مندمل نہ ہوں۔ اس وقت بھی ابّا کی باتوں میں صداقت لگتی تھی، یہ تو لگتا تھا کہ ہمارے ساتھ کچھ گڑبڑ ہوا ہے، ہمارے اندرون میں کوئی چیز مجروح ہوئی ہے لیکن یہ سب ہے کیا اس کا اندازہ بہت سالوں بعد ہوسکا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملک میں جشن آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی جارہی تھی، مجھے پرانی دلّی کے ایک گنجان مسلم علاقہ میں ایک سماجی تقریب میں حاضری کا موقع ملا۔ تقریب تو ولیمہ کی تھی لیکن اس موقع پر چند دردمند اور متحرک نوجوان جو مجھ سے تعلق خاطر رکھتے تھے، جمع ہوگئے تھے۔ ایک نوجوان، جس کی عمر تیس بتیس سال کی ہوگی میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ مجھے بھی پرانی دلّی کا ہی سمجھیے، میرا نام ناصر ہے، ویسے رہتا تو مایاپوری میں ہوں لیکن میرا بچپن ترکمان گیٹ کی گلیوں میں گزرا ہے۔ ترکمان گیٹ کا نام سن کر میں چونکا۔ میں نے پوچھا ایمرجنسی کے ایام میں آپ کہاں تھے؟

بولے: اس وقت میری عمر یہی کوئی دس بارہ سال کی رہی ہوگی، میں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا ہے، میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ آج بھی جب مجھے کوئی بلڈوزر کہیں دکھائی دے جاتا ہے تو مجھ پر ایک وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ میرے وجود کو اپنے آہنی شکنجوں سے دبوچ لے گا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس بلڈوزر کا ایمرجنسی کے بلڈوزروں سے کوئی تعلق نہیں لیکن میرے لاشعور میں نہ جانے کیوں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بلڈوزر مسلم مخالف ہوتے ہیں، ان کی ایجاد ہی دراصل مسلمانوں کو اجاڑنے کے لیے ہوئی ہے۔ میں لاکھ عقلی تجزیہ کرتا ہوں مگر بلڈوزر کے خوف سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔

میں نے دیکھا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ ایک لمحہ کے لیے رکے، پھر بولے، کیا بتاؤں ان بلڈوزروں نے میرے ایک خالہ زاد بھائی کی جان لی ہے، قاتل ہیں یہ قاتل۔

میں لمحہ بھر کچھ سمجھ نہ سکا کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا، خوش خلق نوجوان، جو پیشے سے سوفٹ ویئر انجینئر ہے اور جس کے ہونٹوں پر ابھی مسکراہٹ کھیلتی تھی، اچانک تشنج کی کیفیت میں کیسے چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ ڈپریشن کے مریضوں کے ساتھ یہی تو ہوتا ہے، ان کے مجروح اندرون کب پرانے محور پر لوٹ جائیں، انھیں خود اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ میں نے انھیں اس صورت حال سے نکالنے کے لیے باتوں کا رخ موڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ کہنے لگے آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ ہم ترکمان گیٹ والے جو اب مایاپوری، نندنگری، ترلوک پوری اور شہر کے دوسرے مضافات میں رہتے ہیں۔ ہم اب تک ترکمان گیٹ کے سانحے سے نہیں نکل پائے ہیں، کیسے بھولیں گے آپ اس منظر کو وہ تو آنکھوں میں ایسا بسا ہے کہ اب نکلتا نہیں۔ پرانی دلّی میں ہماری رشتے داریاں ہیں، ہم جب بھی اس علاقے میں آتے ہیں ہمارا احساس محرومی دوچند ہو جاتا ہے۔ پھر ہمارے بچے ان واقعات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، ہم کس گلی میں رہتے تھے، ہماری دکان کہاں تھی، کاروبار کہاں تھا، پڑوسی کون تھا، وہ اب کہاں رہتا ہے، اس پر کیا گزری؟ گویا تعذیب گاہ کی پوری تفصیل تمام جزویات کے ساتھ اگلی نسل کے دل و دماغ میں جا بیٹھی ہے، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ باتیں بچوں کو بتائی جانی چاہئیں یا نہیں، لیکن حقیقت کو چھپایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ پھر بولے میری ایک چچازاد بہن ہے، پی ایچ ڈی ہے، ماشاء اللّٰہ بڑی باصلاحیت ہے، سماجی کاموں میں متحرک رہتی ہے، شادی پر آمادہ نہیں ہوتی تھی، خاندان والے پریشان تھے، جب گھر والوں نے بہت گھیرا تو رونے لگی، لوگ سمجھے کہ شاید عشق و عاشقی کا کوئی مسئلہ ہو، یونیورسٹی میں پڑھی ہے، شاید کسی ناکام محبّت کا زخم دل پر لگا ہو، لیکن شادی سے کترانے کی اس نے جو وجہ بتائی اسے سن کر تو ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پتہ چلا کہ اسے بھی ترکمان گیٹ کا زخم لگا ہے۔ کہتی ہے میں جب بھی شادی کا سوچتی ہوں اور مجھے بچوں سے بہت پیار ہے تو میری نگاہوں میں میری سہیلی ندا کا چہرہ گھوم جاتا ہے، یہی کوئی نو دس سال کی عمر رہی ہوگی جب نس بندی کی تلاشی کے دوران پولیس والے اس کے گھر میں گھس آئے، اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور وہ دس سال کی معصوم بچی جان سے ہار گئی۔ میں جب بھی شادی کا سوچتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ مجھے ندا جیسی پیاری بچی سے نوازے گا، کتنی شوخ اور چنچل تھی وہ اور مجھ سے تو ٹوٹ کر پیار کرتی تھی، لیکن نابابانا، ندا کے لیے یہ دُنیا خطرات سے پُر ہے، ہر طرف وحشی درندے دندنا رہے ہیں، میرا دل کانپ جاتا ہے۔ بس وہ اسی طرح کی باتیں کرنے لگتی ہے، یہ کہتے ہوئے ناصر پھر آبدیدہ ہو گئے، بولے:

لوگوں کو کیا پتہ کہ ہمارے دلوں پر کیا گزرتی ہے، ہمارے اندرون میں کون سا محشر بپا ہے، بظاہر ہم چلتے پھرتے، ہنستے مسکراتے اپنے اپنے کاموں میں مگن دکھائی دیتے ہیں، لیکن انھیں کیا معلوم کہ ہمارے دل اندر سے کتنے مجروح ہیں۔

آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، میری نگاہوں میں خالہ پور کے چندسن رسیدہ چہرے پھر سے جاگ اٹھے ہیں، جن کی زخمی روحیں آج بھی انھیں کسی کل چین نہیں لینے دیتیں۔ مجھے انڈین ایکسپریس میں شائع ہونے والی شریف کونین کی وہ رپورٹ یاد آرہی ہے جو ان متاثرین کے انٹرویوز پر مشتمل ایمرجنسی کے چالیس سال بعد شائع ہوئی تھی۔ شبیرن جس کی عمر اس وقت ستر سال سے متجاوز تھی، اس نے اپنا درد کچھ اس طرح سنایا تھا:

'میں نے اپنے اٹھارہ سالہ نوجوان بیٹے کو شکر لانے کے لیے بھیجا تھا، جب اسے دیر ہوئی تو میں نے چھوٹے بیٹے سلام الدین کو بھیجا کہ پتہ لگائے کہ وہ کہاں رہ گیا، کچھ ہی دیر بعد سلام الدین روتا پیٹتا گھر واپس آیا۔ بولا: 'بھیا کو انھوں نے مار دیا، امی!'۔ شبیرن کہتی ہے کہ میں سڑک کی طرف بھاگی جہاں نظام الدین خون میں لتھڑا پڑا تھا، اس کے سینے سے بری طرح خون بہہ رہا تھا، اس نے آنکھیں کھولیں لیکن کچھ بول نہ سکا۔ میں نے کہا، بیٹا کیوں سو رہا ہے گھر چل۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، لیکن پھر چند ہی لمحے بعد اس کی گردن ڈھلک گئی، پولیس والے اس کی لاش لے کر چلے گئے۔ میں بہت چیخی چلائی مگر کسی نے میری ایک نہ سنی، جب دو گھنٹہ بعد میرے شوہر آئے اور انھوں نے بیٹے کا خون اس طرح سڑک پر بہتا دیکھا تو وہ اسے دھونے لگے اور پھر وہ گھنٹوں خون کا داغ ہی دھوتے رہے، وہ قبرستان سے جب واپس آئے تو انھیں چپ سی لگ گئی۔ اس حادثہ کے بعد وہ وہ نہ رہے، جو تھے، کچھ دنوں بعد ان کا ایک سڑک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ شبیرن نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ تم پوچھتے ہو کہ مجھے اپنا بیٹا اب بھی یاد آتا ہے تو سنو، میں اسے ہر روز یاد کرتی ہوں، ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو، مجھے کیوں مارا؟ امّی۔ کیا کسی کے پاس اس سوال کا جواب ہے؟

انہتر سالہ محمد عمر کی یادوں میں رمضان کا وہ دن آج بھی تازہ ہے جب وہ اپنا کچوری اسٹال لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں دودھ لے کر واپس گھر آرہا تھا کہ پولیس کی گولی میرے بازو میں آلگی، انھوں نے مجھے جانوروں کی طرح ہاسپٹل میں ڈال دیا، وہ میرا ہاتھ کاٹنا چاہتے تھے۔

خواجہ مجیب، جن کی عمر ترانوے سال کی ہوگئی تھی، ویسے تو نسیان کا شکار رہتے ہیں لیکن ان سے جب خالہ پور کے واقعات کا تذکرہ کیجیے تو وہ اپنے بیٹے کی شہادت کی تمام جزئیات کا بڑی تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ سلیم ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جسے پولیس نے نس بندی کے لیے بس اسٹینڈ سے اٹھایا، انھیں ایک دن تک اپنے بیٹے کی موت کا پتہ نہ چل سکا۔ بولے: جب وہ ایک دن تک نہیں ملا تو ہم نے سوچا کہ کہیں زندہ چھپا بیٹھا ہوگا، لیکن جب ہم نے قبرستان کا چکر لگایا تو پتہ چلا کہ اس کی لاش تو شہدا کے ساتھ رکھی ہے۔

ساٹھ سالہ حسینہ بیگم کا غم ایک الگ دلخراش داستان سناتا ہے۔ ایک چھوٹی سی تاریک کٹیا میں ایک سلائی مشین ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ کہتی ہیں کہ اپنے شوہر کی شہادت کے بعد وہ اپنے تین بچوں کی پرورش کے لیے اس مشین کے سہارے زندہ ہیں۔ جس وقت وہ شہید ہوئے ان کی عمر تیس سال تھی، جب لاش گھر لائی گئی تو ہم نے دیکھا کہ ان کے چہرے میں سوراخ تھا، گولی ان کے جبڑے سے داخل ہوکر گردن سے نکل گئی تھی، شوہر کی موت کے بعد کچھ دنوں تک تو میں نے چارپائی بننے کا کام کیا، پھر سلائی بنائی کے کام میں لگی، مجھے اپنے تین بچوں کی پرورش کرنی تھی، میرے شوہر جب زندہ تھے وہ بچوں کو خود اسکول چھوڑ کر آتے تھے، اب میرا ایک بیٹا بڑھئی ہے، حکومت نے میرے بچوں سے تعلیم چھین لی، میں چاہتی ہوں کہ اب وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا خیال رکھے۔

شاہ کمیشن نے انصاف کی جو امید جگائی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ کمیشن حتمی اقدام کی طرف بڑھتا، جنتا پارٹی کی حکومت کو زوال آ گیا۔ کہتے ہیں کہ جے پرکاش نارائن کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ قیامِ انصاف کی لڑائی کے لیے انھوں نے جن لوگوں پر انحصار کیا تھا وہ اس عظیم کام کے اہل نہ تھے۔ مرارجی خود کانگریس کلچر کے پروردہ تھے، ان کا واحد ہدف وزارتِ عظمیٰ کا حصول تھا جو اس سے پہلے دوبار ان کے ہاتھ بس آتے آتے رہ گیا تھا۔ ایک بار لال بہادر شاستری ان کی راہ میں آ گئے تھے اور دوسری بار اندرا گاندھی کے سیاسی داؤ پیچ کے آگے ان کی ایک نہ چلی تھی۔ جے پرکاش اس صورت حال پر کبیدہ خاطر تھے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ بمبئی کے جسلوک اسپتال میں جہاں وہ زیر علاج تھے، انھوں نے ایک بار صاف لفظوں میں یہ بات کہی تھی کہ اگر میری صحت بہتر ہوتی تو میں انھیں پریشان کر دیتا۔

جے پرکاش بذاتِ خود صاف ذہن، بے لوث اور وسیع القلب آدمی تھے، لیکن اندرا کو اکھاڑ پھینکنے میں شاید نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے یہ غلطی ہوگئی کہ انھوں نے جن سنگھ کو اپنی مزاحمتی تحریک میں جگہ دے

دی، جس سے حاشیہ پر پڑی ہوئی ایک فرقہ پرست تحریک کے لیے قومی دھارے میں شامل ہونے کی راہ نکل آئی۔ ایمرجنسی کے دوران آر ایس ایس نے مسز گاندھی سے بھی رابطہ بنانے کی کوشش کی۔ بالا صاحب دیورس نے انھیں خطوط لکھے جس میں کانگریس کے بعض پروگرام کی تحسین کی، مفاہمت کا عندیہ دیا اور اٹل بہاری واجپئی تو ایمرجنسی کے بیشتر اوقات پیرول پر جیل سے باہر ہی رہے۔ لیکن جے پرکاش کرتے بھی کیا۔ ان کی صحت اس بات کی متحمل نہ تھی اور نہ ہی ان کی درویشی اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ وہ خود اس مہم کی کمان سنبھالیں۔

ایمرجنسی کے بطن سے ایک امید افزا تجربہ ہندو مسلم تعلقات کے سلسلے میں سامنے آیا۔ بہت سے ہندوؤں، خاص طور پر آر ایس ایس والوں کے لیے جماعت اسلامی کے لوگوں کے ساتھ رہنے کا تجربہ بڑا چشم کشا ثابت ہوا۔ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں، آپس میں احترام و محبّت کی فضا پیدا ہوگئی۔ بعض لوگ تو اپنی شخصی حیثیت میں جماعت والوں کے معتقد بھی بن گئے۔ یہ ایک بڑی خوش کن پیش رفت تھی۔ ابتداً جماعت کے حلقے میں اس رابطے کو مزید بڑھانے اور اس تجربے کو غیر مسلموں میں عمومی دعوت کے لیے استعمال کرنے کے سلسلے میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس طرح ایک اہم اور نادر موقع ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہ کمیشن بھی اگر کوئی قابل ذکر پیش قدمی کے بغیر مرجھا گیا تو اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خود کمیشن کے قائم کرنے والوں کا ذہن اس کے اہداف کے سلسلے میں صاف نہ تھا۔ شروع سے یہ بات کہی گئی کہ کمیشن ایمرجنسی میں ہونے والی زیادتیوں کی جانچ کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اب جو لوگ مسلمانوں کی منظم نسل کشی کو محض زیادتی سے تعبیر کرتے ہوں، ان سے انصاف کی کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ بالآخر تین حصوں میں کمیشن کی یہ رپورٹ شائع ہوئی، لیکن وہ بھی غیر سرکاری طور پر۔ ورنہ نئی حکومت نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ رپورٹ کا قصہ ہی تمام کر دیا جائے۔ رپورٹ کا ایک حصہ ترکمان گیٹ کے مظالم سے متعلق تھا۔ سابقہ تحقیقاتی رپورٹوں کی طرح آج بھی یہ رپورٹ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے ریاستی جرائم سے پردہ اٹھا رہی ہے، لیکن کوئی نہیں جو اِن مظلومین کی دادرسی کر سکے جو مرورِ ایام کے سبب یا تو زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ اور بہت سے تو انصاف کی امید لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ البتہ پولیس کے رویے اور ریاستی جبر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ جب مجرمین اسی طرح دندناتے پھر رہے ہوں تو مسلمانوں کو غیر شعوری طور پر ایسا لگتا ہے کہ ان کے اردگرد آج بھی ہر طرف ایک ترکمان گیٹ بپا ہے۔ آپ اسی وقت تک محفوظ ہیں جب تک پولیس کی گولی آپ کے قریب سے مگر آپ کو مس کیے بغیر گزر گئی ہو۔

۱۵

ایک عظیم الشان اجلاس

جنتا حکومت کے قیام سے سیاسی افق پر کوئی بنیادی تبدیلی تو واقع نہ ہوئی البتہ قید و بند کے نفسیاتی حصار کے ٹوٹنے کا ایک خوشگوار احساس ضرور عام ہوا۔ ملک میں جلسے جلوس، گفت وشنید اور بحث ومباحثے کی سرگرمیاں پھر سے چل نکلیں۔ خیال ہوا کیوں نہ باقاعدہ کسی عوامی جلسے کا انعقاد کیا جائے۔ اس دوران اسکول کے احباب پر مشتمل ایمرجنسی کی مزاحمت کے لیے جو گروپ بنایا گیا تھا وہ بھی اپنی طبعی عمر پوری کر چکا تھا، لہٰذا کچھ پرانے اور نئے دوستوں پر مشتمل ایک گروہ ادبیات اسلامی کی ملک گیر تحریک کو منظم کرنے کے لیے وجود میں لے آیا گیا۔ تھوڑی سی محنت سے ایک نئی تنظیم کا ڈھانچہ کھڑا ہوگیا۔ کسی عوامی جلسے کے لیے بہت بڑے انتظام کی ضرورت نہ تھی۔ اسٹیج کے لیے ایک بڑا بینر جس پر جلسہ کا عظیم الشان ہونا لکھا ہو اور کچھ ایسے الفاظ جس سے اس کی نوعیت مقامی کے بجائے کم از کم ملک گیر قرار پاتی ہو۔ سفید چادریں جس سے اسٹیج کی میزیں ڈھک سکیں تو یہ گھر میں دستیاب تھیں۔ ایک مائک اور ایک فوٹو گرافر جو جلسہ کی یادگار تصاویر کو محفوظ کر سکے۔ مسلم اسکول کی جغرافیائی اہمیت کے سبب جلسہ گاہ کے لیے اس کے وسیع میدان کا انتخاب کیا گیا اور شاید اس لیے بھی کہ ہمارے بعض رفقا ابھی سال ڈیڑھ سال پہلے ہی اس اسکول سے فارغ ہوئے تھے۔ جلسہ مغرب کے بعد ہونا طے پایا تھا۔ صبح سے دو نوجوانوں کو رکشہ میں بٹھا کر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کے لیے شہر میں روانہ کر دیا گیا۔ ایک صاحب کہیں سے قنات لے آئے تاکہ اسٹیج کی تزئین کاری میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لیجیے دیکھتے دیکھتے ادبیات اسلامی کے قومی اجلاس کا منظرنامہ تیار ہوگیا۔ دن بھر مختلف قسم کے انتظام وانصرام کے ساتھ ساتھ اس ادھیڑ بُن میں رہا کہ خطبۂ استقبالیہ میں کن باتوں کا تذکرہ کیا جائے۔ اب تک اکابرین کے جو استقبالیہ خطبے پڑھے تھے، اس کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ اپنی کم مائیگی اور بے سروسامانی کو حاصلات کے طور پر پیش کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ دُنیا کے بڑے بڑے انقلابات ہم جیسے تہی دستوں کے ہاتھوں ہی برپا ہوتے آئے ہیں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ تو خالص روایتی طریقہ ہے، پھر ہمارے اس اجلاس کی خاص بات کیا ہوئی۔ رکشہ پر جو احباب اعلان کے لیے نکلے تھے انھیں بھی صبح یہ مسئلہ

درپیش تھا کہ قابل ذکر مقررین میں کس کے نام کا اعلان کریں کہ خلقت اب تک کسی پیرانِ پیر، دامت برکاتہم، شاعر باکمال یا قائدِ بے مثال کے نام پر جمع ہوتی آئی تھی۔

ہم لوگ جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو وہاں بڑی بے سروسامانی کا عالم تھا۔ اسکول والوں نے بنیادی انتظامات سے بھی پہلوتہی کی تھی، لیکن جلد ہی صورت حال پر قابو پالیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اسٹیج بھی سج گیا اور سامعین کے لیے سبزہ زار پر بنچوں کی صفیں آویزاں ہوگئیں۔ وقت مقررہ پر سامعین کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ سامعین میں موجود سید شاہ اسداللہ مرحوم اپنی شرعی وضع قطع اور بارعب نورانی حلیے کے سبب صدارت کے مستحق قرار پائے۔ نظامت کے لیے برادر اعجاز کا انتخاب عمل میں آیا، جنھیں ہم نوجوانوں میں مرصع گفتگو کا خاص سلیقہ تھا اور جو آگے چل کر جامعہ ملیہ میں سوشل سائنسز کے ڈین بھی ہوئے۔ چند دنوں بعد اخبارات میں اس اجلاسِ عام کی بڑی بڑی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ دہلی کے بعض ہفت روزہ اخبارات نے تصاویر بھی چھاپیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اجلاس کا ہر مقرر ان رپورٹوں کے مطابق یا تو دانشور تھا یا ادیب یا کم از کم اسے مفکر اسلام کی حیثیت تو ضرور حاصل تھی۔ اخبارات کے علاوہ اس اجلاس کی تفصیلی رپورٹ مسلم قائدین اور تنظیموں کو بھی ارسال کی گئی تھی۔ 'سنگم' نے اپنی ایک رپورٹ میں مجھے اُردو کا مشہور ادیب قرار دیا تھا اور لطف تو یہ ہے کہ غالباً اس رپورٹ سے متاثر ہوکر علی میاں صاحب نے ایک دعوت نامہ بھی ارسال کردیا تھا جو ان دنوں ندوہ میں اسلامی ادب پر کوئی پروگرام منعقد کررہے تھے، جس کے بطن سے آگے چل کر ایک بڑی ادبی تحریک کا ظہور ہوا۔ لوگ حیران تھے کہ میں اچانک راتوں رات اُردو کا مشہور ادیب کیسے بن گیا۔ گو کہ اس دوران اخبارات و رسائل میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے تھے، لیکن یہ چند مضامین مشہور ادیب جیسے لاحقہ کی کفایت تو ہرگز نہ کرتے تھے۔ مولانا آزاد کے بارے میں یہ بات کہیں پڑھی تھی کہ جب وہ چھوٹے تھے تو کسی بکس پر کھڑے ہوجاتے اور اپنے ہم عمر بچے بچیوں کو یہ باور کراتے کہ وہ دلّی کے بڑے مولانا کی حیثیت سے اسٹیج پر کھڑے ہیں اور یہاں لاکھوں کا مجمع ہے۔ جب بچے کہتے کہ یہاں تو کوئی نہیں، بس ہم دو چار لوگ ہیں تو کہتے کہ کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ لوگوں کے آگے پیچھے جو القاب لگے ہوتے ہیں وہ کوئی انھیں دیتا نہیں بلکہ خود لگانا پڑتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے خود کو امام الہند کے لقب سے متعارف کرایا اور پھر امام الہند کہلانے لگے۔ اب جو مشہور ادیب والا فارمولہ اپنایا تو تیر ٹھیک نشانہ پر جالگا۔ طالب علم سے ایک مشہور ادیب اور مفکر بننے کا یہ سفر اتنا مختصر ہوسکتا ہے، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اب جب بھی کسی شخص کو پیر طریقت، قاضیٔ شریعت، فقیہ امت اور امیر شریعت جیسے القاب سے ملقب دیکھتا تو مرعوب ہونے کے بجائے بس یہ سمجھتا کہ میری طرح ان حضرات نے بھی محض بچپنے کے

شوق میں ان القاب کو اختیار کر رکھا ہے۔

مشہور ادیب اور مفکر بن جانے کی شہرت جب شہر کے مختلف حلقوں میں پہنچی تو ایک دن طلبا کی ایک انجمن کے دو ذمہ داران مجھ سے ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے مجھے اپنے ہفت روزہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی۔ جلسہ میں قرآن وسنت کے دروس اور غلبۂ دین کے موضوع پر تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن گفتگو کا قرعہ میرے نام نکل آیا۔ ان دنوں ایرانی انقلاب کا ہر طرف چرچا تھا۔ دینی حلقوں میں جہاں اس انقلاب نے ایک طرف جوش وخروش کو جنم دیا تھا وہیں طبقۂ علما کی طرف سے شیعہ سُنّی کی اختلافی بحثیں بھی اٹھائی جارہی تھیں۔ بہت سے لوگ حیص بیص میں تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ انقلابِ ایران کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا جائے۔ میری نگاہوں میں تہران میں خمینی کی واپسی اور ان کے والہانہ استقبال کا وہ منظر اب بھی تازہ تھا، جہاں لاکھوں لوگ ان کی ایک جنبشِ ابرو پر انقلاب کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے آمادہ دکھائی دیتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انقلاب کے سلسلے میں معاندین اور مخالفین کا پروپیگنڈہ اتنا سخت تھا کہ اصل صورت حال کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا تھا۔ اُردو اخبارات کی بے خبری کا یہ حال تھا کہ وہ بنی صدر کی تصویر کے نیچے آیت اللہ خمینی کا نام لکھ دیتے۔ کبھی انقلابیوں کے مظالم کی خبریں آتیں اور کبھی شیعہ سُنّی کی اعتقادی بحثوں میں قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا کہ حق واقعی کس کے ساتھ ہے۔ ایرانی سفارت خانے سے چند ایک بار کچھ لیفلیٹ مکتبہ میں ضرور آئے، مگر ان کی حیثیت بھی یکطرفہ پروپیگنڈے کی تھی۔ اسی دوران پتہ چلا کہ جامعہ سلفیہ کے ایک استاد مولانا ابوالمکارم صاحب کے پاس ایرانی سفارت خانے سے افادۂ عام کے لیے کچھ دستاویزات آئی ہیں، ان میں ایک تو آیت اللہ خمینی کی تقریر کا متن تھا، کچھ کتابچے رہبر انقلاب کی مدح میں تھے اور کچھ عمومی پروپیگنڈے کی قبیل سے تعلق والی چیزیں تھیں۔ میں نے تقریر کے بعض جملوں کو نشان زد کیا اور وحدتِ امت کے پس منظر میں ایک مختصر گفتگو کا تانا بانا تیار کرلیا۔ ہفت روزہ جلسہ میں بالعموم تیس پینتیس نوجوانوں کی شرکت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا حلقۂ بزرگاں سے بھی شریک ہوجاتا تھا۔ میری تقریر تو حلقۂ طلبا کے لیے تھی، لیکن اس دن جلسہ میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے میری تقریر کے خاتمہ پر غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ داد وتحسین کے کلمات بلند کیے، بولے: واللہ آپ نے حق کہا، بڑی جرأت سے کام لیا ہے آپ نے۔

ان جلسوں میں پیش کی جانے والی تقریریں مشقی تقریر کی قبیل سے ہوتی تھیں۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ واقعی انھیں میری بات پسند آئی ہے یا یہ بھی سرزنش کا ایک انداز ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں علما کے تحفظات کے حوالہ سے یہ کہا تھا کہ ایران کے انقلاب نے امکانات کی ایک نئی دُنیا پیدا کی ہے، اگر ہم

انقلاب فرانس اور امریکی اعلانِ آزادی کی حمایت صرف اس لیے کرسکتے ہیں کہ ان میں اکرام آدمیت اور حریت فکری کے عناصر پائے جاتے ہیں تو ایرانی انقلاب، جس نے خود کو وحدتِ امت کے نقیب کے طور پر پیش کیا ہے اور جو دراصل مستکبرین کے مقابلے میں مستضعفین کا اعلان جنگ ہے، ہماری نیک تمناؤں کا مستحق کیوں نہیں ہوسکتا؟ نظامِ جبر سے نکلنے کی ہر اسکیم ہماری حمایت کی مستحق ہے، امریکی اعلانِ آزادی کو بھی تو ہم اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اس نے فرد کو اس کی زندگی، حریت فکری اور زندگی کی جملہ مسرتوں کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ امریکی انقلاب کے بطن سے انقلابِ فرانس طلوع ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ تمام نظامِ جبر کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز **إن الحکم الا للہ** کی صدا کے طور پر دیکھی جانی چاہیے۔

عام ہفت روزہ تقریروں کی طرح یہ تقریر بھی مسجد کی چہار دیواریوں تک ہی محدود رہتی، لیکن ہوا یہ کہ ادھیڑ عمر کے ان صاحب نے شہر میں اس تقریر کا پروپیگنڈہ شروع کردیا۔ ایک دن وہ مکتبہ میں بھی تشریف لائے اور اس تقریر کے حوالے سے کچھ اس طرح رطب اللسان ہوئے کہ میں اپنی تعریف سن کر شرمندہ سا ہونے لگا۔ ایک دن مغرب کی نماز سے لوٹ رہا تھا، راستہ میں ان ہی صاحب سے آمنا سامنا ہوگیا، بڑی گرم جوشی سے ملے، کہنے لگے: 'آپ کی تقریر ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے، کلمۂ حق کہا آپ نے کلمۂ حق، مولا علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے حق کہا اور تنہا رہ گیا'۔ ہماری یہ گفتگو مسجد سے نکلنے والے ایک پڑوسی بھی سن رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد قدرے متوحش انداز میں مجھ سے بولے، خیریت ہے! کن کن لوگوں کے چکروں میں پڑے رہتے ہو، ارے پتہ بھی ہے یہ صاحب کون ہیں، غالی درجہ کے شیعہ ہیں، یہ لوگ آج کل بہت اچھل کود کررہے ہیں، ایرانی انقلاب نے ان کے درجۂ حرارت میں اضافہ کردیا ہے۔

بات جب آگے چلی اور انھیں ایرانی انقلاب کے سلسلے میں میرے موقف سے آگہی ہوئی تو میرے یہ پڑوسی سخت کبیدہ خاطر ہوئے، مجھے باصرار اپنے ساتھ بیٹھک میں لے کر آئے اور اہل تشیع کے سیاہ کارنامے، ان کی صحابہ دشمنی اور اسلام کے خلاف ان کی تاریخی سازشوں کا وہ طومار باندھا کہ دل دہل سا گیا۔ نہ صرف یہ کہ اپنی صلابت فکری سے میرا اعتماد متزلزل ہوگیا بلکہ یہ خوف بھی دامن گیر ہوگیا کہ اپنی عقل اور مطالعہ پر حد سے زیادہ بھروسہ کرکے میں نے کہیں اپنی عاقبت کا سودا تو نہیں کرلیا ہے۔ وہ رات مجھ پر بہت سخت گزری، کبھی **لا شیعیہ و لا سنیہ** کے پرکشش نعرے مجھے اپنی طرف کھینچتے اور کبھی سبائی سازشوں کا شکار ہوکر میں خود کو جہنم کے اسفل ترین درجہ میں پاتا۔ رخصت کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ سوادِ اعظم کے ساتھ نہیں رہتے، اپنا الگ راستہ بناتے ہیں انھیں ان کی قوم مسترد کردیتی ہے، بڑی بڑی صلاحیتوں والے لوگ راندۂ درگاہ ہوگئے، آدمی کو ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے جو سوادِ اعظم کے جذبات واحساسات

سے مغائر ہو۔

* * *

ایرانی انقلاب کو یہی کوئی پانچ چھ سال کا عرصہ ہوا ہوگا۔ ایک دن میں اپنے استادِ مکرم جعفر ذکی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ جعفر ذکی صاحب ویسے تو انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن اسلامی تاریخ و آثار پر ان کی گہری نظر تھی۔ شرق و غرب سے واقف، غایتِ دین سے آگاہ، آسانی اور مشکل ہر دو حال میں نگاہیں آسمانوں پر ٹکی، جب بھی دیکھیے، ایسا لگتا کسی نور کے ہالے میں گھرے ہوں۔ تعلق اہلِ تشیع کے طائفے سے تھا لیکن فکر و عمل میں فرقہ بندی کے کسی ادنیٰ شائبہ سے بھی خالی۔ ایک دن ایرانی انقلاب کے حوالے سے مشہور فرانسیسی فلسفی میشل فوکو کا تذکرہ چھڑ گیا، جن کی ابھی چند مہینے پہلے ہی وفات ہوئی تھی۔ ابھی گفتگو ابتدائی مرحلہ میں ہی تھی کہ میرے ایک اور استاد رفیق احمد نقوی صاحب تشریف لے آئے۔

ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں فوکو کی تحریروں سے تو واقف تھا، لیکن مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ فوکو انقلابِ ایران کے پرجوش حامیوں میں بھی رہے ہیں۔ میں نے اس امر پر جب حیرت کا اظہار کیا تو نقوی صاحب نے اپنے مخصوص ظریفانہ لہجہ میں کہا: 'ارے تم فوکو کو نہیں جانتے وہ بھی کسی شیعہ سے کم نہیں تھے، تصویر دیکھی ہے ان کی؟ بالکل شیعہ لگتے ہیں، بالکل ویسے ہی چہرے پر نحوست برستی ہے'۔

'ارے ارے نقوی صاحب!' جعفر ذکی صاحب نے اپنے بے تکلف دوست کو لگام دینے کی کوشش کی۔ شاید میرے سامنے وہ اس بے تکلفی کے اظہار کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔ لیکن نقوی صاحب کہاں رکنے والے تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ کچھ تو چہرے کی ساخت ایسی اور کچھ ان کے جملوں کی کاٹ، کہنے لگے جب میں لکھنؤ میں تھا تو میرے ایک سُنّی دوست میرے نام میں نقوی کے لاحقہ کے سبب مجھے شیعہ سمجھتے رہے۔ ایک دن جب انھیں پتہ چلا کہ میں سُنّی ہوں تو کہنے لگے کہ ارے بھئی ایک تو نام سے غلط فہمی ہوئی اور پھر آپ کے چہرے پر بھی...... یہ کہہ کر انھوں نے قہقہہ بلند کیا، پھر بولے، فوکو کو تو راندۂ درگاہ کر دیا مغربی دانشوروں نے، وہ تو کہیے کہ ان کا کام اتنا وقیع ہے کہ اس کی بازگشت دیر تک سنی جائے گی۔ ورنہ انقلابِ ایران کے حامی کی حیثیت سے ان کا نام کہاں آتا ہے۔ لوگ ان مضامین کا تذکرہ بھی نہیں کرتے جو فوکو نے انقلابِ ایران کی حمایت میں لکھے ہیں۔

فوکو کی ایران کے انقلاب میں دلچسپی کیسے پیدا ہوئی، آخر اس کا سبب کیا تھا، میں نے استاد مکرم سے جاننا چاہا۔

بولے: راشد میاں! سوچنے والا ذہن دُنیا کو شرق و غرب کے خانے میں نہیں دیکھتا، طالب حق کے

لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ اسے کلمۂ حق کی گونج سنائی دے۔ یہ آواز کہاں سے آتی ہے اور کس کی زبان سے نکلتی ہے، اسے اس بات سے غرض نہیں ہوتی۔ فوکو ایرانی انقلاب کے مشاہدے کے لیے خود دوبار ایران گئے اور وہاں سے اصل صورت حال پر اپنا تجزیہ فرانسیسی اور اطالوی اخبارات کو ارسال کرتے رہے۔ پہلی بار جب وہ ایران پہنچے ہیں تو اس سے دو دن پہلے ہی بلیک فرائڈے کا سانحہ پیش آیا تھا، جمعہ کے مظاہرے پر پولیس کی بلا دریغ فائرنگ سے سیکڑوں لوگ شہید ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مظاہرے اسی شدت سے جاری تھے۔ انھیں اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کے باوجود لوگوں کے دل خوف سے خالی اور حوصلوں سے معمور ہیں۔ فوکو نے اپنی زندگی میں اہل ایمان کا کوئی ایسا گروہ نہیں دیکھا تھا جسے خوف چھو کر نہ گیا ہو۔ یہ کون لوگ ہیں، آخر وہ کون سا خیال ہے جس نے پوری قوم میں تبدیلی کے لیے ایک collective will کو جنم دیا، کہیں کوئی نہ کوئی چیز تو ہے جو ایرانی انقلاب کو دُنیا کے دوسرے انقلابی ہنگاموں سے ممتاز کرتی ہے۔

مگر یہ باتیں تو دوسرے مغربی مفکرین اور صحافیوں پر بھی عیاں تھیں۔

بولے: فوکو پہلے سے ہی کھلے ذہن کے آدمی تھے، وہ اسلام کو مغرب مخالف یا جدید اقدار کا مخالف سمجھنے کے بجائے اسے خود اس کے تناظر میں سمجھنے کے اہل تھے۔ جو بات ان کے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث تھی وہ اس انقلاب کا روحانی پہلو تھا، انھوں نے دیکھا کہ اس سیاسی تبدیلی کے پیچھے مذہبی داعیہ کارفرما ہے، لوگ اس انقلاب کو ایک فریضۂ دینی کے طور پر برت رہے ہیں۔ مغرب کا فرانسیسی انقلاب روحانیت سے خالی ایک طرح کی سیکولیریٹی لیے ہوئے تھا۔ اس کے برعکس ایرانی انقلاب میں انھیں روحانیت اور مذہبیت کی جلوہ سامانی نظر آئی اور چونکہ اس انقلاب کا آبشار لوگوں کے اندرون سے بہتا ہے، ان کی اپنی ثقافت و حضارت سے جنم لیتا ہے، اس لیے انھیں شاہِ ایران کی طرح باہر سے برآمد کردہ موڈرنائزیشن کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ فوکو نے انقلاب کو موسٹ ماڈرن اور most insane بتایا، جس نے پہلی بار مغربی نظامِ زندگی پر سوالیہ نشان قائم کر دیا تھا۔ فوکو نے سب سے اہم بات یہ کہی کہ جو لوگ مذہب کو انقلاب مخالف سمجھتے ہیں یا جو سمجھتے ہیں کہ مذہب انقلاب کو اُچک لیتا ہے یا ہائی جیک کر لیتا ہے تو انھیں جاننا چاہیے کہ ایرانی انقلاب میں مذہب نے بنیادی محرک کا کام کیا ہے۔ فوکو نے یہ بھی کہا کہ میں نے ایران میں مذہب کو عقائد کے جامع مجموعے کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ یہاں مذہب عام سماجی زندگی میں جلوہ گر ہے۔

فوکو انقلاب کی اتنی گہرائی تک کیسے پہنچ گئے اور وہ بھی اس حد تک کہ اس کے پرزور وکیل بن جائیں؟

میرے اس سوال پر استادِ مکرم مسکرائے، بولے: شریعتی کو تو پڑھا ہے نا آپ نے، کتنی روشنی ہے ان کی تحریروں میں۔ بہت سے مغربیوں کے لیے ان کی تحریروں میں ایک چونک کا سامان ہے، کوند ہے، تجلی ہے، مشرق کا یہ تناظر انھیں مبہوت کیے دیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک لمحہ کو رکے جیسے کوئی بات اچانک یاد آ گئی ہو۔ پھر بولے: اہلِ تشیع کے ہاں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ جس طرح امام حسینؓ نے خود کو، اسمٰعیل کی طرح، رضائے الٰہی کے سپرد کر دیا تو اب ان کے ماننے والوں کو چاہیے کہ وہ تقیہ پر گامزن رہ کر امام غائب کے ظہور کا انتظار کریں۔ لیکن زیدی شیعیت امام حسینؓ کے عمل کی ایک اور ہی تشریح کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حسینؓ نے آخری وقت تک جدوجہد کی۔ ہمیں بھی تقیہ کے راستے قیام کی منزل کو سر کرنا چاہیے۔ شریعتی نے ان بحثوں کو علوی شیعیت اور صفوی شیعیت کی اصطلاحوں میں سمجھانے کی کوشش۔ انھوں نے کہا کہ شیعیت کی اصل روح سترہویں صدی میں متشکل ہونے والے شیعی اداروں میں نہیں بلکہ امام علی کے ان خطبات میں ہے جس میں انھوں نے اپنے متبعین کو قیامِ انصاف کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی ہے۔

فوکو کو اس بات میں بڑی کشش محسوس ہوئی کہ قیامِ انصاف کا نعرہ روحانیت سے اس قدر مملو ہو کہ وہ اپنے ماننے والوں کے لیے مذہبی فریضہ بن جائے اور اسے اخروی کامیابی کی ضمانت کے طور پر دیکھا جانے لگے اور ہاں راشد میاں! فوکو نے ایک بات بڑی زبردست کہی، یہ کہتے ہوئے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ کہاں لکھا ہے، کبھی گھر آیئے گا تو حوالہ بتاؤں گا۔ انھوں نے خاص طور پر یہ بات کہی کہ لوگ اکثر مارکس کے حوالہ سے مذہب کو افیون کہنے والی تحریر کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن ٹھیک اس جملہ سے پہلے جو انھوں نے لکھا ہے اسے لوگ عام طور پر گول کر جاتے ہیں۔ مارکس نے لکھا ہے کہ مذہب ایک ایسی دُنیا کی روح ہے جو بے روح ہو گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بس اسی طرح یہ سمجھ لیجیے کہ ۱۹۷۸ء کے انقلابی ایام میں ہمیں جس اسلام سے سابقہ پیش آیا ہے اس کی حیثیت افیون کی نہیں بلکہ روحانیت سے خالی اس دُنیا کے لیے ایک روح کی ہے۔

تو پھر اس کے تشیع میں شبہ کہاں رہا۔ نقوی صاحب جو اب تک خاموشی سے ساری گفتگو سن رہے تھے، ان کی رگِ ظرافت پھر پھڑک اٹھی۔

استادِ مکرم مسکرائے، بولے کہ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ فوکو کا ذہن اسلام کے بارے میں اتنا صاف تھا۔ وہ اسلامی حکومت کے قیام اور عہدِ رسول ﷺ میں واپسی کو مستحسن قدر سمجھتا تھا۔ لیکن فوکو کی ان تحریروں کی نہ تو مشرق میں قدر ہوئی، نہ مغرب میں۔

مشرق میں تو ان کتابوں کا چلن ہے، ''دو متضاد تصویریں'' اور ''ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت''، نقوی صاحب نے پھر مداخلت کی۔

علی میاں صاحب کی بات کر رہے ہیں؟

جی ہاں! اور ایک صاحب اور ہیں، منظور نعمانی۔ ان دونوں کی کتابیں دھڑا دھڑ بٹ رہی ہیں، نقوی صاحب نے کہا۔

بڑے افسوس کی بات ہے ان علمائے کرام کی عقل پر حیرت ہوتی ہے، امریکی استعمار کے خلاف اٹھنے والی قوم کے حق میں اگر یہ کلمۂ خیر نہیں کہہ سکتے تھے تو کم از کم خاموش ہی رہتے۔

کیسے رہتے، قوم بھی تو پوچھ رہی تھی کہ ایرانی انقلاب کا ہم کیا کریں، شاید انھیں خطرہ ہو کہ کلمۂ حق کہنے میں سُنّیت کا دامن ہاتھ سے نہ نکل جائے، کلمۂ حق کہنا آسان نہیں ہوتا ہے بھائی، کبھی آسان نہیں رہا، یہ کہتے ہوئے نقوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجلس اختتام کو پہنچی۔

میں نے سوچا، نقوی صاحب شاید صحیح کہتے ہیں، کلمۂ حق کہنا آسان نہیں، وہ ظرافت کے پردے میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جو اگر راست کہی جائیں تو خود کہنے والے کے لیے پشیمانی کا باعث ہوں۔ جب تک توفیق الٰہی شامل حال نہ ہو کلمۂ حق حلق میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ فوکو نے ایرانی انقلاب پر اپنے احساسات کو بلاکم و کاست بیان کیا اور اپنے ہم قوموں میں معتوب قرار پائے، اس کے برعکس ہمارے سُنّی علما نے تحقیق و تجزیے کے بجائے نزاعی بحثوں کو زندہ کیا اور ان کی قوم نے انھیں سروں پر بٹھائے رکھا۔ میں جتنا سوچتا نہ جانے کیوں مجھے بڑے بڑے مذہبیوں کے مقابلے میں فوکو اپنی تمام تر لغزشوں کے باوجود ایک روحانی آدمی معلوم ہوتا، راندۂ درگاہ ہو جانے کے خوف سے خالی۔

* * *

اگلی صبح میں نے ابّا سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ میں نے پوچھا کیا واقعی ایرانی انقلاب کی حمایت میں زبان کھولنا، سواد اعظم سے دور جا پڑنا ہے۔ میری اس تشویش پر وہ مسکرائے، بولے، مولوی سمیع تمھیں کہاں مل گئے، یہ سب مولویوں کے جھگڑے ہیں، تمھارا تو بس فریضہ یہ ہے کہ عقل کو کام پر لگائے رکھو، حق کی تلاش میں سرگرداں رہو اور طلب اگر صادق ہو تو خدا نامراد نہیں کرتا۔ ویسے تمھاری دلچسپی کے لیے کل کے اخبار میں ایک اچھا معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے، دیکھو یہیں کہیں رکھا ہے، اٹھا لاؤ۔ پھر خود ہی بولے: ایک بات جو بڑی امید افزا ہے وہ یہ ہے کہ خمینی کی تحریروں میں مسلسل ایک ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ 'کشف الاسرار' جوان کی ابتدائی تصنیف ہے اس میں وہ شہنشاہیت کے لیے گنجائش پیدا کرتے ہیں، لیکن 'اسلامی حکومت' میں جو

انقلاب سے چند سال پہلے کی تصنیف ہے وہ ولایت فقیہ کا تصور پیش کرتے ہیں اور شہنشاہیت کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ آگے چل کر مستضعفین کی اصطلاح ان کے ہاں انقلاب کا حوالہ اور جواز بن جاتی ہے۔ ان باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ عام روایتی شیعہ علما کے برعکس مسلسل راستے کی تلاش میں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ امامِ غائب کے ظہور میں محض انتظار کرنے کے بجائے انھوں نے پوری شیعہ قوم کو تنظیم و تطہیر کی دعوت دی ہے تاکہ اس عقیدے کے مطابق جب امام آئیں تو اپنے متبعین کو بہتر اور منظم شکل میں پائیں۔

ابّا کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ میں نے اخبار کا وہ مرکزی صفحہ ڈھونڈ نکالا، پورے صفحہ پر پھیلا ہوا ایک طویل مضمون تھا۔ بعض جگہ مضمون نگار نے خمینی کے ایک تازہ انٹرویو کے اقتباسات نقل کیے تھے، انھوں نے *La Monde* اخبار کے رپورٹر کے اس سوال کے جواب میں کہ وہ ایران کو کس قسم کی ریاست بنانا چاہتے ہیں، کہا تھا اسلامی عوامی ریاست۔ پھر نمائندے نے جب یہ وضاحت چاہی کہ کیا 'اسلامی جمہوری ریاست نہیں؟ تو انھوں نے صاف کہا کہ صرف اور صرف اسلامی ریپبلک۔ نہ اس سے کم اور نہ زیادہ۔ یہ پوچھے جانے پر کہ اسلامی ریپبلک سے ان کی کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا تھا کہ ریپبلک سے ان کی مراد وہی ہے جو بالعموم سمجھا جاتا ہے، لیکن اسلامی ریپبلک اس لیے کہ ہمارے نظام کی جڑیں اسلام میں پیوست ہیں، البتہ یہ فیصلہ لوگوں کو کرنا ہے کہ اس کی شکل وصورت کیا ہوگی۔ میں نے اخبار بند کیا، ابّا کی گفتگو جاری تھی، بولے: دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، مستقبل سے بھی صرف وہی واقف ہے، ایک طالب علم کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی جستجو جاری رکھے۔ حق بڑا غیرت مند واقع ہوا ہے، طلب صادق کے بغیر نہیں ملتا اور اگر اس کی قدر نہ کی جائے تو قریب آ کر بھی ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔

مولوی سمیع اپنے پیچیدہ فقہی چیستاں سے مخاطب کو مبہوت کر دینے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے پاس ایسے لاینحل مسائل کی ایک طویل فہرست تھی جس سے دراصل سامع پر علم کی دھاک بٹھانا مقصود ہوتا، مثلاً ایک دن کہنے لگے کہ ایک قافلہ محوِ سفر تھا، راستہ میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، حملہ میں دو مرد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، ان کی بیویاں بھی قافلہ کے ساتھ تھیں، ان کی آہ و بکا سن کر ایک صاحبِ کرامت بزرگ برآمد ہوئے، انھوں نے دونوں مردوں کی کٹی ہوئی گردنوں کو جو الگ پڑی تھیں انھیں شانوں پر رکھا، بارگاہِ ایزدی میں دعا گو ہوئے اور خدا کے فضل وکرم سے گردنیں جڑ گئیں۔ دونوں حضرات پھر سے جوانِ رعنا کی طرح اٹھ بیٹھے۔ یہاں تک تو چلیے قصہ میں حلیۃ الاولیاء اور سیر الاولیاء کی کہانیوں کا لطف آتا تھا، لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ ایک مرد کا سر دوسرے کے تن سے جڑ گیا، اب عورتیں حیران و پریشان کہ ان کا شوہر دراصل کون ہے۔ سر سے اگر شناخت کی جائے تو اجنبی تن کا کیا کریں؟ فیصلہ کیسے ہو، یہ قضیہ اس وقت بھی سمجھ میں نہ آیا اور آج بھی

مولوی سمیع کی جلالت علمی اس سوال کے سہارے اسی طرح قائم ہے۔ ایک دن کہنے لگے، اچھا یہ بتاؤ کہ اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو کیا وہ کوئی ایسا بھاری پتھر بنا سکتا ہے جسے وہ خود اٹھا نہ سکے۔ اسی طرح کبھی معراج کی جسمانی اور روحانی نوعیت کا قضیہ اٹھاتے، کبھی مسیح کی آمد ثانی کی تفصیلات کا اس باریک بینی سے تذکرہ کرتے، جیسے مستقبل کو بچشم خود برپا ہوتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ کبھی ابوطالب کی مغفرت پر سوالیہ نشان قائم کرتے اور کبھی حیات النبی بعد وصال النبی ﷺ کی باتیں کچھ اس طرح کرتے جیسے ابھی ابھی خدمت اقدس میں حاضری دے کر آئے ہوں۔ اُن دنوں پندرہویں صدی کی آمد آمد تھی۔ مولوی سمیع کچھ تو ظہورِ مہدی کی روایتوں سے اور کچھ اپنے تخیل کی مہمیز سے کچھ اس طرح روشنی ڈالتے کہ ایک روشن صبح کا امکان دلوں پر دستک دینے لگتا۔ ایک دن مسجد سے نکلتے ہوئے تقریباً راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، کہنے لگے، کچھ خبر بھی ہے، میں نہ کہتا تھا کہ یہ سبائی نہیں مانیں گے دیکھو وہی ہوا جس کا ڈر تھا، حرمِ مکی دشمنوں کے محاصرے میں ہے، تفصیلات تو ابھی کہیں سے نہیں آ رہی ہیں، البتہ یہ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ یہ سب ایرانیوں کی شرارت ہے۔ یہ کہہ کر مولوی سمیع نے اپنی راہ لی۔ میں نے گھر آ کر تفصیلات جاننے کی کوشش کی۔ مغربی اور خاص طور پر امریکی ذرائع ابلاغ اس واقعے کے لیے ایرانیوں کو الزام دے رہے تھے جبکہ آیت اللہ خمینی نے اس حادثہ کے لیے امریکیوں کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ امریکی خبر تو پیچھے رہ گئی، البتہ خمینی کے بیان کا اثر یہ ہوا کہ مسلم اکثریتی ممالک میں امریکی سفارت خانوں کے سامنے عوامی غیض وغضب نے تشدد کی شکل اختیار کر لی۔ چودہ دنوں تک حرمِ مکی کا محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کا بازار گرم رہا۔ دہلی سے نکلنے والے 'دعوت' اخبار نے ایک باتصویر شمارہ بھی شائع کیا جس میں ان انقلابیوں کی تصویریں شائع کی گئی تھیں، جو حرم پر فوجی کارروائی کے دوران مارے گئے تھے۔ ان تصویروں کے نیچے لکھا تھا کہ دُنیا میں ان کے ساتھ جو ہوا یہ کم عبرت انگیز نہیں، آخرت میں جو ان کے ساتھ ہوگا اس کے تصور سے ہی ہم لرزہ براندام ہوئے جاتے ہیں۔ بعد میں جب اس کارروائی سے پردہ اٹھا تو پتہ چلا کہ نہ تو یہ سبائی سازش تھی اور نہ ہی امریکیوں کا اس میں عمل دخل تھا، بلکہ خود سعودی عرب کی سلفی تحریک کے اندر سے اٹھنے والی ایک صدائے احتجاج تھی۔

مولوی سمیع کی خبروں کا تو میں نے کسی طرح پردہ چاک کر لیا، لیکن ان کے پیچیدہ فقہی مفروضے اور الٰہیاتی مخمصے کے حل کی جب کوئی معقول شکل نہ نکل سکی تو میں نے ان کے ہمالیائی علم کا تذکرہ والد صاحب سے کیا، خاص طور پر حیاتِ مسیح اور ظہور مہدی کے سلسلے میں ان سے رہنمائی کا طالب ہوا۔ اس سے پہلے مکتبہ میں کئی بار غلام احمد قادیانی کے حوالہ سے ظلی اور بروزی نبی کی طویل بحثیں بھی سن چکا تھا۔ مجھے ان کتابوں

سے بھی کسی قدر آگہی تھی جو ان بحثوں کے دوران حوالے کے لیے نکالی جاتی تھیں، خاص طور پر تفہیم القرآن کی چوتھی جلد، جہاں اس قبیل کی بیشتر روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ والد صاحب اس مسئلہ پر کسی شافی جواب سے نوازیں گے، لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ میرے معصوم مخمصہ پر مسکرائے، ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولے، ارمغان حجاز دیکھی ہے، لے کر آؤ۔ میں ارمغان حجاز لے آیا، انھوں نے چند صفحات اُلٹے پھر فرمایا اسے پڑھو، نظم تھی 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'۔ میں جب ان اشعار پر پہنچا:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عین ذات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تو کسی قدر بات سمجھ میں آ چکی تھی۔ آگے چل کر یہ بھی پتہ چلا کہ کلامی مباحث کی یہ فہرست جسے اقبال ابلیس کے مشیروں سے اُچک لینے میں کامیاب ہوگئے تھے، دراصل پرانی فہرست تھی، اقبال بھی یہاں دھوکہ کھا گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ابّا مستقبل بینی کے سلسلے میں کوئی بنا بنایا عقیدہ عطا کرنے کے بجائے اس مسئلہ کو ہماری فکر و تحقیق کے لیے کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔

حرم مکی میں نئی صدی کے دعویدار مجدد کی موت سے اسلامی بیداری کی امیدوں پر اوس پڑ گیا تھا۔ اس واقعہ پر ابھی چند ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ افغانستان میں روسی دراندازی نے امت کے لیے ایک نئی مشکل پیدا کر دی۔ پندرہویں صدی کی پہلی صبح جب جہیمان العتیبہ اپنے چار سو رفقا کے ساتھ حرم مکی کے محاصرے کے خیال سے داخل ہوئے تھے، انھیں شاید توقع تھی کہ وہ نئی صدی کی پہلی نماز میں شاہ خالد کو آلیں گے اور ان کا یہ اقدامی عمل امت میں ایک نئی صبح کا آغاز بن جائے گا۔ لیکن افسوس کہ نئی صبح کی یہ امید ایک بھیانک خون خرابے کی نذر ہوگئی۔ میں نے سوچا آگے پتہ نہیں کیا ہو؟ صحوۃ اسلامیہ کی یہ بیل منڈھے چڑھے گی بھی یا نہیں۔ میں نے مستقبل کے دریچوں میں جھانکنے کی بہت کوشش کی، مگر اپنا علم خام تھا اور سوالات گہرے تھے۔ خیال آیا خدا کی دُنیا تو بڑی وسیع ہے، کیوں نہ آگے قصد کیا جائے۔

۱۶

ملّا شدن چہ آسان

ابّا آج پھر مضطرب دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں حمائل شریف کا وہی نسخہ تھا، انگلیاں درمیانی صفحہ میں دبی تھیں جیسے تلاوت کرتے ہوئے اچانک رک گئے ہوں۔ ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر نہ جانے کیوں خاموش رہے۔ کبھی دور خلا میں گھورتے اور کبھی میری طرف دیکھتے۔ میں منتظر رہا کہ شاید وہ کسی کتاب کو نکال لانے کا حکم دیں یا کسی تفسیری حواشی کو پڑھوا کر سنیں، لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آج وہ کچھ کہنے کے بجائے مجھ سے بہت کچھ سننے کے طالب ہوں۔ میں نے ہمت جٹائی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی لفظ زبان سے نکالتا، میری آنکھ کھل گئی۔ یہ میری علی گڑھ کی پہلی صبح تھی۔ ابھی سفر کی تکان باقی تھی، دل اٹھنے کو نہ چاہتا تھا مگر اس خواب نے میری نیند غائب کر دی۔ مجھے مکتبہ کی مجلسیں یاد آئیں۔ خیالات کے ہجوم سے گھبرا کر میں اُٹھ بیٹھا۔ ایسا لگا، جیسے قدرت نے مجھے کسی مشن پر بھیجا ہو، جیسے بہت سے مضطرب سوالوں کے حل کے لیے میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہو۔

ان دنوں ہر طرف پندرہویں صدی ہجری تقریبات کا غلغلہ تھا۔ علی گڑھ میں بھی طلبا کی اسلامی تحریک کی طرف سے مختلف تقریبات منعقد ہو رہی تھیں۔ سیمینار، مذاکرات، جلسے، جلوس، تقریری تحریری مقابلوں، مشاعروں اور مختلف ثقافتی پروگراموں کی گویا بہار آئی ہوئی تھی۔ ان دنوں تحریک کا قومی دفتر بدر باغ میں واقع تھا۔ تحریری مقابلہ میں اپنا مضمون جمع کرانے کے لیے جب میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صدرِ تحریک کے کمرے میں گرما گرم مناقشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک صاحب بڑے پرجوش انداز سے کہہ رہے تھے کہ فی زمانہ اسلامی تحریک کا مستند قالب ایرانی انقلاب میں جلوہ گر ہوا ہے، اس کے برعکس سعودی عرب میں دعوتِ اسلامی کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی حیثیت کفرِ محض کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دونوں طرف کہنے اور سننے والوں کے پاس اپنے اپنے دلائل تھے، البتہ یہ بات صاف طور پر پتہ چلتی تھی کہ ایرانی انقلاب نے دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے مابین ایک ایسی نزاعی بحث کو جنم دیا ہے جس سے دونوں طرف کم از کم نظری طور پر تلواریں کھنچ گئی ہیں۔ ان دنوں یونیورسٹی کیمپس میں بھی جہاں بڑی تعداد

میں ایرانی طلبا موجود تھے، ان کے باہمی ٹکراؤ کے مناظر عام تھے۔ کبھی کبھی یہ ٹکراؤ کشت وخون تک جا پہنچتے تھے۔ ایرانی طلبا سے جب بھی ملتا تو ایسا لگتا کہ جیسے ان کا وجود ان سے سنبھالا نہ جاتا ہو۔ چند ماہ پہلے ناگپور کے ایک اجلاس میں ایرانی طلبا کا جو وفد اسٹیج پر خطاب کے لیے آیا تھا اس کے لیے بھی سیدھی اور سپاٹ زبان میں اپنی بات رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ دراصل ایرانی قوم ایک ایسے انقلابی عمل سے گزری تھی جس نے اس کے اندرون کی کایا پلٹ دی تھی۔ اس تقلیبِ فکر ونظر کو بیان کرنے کی بھلا ان میں تاب نہ ہوتی۔ لہٰذا جب یہ نوجوان کچھ کہنا چاہتے تو ان کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ کہاں سے شروع کریں اور کہاں ختم۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دو چار جملوں کے بعد ہی ان کی تقریر نعروں میں بدل جاتی۔ ناگپور کے اسی اجلاس میں علی میاں کے ایک نوجوان عزیز جب ان کے نمائندہ کے طور پر اسٹیج پر آئے تو انھوں نے ایرانی انقلاب کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز اس مصرع سے کیا 'میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند' جس پر جلسہ میں شور شرابے اور بدمزگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اب علی گڑھ کے اسلامی حلقوں میں بھی اس تنازع نے شدت اختیار کر لی تھی کہ ایران کا انقلاب اسلامی ہے بھی یا نہیں۔ دوسری طرف ایرانی انقلاب کے حمایتی سعودی عرب سے وابستہ سُنّی علما کو کفر وشرک اور امریکہ کا ایجنٹ قرار دیتے۔ بس یہ سمجھیے کہ اسلام پسند حلقوں میں شیعہ سُنّی کے بہانے سعودی ایرانی سیاست کی خلیج مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ایک دن میں نے بہزاد سے پوچھا کہ باہمی کشت و خون کا یہ سلسلہ آخر کب رکے گا؟ بہزاد عمرانیات کا طالب علم تھا۔ دوسرے ایرانی طلبا کے مقابلے میں اس کے جوش میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور گفتگو میں متانت تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں فیصلے تو ضرور سناتا مگر فریقِ مخالف کے لیے مکالمے کی گنجائش بھی چھوڑ دیتا۔ وہ ہاسٹل میں میرا ہمسایہ بھی تھا اور اچھا ہمسایہ۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی۔ اسے درخت کے نیچے سبزہ زار پر چائے پینے میں شاید خاص لطف آتا۔ ایک دن خود ہی ایرانی طلبا کی باہمی رزم خیزیوں پر اظہارِ افسوس کرنے لگا، بولا: کل تک جو لوگ شاہ کو اُلٹ پھینکنے میں مشترکہ رول ادا کر رہے تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے ہیں۔ لیکن وہ کسی قدر مطمئن بھی تھا کہ امام خمینی مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔ ایک دن میں نے بہزاد سے پوچھا: امام کے لیے اس قدر غیر معمولی عقیدت کا آخر سبب کیا ہے؟ اور یہ کہ تم لوگ انھیں امام کیوں کہتے ہو؟ امام وقت کا ظہور تو ابھی باقی ہے نا؟ میرے اس سوال پر بہزاد مسکرایا، بولا: تمھارا اعتراض درست ہے، اتنی باریکی تک تم کیسے پہنچ گئے، ان کی رسمی حیثیت تو نائب امام کی ہے لیکن عوامی جوش وخروش کے سبب نائب کا لفظ ساقط کر دیا گیا ہے۔ ہم انھیں امام غائب کا بدل ہرگز نہیں سمجھتے، وہ تو بس ان کے نائب ہیں، خادم ہیں جو امام کے ظہور سے پہلے ان کے لیے میدان ہموار کر رہے ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ولی فقیہ کی ہوسکتی ہے اور خمینی اسی

حیثیت سے امورِ ریاست کی نگہبانی کا کام انجام دے رہے ہیں اور شیعی دائرۂ فکر میں یہ بات ایسی کچھ اجنبی بھی نہیں۔ صفوی عہد میں صفوی حکمرانوں کو امام کے نائب کی حیثیت نے ہی حکمرانی کا جواز فراہم کیا تھا۔

پھر مخالفین ان کی اس مذہبی حیثیت کو کیوں نہیں مانتے؟

بولا: اصل بات یہ ہے کہ کمیونسٹ اور سیکولرسٹ اس بات سے وحشت زدہ ہیں کہ ایران میں ملاؤں کی حکومت قائم ہوجائے گی۔ جیسے تمھارے ہاں ہندوستان میں مولویوں کو امورِ سیاست اور حکمرانی کے لیے اہل نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح ہمارے ہاں ایران میں کہا جاتا ہے کہ ملّا شدن چہ آسان، آدم شدن چہ مشکل۔ یعنی ملّا بننا بڑا آسان ہے، لیکن آدمی بننا بڑا مشکل ہے۔ بعض لوگوں کے لیے یہ قبول کرنا مشکل ہورہا ہے کہ امام خمینی کوئی عام مولوی نہیں بلکہ عبقری اور ہمالیائی بصیرت کے حامل قائد ہیں اور انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کرلی ہے جس کی روایتی حوضۂ علمیہ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے ہاں شیعہ فکر میں تو علما کے کلیدی رول کی ایک روایت چلی آتی ہے۔ تم نے واحد بہ بہانی (متوفی ۱۷۹۳ء) کا نام تو سنا ہوگا، اچھا باقر مجلسی کو تو جانتے ہوگے؟

میں نے تائید میں سر ہلایا، بحار الانوار والے مجلسی؟

بولا: ہاں مجلسی تو خیر شیخ الاسلام رہے ان پر تو شیعیت کی تقلیبِ فکری کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ انھوں نے شیعیت کو رسوم میں قید کردیا اور بقول علی شریعتی اس طرح شیعیت، شہادت کے بجائے ماتم کا دین بن گیا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ مجلسی کے پوتے واحد بہ بہانی نے اصولی مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی۔ علما کو اس بات کا اختیار ملا کہ وہ کتاب و سنت اور اجماع و عقل کی بنیاد پر عام لوگوں کے لیے رشد و ہدایت کا سامان فراہم کریں۔ آگے چل کر، قجر عہد حکومت میں، ملا احمد نراقی نے غیبتِ امام میں علما کی حکمرانی کے جواز پر دلائل فراہم کیے۔ شیعہ ایران میں روضہ کی مجلسیں ہمیشہ سے اس بات کا احساس دلاتی رہی ہیں کہ علما نے امام کے غیاب میں کارِ امامت کو کسی حد تک سنبھال رکھا ہے یا کم از کم اس کی یاددہانی پر مامور ہیں۔ کل تک حسین بنام یزید کے رمز سے جو مجلسیں قائم تھیں، آج ایک زندہ انقلاب نے اسے خمینی بنام شاہ کا قالب عطا کردیا ہے۔ ایک طرف نائب امام کی حیثیت سے خمینی نے ولایتِ فقیہ کا منصب سنبھال رکھا ہے تو دوسری طرف جبت و طاغوت پر مبنی مغربی قوتوں کے آلۂ کار شاہ ایران کو دیس نکالا دے دیا گیا ہے، ہمارے لیے اب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ کفر و اسلام کی اس فیصلہ کن جنگ میں امام خمینی کی غیر مشروط حمایت جاری رکھیں۔

بہزاد گہرا آدمی نکلا۔ ٹھہری ٹھہری متانت والے اس شخص سے مجھے اتنی سنجیدہ اور متوازن گفتگو کی توقع

نہ تھی۔ ایرانی طلبا کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ انھیں پڑھنے لکھنے سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں ہوتا۔ اکثر انگریزی زبان میں اظہار خیال سے محروم ہوتے۔ میرے کلاس میں چراغ نام کا ایک ایرانی طالب علم تھا جو اکثر کلاس سے غائب رہتا۔ ایک دن استاد نے سرزنش کی تو بولا: 'سوری سر، آئی گو ڈِلہی، نوٹ ہیئر'۔ استاد کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آئی، مصنوعی کرختگی کے ساتھ بولے: ناؤ نو ڈِلہی، ہیئر ہیئر اونلی۔ ایک طرف جہاں بیرونی طلبا کے ساتھ اس طرح کے لطائف پیش آتے رہتے تھے وہاں بہزاد کے فکر و خیال کی پختگی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی اور دُنیا کا آدمی ہے۔

ایک دن ایرانی طلبا کی انجمن نے ایک نمائش کا اہتمام کیا۔ خوبصورت ایرانی پوسٹروں کی گویا ایک باڑھ سی آ گئی تھی۔ کہیں آیاتِ قرآنی، کہیں امام خمینی کے اقوال اور کہیں بیک گراؤنڈ میں انقلابِ ایران کے تصویری مناظر۔ طلبا کے کمرے جو اب تک فلمی اداکاروں کی تصویروں یا مغربی دانشوروں کے اقوال سے مزین ہوتے تھے، اب دیکھتے دیکھتے ان کی جگہ ایرانی پوسٹروں نے لے لی تھی۔ اس نمائش میں بہزاد کی بڑی قدر و منزلت دیکھی۔ اس موقع پر ایک تقریر بھی ہوئی تھی جس میں دہلی سے آنے والے مقرر نے اس بات کو واشگاف کیا تھا کہ ایرانی انقلاب امت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اسے سُنّی شیعہ کے خانوں میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ اقبال لاہوری کی احیائی شاعری اور سید قطب کی انقلابی تحریروں کے بغیر یہ انقلاب شاید ممکن نہ ہوتا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ خمینی کے خاص شاگرد خامنہ ای، جو آگے چل کر آیت اللہ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے، خود ان کے قلم سے سید قطب کی دو کتابوں کے فارسی تراجم شائع ہوئے ہیں۔ مقرر نے یہ بھی بتایا کہ فدائینِ اسلام کے بانی نواب صفوی نے ۱۹۵۴ء میں خاص طور پر سید قطب سے ملاقات کے لیے مصر کا سفر بھی کیا تھا۔ ان دونوں عبقریوں کے ہاں حاکمیت الٰہ اور جدید جاہلیت کے تصورات میں بڑی حد تک یگانگت اور ہم آہنگی ہے، دونوں ہی اس بات کے قائل ہیں کہ مغربیت کے مقابلے کے لیے مشترکہ شیعہ سُنّی جد و جہد کی بنا ڈالی جائے۔ خمینی کے منظر عام پر آنے سے پہلے سُنّی انقلابی فکر نے ایرانیوں کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنالی تھی، اس لیے ایرانی انقلاب کو صرف شیعی فکر کے ثمرے کے طور پر دیکھنا اس سے ناانصافی ہوگی۔ انقلاب سے بہت پہلے خمینی کے خاص نمائندہ ابراہیم یزدی مغربی ممالک میں اخوانی قائدین کے رابطے میں تھے۔ پھر علی شریعتی کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے انقلاب کو سرخ ملا عطا کیے۔ ان گوناگوں فکری مداخلتوں کے نتیجے میں انقلاب کا خمیر تیار ہوا۔

نمائش سے لوٹتے ہوئے میرے ذہن پر یہی سوال حاوی رہا کہ جس انقلاب کی بنا میں سُنّی مفکرین کی تحریریں کام میں آئی ہوں اسے مشترکہ ثمرے کے طور پر قبول کرنے میں آخر کون سی چیز مانع ہے۔ خلیج کی

مسلم ریاستیں ایرانی انقلاب سے اس قدر خائف کیوں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ سُنّی علما، جو عرب ممالک میں صحوۃ اسلامیہ کے نقیب کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایرانی انقلاب سے مغائرت کو آخر کیوں روا رکھا ہوا ہے۔

ایک دن ہاسٹل کو لوٹتے ہوئے بہزاد سے ملاقات ہوگئی، بڑی گرمجوشی سے ملا، چائے کی دعوت دی جو میں نے فوراً قبول کرلی۔ الماری سے ایک مختصر سا کتابچہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے کہ یہ ایک چھوٹا سا ہدیہ ہے استاد مرحوم کی تحریروں کا، اسے غور سے پڑھنا۔ اس کے لفظ لفظ میں انقلاب بند ہے، میں کیا بتاؤں، تم خود پڑھ کر دیکھنا۔ میں نے کتابچہ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ علی شریعتی کے نام سے تو میں واقف تھا، لیکن اب تک ان کی تحریروں کے بالاستیعاب مطالعہ کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔

شریعتی اور استاد مرحوم، کیا مطلب؟ میں چونکا۔ میں نے پوچھا، شریعتی سے تمھارا کیا رشتہ، کیا تم ان سے کبھی ملے ہو؟ میرے اس سوال پر فخر و انبساط کی ایک لہر اس کے چہرے پر آئی اور پھر چند ثانیے کے لیے خاموش ہوگیا، ایسا لگا جیسے کچھ یاد کر رہا ہو۔ پھر بولا، استاد کی مجلسیں میری خوشگوار یادوں کا بہترین سرمایہ ہیں، انھیں میں کبھی نہ بھلا پاؤں گا، اسے تو میں سجا سجا کر اپنی یادوں کے آئینہ خانے میں رکھتا ہوں، کتنے مبارک تھے وہ لمحات جب استاد بولتے اور ہم جیسے نو وارُدوں کو ایسا لگتا کہ دل و دماغ کے غبار دھلتے جا رہے ہوں، ان کی ہر مجلس ہمیں ایک نئے اعتماد سے سرشار کرتی۔ ایسا لگتا جیسے آنکھیں دیکھنے لگی ہوں، جیسے تاریکی چھٹتی جا رہی ہو۔ یہ کہتے ہوئے بہزاد آبدیدہ ہوگیا۔ میں نے سوچا میرا اندازہ صحیح تھا۔ بہزاد تو واقعی گہرا آدمی نکلا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ماضی میں کھو گیا ہو۔ بولا: میں استاد کی مجلسوں کا کیا ذکر کروں۔ حسینیہ ارشاد میں جب ان کا خطبہ ہوتا تو نوجوانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ جو بھی ان کی مجلس میں ایک بار بیٹھ جاتا اس کی فکر و نظر کی دُنیا بدل جاتی۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ بہزاد روایتی حوضۂ علمیہ کے پروردہ ہیں۔ میں نے پوچھا: شریعتی کی شاگردی میں آپ کو کتنا عرصہ گزارنے کا موقع ملا۔ بولے: ویسے تو میری ابتدائی تعلیم قُم میں ہوئی لیکن حسینیہ ارشاد میں شریعتی کے ساتھ گزرنے والے چند ماہ ان سب پر بھاری ہیں۔ منہجِ تنقید کیا ہوتا ہے، مطالعہ کیسے کیا جاتا ہے۔ یہ سب ہمیں ان کی صحبت سے ملا۔ لیکن افسوس کہ ان کی باتیں اب بھلائی جا رہی ہیں، انھیں مغربی فلسفہ اور مارکسزم کے اسیر کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ انھوں نے فرنز فینن اور سارتر سے ہمیں متعارف ضرور کرایا لیکن وہ مغرب کے وکیل ہرگز نہیں تھے۔ وہ تو مغربی مفکرین کی تحریروں کو نقد و تجزیے کے منہج کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے مغربی فکر و فلسفے کو fallacy سے تعبیر کیا اور اس کا سقم واضح کرنے کی کوشش

کرتے رہے۔ ہم جیسے لوگ جن کی جلت پھرت صرف روایتی دانش گاہوں تک محدود تھی، ان کی مجلسوں کے طفیل ہم اس لائق ہوئے کہ اجنبی فکر وفلسفے کا تنقیدی مطالعہ کریں اور بغیر کسی تحفظ فکری کے اپنے دل و دماغ کے دروازے کچھ اس طرح کھلے رکھیں کہ روشنی ہر سمت اور ہر جہت سے داخل ہو سکے۔

بہزاد کی باتوں سے صاف لگتا تھا کہ وہ اہل ایران کے ہاتھوں شریعتی کی ناقدری سے سخت نالاں ہیں۔ میں نے پوچھا: آخر کیا وجہ ہے کہ شریعتی انقلاب کے بعد سرکاری سرپرستی سے محروم ہیں، انھیں انقلاب کے فکری مؤسس کے طور پر کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ میرے اس سوال پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئے، ایسا لگتا تھا جیسے میں نے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ بولے: سیاست کی اپنی مصلحت ہوتی ہے۔ شریعتی روایتی علما کے خاندان سے ضرور تھے، لیکن ان کی اعلیٰ تعلیم فرانس میں ہوئی تھی، وہیں ان کی ملاقات فرانسیسی مفکر سارتر سے ہوئی اور اسی دوران انھوں نے فینن کی تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ سب باتیں شریعتی کے لیے مابعد انقلاب ایران میں منفی حوالہ بن گئیں۔ امام خمینی نے ان کی تحریروں کو مغربی حوالوں کے سبب، Westoxification سے تعبیر کیا۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ آنے والے دنوں میں شریعتی کو انقلاب ایران کے فکری مؤسس کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی؟

میرے اس سوال پر وہ کسی قدر چونکے پھر سنبھالا لیا۔ بولے: شاید امام سے شریعتی کو سمجھنے میں غلطی ہوئی اور شاید اس لیے بھی کہ انھوں نے مروّجہ صفوی شیعیت کی بساط ہی لپیٹ دی تھی جو ان کے خیال میں ماتم کا دین بن گیا تھا، جبکہ علوی شیعیت شہادت کا دین ہے جو بلاخوف لومۃ لائم سنگین ترین حالات میں بھی ہمیں کلمۂ حق کہنے پر ابھارتا ہے۔ کیا پتہ ہم اصطلاحات کی باریک بینی میں کچھ اس طرح الجھے کہ اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔

بولے: انقلاب کے بعد عوامی ریفرنڈم کے وقت یہ تجویز آئی تھی کہ ایران کو (Islamic Democratic Republic) بنایا جائے۔ ڈیموکریسی کے لفظ پر امام کو سخت اعتراض تھا۔ اس وقت امام خمینی نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کسی لاحقہ کا محتاج نہیں۔ اسلام کا لفظ ہی ہمارے لیے کفایت کرتا ہے۔ ایران صرف اسلامی ریپبلک ہوگا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ اصولی طور پر تو یہ بات بالکل درست تھی لیکن شریعتی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مغرب کے سخت ناقد کے بجائے مغربی اصطلاحوں کے شارح اور اس سے اثر پذیر نظر آئے۔ خالص اسلامی مفکر کے لیے طبقۂ علما

سے باہر کسی شخص کو استناد ملنا مشکل ہو گیا۔ حالانکہ طبقۂ علما میں آج جو لوگ بھی تمھیں انسان نظر آتے ہیں ان کی بنیاد میں استاد مرحوم کی تقریروں اور تحریروں کا بڑا دخل ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو، شریعتی اپنی تحریروں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھیں کسی ریاست کی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ بہزاد کے لہجے میں اب کسی قدر احتجاج اُبھر آیا تھا۔ مجھے اپنے استاد کے تئیں ان کی بے لوث محبّت اور وفاداری پر بے پناہ پیار آیا، میں نے کتابچہ اٹھایا اور اگلی ملاقات تک کے لیے رخصت لی۔

۱۷

خونریز ہنگامے

ایرانی انقلاب کی نمائش نے کیمپس میں ایک نئے تنازع کو جنم دیا۔عرب طلبا کی انجمنوں جو بنیادی طور پر فلسطینی، عراقی اور یمنی طلبا پر مشتمل تھیں، نے ایرانی انقلاب کے بڑھتے اثرات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اب عرب انجمنوں کی طرف سے بھی ایسے چھوٹے بڑے پروگرام ہونے لگے جس میں ایران عراق جنگ کو عرب وعجم اور شیعہ سُنّی کے پیراڈائم میں دیکھا جانے لگا۔ گو کہ صدام حسین نے جب ایران پر چڑھائی کی تھی اس وقت انھوں نے خود کو عجم کے مقابلہ میں عرب تہذیب کے نمائندے کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن عرب سُنّی ریاستوں کی صدام کی حمایت کے سبب رفتہ رفتہ اس جنگ کو شیعہ سُنّی تنازعے کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ ابتداً عراقی شیعوں نے صدام کی بھرپور حمایت کی، لیکن جب جنگ شیعہ سُنّی کے تناظر میں دیکھی جانے لگی تو عراقی شیعوں کے جوش وخروش میں کمی واقع ہوگئی۔ اِدھر شام کی حکومت، جو اسلامی ایران کی حمایتی تھی، اس نے حما میں شامی اخوان المسلمین کے خلاف عسکری کارروائی میں بیس ہزار سے زیادہ اخوانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اخوانی نظری طور پر ایرانی انقلاب کے حامی تھے، لیکن ایران کی حمایت یافتہ اسد حکومت کے ہاتھوں انھیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔صورت حال خاصی پیچیدہ تھی۔ شیعہ سُنّی، عرب عجم، اسلام اور کفر یا محض حصولِ اقتدار؟ آخر ان خونریز ہنگاموں کے پیچھے اصل محرک ہے کیا؟

ایک دن جب میں بہزاد کے کمرے میں بیٹھا تھا، وہیں سامنے سے محمود کا گزر ہوا۔محمود عرب یونین کا سکریٹری تھا، کسی قدر آزاد خیال، حسِ مزاح سے بھرپور۔ وہ اکثر مجھے فجر میں بیدار کرنے کے لیے دروازہ پر دستک دیتا، لیکن کبھی خود مسجد میں نظر نہ آتا۔ ایک دن میں نے نمازوں میں مسلسل اس کی غیر حاضری کا سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ میں تم لوگوں کو نماز کے لیے اٹھا کر ثواب حاصل کر لیتا ہوں اور یہ فی نفسہٖ کم اہم کام بھی نہیں۔ محمود ابھی تازہ تازہ وطن سے لوٹے تھے، سفر کی صعوبتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے، ڈائریکٹ فلائٹ نہ ہونے کے سبب بڑی پریشانیوں کا سامنا رہتا ہے، پھر ساری کلفتوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ نوابی شان کے ساتھ سفر کے الگ ہی مزے ہیں۔ ’رائل جورڈنین ایرلائنز‘، نام سے ہی نوابی

ٹھاٹ باٹ ٹپکتی ہے اور ہاں سنو، میرا خیال یہ ہے کہ عرب نوابوں کے دن ابھی اور خراب ہونے والے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک بڑی خوفناک جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

جی ہاں! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ جس طرح خلیج کی عرب ریاستوں نے صدام کی پشت پناہی کر رکھی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ برادرکشی کی یہ جنگ ابھی لمبی کھنچے گی، بہزاد نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

بولے: نہیں میں ایران عراق جنگ کی بات نہیں کر رہا، میرا اشارہ تو اس خانہ جنگی کی طرف ہے جس کا خمیر اس وقت پورے عالم اسلام میں تیار ہو رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ہم اہل یورپ کی طرح تیس سالہ مذہبی جنگ کا ایندھن بننے جا رہے ہیں، اگر ایک بار یہ شعلہ بھڑک اٹھا تو اسے بجھانا بہت مشکل ہوگا۔

'اجنبی طاقتیں یہی چاہتی ہیں کہ ایرانی انقلاب سے جو زبردست اقدامی انرجی پیدا ہوئی ہے اسے شیعہ سُنّی کی خانہ جنگی میں الجھا دیا جائے۔' بہزاد نے انقلاب کی مدافعت کی کوشش کی۔

'قصور تو دونوں ہی کا ہے، ہم صرف عرب حکومتوں کو الزام نہیں دے سکتے۔ ایران سے اٹھنے والی ہر آواز، خواہ وہ خود کو متحدہ امت کے قالب میں کیوں نہ پیش کرے، اسے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ مختلف عرب ملکوں کی شیعہ آبادی ان کے لیے ہراول دستے کا کام کرے گی۔ وہ عرب شیعہ آبادی کو منظم کرنے کے لیے مسلسل اقدامات بھی کر رہے ہیں۔ پھر یہ کیسے سمجھا جائے کہ ان کی دعوت مسلکی آلودگی سے پاک متحدہ قالب کی امین ہے۔'

مگر امام نے تو مستضعفین کو متحد کرنے کی بات کہی ہے، بہزاد نے لقمہ دیا۔

عملاً کیا ہو رہا ہے اسے بھی تو دیکھو۔ انقلابِ ایران کے بعد اہل تشیع کے خیمے میں غیر معمولی ہلچل ہے۔ افغانستان، عراق، بحرین، کویت اور سعودی عرب ہر جگہ شیعہ آبادی کو منظم کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ عراق میں پچپن فیصد شیعہ آبادی ہے، بحرین میں بھی اہل تشیع کی اکثریت ہے، کویتی شیعوں کے ایک وفد سے ابھی حال ہی میں امام خمینی نے ملاقات کے بعد انھیں یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مستضعفین کی ایک ایسی پارٹی بنائیں جو انھیں بین الاقوامی طور پر منظم کر سکے۔ سُنّی ریاستوں کو اب یہ فکر دامن گیر ہے کہ اپنے ہاں بسنے والی شیعہ آبادی کو کیسے قابو میں کیا جائے۔ ابھی پچھلے دنوں لندن کے ایک رسالہ الدستور کے حوالہ سے یہ خبر آئی ہے کہ الاحساء جو سعودی عرب کے مشرق میں شیعہ آبادی کا علاقہ ہے وہاں بھی ایک زیر زمین انجمن وجود میں آ گئی ہے۔ ادھر بیروت میں حزب اللہ کے نام سے جو لوگ منظم ہو رہے ہیں ان کی مسلکی شناخت بھی سب پر عیاں ہے۔ پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی انقلاب شیعیت کا نہیں بلکہ اسلام کی احیا کا پروگرام ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کے پیش نظر عالم اسلام کی سطوت کی بحالی کا منصوبہ ہو، لیکن عملی طور پر آپ یہ

کام اپنے شیعہ ہم قوموں کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں جہاں شیعہ آبادی ہے اسے آپ انقلابی چھاؤنیوں کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کی تنظیم نو کے لیے ریاستی وسائل کام پر لگا رہے ہیں۔ اس طریقۂ کار سے سُنّی دُنیا کا متوحش ہونا فطری ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اس طرح ایرانی حکومت نے عرب ریاستوں کو خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ شیعہ جارحیت کے مقابلے میں سُنّی اسلام کے چمپئن کی حیثیت سے سامنے آئیں۔

'مگر ایک بات اور بھی ہے جو ہمارے لیے حیران کن بھی ہے اور تشویشناک بھی۔'

'وہ کیا؟' محمود نے پوچھا۔

عرب دُنیا کی وہ اسلام پسند تنظیمیں جنھیں ہم **صحوۃ اسلامیۃ** کا حصہ مانتے ہیں اور وہ حضرات جو فکر اسلامی کے عالی مقام قائدین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں وہ اس مسلکی جنگ میں کیسے خوشی خوشی شامل ہو گئے؟ اب عالم یہ ہے کہ صحوہ قائدین سنی اسلام کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ عالم اسلام سیاسی اور فکری طور پر دو خیموں میں بٹ گیا ہے۔ شیعہ اسلام کی قیادت انقلابی ایران کے ہاتھوں میں ہے اور سنی اسلام کی قیادت سعودی عرب کر رہا ہے جسے سلفی/ اخوانی اسلام پسندوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ دونوں طرف اسلام کے نام لیوا اپنے اپنے سیاسی آقاؤں کے مفادات کے لیے سرگرم ہیں۔ اس ہنگامے میں اسلام تو اب کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے وضاحت کی۔

'تمھاری بات کسی حد تک درست ہے۔' بہزاد نے تائید کی۔ بولا: اس دھماکہ خیز صورت حال کے لیے صحوۃ اسلامیہ کے قائدین بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ انھوں نے مجرمانہ طور پر اصل حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ دوسروں کے مقابلے میں انھیں اس بات کا کہیں بہتر اندازہ ہے کہ ایران کا انقلاب عالمِ اسلام کے لیے کس قدر زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہے۔ ایران سے امریکی استعمار کی رُخصتی پورے خطے کے لیے فال نیک ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے علمبردار عین فیصلہ کن لمحات میں انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے اپنا وزن مخالف خیمے میں ڈال دیں۔

'ہاں یہ بات حیران کن تو ہے بلکہ کسی قدر پریشان کن بھی۔ تمھارا کیا خیال ہے، سُنّی اسلام پسندوں کے لیے امام خمینی کی قیادت کے مقابلے میں امریکی سرپرستی والی ملوکیت کو قبول کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ کیا صحوۃ کے قائدین کی آنکھوں پر طمع دُنیا نے پٹیاں باندھ دی ہیں یا اس کی وجہ کچھ اور ہے۔' میں نے محمود کی رائے جاننا چاہی۔

بولا، میں یہ تو نہیں کہتا کہ سُنّی علما اور دینی تحریکوں نے آخرت کا سودا کر لیا ہے، یہ کہنا بہت بڑی

جسارت ہوگی۔ ہاں مجھے یہ ضرور لگتا ہے کہ یہ لوگ واقعات وحوادث کا صحیح تجزیہ کرنے میں ناکام رہے اور بالآخر کچھ تو اپنی سادہ لوحی کے سبب اور کچھ ان کی سہل پسندی نے انھیں رخصت کی راہ پر گامزن کردیا۔ اصل میں ہوا یہ، اب میں تمھیں کیسے بتاؤں، اس بات کو سمجھنے کے لیے جہیمان العتیبہ کی تحریک کے پس منظر کو بھی سمجھنا ہوگا۔ جہیمان کے بارے میں عوامی سطح پر بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ابھی حال ہی میں کویت سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے صورہ فی رحاب مکة۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جہیمان سعودی اخوان کی دوسری تیسری نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہی اخوان جنھوں نے سعودی ریاست کے قیام میں عبدالعزیز ابن سعود کی مدد کی تھی۔ اخوان سلفی اسلام کی خالص بدویانہ تحریک ہے، اسے اخوان المسلمین کے ساتھ خلط ملط مت کرنا۔ اب ہوا یہ کہ جہیمان نے سعودی عرب کو جب مغرب زدگی کی راہ پر دیکھا تو اس نے اس عمل پر سخت احتجاج کیا۔ پولیس نے اسے اس کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ پھر شیخ بن باز کی مداخلت کے سبب اسے رہائی مل گئی۔ اسے شیخ بن باز کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔ البتہ جب اس نے پندرہویں صدی کے آغاز کے موقع پر حرمِ مکی کا محاصرہ کرلیا اور عبداللہ قحطانی کو نئی صدی کے مجدد کے طور پر پیش کیا تو شیخ بن باز کے لیے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس کی دادرسی کو آتے۔ اس واقعہ نے عالم اسلام کو سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا کردیا تھا۔ سعودی حکومت کے سامنے بھی حرمِ مکی کو بزور بازو خالی کرانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ جہیمان تو مارے گئے لیکن سعودی حکومت کی مغرب نواز پالیسی پر ان کی تنقید زندہ رہی۔ اُدھر ایران اسلام کے حوالہ سے قیادت کا دعویدار تھا، اب سعودی حکومت کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ بچا کہ وہ خدمت اسلامی کی مہم میں ایک ایسی پالیسی اپنائے جو نہ صرف یہ کہ ایران سے کہیں بڑھ کر ہو بلکہ جہیمان کے اعتراضات کو بھی باطل کردیتی ہو۔ لہٰذا ریاست نے سلفی علما، جو مصری اخوان کے زیر اثر صحوۃ اسلامیہ کے امین اور نقیب سمجھے جاتے تھے، ان کی بھرپور سرپرستی کا ارادہ کرلیا۔ سعودی اور ایرانی ریاست کے مابین خدمت اسلامی کے حوالے سے مسابقے کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اگر ایک طرف امام خمینی کو نائب امام کی حیثیت سے ولی فقیہ کے منصب کی دعویداری تھی تو دوسری طرف شاہ فہد نے خود کو جلالۃ الملک کے بجائے خادم الحرمین کہنے میں عافیت جانی۔ اسی دوران افغانستان میں روسی دراندازی کا واقعہ پیش آ گیا۔ امریکہ نے جہاد افغانستان کی سرپرستی کا عزم کیا جس میں سعودی عرب اور پاکستان کو کلیدی رول ادا کرنا تھا۔

اب دیکھیے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، یہ کہتے ہوئے محمود ایک لمحہ کو رُک کے پھر اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے دو متبادل خیموں کی نشان دہی کرتے ہوئے بولے: اب انقلابِ اسلامی ایران اور اس کی دعوتِ وحدت وانقلاب کے مقابلہ میں سعودی عرب کے پاس صحوۃ کے قائدین تھے، اسلامی تحریکیں تھیں اور

افغانستان میں کمیونسٹ روس کے خلاف امریکہ کی سرپرستی میں اسلامی جہاد کا عظیم الشان منصوبہ تھا۔ شیعہ ایران کے مقابلے میں سُنّی جہاد کے اس متبادل بیانیے میں، جہاں مقابلہ خدا بیزار روس سے تھا، یقیناً کشش زیادہ تھی۔ یہ نیا بیانیہ کچھ اس سرعت سے مرتب ہوا اور آگے بڑھا کہ صحوۃ کے قائدین اس تبدیلی کا کماحقہ ادراک نہ کر سکے، وہ محض اس بات پر خوش تھے کہ حکومت نے حرم مکی کے محاصرے سے سبق لیتے ہوئے ملک میں اسلام نوازی کے کاروبار کو اپنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ قربانی تو جہیمان اور اس کے رفقا نے دی تھی، البتہ اس سے پیدا ہونے والی زبردست تخلیقی انرجی کے سہارے صحوۃ کے قائدین ساری دُنیا میں جلسوں اور کانفرنسوں کے حوالے سے جہازوں میں اڑتے پھرے۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ جہاد و دعوت کے نام پر اب امریکی خارجہ پالیسی کا حصہ بن چکے ہیں۔

مجھے محمود کے اس تجزیہ پر بڑی حیرت ہوئی، اسلامی حلقوں میں اب تک میں نے جتنی باتیں سنی تھیں اس سے ایک طرح کی بے چینی کا اظہار تو ضرور ہوتا تھا لیکن محمود نے، ایسا لگتا تھا، جیسے سارے منتشر اجزا کو باہم مربوط کر دیا ہو، جیسے صورت حال کی ایک واضح تصویر سامنے آ گئی ہو۔

* * *

چند سال بعد جاڑے کی ایک سرد شام کا قصہ ہے۔ میں چند احباب کے ساتھ پشاور کے ایک ریستوران میں بیٹھا تھا، گفتگو جہادِ افغانستان پر چل رہی تھی تبھی ایک صاحب نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا کہ روسی اثرات کے علاقوں میں امریکی خفیہ ایجنسی قرآن مجید کی ترسیل و اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے۔ پہلے تو یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہ آئی، لیکن جب ان صاحب نے مزید تفصیل بتائی کہ ازبک زبان میں قرآن مجید کے تراجم بڑے پیمانے پر چھاپے جا رہے ہیں۔ امریکی ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ اس طرح سوویت یونین کے اندرونی علاقوں میں وہ جہاد کی منتقلی میں کامیاب ہو جائیں گے۔

'ایسا تو نہیں کہ وہ ہمارے جذبۂ جہاد کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں؟'

بولے: استعمال تو دراصل ہم انھیں کر رہے ہیں۔ اب تم دیکھنا! پیسہ ان کا، جنگی ساز و سامان ان کا، ٹیکنالوجی ان کی اور وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ روسیوں کے مقابلے میں ہماری مدد کریں۔ انھیں اندازہ ہے کہ سرخ فوج کا راستہ ہم ہی روک سکتے ہیں۔ وہ قرآن مجید کا مقامی ازبک ترجمہ خوشی خوشی بانٹ رہے ہیں تاکہ جہاد کی یہ آگ سوویت یونین کے اندرون تک پہنچ جائے۔

یہ سب سن کر میری تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا، میں نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہیں کہ اسلامی تحریک جو مدت سے ایک آزاد ریاست کا خواب دیکھ رہی ہے اور جو اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانیوں کے

لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرتی رہی ہے، وہ امریکی استعمار کے ہاتھوں نفسیاتی اور جذباتی طور پر ہائی جیک ہورہی ہے اور ہمیں جوشِ جہاد میں اس بات کا اندازہ نہیں ہورہا ہے، ورنہ امریکیوں کو بھلا قرآن مجید کی اشاعت میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔

بولے: ارے بھئی خدا جس سے کام لے اور جسے چاہے اپنی کتاب کی تحمیل کا شرف بخشے۔

بجا فرمایا مگر یہاں معاملہ تحمیل کا نہیں۔ یہ بات آپ کیوں بھولے جاتے ہیں کہ امریکیوں نے کتاب کو قبول نہیں کیا ہے، وہ تو اپنے سرمایہ دارانہ ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے ہمارے جذبۂ جہاد کا استعمال، بلکہ کہہ لیجیے کہ استحصال کررہے ہیں۔ انھیں اندازہ ہے کہ مسلمان شوقِ شہادت میں جان دے سکتا ہے، انھیں قرآنی آیات شہادت پر مہمیز کرتی ہیں اس لیے ازبکستان کے اسٹریٹیجک علاقوں میں جہاں عرصہ سے مسلمانوں پر خوابیدگی طاری ہے وہ قرآن مجید کے تراجم کے ذریعہ زندگی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سب کے پیچھے اصل مقصد کسی نظامِ انصاف کا قیام نہیں بلکہ امریکی استعمار کے تفوق اور اس کی فتح کا داعیہ ہے۔

بولے: یہ بات تو وقت بتائے گا کہ کس نے کس کو استعمال کیا، ہمارے پاس سردست اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے کہ امریکیوں کی اس فیاضانہ مدد کو پوری خوش دلی اور جذبۂ تشکر کے ساتھ قبول کریں۔

۱۸

شیخِ علی گڑھ کی مجلس میں

علی گڑھ میں میری آمد کے چند ہی ہفتوں بعد میری رسائی شیخِ علی گڑھ احمد سورتی صاحب کی مجلسوں تک ہوگئی۔ سورتی صاحب جنرل ایجوکیشن کے ایک مؤقر استاد تھے۔ فرسٹ ایئر کے طالب علموں کو سائنس اور سوسائٹی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ جنرل ایجوکیشن کا تصور یہ تھا کہ علوم کے مختلف شعبوں میں اختصاص کے سبب طلبا کے اندر مجموعی سرمایے سے ناآگہی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس کا کسی قدر ازالہ ہوجائے، لہٰذا آرٹس کے طلبا کو سائنس اور اس کی سماجیات اور سائنسی اکتشافات کے نتیجے میں بدلتے معاشرے پر پڑنے والے اثرات جیسے عناوین اس کورس کا حصہ تھے۔

ایک دن کلاس میں بحث اقدار (values) پر چل نکلی۔ شر کیا ہے، خیر کیا ہے، حق اور ناحق کیا ہے، یہ سب اضافی قدریں ہیں یا حتمی یا ان دونوں کے مابین اقدار کا پینڈولم مسلسل گردش میں رہتا ہے۔ بنے بنائے مسلّمات کو وہ تحلیل وتجزیے کی میز پر کچھ اس شان سے لاتے کہ ان کی حتمیت کا اعتبار جاتا رہتا۔ ایک دن لیکچر کے دوران ڈرامائی سرعت کے ساتھ پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک طالب علم کے قریب پہنچے اور اس سے پوچھا کہ کیوں بھئی، اگر تمھیں عزت اور دولت دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑے تو کس چیز کو ترجیح دو گے؟ پھر زور کا ایک قہقہہ بلند کیا، بولے: لو بھئی ایک اور سادہ لوح کا سراغ ملا، انھیں بھی عزت چاہیے۔ ارے بھئی خالی خولی عزت لے کر کیا کرو گے، دولت تو اپنے ساتھ خود عزت لاتی ہے، انسانوں کے معائب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ طالب علم بیچارہ حیران، ایک نئے مخمصے سے دوچار۔

اقدار کے اضافی ہونے کی بحث کچھ اسی شان سے الگ الگ جہتوں سے چلتی رہتی۔ کچھ دنوں بعد ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ آئیڈلزم اور پریگمیٹزم کے مابین سیاہ وسفید کے علاوہ ایک بڑا علاقہ ان دونوں رنگوں کے سرمئی امتزاج کا بھی ہے جسے ہم اپنی عقل وفہم کے مطابق پورے اخلاص اور شرح صدر کے ساتھ اختیار کرسکتے ہیں۔ یہ اسٹریٹیجک فیصلہ زمان ومکان اور حالات وحوادث کے تابع ہوتا ہے اور اسے ہی شخصی اجتہاد کہتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو انسان محض مسلّمات کا آٹومیشن بن کر رہ جائے۔

ایک دن لائبریری سے نکلتے ہوئے استادِ محترم سے آمنا سامنا ہوگیا۔ میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ پوچھا: کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا: آج کل ویلیوز کے اِسنس کی تلاش میں ہوں۔ یہ سن کر مسکرائے، بولے: ارے بھئی تم تو کام کے آدمی لگتے ہو۔ پھر پوچھا: ان دونوں باتوں میں فرق سمجھتے ہو، کام کا آدمی ہونا اور کام سے لگ جانا۔ بڑی بڑی صلاحیتیں کام سے لگ کر ضائع ہوجاتی ہیں، کوئی گورنر بنا، کوئی وزارت کے منصب پر پہنچا، کسی کو سفارت ملی اور کوئی نائن ٹو فائیو کے اوقات کا اسیر ہوگیا۔ دُنیا نے کچھ اس طرح کام سے لگایا کہ اعلیٰ خیالات کی آبیاری یا ایک نئی دُنیا بنانے کا خواب نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

سورتی صاحب سے یہ ملاقات میرے لیے ان کی مجلسوں میں حاضری کا اجازت نامہ بن گئی۔ اب جب بھی موقع ملتا ان کی مجلس میں جا بیٹھتا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر ہویدا ہوتی، صدیق میاں چائے کی ٹرے لیے آتے۔ گرین لیبل کو ایک خاص وقت تک دَم دینا اور پیالیوں کو ایک خاص درجۂ حرارت تک جوش دینے کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ہمیشہ اسی التزام کے ساتھ چائے آتی جس کے پینے کے بعد کہیں اور چائے پینے کا جی نہ چاہتا۔ سورتی صاحب کی مجلس میں طرح طرح کے لوگ ہوتے۔ پائپ پینے والے دانشوروں سے لے کر جبہ و دستار کے حامل اہل علم تک، ہر کوئی یہاں اپنی حاضری کو سعادت جانتا۔ خاص بات یہ تھی کہ بزرگ اساتذہ اور نامی گرامی پروفیسران کی اس مجلس میں ہم جیسے طلبا کو بھی برابر کا شراکت دار سمجھا جاتا۔ ایک دن جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر خورشید الاسلام کو پہلے سے موجود پایا۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں پائپ سنبھال رکھا تھا جس سے وقفہ وقفہ سے دھواں اڑاتے جاتے اور درمیان میں جو موقع ملتا اسے اپنے فرمودات سے پُر کردیتے۔ بات ابوالاعلیٰ مودودی کے اس خطبے کی ہورہی تھی جو انھوں نے ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کی دعوت پر دیا تھا اور جسے بعد میں 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے' کے نام سے شائع بھی کیا گیا۔ خورشید الاسلام غالباً خود اس جلسہ میں شریک تھے، فرمارہے تھے: بھلا بتایئے ان کا مارکسزم کا کیا مطالعہ، پھر تخصیص کے ساتھ، تحقیق کے ساتھ اور معین طور پر انھوں نے کوئی علمی تنقید بھی تو نہیں کی، بس سرسری طور پر مسترد کردیا۔ سوئپنگ اسٹیٹمنٹ دینا تو بڑا آسان ہوتا ہے، یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف کیا اور دھویں کے مرغولے بنانے میں مصروف ہوگئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابوالاعلیٰ مودودی جیسے عبقری کو جنھوں نے بیسویں صدی کی مسلم فکر کو متاثر کیا ہے، ان حضرت نے کس طرح دھویں کے چند مرغولوں میں نپٹا دیا۔ جی چاہا کہ ان سے اسٹریچی ہال کے اس جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال پوچھوں، لیکن ادب مانع رہا۔ کسی پائپ کش دانشور سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا، البتہ چند ثانیے بعد انھوں نے کمالِ انکسار سے جب یہ بات کہی کہ بھئی میں تو ایک ادنیٰ مارکسسٹ ہوں تو مجھے

اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ یہ صاحب بھی حضرتِ مارکس کی عقیدت میں لت پت ہیں۔ عقیدت خواہ پیر صاحب کی ہو یا اپنے ممدوح اسکالر کی، یہ انسان کو صحیح تحلیل وتجزیے کے لائق نہیں چھوڑتی۔

ایک دن اقبال انصاری صاحب، جو خیر سے ہمارے انگریزی کے استاد بھی تھے اور جن کے پاس شیکسپیئر تنقید کا پرچہ تھا، سورتی صاحب کی مجلس میں مسئلۂ خیر وشر پر گفتگو فرما رہے تھے۔ شر کیا ہے، اس کا اصل منبع کہاں واقع ہے، انسانی رزمیہ میں اس کی کارفرمائی اور پھر حضرتِ انسان سے اس کا محاسبہ اور اس طرح کے دسیوں اعتراضات جو مختلف فلسفیوں نے بیان کیے ہیں اور جس پر کوئی حتمی گفتگو، نہ اب تک ہوئی ہے اور شاید نہ کبھی ہو سکے گی۔ یہ سوالات اقبال صاحب کے اسلوبِ خاص میں کچھ اس طرح الجھے جیسے خیالات کی جلیبی بن گئی ہو۔ کچھ تو ان کے اظہارِ خیال کا یہ طریقہ کہ جملے کبھی مکمل نہیں ہوتے۔ ابھی ایک جملہ یا کوئی بات مکمل بھی نہ ہوتی کہ دوسرے جملے اور دوسرے خیال کو آ لیتے۔ بیچ میں سائل کے لیے کوئی وقفہ نہ ہوتا، خود ہی فرماتے کہ نہیں نہیں آپ نہیں سمجھے اور پھر فرمودات کا اٹوٹ سلسلہ جاری رہتا۔ اتفاق سے خیر وشر کے یہی مسائل شیکسپیئر کے رزمیے کو پڑھاتے ہوئے بھی سامنے آ گئے۔ میں نے استاد محترم کے ان ہی لاینحل سوالوں کو کلاس میں طالب علمانہ شان سے ان کے سامنے مرصع کر دیا۔ بات پا گئے لیکن غضبناک ہونے کے بجائے سکوت میں عافیت جانی۔ چند دنوں بعد ایک علمی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ گفتگو اس بات پر مرکوز تھی کہ کافر کون ہے؟ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اساتذہ کی اس مجلس میں انھوں نے مجھ جیسے طالب علم کو بھی اظہارِ خیال کے لیے نامزد کر رکھا تھا۔ طالب علم کو اس کی پوری شخصیت کے ساتھ تسلیم کرنا، اس کے انفرادی خیالات کو اہمیت دینا اور اسے یہ حق دینا کہ اپنے محدود علم وتجربے کے باوجود وہ بھی ایک رائے رکھنے کا اہل ہے۔ شاید کسی ایسی ہی تربیت گاہ کا نام یونیورسٹی یا اکیڈمی ہوتا ہے۔ یہ محض ہم جیسے طلبا کی خوش قسمتی تھی کہ ہمیں یونیورسٹی کے اندر چل رہی اس یونیورسٹی تک رسائی حاصل ہوگئی تھی، جس کی قیادت شیخِ علی گڑھ احمد سورتی صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔

ایک دن سورتی صاحب اپنے کمرے میں اداس بیٹھے تھے۔ میں نے اس سے پہلے انھیں کبھی اس طرح بجھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ بولے: ارے بھئی تمھیں نہیں معلوم اِریک فرام کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ کون ہے؟ میں نے پوچھا۔ پھر کسی قدر حیرت سے بولے: تم اریک فرام کو نہیں جانتے، ارے بھئی بڑا وقیع کام ہے ان کا، یہ کہتے ہوئے انھوں نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور میرے سپرد کرتے ہوئے بولے: یہ آپ کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ سوچا، دیکھوں تو سہی ہمارے سورتی صاحب کو ان کی موت کا اس قدر صدمہ کیوں ہے۔ پہلا ہی باب disobedience یعنی انکار سے متعلق تھا۔ مصنف کا کہنا تھا کہ اگر انکار نہ ہوتا تو انسانی

رزمیے میں رنگ کیسے بھرا جاتا۔

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

لیکن بات ابلیس کے انکار پر ختم نہیں ہوگئی، انکار ایک مثبت قدر بھی ہے۔ دُنیا میں نظامِ جبر کے خلاف جن لوگوں نے بھی آواز اٹھائی ہے اور جو لوگ بھی طاغوت کے انکاری رہے ہیں، جنھیں ہم انقلابی صفات کا حامل سمجھتے ہیں اور جن کے دَم سے انسانی تہذیب کی تابانی قائم ہے، یہ سب لوگ بنیادی طور پر نظامِ وقت کی نافرمانی کے مجرم ہیں۔ چلیے یہ بات تو ہوئی کفر بالطاغوت کی۔ صفحات پلٹے تو ایک جملہ پر جا کر نگاہ اٹک گئی۔

'ہماری معیشت کے صحت مند ہونے کے لیے لازم ہے کہ ہمارے انسان ناصحت مند ہوں'

کیا مطلب؟ مصنف کا کہنا تھا کہ ہم جسے معیشت کی نمو کہتے ہیں خاص طور پر سرمایہ دارانہ معاشرے میں جہاں دولت کی ریل پیل اور معیارِ زندگی کے بلند ہوتے ہوئے مظاہر دیکھنے کو مل رہے ہیں تو اس کے پیچھے دراصل ان بے شمار انسانوں کی محرومی ہے جو اس دولت کو پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، لیکن انھیں اس کے ثمرات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کا یہ تضاد اس کے مستقبل کے لیے کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ مصنف کا کہنا تھا کہ ۱۹۵۸ء کا امریکہ انسانی تاریخ کے بہترین ایام میں شمار کیا جائے گا کہ مرفہ الحالی کی یہ دُنیا اس سے پہلے وجود میں نہیں آئی، لیکن خود اس کا وجود میں آنا ہی خطرے کی گھنٹی ہے کہ اس کو برقرار رکھنے اور اسے آگے لے جانے میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو محرومی کی بھینٹ چڑھانا ہوگا۔

ایک بات جو ذرا دل کو چھوتی ہوئی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ہر شخص پیدا تو کسی نہ کسی طائفے میں ہوتا ہے، البتہ اسے چاہیے کہ وہ اس طائفے کا اسیر رہنے کے بجائے اس سے باہر آنے اور اپنے خودمختار وجود کی تشکیل میں سرگرداں رہے، اسی کو fully born ہونا کہتے ہیں۔ بہت سے لوگ دُنیا میں پوری طرح پیدا ہوئے بغیر ہی انتقال کر جاتے ہیں۔ اپنے خول سے باہر آنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ incest کی تعریف بھی بڑی دلچسپ معلوم ہوئی: یعنی ماں کے وجود میں حفاظتی حصار کے تلاش کی کوشش۔ بقول مصنف یہ کام بڑا مشکل ہے کہ آپ اپنے وجود کو پوری طرح خودمختار حیثیت عطا کریں، ورنہ ماں ہو یا خاندان یا طائفہ یا وہ نظری گروہ یا قوم جس کا آپ خود کو نقیب سمجھتے ہیں، اس کی شناخت کو اپنی شناخت جانتے ہیں تو اس میں بڑی عافیت کا سامان ہے۔ لیکن اگر آپ اسی نظری گروہ کا حصہ بنے رہے تو پھر آپ کی علیحدہ پیدائش ہوئی کہاں؟ یہ اور اس قسم کی دسیوں باتیں جو مختلف انداز سے کہی گئی تھیں اس میں ایک طرح کی چونک تھی۔ فرائیڈ کے بعض مسلّمات کا مصنف نے سخت ابطال کیا تھا جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ علمی دُنیا میں

بڑے بڑے اساطینِ فن کے منارے بھی زمیں بوس کیے جاسکتے ہیں۔

دوسرے دن سورتی صاحب کو کتاب واپس کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ ویسے تو ان صاحب کے ہاں fully born ہونے پر اتنا اصرار ہے کہ اگر آپ بنے بنائے فکری سانچے سے باہر نہ نکلے تو گویا دُنیا میں آپ کا وجود میں آنا ہی محل نظر ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خود یہ اپنے بارے میں یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ میں دراصل ایک سوشلسٹ ڈیموکریٹ ہوں۔ میرے اس اعتراض پر سورتی صاحب مسکرائے، بولے: گوکہ آپ کی بات میں وزن ہے، لیکن نتائج پر اتنی جلدی نہیں پہنچنا چاہیے۔ پہلا مرحلہ شبہ کا ہے اور پھر جب آپ شبہ کے بارے میں شبہ کرنے لگیں تو سمجھیے کہ یقین کی سمت میں آپ گامزن ہو گئے ہیں۔

جنرل ایجوکیشن سینٹر جہاں سورتی صاحب کا دفتر واقع تھا، مختلف قسم کی غیر نصابی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔ کسی گوشہ سے موسیقی کے طلبا و طالبات کے ریاض کی آوازیں آتیں تو کہیں تھیٹر کے شائقین اگلے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف نظر آتے اور کہیں فلم کلب کے شائقین اگلی ڈاکومینٹری کی نمائش کا پروگرام بناتے دکھائی دیتے۔ رائٹرس فورم کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے ذمّے ادب وثقافت اور فلسفہ وسیاست جیسے موضوعات پر مجالس کے انعقاد کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔ ہفتے عشرے میں شام ڈھلے جلسوں کا انعقاد ہوتا۔ درختوں کے نیچے سبزہ زاروں پر قطار اندر قطار کرسیاں بچھادی جاتیں، اساتذہ آرام دہ صوفوں پر فروکش ہوتے۔ ذائقۂ کام و دہن کے لیے چائے اور نمک پاروں کا اہتمام ہوتا۔ کبھی شعر و ادب کی محفل سجتی تو کبھی دوسرے علمی موضوعات پر مقالے پڑھے جاتے۔

ایک بار سویڈن سے روحانیوں کا ایک طائفہ آیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ روحانی ارتکاز کے ذریعہ ہمارے دلوں کی دُنیا کو روشن کرسکتا ہے، بلکہ اگر اسے سالکین کا طلب صادق حاصل ہوجائے تو عجب نہیں کہ چند دنوں میں ہماری لطیف روحیں اپنے جسم کے ساتھ فضا میں یوں معلق ہوجائیں جیسے روئی کے گالے۔ انھوں نے ہمیں مختلف قسم کے رنگین تعارفی کتابچے بھی دکھائے جس میں کچھ لوگ فضا میں معلق اور مائل بہ پرواز دکھائے گئے تھے۔ خیال دلچسپ تھا، کچھ اساتذہ اور کچھ طلبا اس روحانی تجربہ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اب لیجیے ایک نئی مشق شروع ہوئی۔ سالکین کی آنکھیں بند ہیں اور وہ اس بات کی عمداً کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی خیال انھیں چھو نہ جائے۔ پہلے مرحلے میں دل و دماغ کو تمام تر خیالات اور تمام تر وساوس سے پاک کرنا تھا تاکہ دوسرے مرحلے میں اعلیٰ وارفع خیالات کا داخلہ ممکن ہوسکے۔ چند دنوں تک صبح و شام یہ مجلسیں آباد ہوتی رہیں، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ روحانیوں کا یہ طائفہ اچانک کوچ کرگیا اور فضا میں معلق پھرنے کی حسرتیں ہمارے دلوں میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔

۱۹

عقوبت گاہ کا 'مسلمان'

طالب علمانہ زندگی کی یہ تمام مسرتیں جو ایک ناقابل بیان حظ سے معمور تھیں، افسوس کہ عین عید کے دن اسی روایتی حادثے کا شکار ہوگئیں جن سے منقسم ہندوستان میں ہندوستانی مسلمان روزِ اوّل سے نبرد آزما ہیں۔ مراد آباد میں عید کے مجمع پر پولیس کے بے دریغ اور ظالمانہ فائرنگ کی خبریں تھیں۔ سیکڑوں لوگ پولیس کی گولیوں سے مرے اور سیکڑوں کی بھگدڑ میں جان گئی، جن میں ایک بڑی تعداد معصوم بچوں کی تھی۔ سیکولر ہندوستان میں مسلمانوں کو عید کا یہ سرکاری تحفہ تھا مسز گاندھی کی وزارتِ عظمیٰ اور ویر بہادر سنگھ کی وزارت علیا میں عطا ہوا تھا۔ دوسرے دن اخبارات میں جو تصویریں شائع ہوئیں ان میں ایک تصویر جوتوں کے ڈھیر کی تھی۔ یہ وہ جوتے تھے جن کے پہننے والے اب اس دُنیا میں نہیں رہے تھے۔ فوٹوگرافر نے شاید اس خیال سے یہ تصویر چھاپی تھی کہ یہ جوتے ناظرین سے بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان جوتوں سے بھی درد و کرب کی متعدد کہانیاں باہر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، لیکن یہ مرتے، دم توڑتے انسانوں کے آہ و کرب میں ڈوبے آخری لمحات کی کفایت تو نہیں کر سکتے تھے۔ چھوٹے سائز کے طفلانہ جوتوں کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا کہ ان معصوموں نے عیدگاہ سے لوٹتے ہوئے عیدی کے پیسوں سے نہ جانے کیا کچھ خریدنے کا پروگرام بنایا ہوگا۔ ماؤں نے کس پیار و محبّت سے بچوں کو سجا بنا کر روانہ کیا ہوگا۔ نہ جانے اب یہ معصوم کہاں ہوں۔ جوتوں کے ڈھیر تو محض اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ یہاں سے موت کا کوئی قافلہ گزرا ہے، لیکن اس موت کے پیچھے حقیقی انسانوں کی آہ و بکا تک ہماری رسائی نہیں کرتے۔ میری نگاہوں میں یہ تصویر کچھ اس طرح بسی کہ ایک مدت تک نمازیوں کے یہ جوتے، ایسا لگتا جیسے باہم کلام کرنے لگے ہوں۔ برسوں بعد جب میری رسائی ہالوکاسٹ میوزیم تک ہوئی اور میں نے وہاں جوتوں کے ڈھیر اور انسانی بالوں کے ذخیرے کمالِ احتیاط کے ساتھ سجے دیکھے تو مجھے اندازہ ہوا کہ آثار و تذکار خواہ پوری بات نہ کہہ پاتے ہوں، ایک لمحہ کے لیے ناظر کے وجود میں جھرجھری کی کیفیت پیدا تو کر ہی دیتے ہیں، جیسے سراسیمگی کی ایک رو اس کے

سر سے پیر تک گزر گئی ہو۔ البتہ اس وقت نمازیوں کے جوتوں کی اس تصویر کو میں پوری طرح (decipher) نہ کرسکا۔

دن گزرتے گئے، تفصیلات چھن چھن کر آتی رہیں بلکہ یہ کہیے کہ قومی پریس اور حکومتی مشینری مسلمانوں کے اس قتل عام پر پردہ ڈالنے کی منصوبہ بند کوشش کرتی رہی۔ پہلے تو اس قتلِ عام کو ہندو مسلم فساد باور کرانے کی کوشش کی گئی اور پھر یہ کہہ کر سارا الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا گیا کہ ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ انھوں نے پولیس پر سنگباری کی جس کے نتیجے میں پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ سرکاری طور پر مرنے والوں کی تعداد ڈھائی تین سو بتائی گئی جبکہ آزاد ذرائع ڈھائی تین ہزار جانوں کے اتلاف کی خبر دے رہے تھے۔ ایم جے اکبر جو اُن دنوں نوجوان صحافی کی حیثیت سے ابھر رہے تھے، انھوں نے مرادآباد سے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ پی اے سی نے چالیس ہزار مسلمانوں کے مجمع پر جو عید کی نماز کے لیے جمع ہوئے تھے، بلا دریغ گولیاں چلائیں۔ کتنے لوگ مرے یہ کہنا تو مشکل ہے، ہاں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مرادآباد میں جو کچھ ہوا وہ ہندو مسلم فساد نہیں تھا بلکہ پولیس کے ذریعہ مسلمانوں کا قتل عام تھا، جسے فساد کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی گئی۔ ٹائمز آف انڈیا نے اس قتلِ عام کی ذمہ داری مسلمانوں کے فرقہ وارانہ رویے پہ ڈالی اور اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اس کے پیچھے خلیجی ممالک سے آنے والے پیسوں کا بھی ہاتھ ہے، حتیٰ کہ اکونومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی (EPW) جیسے جریدے نے بھی، جسے غیر جانبدار حلقوں میں اعتبار حاصل تھا، اس قتلِ عام کی ذمہ داری مسلمانوں کے ''فرقہ پرست رہنماؤں'' اور مسلم لیگ جیسی تنظیموں کے سر ڈال دی۔ عیدگاہ میں فی الواقع مسلمانوں پر کیا گزری، بدنام زمانہ پی اے سی نے نہتے مسلمانوں اور معصوم بچوں کو کس طرح تہہ تیغ کیا، یہ کہانی ذرائع ابلاغ کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

ہمارے ایک کلاس فیلو تھے حلیم احمد صدیقی۔ یہ صاحب عمر میں ہم لوگوں سے خاصے بڑے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں بی اے کے خیال سے علی گڑھ آئے تھے، لیکن اپنے بعض گھریلو حالات کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اب سات سالوں کے بعد اپنی غربت کے باوجود دوبارہ پڑھنے کی ہمت جٹائی تھی۔ ان کے جملوں میں ایک خاص قسم کی کاٹ ہوتی اور جب یہ بیان پر آتے تو الفاظ کا ایک طلسم بنا دیتے۔ لطائف و حکایات کا ان کے پاس انبار تھا جسے وہ اپنے مخصوص قسم کے حس مزاح کے ساتھ دوآتشہ بنا دیتے۔ کبھی کبھی ان کی بلوغ بیانی اہل مجلس کو شرمسار بھی کرجاتی۔ ایک دن قرۃ العین حیدر سے مل کر آئے — جو ان دنوں یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مقیم تھیں — اور ان کے خدوخال پر یہ تبصرہ کرڈالا کہ کھنڈرات بتاتے ہیں کہ محل اچھا رہا ہوگا۔ حلیم صاحب کو افسانہ نویسی کا شوق تھا اور شاعری کو بھی ان سے امان

نہیں تھا۔ جب بھی ملتے کچھ نہ کچھ سنانے کی تاک میں رہتے، البتہ ان کی تحریر سے کہیں زیادہ لوگ ان کی دلچسپ گفتگو سننے کے مشتاق رہتے۔ عید کی چھٹیوں کے بعد جب کلاسیں شروع ہوئیں تو حلیم بھائی بہت دنوں تک غائب رہے، پھر اچانک ایک دن دبے پاؤں کلاس میں کچھ اس طرح داخل ہوئے جیسے ان کے قالب میں کوئی اور آبسا ہو۔ ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ حلیم بھائی اس طرح بجھے بجھے، خاموش، زندگی سے خالی، حسرت و یاس کی تصویر کیسے ہوسکتے ہیں۔ کلاس کے بعد لڑکوں نے انھیں گھیر لیا، صورت حال جاننا چاہی۔ حلیم بھائی کے دل پر بوجھ تھا، وہ آنسوؤں کی شکل میں باہر آ گیا۔ کہنے لگے: میں پتہ نہیں کیوں زندہ بچ گیا، مجھے بچنا نہیں چاہیے تھا۔ میرے بھائی نے آخر کیا قصور کیا تھا، اسے کیوں مارا گیا۔ اسی نے تو گھر کا سارا بوجھ سنبھال رکھا تھا۔ میں علی گڑھ آتو گیا ہوں لیکن نہ آتا تو کیا کرتا۔ وہاں پولیس والے تاک میں ہیں، ہر لمحہ گرفتاری کا ڈر۔ ایک تو گھر اجڑا، خاندان تباہ ہوا اور اب جھوٹے مقدمات کا سلسلہ۔ یہ سب کہتے ہوئے حلیم بھائی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ ہم لوگوں نے انھیں تسلی دی، ہمت بندھانے کی کوشش کی، لیکن ہم بھی جانتے تھے کہ اس بے بسی کا مداوا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس ملک میں مسلمان ہونے کا مطلب ہے کہ آدمی مسلسل خوف میں جیتا رہے تا آنکہ ظالم کی گولی خوف سے اسے رہائی دلا دے۔

دو چار دن بعد جب حلیم بھائی کے حواس بحال ہوئے تو انھوں نے مربوط گفتگو شروع کی۔ بولے: میں رہنے والا تو امروہے کا ہوں لیکن عید کے موقع پر ہم لوگ ننہال میں تھے۔ میرے بھائی نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ مجھے اب بھی اس کی آنکھوں میں منجمد خوف کی وہ کیفیت پوری طرح یاد ہے۔ ظالموں نے اسے طبی سہولت بھی نہ ملنے دی۔ کیا پتہ کسی دم جی اٹھتا، اس بات کا شاید مجھے زندگی بھر قلق رہے۔

حلیم بھائی عیدگاہ سانحہ کا جب بھی تذکرہ کرتے چند جملوں سے آگے نہ چل پاتے، ایسا لگتا جیسے الفاظ ان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہوں۔ ایک دن بہتر موڈ میں تھے، خود ہی کہنے لگے جانتے ہو میں خون کے اس دریا سے باہر کیسے آیا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی ہمت پر حیرت ہوتی ہے بلکہ بزدلی کہہ لو۔ دراصل ہوا یہ کہ پولیس فائرنگ کے بعد جو بھگدڑ مچی تو اس میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ کون کہاں گیا۔ بھائی کے مرنے کا تو مجھے معلوم تھا، لیکن نانا اور ماموں بھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ میں کئی دنوں تک قبرستان کے چکر لگاتا رہا۔ پولیس کے ٹرکوں میں جو لاشیں پڑی تھیں انھیں پہچاننے کی کوشش کی۔ ہسپتال میں مجروحین کے درمیان اپنوں کو تلاش کیا لیکن نہ کہیں ماموں کا پتہ چلا اور نہ نانا کہیں نظر آئے۔ جب اس واقعہ کو چھ سات دن گزر گئے اور ساری امیدیں دم توڑ گئیں تو ایک دن ماموں چھپتے چھپاتے گھر واپس آئے۔ آدھی رات کو دروازے پر دستک ہوئی، ہم لوگوں کا

خوف سے برا حال۔ یا خدا! اب کون سی نئی مصیبت آئی ہے۔ بہت پس وپیش کے بعد دروازہ کھولا۔ ماموں کو دیکھ کر حیرت ہوئی، جان میں جان آئی۔ آپ اچانک اس طرح پراسرار انداز میں کہاں سے وارد ہو گئے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ بولے: کیا بتاؤں یقین نہیں آتا مگر جب زندگی پر بن آتی ہے تو انسان کیا کچھ نہیں کر لیتا۔ پولیس فائرنگ کے بعد کچھ دیر تک تو مسلمانوں نے پولیس والوں کا بڑی ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن جب پولیس کی کمک آ گئی اور انھوں نے جانوروں کی طرح ہمارا شکار کھیلنا شروع کیا تو جان بچانے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ رہا۔ میں نے قریبی قبرستان میں پناہ لی اور جب وہاں بھی پولیس کی چلت پھرت کا اندازہ ہوا تو ایک ٹوٹی بوسیدہ قبر میں اندر گھس کر بیٹھ گیا۔ تین دنوں تک بھوکا پیاسا وہیں پڑا رہا۔ خطرہ کم ہوا تو ایک قریبی عزیز کے ہاں پہنچا۔ شہر کے مسلم علاقوں میں اب بھی پولیس کے درندے مسلمان مردوں کی تلاش میں تھے۔ اب سوچو کہ عیدگاہ سے انھیں گھر واپس پہنچنے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔

اور نانا کا کیا بنا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: نانا تو گھر سے گرفتار کر کے لے جائے گئے تھے، ان کی طبیعت ناساز تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ پولیس وین سے اسیران میں سے جب کوئی باہر نکلتا تو پولیس کے وحشی درندے لاٹھی ڈنڈوں سے اس پر ٹوٹ پڑتے۔ نانا کو سر پر چوٹ لگی، سو خون کا فوارہ نکل آیا، ان کی سفید داڑھی سرخ ہو گئی۔ لیکن پولیس والوں کو اس پر بھی رحم نہ آیا۔ کسی نے انھیں ٹھوکر ماری، وہ زمین پر گرے اور پھر زندہ نہ اٹھ سکے۔ یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔ بولے: ماموں بھی بس یہ سمجھو کہ بس زندہ ہیں مگر زندگی کی کوئی خوبو اُن میں اب باقی نہیں ہے۔ زندہ لاشہ کہہ لو۔ قبرستان کی پناہ گزینی نے شاید ان سے زندگی کی ساری رمق چھین لی ہے۔ ان کی بے بسی دیکھ کر نانا کی موت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کم از کم وہ مُردوں کی سی شان سے اپنی قبر میں تو جا سوئے۔ مصیبت تو ہم زندہ رہنے والوں کی ہے، جنھیں زندگی بھی مُردوں کے انداز سے بسر کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی پھر آبدیدہ ہو گئے۔ وہ شاید کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن میں نے اسی پر اکتفا کرنا مناسب جانا، مبادا ان کے ضبط کا بندھ ٹوٹ جائے۔

جنرل ایجوکیشن سینٹر میں سورتی صاحب نے گریٹ بک کلب بھی بنا رکھا تھا جو گاہے بہ گاہے اہم اور شہرۂ آفاق کتابوں پر مذاکرے منعقد کرتا۔ اس کے سکریٹری عبدالمجید شمسی ہمارے ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ شمسی یوں تو انجینیئرنگ کے طالب علم تھے، لیکن ادب وفلسفہ میں ان کی خاصی دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتے۔ انھیں نادر کتابوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے میں وہ دو چار ہفتوں پر دہلی میں منعقد ہونے والے سنڈے بازار کا چکر بھی لگا لیا کرتے تھے۔ شمسی کے کمرے میں اوپر تلے کتابیں

ہوتیں، اکثر تازہ مگر پرانی کتابیں۔ ایک دن ان کے ہاں پرائمو لیوی کی دو کتابیں دکھائی دیں۔ ایک کا نام تھا Periodic Table جسے میں پہلی نظر میں کیمسٹری کی کوئی کتاب سمجھا۔ دوسری کتاب کا نام تھا (If this is a Man) جو خودنوشت سوانح قسم کی چیز معلوم ہوتی تھی۔ پتہ چلا کہ مصنف کا تعلق اہل یہود کے طائفے سے ہے اور یہ داستان ان ایام کی ہے جب انھیں دس ماہ تک نازی جرمنی کی عقوبت گاہ میں گزارنے پڑے تھے۔ میرے لیے کسی یہودی مصنف کی آپ بیتی پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں نے شوقِ تجسس میں اسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا میرے انہاک میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ تجربہ کچھ جانا پہچانا سا ہو۔ آدھی کتاب کسی قدر عجلت میں ختم ہوگئی، حالانکہ ہر صفحہ پر رک کر سوچنے کو جی چاہتا تھا، لیکن یہ جاننے کی بھی جلدی تھی کہ ان عقوبت گاہوں میں انسانوں کے ہاتھوں انسانوں پر کیا گزری، یہاں تک کہ کتاب کے اس باب میں آ پہنچا جس کا عنوان تھا The Drowned and the Saved یعنی بارے میں ان لوگوں کے جو ڈوبے اور جو بچا لیے گئے۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ جرمنی کی ان عقوبت گاہوں میں سب سے نچلے درجے کے قیدیوں کو جن کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہ گئی ہو، عرف عام میں مسلمان کہا کرتے تھے۔ مسلمان کا مطلب تھا ایک ایسا قیدی جس کی صحت مسلسل روبہ زوال ہو، جس کی افادیت جبری مزدوری یا کسی جسمانی کام کے لیے ختم ہو کر رہ گئی ہو اور اب اس کا اگلا ٹھکانہ گیس چیمبر کے علاوہ کوئی اور جگہ نہ ہو۔ ایسے قیدی کو نہ کوئی دوستی کے لائق سمجھتا نہ اس کی مدد کی جاتی حتیٰ کہ اس کا ذکر زبان پر لانے میں بھی لوگ تکلف سے کام لیتے۔ ایک ایسا شخص جس کی افادیت صفر ہو کر رہ گئی ہو اپنے ساتھیوں کی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ عقوبت گاہ کا یہی اصول تھا۔

To he that has, will be given; he that has not, will be taken away.

ایک ایسی عقوبت گاہ میں جہاں ہر شخص ہمدردی کا مستحق تھا 'مسلمان' کے لیے ہمدردی کا اظہار بھی ایک غیر ضروری شے سمجھی جاتی تھی کہ ہمدردی کے چند بول کی بھی قیمت ہوتی ہے، اسے ایسے شخص پر کیوں ضائع کیا جائے جس کا کوئی مستقبل نہ ہو، جس کے لیے گیس چیمبر کے دروازے بس وَا ہونے ہی کو ہوں۔ قیدیوں میں اگر کسی کی اہمیت تھی تو وہ ان کی افادیت کے سبب تھی۔ ڈاکٹر، درزی، موچی، گلوکار، باورچی یا پھر خوبرو لڑکے عقوبت گاہ کے جرمن اہلکاروں سے رابطہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ انھیں کام کا آدمی سمجھا جاتا یا پھر عام قیدیوں میں وہ لوگ جو نازی اہل کاروں کو عقوبت گاہ کے انتظام و انصرام میں امداد بہم پہنچاتے، اپنے ہی ہم قوموں کو قابو میں رکھنے کی ترکیبیں بتاتے۔ یہ لوگ عرف عام میں کاپو کہے جاتے۔ جرمن آفیسروں کی تعداد تو بہت تھوڑی ہوتی، عقوبت گاہوں کا سارا انتظام و انصرام دراصل کاپو ہی انجام دیتے

جو اپنے ہم قوموں کی نفسیات سے واقف تھے اور انھیں قابو میں رکھنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ یہ یہودی کاپو بسااوقات جرمن نازیوں سے بھی کہیں زیادہ سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے۔ انھیں خوف تھا کہ اگر انھوں نے انتظام و انصرام میں کوئی نرمی برتی تو ان کی جگہ کسی دوسرے کو یہ خدمت تفویض کردی جائے گی اور انھیں اس عہدے کے سبب جو رعایات وعنایات حاصل ہیں وہ جاتی رہیں گی۔ یہ کاپو اپنے عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے ہم قوموں پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتے۔ ان کے پاس کوئی دوسرا متبادل بھی نہ تھا۔ یا تو کاپو بنیں اور اس منصب کو برقرار رکھنے کے لیے تمام اخلاقی حدوں کو پار کر جائیں یا پھر سیدھے سادے بے وقعت قیدی بن کر 'مسلمان' بننے کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ لیوی کو اس بات پر حیرت تھی کہ بے حوصلہ، زندگی سے خالی، اپنے مصائب کے شعور سے عاری، اپنی آہ و کراہ کی آوازوں کو سننے سے قاصر لوگوں کی موت کو موت کیسے کہا جائے۔ جو زندگی ہی میں مر چکا ہو بھلا اسے موت کیا آئے گی۔ حسرت و یاس کی اس تصویر کو 'مسلمان' کا نام دیا گیا تھا، یعنی ایک ایسا شخص جس کی عزت، غیرت اور حمیت اس سے جدا ہو گئی ہو، اکرامِ آدمیت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ اوشوٹز کی عقوبت گاہ میں اسی چلتے پھرتے لاشے کو 'مسلمان' کہتے تھے۔

اہل یہود کے ایک دانشور کی زبانی مسلمان کی یہ تعریف سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ Auschwitz تو ایک تجربہ گاہ تھی جہاں چلتے پھرتے یہودیوں کو تعذیب کے ایسے مراحل سے گزارا گیا کہ وہ آنے والے دنوں میں 'مسلمان' کی تصویر بن جائیں۔ لاکھوں یہودیوں کو 'مسلمان' بنانے کے لیے، ان کی غیرت وحمیت سلب کرنے کے لیے اور انھیں زندہ لاشوں میں تبدیل کرنے کے لیے ہٹلر کو بڑے پیمانے پر عقوبت گاہیں بنانی پڑیں۔ نازیوں کے ہاتھوں انسانوں کا یہ حشر دیکھ کر دُنیا چیخ اٹھی، اتحادیوں کے بمبار طیارے حرکت میں آ گئے، لیکن منقسم ہندوستان میں تیس بتیس سال سے مسلمانوں کو حکومت کے ہاتھوں جس منظم خونی مزاحمت کا سامنا ہے اور جس کے سبب بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان، اوشوٹز جیسے 'مسلمان' بننے کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس عقوبت گاہ سے ابھرنے والی مسلمان کی نئی تعریف یہی تو ہے کہ ایک ایسا شخص جس سے اس کے انسانی خواص سلب کر لیے گئے ہوں۔ ان سطور کو پڑھتے ہوئے مجھے حلیم بھائی کے ماموں بہت یاد آئے جو چند دنوں کی قبر گزینی کے سبب اب زندگی کی رمق سے خالی کچھ اس انداز سے زندگی کے دن جی رہے تھے جیسے حقیقی زندگی کے ایام وہ پہلے ہی پورے کر چکے ہوں اور اب آگے جو کچھ ہے وہ اسی اَدھ مری زندگی کا بے معنی تسلسل ہے۔ مجھے بار بار حلیم بھائی کی ڈبڈباتی آنکھیں یاد آتیں۔ مرادآباد کا قتل عام اس ملک میں کوئی نیا عمل نہیں تھا۔ مجھے خود اپنی صلابت فکری پر شبہ ہونے لگا۔ میں بھی تو آخر اس تجربہ گاہ کا ایک کردار ہوں۔ بارالٰہا! مجھے 'مسلمان' بننے سے بچا۔

۲۰

مولوی کاپو

لیوی کو پڑھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوا کہ نازی عقوبت گاہوں میں اہل یہود پر جو گزری اس میں دشمنوں کے مقابلے میں خود ان کے ہم قوموں کا حصہ بھی کم نہ تھا۔ جرمن آفیسروں کی تعداد تو بہت تھوڑی ہوا کرتی تھی۔ چند آفیسر بھلا ہزاروں قیدیوں پر کیسے قابو پا سکتے تھے۔ سو اس کی ترکیب انھوں نے یہ نکالی کہ خود ان ہی قیدیوں میں سے بعض کو کاپو جیسے انتظامی عہدے پر مامور کر دیا اور انھیں اس بات کا اختیار بھی دیا کہ وہ ان ہی قیدیوں میں سے ایک جتھا تشکیل دے لیں جو عام قیدیوں سے کیمپ کے اصول وضوابط کی پابندی کروا سکے۔ ان لوگوں کو کمانڈو کہا جاتا۔ اب شکل یہ بنتی کہ چند جرمن ایس ایس آفیسروں کی تحویل میں ہزاروں قیدیوں پر مشتمل ایک کیمپ ہے جسے انھوں نے مختلف کاپوؤں کی نگرانی میں دے رکھا ہے۔ ہر کاپو کے پاس زور آوروں کا ایک جتھا ہے جس کی مدد سے اس نے قیدیوں کو جبری مزدوری پر لگا رکھا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی اُف بھی کر سکے، خواہ کسی کی طبیعت خراب ہو یا کم خوابی اور مناسب غذا کی کمی کے سبب صحت گرتی جاتی ہو، کاپوؤں کو اس سے کچھ غرض نہ ہوتی۔ لیوی نے لکھا تھا کہ ایک بار ایک کاپو نے جو اس کے قریب سے گزرا، اپنے گندے ہاتھ کو اس کے کپڑے پر مَل کر اس طرح صاف کیا جیسے وہ کوئی آدمی نہیں بلکہ شئے ہو اور اسے اس معاملہ پر ذرّہ برابر بھی تاسف نہ تھا۔ کاپوؤں کے ہاتھ میں زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے۔ ویسے تو یہ خود قیدی تھے اور ان کا تعلق بھی اہل یہود سے تھا، لیکن انتظامی امور کو کمالِ وفاداری سے بجالانے اور نازیوں کی معاونت یا مصاحبت اختیار کر لینے کے سبب انھیں غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ البتہ انھیں ہر وقت اس بات کا دھڑکا لگا رہتا کہ اگر انھوں نے اپنے ہم قوموں کی طرف نرمی کا رویہ اختیار کیا تو ایسا نہ ہو کہ ان کے ہاتھوں سے یہ پر کشش عہدہ جاتا رہے۔ کاپو، جرمن آفیسروں اور قیدیوں کے درمیان پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہم قوموں پر غلامی مسلط کرنے کی ذمے داری خوشی خوشی سنبھال رکھی تھی اور اس سبب وہ مختلف مراعات کے مستحق ٹھہرے تھے۔ انھیں جبری مزدوری سے چھٹی مل گئی تھی۔ ان کا کام اپنے ہم قوموں کو مشقت پر لگائے رکھنا تھا۔ انھیں عام قیدیوں کے مقابلے میں راشن زیادہ ملتا، رہنے کے لیے علیحدہ کمرے ملتے اور

عوامی ٹوائلٹ کے عذاب سے، جس کے تصور سے ہی اوسان خطا ہوتے تھے، انھیں نجات ملی ہوتی۔ خاص خاص موقعوں پر انھیں سگریٹ اور شراب کی بوتلیں بھی مل جاتیں۔ ان مراعات کے بدلے انھیں صرف ایک کام کرنا تھا وہ یہ کہ کیمپ میں حالات معمول پر رہیں۔ بعض اوقات بعض نیک دل کاپو اپنے اس انتظامی منصب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ہم قوموں کی مدد بھی کرتے۔ البتہ ایک بات پر اچھے برے تمام کاپوؤں کا اتفاق تھا کہ موجودہ صورتِ حال (status quo) برقرار رہے، تبدیلی کی کوئی آواز کہیں سے نہ اُٹھے۔

لیوی نے کیمپ کی زندگی کے حوالے سے لکھا تھا کہ جب انسان ایک ایسی صورت حال میں پھنس جاتا ہے جہاں دور دور تک امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تو غلامی کی اس زندگی کا خاصہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی قوم سے بے وفائی کے عوض کوئی عہدہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اسے قبول کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تو کوئی اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں قوم متحد ہو جاتی ہے، لیکن کیمپ کی زندگی میں اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہاں تو مصیبت سے نکلنے کی ترکیب ہی یہ ہے کہ آپ دوسروں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔ آپ کے زندہ رہنے کی کوشش آپ ہی جیسے کسی انسان سے زندگی چھین لیتی ہے۔ اب دیکھیے جو لوگ گیس چیمبر اور آتشی بھٹی، جہاں اہل یہود کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا جاتا تھا، کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھے ان کا تعلق بھی تو اہل یہود کے طائفے سے ہی تھا، وہ سونڈر کمانڈوز کہلاتے تھے۔ انھیں یہ خدمت بھی تفویض کی گئی تھی کہ لاشوں کو جلانے سے پہلے ان میں سے اگر کسی کے سونے کے مصنوعی دانت ہوں تو اسے نکال لیا کریں۔ اس طلسم خانۂ ظلم وستم کی کلید دیکھا جائے تو بڑی حد تک ان ہی کاپوؤں کے ہاتھ میں تھی ورنہ چند جرمن آفیسر لاکھوں یہودیوں پر بھلا کہاں قابو پا سکتے تھے۔

میں نے ابوالکلام آزاد کی تحریر میں ایک جملہ پڑھا تھا۔ مولانا نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یاد رکھو ہمیں ہمارے علاوہ کوئی اور زیر نہیں کر سکتا۔ اب جو میں نے کاپوؤں کی اس کارکردگی کے تناظر میں ہندوستانی مسلمانوں کے حالات پر نظر ڈالی تو مجھ پر ایک نئی حقیقت واشگاف ہونے لگی۔ منقسم ہندوستان کا یہ سیکولر طلسم خانہ بھی کیا ان ہی 'کاپوؤں' کے دم سے قائم ہے؟ احمد آباد کے ۱۹۶۹ء کے فساد سے لے کر مراد آباد کے ۱۹۸۰ء کے قتل عام تک مسلمانوں کی ہمتیں پست کرنے کا جو سلسلہ ہے اس گردابِ شر کو لگام دینے کے لیے کہیں سے کوئی مؤثر آواز نہیں اُٹھتی۔ مسلمانوں کے وہ اربابِ حل وعقد جو حکمراں کانگریس اور مسلم عوام کے مابین رابطے کا کام انجام دے رہے ہیں وہ بس یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حال برقرار رہے، تبدیلی کی کوئی آواز کہیں سے نہ اٹھے۔ کانگریسی مولوی ہوں یا سیاسی مسلمان ان کے اندر سخت سے

سخت حالات میں بھی نظامِ وقت کے خلاف اُف کہنے کا یارانہیں۔ یہ جبہ و دستار والے علما جن کی زبانیں بظاہر قال اللہ و قال الرسول سے مملو نظر آتی ہیں ہر الیکشن کے موقع پر ہندو احیا پرستی کا عفریت دکھا کر مسلمانوں سے کانگریس کے حق میں ووٹ طلب کرتے ہیں۔ یہ مراعات یافتہ علما اور سیاسی قائدین بھی کیا یہودی کاپوؤں کی طرح سگریٹ کے چند ڈبوں اور شراب کی چند بوتلوں کے عوض اپنی قوم پر دائمی خوابیدگی اور ابدی عذاب مسلط کیے رکھنے کا سودا کر چکے ہیں؟ لیوی کی یہ کتاب میرے لیے بڑی جان لیوا ثابت ہوئی۔ بار الہا! حقیقت کیا ہے اور نظر کیا آتی ہے، میں چیخ اٹھا اللّٰھم أرنی الأشیاء کما ھي۔ بار الہا! مجھے اس صورت حال کی اصل حقیقت پر مطلع کر۔

* * *

اِدھر حلیم بھائی کئی دنوں سے کلاس سے غائب تھے۔ سوچا پتہ نہیں کس حال میں ہوں، ان کی خبر گیری کرنی چاہیے۔ ہم لوگ شام میں ان کے کمرے پہنچے۔ انھیں بستر میں لیٹے دیکھ کر تشویش ہوئی۔ خیر تو ہے؟ میں نے پوچھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن پھر نقاہت کے مارے اُٹھ نہ سکے، بستر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئے۔ بولے: دو تین دن پہلے کچھ حرارت محسوس ہوئی تھی اب بخار تو نہیں ہے مگر کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا، سب کچھ بے معنی سا لگتا ہے۔ مرادآباد کے حالات بھی ابھی تک تشویشناک ہیں۔ کوئی دن نہیں جاتا جب تشدد کا کوئی واقعہ نہ پیش آتا ہو۔ جن لوگوں کے گھر اجڑے، جن کا خاندان تباہ ہوا اب ان ہی لوگوں کو اُلٹا جھوٹے مقدمات میں پھنسایا جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس امت کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ آنکھ لگتی ہے تو عیدگاہ کا منظر نگاہوں میں پھرنے لگتا ہے۔ میں نے انھیں اس طرح متفکر اور پریشان دیکھ کر دلجوئی کی خاطر ان سے کہا: آپ اس مسئلہ پر کچھ لکھتے کیوں نہیں، آپ کی تو کہانی کے فن پر بڑی گرفت ہے، اس درد کو لوگوں تک منتقل کیجیے۔ بولے: پہلے میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں کہانیاں اچھی لکھ لیتا ہوں لیکن اب تو میں خود کہانی بن گیا ہوں، خدا ہماری کہانی میں کوئی ہیپی اینڈنگ (happy ending) پیدا کردے۔

مرادآباد کا تذکرہ جب آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ مسلم قیادت اس قتل عام پر کسی اقدامی عمل سے مجرمانہ حد تک غفلت برت رہی ہے۔ ابھی چند دنوں پہلے مشاورت کے جلسے کی خبر تو آئی تھی، میں نے انھیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ بولے: گیارہ ستمبر کو 'بچوں کے گھر' میں جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں، میں خود شریک ہوا تھا۔ علی گڑھ کے کچھ اور طلبا بھی تھے۔ ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے قتل عام کے بعد بھی مشاورت کی مجلس عاملہ نے نشستند گفتند برخاستند کے علاوہ کوئی عملی پروگرام نہیں بنایا۔

پھر میٹنگ میں بات کیا طے پائی؟

بولے: کچھ نہیں، ایسا لگتا تھا جیسے انھوں نے رسم ادا کردی ہو۔ حسب سابق قرارداد پاس ہوئی کہ یہ جلسہ سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ ہم لوگوں کو اس بات پر سخت غصہ آیا، ہمارا اصرار تھا کہ اگر کچھ اور نہ کرسکیں تو کم از کم مشاورت کا ایک وفد فی الفور مرادآباد جائے۔ جب دیکھا کہ لوگ اس کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں تو ہم لوگوں نے سخت احتجاج کیا۔ جلسہ میں بدمزگی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ طلبا نے نعرے لگانے شروع کیے کہ یا تو آپ لوگ کل مرادآباد جائیں یا اپنی قبروں میں جا سوئیں، ایسی ناکارہ اور بے حس قیادت کی ہمیں ضرورت نہیں۔

کون لوگ تھے جلسہ میں؟ میں نے پوچھا۔

وہ تمام لوگ جنھیں ہم بدقسمتی سے اپنا ہمدرد و غم گسار سمجھتے ہیں۔ مختلف مسلم جماعتوں کے سربراہان، علمائے عظام اور ملّی قائدین سبھی موجود تھے، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کچھ کرنے سے گریزاں ہوں، کسی نے ان کی زبانوں پر تالے ڈال رکھے ہوں۔ اظہار تشویش کے علاوہ ان کی زبان سے کچھ اور نہیں نکل سکا۔

پھر کیا ہوا مرادآباد جانے کا کوئی پروگرام بنا؟

بولے: مرادآباد تو یہ حضرات چند دن بعد گئے البتہ اس سے پہلے انھوں نے وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ جیسے اس سفر کے لیے بھی اذن چاہتے ہوں اور پھر ان کی ایما سے جب یہ وفد مرادآباد پہنچا تو مرادآباد کے کمشنر نے گیسٹ ہاؤس میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کروائیں اور چند گھنٹوں کی گفت وشنید کے بعد اس خدشے سے یہ حضرات شہر سے نکل آئے کہ ان کا مزید قیام خطرات کو دعوت دینے کا سبب ہوسکتا ہے۔

'جب یہ حضرات وزیراعظم کی ایما پر گئے تھے اور کمشنر مرادآباد نے سرکاری طور پر ان کے قیام کا انتظام بھی کیا تھا تو پھر انھیں کس بات کا خطرہ تھا؟'

بولے: یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی کہ انھیں مرادآباد سے جانے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ انھیں تو چاہیے تھا کہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے محلّوں میں جاتے، ان کا دردِ دل سنتے، ان میں سے جو لوگ اب تک جیلوں میں ہیں ان کی رہائی کا پروگرام بناتے، جھوٹے مقدموں سے انھیں نکالنے کے لیے وکلا کا انتظام کرتے اور جو بے گناہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں انھیں انصاف دلانے کے لیے ہرجانوں کے مقدمے دائر کرتے، چشم دید گواہوں کے بیانات قلمبند کرواتے تاکہ دُنیا کو اصل صورت حال کا اندازہ ہوسکے۔ اس وفد میں بعض اصحابِ قلم اور مصنّفین بھی تھے، انھیں یہ بات کیوں نہ سوجھی کہ اس سانحہ پر ایک مفصل رپورٹ مرتب کرنے کا اہتمام کروائیں تاکہ مسلمانوں کے قتل عام کا اس طرح کا واقعہ پھر کبھی پیش نہ آئے۔

'جو لوگ اس وفد میں شامل تھے ان میں بیشتر مسلمانوں کی قابل احترام شخصیتیں ہیں، ہمیں نہیں لگتا

کہ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کمی چھوڑی ہوگی'۔

یہ سن کرحلیم بھائی بپھر سے گئے، بولے: کمال کرتے ہیں اسی عقیدت مندانہ طرزِفکر نے تو ہمارا بیڑا غرق کیا ہے۔ لوگوں کو ان کے القاب و آداب اور جبہ و دستار سے مت پہچانیے، یہ دیکھیے کہ ان کی کارگزاری امت کے تئیں مفید ہے یا مضر۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ امت کے اوپر گزرنے والی ہر قیامت ہمارے قائدین کو وزیر اعظم سے ملنے کا ایک موقع فراہم کرتی ہے۔ عاملہ کی ایک میٹنگ، محضر نامہ کی تیاری، پریس میں تشویش کا اظہار، یا تقریبِ تصویر کشی (photo-opportunity) اور پھر اپنے اپنے گھروں کو واپسی۔ یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی اظہار جوش میں اُٹھ بیٹھے، بولے: میں تو کہتا ہوں کہ یہ لوگ شاید انتظار میں ہوتے ہیں کہ کہیں فساد ہو تو انھیں وزیر اعظم سے ملاقات کا موقع ملے۔

حلیم بھائی کے دل کا درد جو باہر آیا تو طبیعت بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے رخصت کی اجازت لی۔ لوٹتے ہوئے بار بار خیال آتا حلیم بھائی شاید سچ کہتے ہیں۔ اتنے بڑے قتلِ عام کے بعد مرادآباد کے مسلمانوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بجائے اگر کچھ نہیں تو کم از کم ایک وائٹ پیپر تیار کیا جاتا اور پولیس آفیسروں اور حکمرانوں کے خلاف مناسب قانونی کارروائی کی منظم کوشش کی جاتی تو کم از کم اس تاثر کو تو ختم کیا ہی جاسکتا تھا کہ اس امت کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ یہ تو مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ ہمارے علما و قائدین، خاص طور پر وہ حضرات جنھوں نے مذہب اور روحانیت کے حوالے سے اپنے اردگرد تقدس کا ایک ہالہ قائم کر رکھا ہے، جن کی ایک آواز پر ملک بھر میں تحفظِ شریعت کے جلسے ہونے لگتے ہیں، ندوہ کے پچاسی سالہ جشن میں دوردراز سے ہزاروں لوگ جمع ہوجاتے ہیں، دیو بند کے جشنِ صد سالہ میں لاکھوں کا مجمع اکٹھا ہوجاتا ہے۔ اگر یہ حضرات اصلاح احوال کے لیے باقاعدہ اُٹھ کھڑے ہوں تو کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ حضرات کسی عملی اقدام کے بجائے محض وزیر اعظم کی طفل تسلیوں پر کیوں اکتفا کرتے ہیں۔ وہ موجودہ صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ وہ مدت سے فساد، میٹنگ اور پھر وزیر اعظم سے ملاقات کے گھسے پٹے فارمولے پر کیوں عامل ہیں؟ ایسا لگا جیسے کوئی میرے دل میں وسوسے ڈال رہا ہو کہ ان کا وقار و احترام بھی تو وزیر اعظم سے ملاقات کے سبب ہے۔ وزیر اعظم کو بھی ایسے ہی قائدین کی ضرورت ہے جو ہر حادثے اور قتلِ عام کے بعد وزیر اعظم سے ہی دادرسی کا طلبگار رہوں۔ وزیر اعظم اور ان کی پارٹی کے لیے کوئی کلمۂ بغاوت ان کی زبان پر نہ آئے۔ ایک لمحہ کے لیے تو مجھے ایسا لگا جیسے منقسم ہندوستان کے اس طلسم خانے میں ہمارے محترم علما و قائدین جانے انجانے کاپوؤں کا فریضہ انجام دے رہے ہوں، لیکن پھر یہ سوچ کر اس خیال کو جھٹک دیا کہ مقدس اور روحانی لوگوں کے بارے میں اس طرح کے خیالات شیطان کے وساوس بھی تو ہو سکتے ہیں۔

۲۱

دستوری تحفظات

نئے تعلیمی سال کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہماری گفتگو اب بھی مرادآباد کے سانحے سے مملو ہوتی۔ یہ احساس اب بھی عام تھا کہ اس بے آسرا امت کا کوئی ناخدا نہیں۔ ملّی اور سیاسی قیادت نے منقسم ہندوستان کے اس سب سے بڑے قتلِ عام کو روزمرہ کا فساد قرار دے کر نئے معمول (new normal) کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ کہنے کو تو زندگی اپنے راستے پر چل نکلی تھی، مگر ہر پل یہ اندیشہ ستاتا تھا کہ جن سیاسی اور سماجی عوامل نے مرادآباد کے قتلِ عام کو جنم دیا ہے وہ تو اسی طرح باقی ہیں۔ نہ تو حکومت کے طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ محکمۂ پولیس کو لگام دینے کی کوئی کوشش کی گئی اور نہ ہی اربابِ اقتدار کی طرف سے اس واقعے پر کسی شرمندگی اور اسے آئندہ روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا۔ جب سیاسی مشینری حسبِ سابق مسلم دشمنی کی اسی راہ پر گامزن ہو تو پھر کسی بھی لمحہ کوئی نیا مرادآباد سامنے آسکتا ہے۔ طلبا کی مجلسوں میں ایک نئے راستہ کی تلاش کے سلسلے میں پرجوش گفتگو ہوتی مگر راستہ کوئی دکھائی دیتا نہ تھا۔ اسی دوران سورتی صاحب کا حکم ہوا کہ مسلم مسئلہ پر گفتگو کے لیے نوجوانوں میں سے کسی کو دعوت دی جائے اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے جاوید حبیب کا نام بھی طے کر دیا۔ جاوید حبیب، سورتی صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے۔ طالب علم لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی مہم میں اہم رول ادا کیا تھا۔ مسلم یوتھ کنونشن کے حوالے سے بھی انھیں شہرت مل چکی تھی۔ شعلہ بیان مقرر تھے اور دہلی سے ہفت روزہ ہجوم کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے اور شاید ایک نئی سیاسی راہ کی تلاش میں سرگرداں بھی تھے۔ سورتی صاحب انھیں آدھا قلندر کہتے۔ آدھا اس لیے کہ وہ سیاست کے ایوان میں اسی قلندرانہ شان کے ساتھ اپنی چلت پھرت بنائے رکھتے۔ جاوید صاحب کی آمد کے ساتھ ہی نہ صرف یہ کہ سورتی صاحب کا پرانا بوم کلب پھر سے جی اٹھا بلکہ مسلم مسئلہ بھی پوری طرح مناقشہ کی میز پر آ گیا۔ اب پروگرام کی ترتیب یہ رہتی کہ فورم کے سکریٹری کی حیثیت سے میں موضوع پر کچھ تعارفی کلمات کہتا اور پھر ڈائس فاضل مقرر کے حوالے کر دیتا۔ اس خیال سے کہ گفتگو نتیجہ خیز اور ثمرآور ہو کچھ طلبا کو موضوع سے متعلق ضروری معلومات اور اعداد و شمار کے گوشوارے پیش کرنے پر بھی مامور کیا گیا تھا۔ مثلاً

سیاسی، ثقافتی اور معاشی صورت حال پر تین الگ الگ خطبات سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کا گوشوارہ، مسلم ثقافتی اداروں کا اجمالی جائزہ اور معاشی زندگی میں ان کی شمولیت پر وائٹ پیپر تیار کیے گئے تھے تا کہ گفتگو صحیح رخ پر اور صحیح تناظر میں چلتی رہے۔ جاوید صاحب عوامی مقرر تھے، انھیں خطابت کا جادو جگانے کا فن خوب آتا تھا۔ اعداد و شمار کے گوشواروں سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک انھوں نے طلبا کو اپنے سحرِ کلام میں لیے رکھا مگر یہ سوال کہ مسلمان جائیں تو جائیں کدھر، ان کے سیاسی امپاورمنٹ کا کام کیسے شروع ہو، یہ سوال ہنوز حل طلب رہا۔

ان دنوں جاوید حبیب صاحب جگ جیون رام کے زیر اثر دلت مسلم سیاسی اتحاد کا تانا بانا بننے میں مصروف تھے۔ دوسرے دن ان کی گفتگو سے پہلے میں نے اس طرز سیاست کی سختی سے نکیر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ اسلامی ایجنڈے سے سراسر انحراف پر مبنی ہے۔ مسلمان خیر امت کی حیثیت سے اس ملک میں جس نظام کے داعی اور نقیب ہیں، اس مشن کی قیادت یہ دلت رہنما نہیں کر سکتے خواہ ان کی نیتیں کتنی ہی صاف کیوں نہ ہوں۔ میں نے یہ بات اتنی شدت سے کہی تھی کہ اس سے فاضل مقرر کی گفتگو کی پوری طرح نفی ہو جاتی تھی۔ جاوید صاحب نے میری باتوں کو خندہ پیشانی سے سنا البتہ سورتی صاحب سے میری اس زیادتی کی شکایت کی کہ میزبان کی حیثیت سے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کہنے لگے کہ تحریکی ادب اور سیاسی اسلام کے مفکرین کو پڑھنے کے بعد ہمارے نوجوانوں کا کچھ اسی قسم کا ذہن بنتا ہے۔ سورتی صاحب نے معاملہ کو یہ کہہ کر رفع دفع کر دیا کہ ارے بھائی کسی شخص میں دین کی غیرت وحمیت ہو، اس کے ہاتھ مولانا مودودی کا لٹریچر لگ جائے اور پھر وہ جماعت اسلامی سے متاثر نہ ہو یا اس کا رکن نہ بنے تو اس کے ایمان پر شبہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شخص نوجوانی میں مودودی صاحب کی تحریروں کے سحر میں گرفتار ہو کر جماعت میں داخل ہو جائے اور پھر زندگی بھر وہیں اٹکا رہے تو اس کی عقل پر ماتم کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا ذہنی ارتقا رک گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے سورتی صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجلس میں باہمی لطف وکرم کی فضا بحال ہو گئی۔ سورتی صاحب ایک زمانے تک جماعت کے سرگرم رکن رہے تھے اور اب بقول خود جماعت سے آگے ان کا علمی اور فکری سفر جاری تھا۔

پروگرام کے خاتمہ کے بعد ایک دن ہم لوگ جنرل ایجوکیشن سینٹر میں مولسری کے درخت کے نیچے چائے کا لطف لے رہے تھے۔ اسی دوران حلیم بھائی بھی ادھر آ نکلے۔ حلیم بھائی جاوید صاحب کے خطبوں میں شریک تو رہے تھے مگر کچھ گُم سُم سے۔ آج وہ عادل کے ہاتھ میں دستور ہند کا جیبی نسخہ دیکھ کر پھر جز بز سے ہوئے، بولے: شاید تم اسے حفظ کر کے ہی دم لوگے۔ بھئی دستور سے واقفیت تو ہونی چاہیے نا تا کہ یہ پتہ چلے

کہ آپ جس ملک کے شہری ہیں وہاں دستوری طور پر آپ کو کیا تحفظات حاصل ہیں، ہم میں سے اکثر لوگوں کو تو اپنے دستوری حقوق کا پتہ بھی نہیں ہوتا، عادل نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ عادل کے پاس سیاسیات کا ایک اضافی پرچہ تھا اور شاید اسی حوالے سے دستور میں ان کی اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ دستور کا ایک جیبی نسخہ ہر وقت ساتھ لیے پھرتے۔ وہ اس بات پر اکثر حیرت کا اظہار کرتے کہ جب دستور مسلمانوں کو ایک شہری کی حیثیت سے اور خاص طور پر اقلیتی شہری کی حیثیت سے ایسی مستحکم ضمانتیں دیتا ہے تو پھر اس ملک میں مسلمانوں کا حال اتنا پتلا کیوں ہے۔ اس سلسلے میں عباس سے اس کی اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی۔

حلیم بھائی مرادآباد کے سانحے کے بعد کچھ دنوں تک تو بجھے بجھے سے رہے پھر سراپا احتجاج بن گئے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ وہ کب کون سا رخ اختیار کریں گے۔ کچھ دیر تو مجلس سے غیر متعلق چائے نوشی میں مصروف رہے پھر کرسی کھینچ کر مرکز میں آبیٹھے، بولے: ارے بھائی ان باتوں سے کچھ بھی حاصل نہیں۔ مرادآباد کے بعد جو لوگ محبّت کے دیپ جلانے کی باتیں کرتے ہیں، وہ دراصل ہمارے کرب سے آگاہ ہی نہیں۔ انھیں کیا پتہ کہ ہم پر کیا گزری ہے اور آج بھی ہمارے اندرون کا زخم کس طرح مسلسل رِس رہا ہے۔ پیام انسانیت کی طفل تسلیوں سے جو لوگ ہمارے کرب کو چھپانا چاہتے ہیں وہ دراصل مجرم ہیں۔ وہ ہمارے بہی خواہ نہیں ہوسکتے۔ کاش کہ وہ اس عذاب سے خود گزرے ہوتے تو انھیں پتہ ہوتا کہ دوسروں کے درد کو ہلکے میں لینا اور اسے زورِ خطابت میں اڑا دینا مجروح دلوں کے لیے کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔

حلیم بھائی آپ کی بات درست ہے مگر ہمیں آگے تو بڑھنا ہوگا نا! نئی ترکیبیں دریافت کرنی ہوں گی، ہم آخر کب تک مرادآباد کا ماتم کرتے رہیں گے۔

ماتم؟ بہت خوب! یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی نے اپنی کرسی کا رخ پھیرلیا اور مجلس کی طرف اس طرح پیٹھ پھیر کر بیٹھ گئے جیسے احتجاجاً واک آؤٹ کرگئے ہوں۔

دیکھیے بھئی میری تو یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ابھی ہم نے دستوری اور قانونی مراعات کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں ایک قانونی اور دستوری لڑائی کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔

'تم کس دستور کی بات کرتے ہو، میرا تو خیال یہ ہے کہ اس کی خوشنما دفعات کاغذ پر ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ عملی زندگی میں اس کی صورت گری کمزوروں کے بجائے زورآوروں کو تقویت پہنچاتی ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی بِنا میں ہی کچھ ایسی باتیں رکھی گئی ہیں جو ہندو اکثریت کی بالادستی کو یقینی بناتی ہیں'، عباس نے کہا۔

وہ کیسے؟ عادل نے اعتراض وارد کیا۔

بولے: باتیں تو بہت سی ہیں، میں چند ایک مثالیں پیش کیے دیتا ہوں، یہ کہتے ہوئے عباس نے دستور کے ابتدائی صفحات پلٹے، بولا دیکھو یہ دستور کی پہلی دفعہ کیا کہتی ہے:

India, that is Bharat, shall be a union of states.

یہ بھارت کیا ہے، وہی اسطوری ہندوستان جہاں اونچی ذات کے ہندوؤں کو بقول ان کے غلبہ و تفوق حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ جب دستور ساز اسمبلی نئے ہندوستان کا نظری خاکہ تیار کر رہی تھی اس وقت ہندو زعما کی طرف سے آزاد ہندوستان کو اسطوری بھارت کے احیا کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ بعض سادھو سنت تو اس مطالبہ کے لیے مرن ورت پر بیٹھ گئے اور ایک خاتون سنیاسن نے تو باقاعدہ اس بات کی دھمکی دے دی کہ جب تک انھیں اس بات کی یقین دہانی نہیں کرائی جائے گی کہ نئے ہندوستان کا نام بھارت ہوگا اور اس کی قومی زبان ہندی ہوگی وہ اپنا ورت نہیں توڑیں گی۔ نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا۔ دستور کی دفعۂ اوّل میں بھارت کا لفظ اس بات کا غماض ہے کہ نئے ملک پر اب وہ لوگ حکمراں ہیں جن کی جڑیں قدیم بھارت کی ہندو تہذیب سے جا ملتی ہیں۔

اچھا! میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا، عادل کے لہجہ سے حیرت و استعجاب ظاہر تھا۔

اتنا ہی نہیں، میں تمھیں ایک اور دلچسپ بات بتاتا ہوں، یہ جو تم دستور کی دفعہ اوّل میں بھارت کو یونین بنانے پر اتنا زور دیکھتے ہو تو اس کے پیچھے بھی ایک تاریخ ہے۔ ہندوستان تو ہمیشہ سے مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک وفاق رہا ہے۔ مغلوں کے دور میں بھی مختلف راجے مہاراجے اپنے طور پر نسبتاً خودمختاری کے ساتھ حکومت کرتے رہے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال انگریزوں کے عہد میں بھی قائم رہی۔ اس اعتبار سے تو اس ملک کو ایک فیڈریشن یعنی وفاق ہونا چاہیے تھا، لیکن جن لوگوں نے اسے یونین بنانے کی تحریک چلائی اور سارے اختیارات مرکز کو سونپنے کی کوشش کی، ان کی دلیل یہ تھی کہ ماضی میں ایک مضبوط مرکزی حکومت نہ ہونے کے سبب بیرونی حملہ آوروں کے لیے اس ملک میں قدم جمانا آسان ہوگیا۔ جگت نارائن لال اور کپور جیسے لوگوں کی تقریریں سنیے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کو ماضی کے مسلم حملہ آوروں سے بچانے کے لیے مضبوط مرکز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

عجیب! یہ نکتے آپ کہاں سے لے کر آتے ہیں، عادل نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ارے بھئی ایک دو بات ہو تو بتاؤں یہاں تو ایک لمبی فہرست ہے۔ اب اسی ہندو کوڈ بل کو لو جو ۱۹۵۵ء میں نہرو کے دور میں پاس ہوا۔ اس دفعہ نے لفظ ہندو کی ایک ایسی تعبیر کی جس کے مطابق مسلم،

عیسائی، یہودی اور پارسی کے علاوہ ہر شخص کو ہندو قرار دے ڈالا گیا۔ حالانکہ بودھ، جین اور سکھ خود کو اس دائرے میں کھینچ لانے پر مسلسل احتجاج کرتے رہے۔ ان باتوں سے آپ کو یہ نہیں لگتا کہ دستور ہندو اکثریت کو یا کہہ لیجیے کہ برہمن ذہن کو ملک کے مرکزی اسٹیج پر رکھتا ہے جبکہ دوسرے مذہبی فرقے اس تعریف کے سبب حاشیے پر چلے جاتے ہیں۔ اور اگر اب بھی آپ ہماری بات کے قائل نہ ہوں تو آپ آرٹیکل ۴۸ اٹھا کر دیکھیے جو زراعت اور مال برداری کے جانوروں سے متعلق ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ ریاست کو اس کام پر لگا دیا جائے کہ وہ گائے بچھڑے کے تحفظ کے لیے اقدامات کرے۔ یہ تو اونچی ذات کے ہندوؤں کا ایجنڈا ہے ورنہ ہندوؤں کے بہت سے طبقے گائے کو مقدس نہیں مانتے۔ خاص طور پر جنوب کے ہندو، دلت، عیسائی اور مسلمان اس دفعہ کو ایک ریاستی جبر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ کیسا سیکولرازم ہے کہ آپ ایک فرقہ کی روحانیت کو ریاستی مشینری کے ذریعہ دوسرے فرقے پر تھوپنا چاہتے ہیں۔

بات تو صحیح ہے مگر اور بھی تو بہت سی مثبت باتیں ہیں۔ دفعہ ۱۴ کو لیجیے، ۱۸ کو لیجیے، ۳۰ کو لیجیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دستور کے ابتدائیہ کی اٹھان دیکھیے۔ آزادی، مساوات، حریت اور مواخاتِ انسانی پر مبنی ایک معاشرے کے قیام کی خواہش۔ ان باتوں کو آپ کیسے مسترد کر سکتے ہیں؟ ایسا لگا کہ عادل نے اپنے دستوری تحفظات کے ترکش سے اچانک بہت سے تیر چھوڑ دیئے ہوں۔ بولے، میں ان باتوں کی نکیر نہیں کرتا، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تنگ نظروں نے اس خوشنما دستاویز کے اندر بھی ایسی ترکیبیں ڈال دی ہیں کہ اس ملک کا رخ مستقبل کی جدید دُنیا کے بجائے ہندو تہذیب کے احیا کی طرف چل پڑا ہے۔ اور یہ کام صرف متعصبین نے نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے کیا ہے جنھیں آپ سیکولر اور روشن خیال ہندو سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اب اسی قومی زبان کے مسئلہ کو لیجیے۔ نہرو اور گاندھی کے ابتدائی بیانات سے بہت سے لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ وہ شاید اُردو زبان کو اس ملک سے مٹتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ گاندھی نے قومی زبان کے تنازع کو یہ کہہ کر سلجھانے کی کوشش کی تھی کہ ہماری قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جا سکے گی، لیکن عملاً ہوا کیا۔ دیوناگری رسم الخط والی ہندی ملک کی قومی زبان بنی اور دفعہ 351 میں ریاست کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ ہندی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کے اضافے میں بنیادی طور پر سنسکرت سے مدد لی جائے۔ اب جو لوگ سنسکرت کو خداؤں اور دیوتاؤں کی زبان سمجھتے ہوں انھیں سنسکرت زدہ ہندی کا فروغ ایک مذہبی فریضہ کی انجام دہی معلوم ہو تو اس میں ان کا کیا قصور؟

حلیم بھائی جو اب تک ہمارے طرز فکر سے نالاں ہماری طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے، اچانک ہماری طرف مڑے اور بولے: عباس! تمھاری باتوں میں وزن ہے البتہ میری طرف سے ایک اور نکتہ کا اضافہ کرلو،

وہ یہ کہ دستور لکھنے والوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بھی گنجائش رکھی ہے کہ تمام خوشنما وعدے اور تحفظات کی یقین دہانیاں محض وعدے ہی بنے رہیں گے اور یہ سب کچھ بین السطور میں لکھا ہے۔ ورنہ تیس سال بعد بھی انسانوں کی وہ مواخات کیوں نہ قائم ہو سکی۔ آزادی، مساوات اور حریت کی ضمانتیں آج بھی ایک خواب کیوں ہیں۔ تم صحیح کہتے ہو ہمارے دستوری انجینئروں نے گاڑی تو اچھی بنائی، لیکن اس میں بڑی خاموشی سے اُلٹے گیئر کی ترکیبیں ڈال دیں ورنہ ریاست پر یہ ذمہ داری کیوں ڈالی جاتی کہ وہ آنے والے دنوں میں یکساں سول کوڈ، عدم گاؤکشی اور ویدک ہندی کے فروغ کے ذریعہ ہمیں قدیم بھارت کی طرف لے جانے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ریاستی اور قانونی جبر پر روشن خیالی، سیکولرازم اور قانون کی حکمرانی کا پردہ پڑا رہے۔

میرے خیال میں آپ لوگ دو چیزوں کو خلط ملط کر رہے ہیں، ایک دستور کی نظری پوزیشن اور دوسرا عملی اطلاق کے مسائل۔ مگر حلیم بھائی اب کسی کی کہاں سننے والے تھے۔ بولے، عملی اور اطلاقی بات تو بس یہی ہے کہ ان کے علاوہ اب اس ملک میں اور کوئی زندہ نہ بچے۔ وہ ہمیں زندہ دیکھنا نہیں چاہتے اور یہ جو آپ لوگ ہمیں زندہ سمجھے بیٹھے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ سیکولرازم کے اس طلسم خانے میں کوئی بھی اہل ایمان اب زندہ نہیں بچا۔ اپنے اندرون میں ہم دم توڑ چکے ہیں۔ مرادآباد کے قتلِ عام کے بعد اب زندگی کہاں اور جو لوگ خود کو زندہ سمجھتے ہیں وہ روز روز کی موت دیکھ کر اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ان کی عقلیں گنگ، حواس منجمد گویا وہ انسان نہیں، زومبی ہوں۔'

حلیم بھائی کو یاس و ناامیدی کی دُنیا میں واپس جاتے ہوئے دیکھ کر عادل نے انھیں سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ بولا: حلیم بھائی آپ بھی کمال کرتے ہیں، شاعر مشرق تو کہہ گئے ہیں کہ' کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری' من حیث القوم، ہم بڑے بڑے حوادث سے گزرے ہیں۔ ہمیں مرادآباد سے بھی کامران گزرنا ہے۔ آگے کا راستہ نکالنا ہے۔

بولے: اجی وہ شاعری ہے اور یہ حقیقت۔ ہمارے سیکولر دوست جو ہمیں مرادآباد کے حادثے کو بھلا کر آگے بڑھ جانے کی تلقین کرتے ہیں وہ ہمیں زندہ ضرور رکھنا چاہتے ہیں مگر bare minimum کی سطح پر۔ انھیں ہمارا بیالوجیکل وجود برداشت ہے شعوری اور نظری شخصیت نہیں۔ اور ہاں تم کہتے ہو کہ مرادآباد سے آگے بڑھیں، دستوری تحفظات کو کام پر لگائیں تو بھئی آگے تو دستوری اور قانونی حیلوں نے ہی راستہ بند کر رکھا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ملک میں مسلم اکثریت کی کوئی اڑتالیس پارلیمانی نشستیں ایسی موجود ہیں جہاں سے ہر حال میں مسلمان کو ہی منتخب ہو کر آنا تھا، اب ان میں بھی چوبیس نشستیں ایس سی ایس ٹی کے لیے

محفوظ کردی گئی ہیں۔ اب بیچارہ مسلمان جائے تو کدھر جائے۔ ہر طرف مزاحمتیں کھڑی کردی گئی ہیں۔

آپ کی بات درست ہے، عادل نے انھیں نرم کرنے کی کوشش کی۔ بولا، حالات کی سنگینی سے کسے انکار ہے۔ پہلے تو ملک میں معمول کی زندگی واپس لانی ہوگی۔ فسادات کی روک تھام کے لیے دونوں فرقوں کے مابین افہام وتفہیم اور مکالمے کی راہ اپنانی ہوگی۔

بولے: فسادات کہاں ہوتے ہیں بھائی، انھیں فساد نہ کہو، یہ تو منظم قتلِ عام ہیں جنھیں حکمراں اپنے سیاسی مصالح کے لیے انجام دیتے ہیں۔

'پھر ان حکمرانوں سے مکالمہ ہونا چاہیے'

مگر مکالمہ تو برابر کی سطح پر ہوتا ہے، یہ تو ہمیں محض اپنے اقتدار کا مہرہ سمجھتے ہیں۔

آپ کی بات سو فیصد درست، میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا: کیوں نہ حکمرانوں کے دلوں پر دستک دی جائے، کیا پتہ دل کا کوئی دروازہ کھل ہی جائے۔

بولے: یہ ممکن تو ہے مگر اس کے لیے کم سے کم پیمبری چاہیے۔

میں نے کہا: ہیں نا ہم لوگ پیغمبر، کارِ پیمبری پر مامور۔

کون لوگ؟ ایسا لگا جیسے حلیم بھائی کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا، بولے: خیر امت! تم کہتے ہو ہم لوگ خیر امت ہیں، بھئی لطیفہ کہنے میں تمھارا بھی جواب نہیں۔ پھر کسی قدر چیختے ہوئے بولے کہ اگر ہم لوگ واقعی خیر امت ہوتے تو ہمارا یہ حشر کیوں ہوتا۔ اگر ہمارا بھی کوئی خدا ہوتا تو وہ ہمیں بے آسرا کیوں چھوڑ دیتا۔ ہم گنہگاروں کو جانے دیجیے، سات سو بچے مرے ہیں جناب! ہے کسی کے پاس اس کا جواب۔ وہ معصوم بچے اپنے خدا کے آگے سجدہ ریز ہونے کے لیے ہی تو گئے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے خدا کو آخر ہوا کیا ہے۔ کیا وہ بھی پاکستان ہجرت کر گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز میں ارتعاش نمایاں ہو گیا، آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ رندھی ہوئی آواز میں بولے: کیسا خدا، کس کی عبادت اور کون سی کارِ پیمبری؟ مجھے ملے تو میں پوچھوں کہ تیرا نام لے کر ہم نے کون سا جرم کیا ہے جو تو نے ہم سے زندگی تو زندگی چھینی، موت سے بھی ہمیں محروم کر دیا۔

حلیم بھائی کو سانحۂ مرادآباد کے گرداب میں ڈوبتا دیکھ کر ہم نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ وہ حرفِ شکایت کی جس منزل پر جا پہنچے تھے اس کے بعد کسی مناقشے کی گنجائش ہی کب رہ جاتی ہے۔

۲۲

سہ ماہی تجدید

لکھنے لکھانے میں حلیم بھائی کی دلچسپی ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے فورم کی طرف سے جب ایک ادبی رسالے کے اجرا کا پروگرام بنایا تو انھوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ سورتی صاحب جوان کی اس ذہنی کیفیت سے شاید کسی قدر واقف تھے، نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ بولے: ارے بھئی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اپنے لیے لکھو، اپنے کرب کے مداوے کے لیے لکھو، اہل فکر کے لیے تو لکھنا بھی ایک قسم کی تھراپی ہے ورنہ وہ اس دور وحشت میں اپنا توازن کھو بیٹھیں۔ مجھے دیکھو! نثری نظم کا ایک قالب مل گیا ہے، میں اس میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ نہ لکھوں تو survival مشکل ہوجائے۔ سورتی صاحب کی یہ باتیں سن کر مجھے اپنے بچپن کے وہ پروفیسر یاد آئے اور ان کا مسلسل خالم مخول، خالم مخول لکھتے رہنا یاد آیا۔ پھر خیال آیا کہ کیا عجب کہ وہ بھی survival کی ایک اسٹریٹجی رہی ہو۔

سہ ماہی تجدید کا منصوبہ لے کر ہم لوگ شیخ الجامعہ سید حامد صاحب کے دفتر پہنچے۔ ان دنوں وائس چانسلر کا دفتر وکٹوریہ گیٹ پر ہوا کرتا تھا۔ سید صاحب بڑی ہی خندہ پیشانی سے ملے۔ مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ سید صاحب سے میری اس سے پہلے بھی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ان کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں، میں نے اپنے منظوم ترجمے بھی سنائے تھے۔ اب تو اکثر ایسا ہوتا کہ جب بھی جی چاہتا یا موقع ملتا ہم لوگ، جن میں اکثر عادل، شاہد، عباس اور آلِ علی شامل ہوتے، سید صاحب سے ملاقات کے لیے جا پہنچتے۔ وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور ان کا ایک شعر تو اہل ذوق کے حلقوں میں زبان زد عام تھا:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اُٹھے

سچ پوچھیے تو ہماری علمی اور ادبی دلچسپیوں نے سید صاحب کا دل جیت لیا تھا۔ میں نے انھیں بڑا کریم النفس پایا۔ وہ شائستگی کے ایک ایسے سانچے میں ڈھلے تھے جو علی گڑھ کا خاص طرۂ امتیاز تھا۔ میں سیکنڈ ایئر کا

طالب علم اور کہاں وہ شیخ الجامعہ۔ جب بھی ملتے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑے ہوجاتے۔ ایک بار غیرنصابی سرگرمیوں کے حوالے سے کلب کے ذمہ دار طلبا کو عشائیہ پر مدعو کیا اور خود میزبان کی حیثیت سے رکابیاں اٹھا اٹھا کر ہمیں تھمانے لگے۔ سید صاحب کی طرف سے مالی اخراجات کی یقین دہانی مل جانے کے بعد ہم لوگ پورے زور وشور سے رسالے کی تیاری میں لگ گئے۔ طلبا کو نوٹس کے ذریعہ مطلع کیا گیا اور علی گڑھ کے مقامی ادبا، شعرا اور مفکرین سے ملاقاتوں کا پروگرام بنایا گیا۔ اس سلسلہ کا پہلا پڑاؤ اختر انصاری کی رہائش گاہ ٹھہری۔ انصاری صاحب کچھ عرصہ پہلے یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ میری گزارشات سن کر بولے، آپ کو میرے بارے میں کس نے بتایا۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ میں مر چکا ہوں، اب کہاں کوئی میرا نام لیتا ہے۔ وہ شعر سنا ہے آپ نے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

کسی کو کیا پتہ کہ اس شعر کا خالق اب بھی زندہ ہے۔ کچھ دیر اسی طرح دُنیا کے ہاتھوں اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے رہے۔ علی گڑھ کے ایک سابق پروفیسر اور کہنہ مشق شاعر کو اس ذہنی کیفیت میں دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے سوچا شاعر خواہ یہ کتنے ہی اچھے ہوں اور ان کے افسانوں میں خواہ کتنی ہی فنی خوبیاں ہوں، ہیں تو یہ ایک زوال پذیر زبان کے شاعر۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اُردو زبان کو اس ملک سے ہجرت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک ایسی زبان کے شاعر وادیب کے لیے، جس کی زبان اس ملک سے ہجرت کرگئی ہو، اس ملک میں اب بچا ہی کیا ہے۔ تقسیم ہند نے ان سے ان کی زبان چھین لی۔ گویا زندگی کا تلچھٹ رہ گیا، زندگی اور اس کی مسرتیں غائب ہوگئیں۔ میں نے سوچا کہ یہ صاحب تو اچھے خاصے اشترا کی تھے۔ ترقی پسند تحریک کے اساطین میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔ سیکولرازم کا یہ طلسم خانہ بھی کیا خوب ہے! اچھے بھلے اشترا کیوں کو بھی 'مسلمان' بنا دیتا ہے، اوشوِٹز کا 'مسلمان'۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے، ان دنوں قرۃ العین حیدر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ میں مقیم تھیں۔ آرٹس فیکلٹی میں آتے جاتے اکثر ان پر نظر پڑتی۔ ایک دن ہمت کرکے ان کے چیمبر میں جا پہنچا۔ 'تجدید' کے لیے مضمون کی فرمائش کی۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیا۔ بولیں، ارے بھئی میں فرمائش پر نہیں لکھتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس صورت حال کا سامنا کیسے کیا جائے۔ میں نے کہا: تو پھر بغیر فرمائش کے ہی لکھ دیجیے۔ یہ سن کر انھوں نے میری طرف بغور دیکھا جیسے میری جسارت پر کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن نہ جانے کیوں توقف اختیار فرمایا پھر بولیں: سنڈے کو گھر آیئے گا اپنی فائل میں دیکھوں گی، اگر آپ کے لائق کوئی چیز ہوئی تو دے دوں گی۔ اتوار کو میں ثریا آپا کے گھر پہنچا جو شعبۂ اُردو کی صدر تھیں اور ان ہی کے ہاں عینی آپا

کا قیام تھا۔ اس دن وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔مسلم اندلس کی شعری روایت سے متعلق ایک مضمون میرے حوالے کیا جس کا عنوان تھا 'آبِ روانِ کبیر'۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی　　　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

وہ مسلم اندلس کہاں کھو یا گیا جہاں بقول جسٹس امیر علی جیسا کہ عینی آپا نے نقل کیا تھا 'عورتوں اور مردوں کے مخلوط معاشرے نے ایک ایسے شائستہ اور نستعلیق طرز زندگی و اخلاق و آداب کو جنم دیا تھا جس کا تصور آج کے ہندی مسلمان کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اندلس جس کی عورتیں اتنی باعزت اور آزاد تھیں، تعلیم عام تھی، شاعر ابوالحسین کی بیٹی حسانہ التمیہ اور امّ العلیٰ اور الشریفہ امۃ العزیز، حفصہ الرکینہ، حفصہ بنت حمدون، زینب المرویہ، مریم بنت ابویعقوب انصاری، اسماء العماریہ اور امّ الحنا بنت قاضی ابومحمد عبدالحق ابن عطیہ اپنے اپنے زمانہ کی جید اسکالرز، استاد، شاعرات اور مقررہ تھیں۔ امّ الحنا ماہر قانون بھی تھیں۔ اشبیلیہ کے آخری حکمراں معتمد کی ملکہ اور اس کی بیٹی دونوں اپنے علم و فضل کے لیے مشہور تھیں' مسلم اندلس زندگی کی جملہ مسرتوں سے معمور تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ 'اشبیلیہ میں شام کے وقت لوگ باگ دریا کے کنارے جاتے، کشتیوں میں سیر کرتے، سنترے کے باغوں میں گھومتے، شفق کی روشنی میں غزل گانے والے مطرب اپنے اپنے ستار سنبھالے شہر کی سڑکوں پر نکل آتے۔ ان کے گیت سننے کے لیے عورتیں اپنے گھروں کے جالی دار دریچوں میں جمع ہوجاتیں'۔

اندلس کی یہ جنت ارضی تاریخ کے پردوں میں کھوگئی، لیکن عینی آپا نے تو خود اپنے ملک میں ایک پوری تہذیب کا قتل دیکھا تھا۔ وہ آگ کے دریا کو عبور کرکے سرحد کے پار پہنچیں لیکن جب وہاں بھی انھیں قرار نہ ملا تو وہ ہندوستان لوٹ آئیں۔ اندلس تو محض ایک حوالہ تھا ورنہ اس مصنفہ پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی جس کی زبان خود اس کی نگاہوں کے سامنے اجنبی بن کر رہ گئی ہو۔ ایک تناور تہذیب کے زوال کو انھوں نے جس طرح محسوس کیا اور اسے اپنے تخلیقی تجربہ کا حصہ بنایا تو اس کے بعد ان کے پاس اس کے علاوہ اور چارہ کیا تھا کہ وہ دیوا شریف کے پیر کے چرنوں میں پناہ لیں۔

معین احسن جذبی بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی رہائش گاہ بھی کیمپس سے قریب ہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد مدعا پا گئے۔ دراز سے قلم نکالا اور اپنے حافظہ کی مدد سے فی الفور ایک غزل لکھ کر حوالے کردی:

وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے
مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں

اوران کا یہ شعر تو میرے حافظہ پر اس طرح چپکا کہ آج بھی کبھی کبھی یاد آجاتا ہے:

یہ زندگی جو بسر ہورہی ہے اے جذبیؔ
خدا ملے تو یہ پوچھوں عذاب ہے کہ نہیں

لطف تو یہ ہے کہ سید حامد صاحب جو اپنے انتظامی فیصلوں اور حوصلہ مند منصوبوں کے سبب ہمیں عزائم کی چٹان دکھائی دیتے تھے، جب ان کے پاس میں رسالے کے لیے کسی تازہ غزل کی فرمائش لے کر گیا تو انھوں نے بھی اپنی غزل کی ابتدا کچھ اسی رنگ کے شعر سے کی:

کیوں فنا سے ڈریں بقا کیا ہے؟
بجھ گیا دل ہی جب، رہا کیا ہے؟

اور مقطع کا یہ شعر:

گوشہ میں ان حسین آنکھوں کے   یہ بتا دیجیے چھپا کیا ہے؟

خورشید الاسلام جن کے ادنیٰ مارکسسٹ ہونے کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، ان کے اشعار سے بھی یہی لگتا تھا کہ بظاہر کیم شحیم اور توانا دکھائی دینے والے اس طرب سنج کے اندرون میں بھی حسرت و یاس نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

دل دھڑکتا ہے تو رونے کی صدا آتی ہے
ایک ہنگامہ سا رہتا تھا مکاں میں پہلے
اب جو ہے گرمئ بازار تو ہم اس میں نہیں
ہم ہی تھے گرمئ بازار جہاں میں پہلے

اور بے چارے شہر یار جو فلم 'امراؤ جان ادا' میں اپنے نغموں کے لیے مشہور ہوئے، ان پر تو اس اجڑتی تہذیب نے کچھ الگ ہی انداز سے حملہ کیا تھا:

ہر بار پلٹتے ہوئے گھر کو، یہی سوچا
اے کاش کسی لمبے سفر کو گئے ہوتے
ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

اب یہ بات تو بحث طلب تھی کہ تہذیب کے اجڑنے میں خطا اجداد سے سرزد ہوئی البتہ اس بات کا ہر کسی کو اندازہ تھا کہ ہم بحیثیت ملّی ایک بے کیف زندگی کے عذاب سے دو چار ہیں۔

تجدید کی اشاعت سے علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا ہوگئی یا کم از کم ہم لوگوں کو کچھ اسی قسم کی مسرت کا احساس ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ میں نے اپنے اداریہ میں جس بلند آہنگی کا مظاہرہ کیا تھا اور جس پایۂ بلند سے اپنے قارئین کو خطاب کا مستحق سمجھا تھا، تو چلتے پھرتے لوگوں کے چند توصیفی جملوں سے اس احساس عالی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ مگر یہ حلقے بھی کیا تھے چند اساتذہ کے ڈرائنگ روم، شعبوں میں تعلیم و تعلّم کی کچھ مجلسیں اور شمشاد مارکیٹ یا کیفے ڈی پھوس پر طالب علم ادیبوں اور شاعروں کی مختلف بیٹھکیں جہاں گفتگو کے لیے ہر روز کوئی موضوع اور گپ شپ کے لیے کسی جواز کی تلاش ہوتی۔ ان بیٹھکوں کے شارکین کو اپنے نابغۂ عصر ہونے کا بھرپور احساس ہوتا اور ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو کم از کم بین الاقوامی سطح کی شخصیت ضرور سمجھتا تھا۔ پھر اہل تجدید اس احساس میں کسی سے پیچھے کیوں ہوتے کہ وہ اس رسالے کی اشاعت کے ذریعہ علم و ادب کی ایک نئی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

کچھ اسی اعتماد سے سرشار میں ایک دن پروفیسر نذیر احمد صاحب سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔ نذیر صاحب فارسی کے بڑے اہل علم میں شمار ہوتے تھے۔ یونیورسٹی سے تو ریٹائر ہو چکے تھے، لیکن دہلی میں واقع غالب انسٹیٹیوٹ کے صدرنشیں تھے۔ جاڑے کے دن تھے، وہ مجھے اپنے گھر کے باہر سبزہ زار پر چائے سے شغل کرتے ہوئے مل گئے۔ ان کے ساتھ وارث کرمانی صاحب بھی موجود تھے، جن کا مضمون 'یہ دشت جنوں دیوانوں کا' میں نے تجدید میں شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے علی گڑھ کے ایک منچلے صاحب زادے کے حوالے سے لکھا تھا کہ انھوں نے کس طرح امیر منزل کی ایک شعری مجلس میں، جس میں جگر صاحب، سیماب صاحب اور سجاد حیدر یلدرم جیسے اہل قلم موجود تھے، اپنی ایک نظم 'گرلس کالج کا تانگہ' پڑھ کر سنائی تھی۔ نظم اس شعر سے شروع ہوتی تھی۔

گرلس کالج کا تانگہ چلا جا رہا تھا　　میں تانگہ کے بُم میں جتا جا رہا تھا

بزرگوں کی طبیعت پر اس نظم نے کچھ اچھا اثر نہ چھوڑا، لیکن آدابِ مجلس کے سبب خاموش رہے۔ ان کے بعد جب کرمانی صاحب کی باری آئی تو ایک بزرگ نے ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ میاں صاحب زادے! آپ اپنی نظم میں گرلس کالج کے کس پہلو پر روشنی ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ کرمانی صاحب نے لکھا تھا کہ وہ منچلے صاحب زادے جواب بھی علی گڑھ میں موجود ہیں اب بزرگوں میں ان کا شمار ہے اور انھوں نے اپنی سن رسیدہ پارسائی کا واسطہ دے کر بڑی خوشامد سے مجھے منع کیا ہے، ورنہ میں ان کا نام لکھ دیتا۔ آج ایک ایسے ہی سفید ریش بزرگ کے ساتھ انھیں چائے پیتا دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ جب انھوں نے علیک سلیک کے بعد مجھ سے پوچھا کہ میاں کہاں ٹہل رہے ہیں تو میں نے کہا،

بزرگ کی تلاش میں ہوں جن کی پارسائی کا آپ نے واسطہ دے رکھا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھے، استاد کی مجلس تھی خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

ان ہی دنوں غالب انسٹیٹیوٹ کا دہلی میں سالانہ بین الاقوامی سمینار ہونے والا تھا اور غالباً یہ حضرات بھی کچھ اسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ میری باتیں سن کر نذیر صاحب ایک دعوت نامہ اٹھا لائے اور مجھے ازراہ ہمت افزائی رائٹرس فورم کے سکریٹری کی حیثیت سے دہلی کے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی۔ اب تک یونیورسٹی کی طرف سے میں نے مختلف شہروں میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔ ابھی حال ہی میں اپنے ایک عزیز دوست اعجاز مقبول کے ساتھ سیفیہ کالج بھوپال میں شرکت سے لوٹا تھا جہاں عبدالقوی دسنوی اور شہر کے دوسرے اہل علم کی شفقتوں کا سزاوار ٹھہرا۔ البتہ دہلی کا پروگرام اس اعتبار سے مختلف تھا کہ یہاں میرا مقابلہ اپنے ہم عمر طلبا کی ٹیموں سے نہیں، بلکہ سند یافتہ ناقدین اور دانشوروں سے تھا۔ مقالہ کوئی لکھنا نہیں تھا۔ میری حیثیت ایک ناظر اور سامع کی تھی۔ سوچا کیوں نہ بیٹھے بٹھائے اپنے سر ایک عالمی سمینار میں شرکت کی تہمت بھی لے لی جائے۔

تاریخ مقررہ پر میں غالب انسٹیٹیوٹ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا، مقالہ خوانی کی مجلس چل رہی تھی اور مقالہ نگار تھے پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ دو چار منٹ تو صورت حال کو سمجھنے میں لگے، پھر اندازہ ہوا کہ غالب کی شاعری کا کوئی لسانی پہلو زیر بحث ہے۔ غنائی آوازوں کے زیر و بم پر گفتگو چل رہی ہے، البتہ اس کی بعض لسانی تعبیروں اور اصطلاحوں کے تعین میں فاضل مقالہ نگار التباسات کا شکار ہیں۔ میں نے جلدی جلدی ان تسامحات کو نوٹ کیا۔ لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ اسباق تازہ اور از بر تھے۔ مقالہ سماعی کے بعد جب سوال و جواب کی مجلس شروع ہوئی تو میں نے کچھ کہنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ جب دو تین لوگ کلام کر چکے اور میرا بار بار ہاتھ اٹھانا جاری رہا تو بادلِ ناخواستہ مجھے بھی اجازت مل گئی۔ میں نے کہا کہ اس مقالہ پر میرے کچھ سوالات ہیں اور کچھ ملاحظات بھی۔ لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ فاضل مقالہ نگار سے فاش غلطیوں کا صدور ہوا ہے۔ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ آل احمد سرور صاحب نے، جو صدر مجلس تھے، میری بات کاٹتے ہوئے کہا، میاں آگے آیئے، پہلے اپنا تعارف کرایئے، آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، پھر اپنا سوال رکھیے۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پہلے تو اس بات کی صراحت کی کہ میں علی گڑھ میں بی اے کا طالب علم ہوں اور پروفیسر مسعود حسین خاں کا شاگرد، جنھیں اُردو لسانیات کے ماہر کی حیثیت سے اتھارٹی کی حیثیت حاصل تھی۔ پھر میں نے سلسلہ وار اپنے اعتراضات رکھے۔ نارنگ صاحب نے اپنی جوابی گفتگو میں سوالات کا راست

جواب دینے کے بجائے بین بین کا راستہ اختیار کیا، آپ کی یہ بات درست ہے لیکن یوں بھی ہوتا ہے۔ ان گول مول بیانات سے اہل مجلس کو اس بات کا تو اندازہ ہو ہی گیا کہ غالباً پھسل جانے یا حافظے میں بعض اصطلاحوں کے خلط ملط ہو جانے والا معاملہ ہے۔ ایک طرف بی اے کا طالب علم اور دوسری طرف مشہور زمانہ پروفیسر جس کے علم و فضل کا ڈنکا بج رہا تھا۔ خیر تسامحات تو کسی سے بھی ہو سکتے ہیں، لیکن برسرِ مجلس اس کے اعتراف کا یارا اکثر لوگوں میں نہیں ہوتا۔ مجلس کے خاتمے پر جب چائے کا وقفہ ہوا تو بہت سے بڑے بوڑھوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ بعضے اس بات پر خوش تھے کہ ان کی برسرِ مجلس گرفت ہوئی۔ بعض اس خیال سے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے کہ اگلی مجلس کے مقالہ نگاروں میں ان کا نام بھی شامل تھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ان ادبی جلسوں میں دھڑے بندیوں کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ برسرِ مجلس نارنگ کی ٹوپی اچھال کر میں انجانے میں اُردو والوں کی سیاست میں جا پھنسا تھا۔

۲۳

چوہے، دیمک اور مسلمان

دہلی کے اس سفر میں مجھے کئی دنوں تک جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں قیام کا موقع ملا۔ ان دنوں پرانے کیمپس میں روسی سفارتخانے کی طرف سے کمیونسٹ پارٹی کے لٹریچر پر مشتمل کثرت سے کتابوں کی نمائش لگا کرتی۔ خوبصورت مجلدات میں مارکس، اینگلس، لینن اور اس قبیل کے دیگر مفکرین و مصنّفین کی کتابیں کوڑی کے بھاؤ ملا کرتیں۔ طلبا ان کتابوں کو پڑھنے کے خیال سے کم اور آرائش حجرہ کے خیال سے کہیں زیادہ، اٹھا لاتے۔ ان ہی نمائشوں کے طفیل پرانی کتابوں کے تاجران بھی وہاں پہنچ جاتے۔ بسا اوقات کام کی چیزیں انتہائی کم داموں میں مل جاتیں۔ پرانی کتابوں کے اس ڈھیر سے میں نے چند کتابیں چنیں جن میں ایک فرینز کافکا کی مشہور زمانہ کتاب *The Metamorphosis* تھی۔ کتاب مختصر تھی، شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ بیچ بیچ میں رک کر سوچتا۔ خود کو حیرت و استعجاب کی ایک نئی دُنیا میں پاتا۔ پھر اپنی شخصی اور ملّی کیفیت پر غور کرتا۔ ایسا لگتا جیسے یہ کہانی رمز و علامت کی سطح پر ہم سے بہت کچھ کہہ رہی ہو۔ بس یہ سمجھیے کہ ایک پیراڈائم شفٹ کی کیفیت تھی۔

کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی کہ ایک دن گریگر سمسا جب صبح بیدار ہوا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت و کوفت ہوئی کہ اس کا انسانی وجود ایک بڑے سے کیڑے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی خواب نہ تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اب وہ انسان نہیں بلکہ ایک کیڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں مختصر اور منحنی تھیں۔ اس نے سخت بے بسی محسوس کی۔ ارے یہ مجھے کیا ہوا۔ یہ اس کے کام پر جانے کا وقت تھا اور وہ اپنے خاندان کا تنہا کفیل تھا۔ اس کے ماں باپ اور اس کی چھوٹی بہن اس کی اس بدلی ہوئی ہیئت پر ترس کھاتے، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اب جو اس کی ہیئت بدلی تو ضروریات بھی بدل گئیں۔ ایک کیڑا سڑی گلی چیزیں ہی کھا سکتا تھا۔ اسے بستر اور فرنیچر کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی ماں نے اس خیال سے فرنیچر ہٹا لیا کہ اسے رینگنے کے لیے وافر جگہ مل جائے۔ جب اس کے کمرے سے اس کی محبوب چیزیں ہٹائی جانے لگیں تو سمسا کو، جو اب ایک بڑے سائز کا کیڑا تھا، سخت تکلیف ہوئی۔ یہاں تک کہ جب اس

نے اپنی پسندیدہ پینٹنگ کو ہٹتے دیکھا تو اس کے ایک کونے کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دنوں تک تو سمسا کی بہن اس کے کھانے پینے کا انتظام کرتی رہی لیکن ایک کیڑے کی آخر کب تک مدارات ہوتی۔ سمسا کا وجود اہل خانہ کے لیے بھی بوجھ بن گیا۔ گھر میں آمدنی کے ذرائع نہ تھے سو پہلے تو سمسا کے کمرے میں غیر ضروری چیزیں رکھ دی گئیں اور بیرونی حصہ کو کرایے پر اٹھا دیا گیا۔ ایک دن سمسا کو نہ جانے کیا سوجھی، موسم خوشگوار تھا، وہ بڑی مشکل سے دروازہ سرکا کر باہر نکل آیا۔ کرایے دار اسے دیکھ کر بدک گئے۔ جہاں اتنے بڑے بڑے کیڑے ہوں وہاں بھلا کون رہتا۔ گھر والوں کے لیے سمسا کا وجود نا قابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے اہل خانہ کے اس رویے سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔

کوئی انسان اگر اپنے آپ کو اچانک ایک کیڑے کی شکل میں پائے تو ذرا سوچیے کہ وہ خود کو کتنا بےبس محسوس کرے گا۔ کہاں اکرامِ آدمیت کا کلیدی منصب اور کہاں حشرات الارض جیسی بےتوقیری کہ جب جو چاہے اسے بلا تکلف مسل دے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں پر کچھ ایسی ہی قیامت گزری۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک نئی صورت حال میں پایا۔ جس ملک کو صدیوں سے انھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا اور جس کے چپے چپے پر ان کے تفوق کی تاریخی علامتیں ثبت تھیں، اسی ملک میں وہ ملیچھ بمعنی اجنبی کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے تھے۔ ان کی جسمانی ساخت کے فرضی نقص کو 'کٹوا' کہہ کر ابھارا گیا۔ انھیں غربت اور کثرت عیالی کے سبب ملک کی معاشی بدحالی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ان کی آبادی پر لگام کسنے کے لیے ایمرجنسی میں جبری نس بندی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ فلم 'قصہ کرسی کا'، جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں، میں انھیں چوہوں کی شکل میں پیش کیا گیا جو ملک کے وسائل کا بڑا حصہ چٹ کر جاتے ہیں اور جس کے سبب اس ملک کی ترقی کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ گو کہ اس وقت امت شاہ کا ظہور نہیں ہوا تھا جنھوں نے برسرِ عام انتخابی جلسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو گھس پیٹھیا اور دیمک (termite) قرار دیا۔ لیکن اس بات کا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہم وطنوں کی نظر میں اکرامِ آدمیت کے شرف سے محروم ہو چکے ہیں۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے ابّا کا وہ جملہ بار بار یاد آیا کہ آزادی کے نام پر ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ جو مکر و فریب ہوا اور تقسیم وطن کے نام پر جو عذاب ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا اس حادثۂ فاجعہ کے مالہٗ و ماعلیہ کو سمجھنے میں ایک نسل گزر جائے گی۔ اب جو میں اس تناظر میں اپنی ملّی تاریخ پر نظر ڈالتا تو ایسا لگتا تھا جیسے تلخ اور کریہہ حقائق سے پردہ اٹھ گیا ہو۔ میں نے سوچا کہ جب تک امت اپنے اصل نظری استوانہ پر دوبارہ نہ لوٹے اس کی بےبسی کا مداوا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب تک اس ملک کے حکمرانوں اور برادرانِ وطن کی نظروں میں ہماری حیثیت حشرات الارض کی رہے گی، وہ ہم سے برابری کی سطح

پرعزت وتوقیر کا معاملہ کیسے کرسکتے ہیں۔

***

گنگا ہوسٹل سے نشیب کی طرف جہاں درختوں کے نیچے پتھروں کی منڈیروں پر چائے پینے اور گپ شپ کرنے والے طلبا و طالبات کے دم سے شام ڈھلے رونق رہتی تھی وہاں آج ہاسٹل اُتسو کی مناسبت سے ثقافتی پروگراموں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ٹونک سے چہار بیت گانے والوں کا کوئی طائفہ آیا تھا جس نے دَف کی تھاپ پرعشوہ و ادا کی سحر انگیزی کا تذکرہ چھیڑ رکھا تھا۔ نگاہوں کے تیر دلوں کو زخمی کرتے، کبھی دل کے غیاب کا شکوہ ہوتا اور کبھی سنگدلی کا طعنہ دیا جاتا۔ دفعتاً سازندوں کے ہاتھ فضا میں بلند ہوتے دَف پر ایک زور کی تھاپ پڑتی اور سب کورَس میں ایک ساتھ کہتے 'دیکھو نہ مجھ کو، ترچھی نظر سے'۔اسی دوران ایک شخص ان کے درمیان سے اٹھا اور اہل مجلس سے یوں گویا ہوا: بھائیو بہنو! چہار بیت کی یہ عوامی شاعری کوئی چار سو سالوں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہی ہے۔ٹونک، رامپور، بھوپال جیسی ریاستوں نے اس کی سرپرستی کی، لیکن بدقسمتی سے اب یہ ہندوستانی ثقافت کے حاشیہ پر ہے۔ اگر اس کی سرپرستی نہ کی گئی تو شعر و موسیقی کے اس خوبصورت سلسلہ سے ہم لوگ محروم ہوجائیں گے۔ یہ شاید باضابطہ مجلس کے آغاز کا اشارہ تھا۔ ڈھلتی رات کے منظرنامے میں درختوں کے نیچے طلبا و طالبات کے ہجوم اور گاہے گاہے یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے ایسا لگتا تھا جیسے صحرا نوردوں کا کوئی قافلہ فطرت کی وادی میں خیمہ زن ہوگیا ہو۔البتہ جب اشعار کی مشکل زبان سامعین کی ذہنی سطح سے بلند ہونے لگی اور داد و تحسین کا سلسلہ سازندوں پر روپے نچھاور کرنے تک آپہنچا تو ساری توجہ اس امر پر مرکوز ہوگئی کہ طلبا و طالبات اس مجلس کو شعر و موسیقی سے کہیں بڑھ کر باہمی مواخات اور دوستی کے قیام میں استعمال کرنے کا فن کس قدر جانتے ہیں۔ ویسے بھی یہ ایک ثقافتی جشن تھا، یہاں ایک ایسی زبان اور ایسی ثقافت کا نوحہ سننے کی کسے فرصت تھی، جو بقول ان سازندوں کے ہر پل فنا کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے پوچھا، کیا آپ نے پہلے بھی کبھی اس طائفہ کو سنا ہے؟ بولے: میں تو حیران ہوں کہ صرف دَف کی مدد سے حکایتوں اور داستانوں کا یہ منظوم سلسلہ گھنٹوں ناظرین کو مسحور رکھ سکتا ہے اور کتنا درد ہے اس بیانیے میں۔

جی ہاں ایک مٹتی قوم کا مٹتا فن ہے، جاتے جاتے بھی تو لطف دے جائے گا، جیسے چراغ بجھنے سے پہلے تیز بھڑک کر خاموش ہوجاتا ہے۔ پاس میں بیٹھے ہوئے ایک مولوی نما نوجوان نے لقمہ دیا۔

اچھا! میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ شاید میں ان کے اس تبصرہ کے لیے تیار نہ تھا۔ ویسے آپ

یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے پہلے نوجوان نے بات اُچک لی، بولا: یہ میرے دوست حیدر ہیں، بیرونی زبانوں کے مرکز میں ایم اے کر رہے ہیں اور مجھے کہتے ہیں احمد صیہونی۔

جی کیا کہا؟ صیہونی کا لفظ سن کر میں چونکا۔

بولے: ماسونی کہہ لیجیے۔کیا مطلب یہ کہہ لیجیے یا کہتے ہیں کا کیا قصہ ہے؟ آپ جو ہیں وہ کیوں نہیں بتاتے؟

بولے: یہ کہانی پھر کبھی، ویسے مجھے کامریڈ احمد بھی کہتے ہیں۔ مجھے احمد کی گفتگو میں لطف کا ایک خاص پہلو نظر آیا۔سوچا ایک شخص کی ذات کے اتنے پہلو۔اتنی پھسلتی گھومتی اور تغیر پذیر شناخت کا آخر سبب کیا ہے۔ میں نے پوچھا، یہ صیہونی ہونے کا کیا قصہ ہے؟ اور پھر اس مقام سے گرے تو ماسونی بن گئے۔کیا ان میں سے کوئی آپ کا تخلص ہے؟

بولے: نہیں یہ بات نہیں۔ جب ایک بار آدمی اپنے کھونٹے سے ہٹ جائے تو پھر کسی اور کھونٹے پر فٹ نہیں بیٹھ پاتا۔مگر کیا کریں مجبوری ہے۔

کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔

بولے: آپ لوگوں کو اس کسک کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔آپ لوگ علی گڑھ کے چھوٹے سے جزیرے میں رہتے ہیں، وہاں کوئی بات مزاج کے خلاف ہوجائے تو اسلام خطرے میں آجاتا ہے۔ہم لوگ بھی جب تک دارالعلوم دیوبند میں تھے ہماری اپنی دُنیا تھی۔حیدر تو اسی سال یہاں آئے ہیں۔ میں چار سالوں سے یہاں کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔اس شوق میں کبھی کامریڈ بنا اور کبھی دو قدم آگے بڑھ کر اپنے انقلابی ہونے کا ثبوت دینے کے لیے خود کو احمد صیہونی کہلوانے لگا۔ پھر ایسا لگا کہ شاید ماسونی زیادہ مانوس اور قابل قبول لفظ ہو،مگر ان سب باتوں کے پیچھے دراصل ایک ہی دھن تھی کہ جے این یو کے اس ماحول میں جہاں خالص مسلم شناخت کے ساتھ جہد و عمل کی گنجائش کم تھی، اپنے لیے ایک وسیع میدان تلاش کیا جائے۔

پھر کیا ہوا؟ اس کام کے لیے تو آپ کا کامریڈ بننا ہی کافی تھا۔

بولے: بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے اور میں پہلے ہی جھٹکے میں کامریڈ بن بھی گیا، کمیونزم کی امہات الکتب کے کئی کئی ایڈیشن آج بھی میرے کمرے میں رکھے ہیں۔روسی مصنّفین کی کتابوں سے الماریاں پٹی ہیں۔ بورژوا اور پرولتاری کی گردان کرتے اور لوگوں کو طبقاتی کشمکش کا درس دیتے بھی بڑا وقت گزرا۔کامریڈوں کا یہ جھولا دیکھو آج بھی میرے کندھے سے لٹکا ہے،لیکن ان سب کے باوجود شاید اپنی مسلم شناخت کے سبب

میں اب تک اس مشن کے حاشیہ پر ہی رہا۔ مرکز میں میرے لیے کوئی رول مختص نہ ہوسکا۔

آخر ایسا کیوں؟ انھیں تو ایسے لوگوں کی تلاش ہوتی ہے۔

بولے: اس کا ایک سبب تو تعصب ہے جو مسلمان کامریڈوں کے لیے ہندو کامریڈوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے اور دوسرا سبب ان کا ہم سے یہ توقع کرنا ہے کہ ہم پارٹی ممبر بننے کے بعد اپنی مسلمانیت سے پوری طرح دست بردار ہوجائیں۔

مگر جب آپ صیہونی اور ماسونی ہوسکتے ہیں تو پھر شکایت کی کہاں گنجائش ہوسکتی ہے؟

بولے: یہ تو ایک ردّعمل ہے۔ میں نے کئی سال اے آئی ایس ایف (AISF) کے ساتھ کام کیا۔ بہت سے مسلمان طلبا میری وجہ سے بائیں بازو کی سیاسی مہم کا حصہ بنے۔ اسی دوران ایک دن مجھے پتہ چلا کہ پرانے کیمپس کے قریب ایک ویران مسجد کی بازآبادکاری کا مسئلہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی کم ہے۔ جے این یو کے طلبا نے جمعہ کی نماز کے لیے ایک مہم کے تحت اس مسجد میں پہنچنے کا پروگرام بنالیا۔ میں بھی اس گروپ کا حصہ تھا بلکہ کہہ لیجیے کہ اس بہانے بہت دنوں بعد مجھے جمعہ کی نماز پڑھنے کی تحریک ملی تھی۔ میری اس سرگرمی کو پارٹی کے اندر غیر مستحسن نگاہوں سے دیکھا گیا۔ دوستوں نے مجھ پر رجعت پسند ہونے کی پھبتی کسی۔ پارٹی سے میری وفاداری شک کے دائرے میں آگئی۔ میں نے سوچا عجیب لوگ ہیں، خود تو مندر میں درشن کریں، ہندو تہواروں میں جوش وخروش سے شریک ہوں تو ان کے مارکسزم پہ آنچ نہیں آتی۔ لیکن ہم مسلمانوں سے مطالبہ ہے کہ ہم اپنے مذہبی ظواہر اور ملّی شناخت کو پوری طرح تج دیں اور لطف تو یہ ہے کہ ان سب کے باوجود ہمیں حاشیہ پر ہی رہنا ہے، مرکز میں ہمارے لیے کوئی رول نہیں ہوسکتا۔

'تو کیا اب آپ نے پارٹی کو خیر باد کہہ دیا ہے؟'

بولے: عملاً تو ایسا ہی ہے البتہ وہ لوگ اب بھی مجھے اپنے حلقہ میں ہی شمار کرتے ہیں۔

'پھر آپ کمیونسٹوں پر تین حرف کیوں نہیں بھیجتے؟'

بولے: یہ جے این یو ہے، یہاں survival کے لیے کمیونسٹوں سے بہتر کوئی گروپ نہیں۔ اساتذہ میں ان ہی کا دبدبہ ہے، ان ہی کے سہارے تقرریاں ہوتی ہیں، بس یہ سمجھیے کہ آپ جے این یو میں داخل ہوئے اور کمیونسٹوں کے حلقے میں شامل ہوئے بغیر ٹھنڈے ٹھنڈے جے این یو سے پڑھ کر نکل آئے تو آپ نے یہاں کی برکات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ خالص مسلم شناخت کے ساتھ تو یہاں کیا کہیں بھی آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ گفتگو میں بورژوا، پرولتاری کی تکرار اور زندگی کی مارکسی تعبیر اور منہج پر اصرار آپ کو کسی قدر قابل قبول بنادیتا ہے۔ اس کیمپس میں آپ جو دو چار مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو وہ اسی راستہ سے یہاں تک

پہنچے ہیں۔ خیر چلیے ہم لوگوں کو یہ لڑائی لڑنے دیجیے۔ آپ علی گڑھ والے 'اسلام خطرے میں ہے' کا آوازہ بلند رکھیے۔ آپ کا کام نسبتاً آسان ہے، بلکہ بہت آسان۔ یہ کہتے ہوئے احمد نے میری طرف الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ سازندوں کی دھمال میں اب ہاؤ ہُو کا انداز غالب تھا۔ لوگ ایک عالم وارفتگی میں تھے۔ میں نے ان حضرات سے اجازت لی، آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

جے این یو میں جہاں میرا قیام تھا وہاں سے پروفیسر مظفر عالم کی رہائش گاہ زیادہ دور نہ تھی۔ اتوار کی صبح بھائی جان کے ساتھ ان کے ہاں جانے کی تقریب نکل آئی۔ مشیر الحسن، جو بعد میں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہوئے، وہاں پہلے سے موجود تھے۔ گفتگو کا رخ مسلمانوں کے مسائل سے ہوتا ہوا علی گڑھ کی موجودہ صورت حال تک جا پہنچا۔ مظفر عالم اس بات پر مسلسل زور دیتے رہے کہ امت کے ایک فرد کی حیثیت سے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ انھیں اس قرض کو بہر طور ادا کرنا ہے۔ امت کے تئیں ان حضرات کی فکرمندی دیکھ کر یہ اندازہ تو ضرور ہوا کہ ان حضرات نے ایک مخالف ماحول میں اپنی چلت پھرت بنائے رکھنے کے لیے خواہ روشن خیالی یا مارکسی طرزِ فکر کی جیسی بھی شناخت اختیار کر رکھی ہو، ان کے اندرون اسلام اور مسلمانوں کی فکرمندی سے یکسر خالی نہیں۔ پھر یہ خیال آتا کہ کیا روشن خیالوں میں خود کو قابل قبول بنانے کے لیے اپنی اصل شناخت سے دست بردار ہونا ایک لازمی امر ہے؟ احمد صہیونی کی باتیں یاد آتیں جو دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، لیکن ایک نئی کمیونسٹ شناخت کے بغیر جے این یو میں اپنا کوئی مستقبل نہیں دیکھتے۔ پھر خیال آتا کہ یہ تو بہت بڑی قیمت ہے۔ خیر یہ تو ایک مخالف ماحول کی بات ہوئی البتہ یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ علی گڑھ میں جن لوگوں نے روشن خیالی کا علَم اٹھا رکھا ہے اور جو خود کو ادنیٰ مارکسسٹ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں انھیں ایک مسلم اکثریتی ماحول میں امت کے علی الرغم ایک نئی شناخت کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔

جب میں علی گڑھ سے چلا تھا اس وقت یونیورسٹی میں اسلامیوں اور کمیونسٹوں کے مابین سخت معرکہ آرائی جاری تھی۔ اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی طلبا کر رہے تھے جن کا مقابلہ 'روشن خیالی' کے علمبردار پروفیسر عرفان حبیب اور ان کی کمیونسٹ پارٹی سے تھا، جن کے حامیوں کی ایک وافر تعداد تدریسی اور غیر تدریسی عملے میں کچھ اس طرح داخل ہو گئی تھی کہ عرفان صاحب جب چاہتے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اصرار کے لیے یونیورسٹی میں بھوک ہڑتال، دھرنے اور مظاہروں کے ذریعہ انتظامیہ کو مفلوج کر دیتے۔ طلبا میں یہ شور تھا کہ وہ بہت قابل پروفیسر ہیں، ان کی کتابیں آکسفورڈ میں چلتی ہیں، اس جیسا کوئی دوسرا اسکالر یونیورسٹی میں نہیں۔ اُدھر تدریسی حلقے میں بھی وہ ایسے مریدوں کو داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان کی بات پر تالی

بجانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ سید حامد صاحب جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ آئے تو انھوں نے ابتداً عرفان صاحب کو لگام دینے کی کوشش، لیکن پھر شاید ان کی ٹریڈ یونینزم کے خوف سے ان کی طرف نرم رویہ اختیار کر لیا۔ اِدھر طلبا وائس چانسلر کو محورِ شر باور کرانے میں جٹ گئے۔ اسلامی حلقے کے ایک جوشیلے طالب علم جو بعد میں علم الادویات کے پروفیسر ہوئے، مجھے اب بھی یاد ہے کس طرح حبیب ہال سے نکلنے والے طلبا کے ایک جلوس کو سید حامد کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر ابھار رہے تھے: 'ان کے پاس اگر بندوق کی گولیاں ہیں تو ہمیں اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم ناخنوں اور دانتوں سے اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنے ایمان کے بل بوتے پر انھیں شکست فاش دیں گے'۔ اس طرح کی جوشیلی تقریروں میں طلبا یونین کے لیڈران بھی پیچھے نہیں تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اسلام بنام سیکولرزم اور دقیانوسیت بنام روشن خیالی کی فرضی جنگ نے پوری یونیورسٹی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

ایک دن جے این یو کی مرکزی لائبریری میں اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر *Economic and Political Weekly* میں شائع شدہ ایک مراسلہ پر اٹک کر رہ گئی۔ عنوان تھا 'اے ایم یو اور عرفان حبیب' اور مراسلہ نگار تھے نئی دہلی کے ایم وائی قاضی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کمیونسٹوں کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ اپنے منتخب آدمی کی حمایت پر آتے ہیں تو اسے اتنا بڑا بناتے ہیں کہ اس کی ذات کے آگے کسی پارٹی یا علمی ادارے کی حیثیت بھی بے وقعت ہو جاتی ہے۔ عرفان حبیب علی گڑھ کی پیداوار ہیں اور مشکل وقتوں میں علی گڑھ ہمیشہ ان کی مدد کے لیے آگے آیا ہے۔ جب کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان پر وارنٹ جاری ہوا تھا اس وقت علی گڑھ نے نہرو سے کہہ کر ان کی گرفتاری رکوائی تھی۔ گو کہ وہ علی گڑھ میں ایک استاد تھے، لیکن انھوں نے اس منصب کا خیال رکھے بغیر ٹریڈ یونین ازم اور تصادم کی راہ اختیار کی۔ اس کے باوجود انھیں اوائل عمری میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ ان کے مخالفین کہتے ہیں کہ شاید اسی لیے ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ مراسلہ نگار نے اس بات کی شکایت کی تھی کہ ان کے طرزِ عمل سے ایسا لگتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے محض ایک ملازم ہوں، بہی خواہ نہیں۔ انھوں نے فریق مخالف سے صلح صفائی کی ساری پیشکش ٹھکرا دی اور جب معاملہ کی جانچ ایک ہائی کورٹ کے جج سے کرانے کی تجویز سامنے آئی تو اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ان کے لیے ایک مسلم جج قابل قبول نہیں۔ خیر سے اب ایک سکھ جج کا تقرر ہوا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے، مراسلہ نگار نے پوچھا تھا، کہ کیا مارکسسٹ کسی اخلاقی اصولوں کے تابع نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہے تو پھر مارکس سچائی، ضمیر اور آزادانہ سائنسی جستجو کی بات کیوں کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیا ہندوستانی کمیونسٹ واقعی ہندوستان میں سوشلزم کے قیام میں مخلص ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان حضرات نے علی گڑھ کے

قضیے پر ہندوفرقہ پرستوں کے ساتھ مل کرمشترکہ محاذ کیسے بنا رکھا ہے۔ مراسلے میں اور بھی اسی طرح کی بہت سی باتیں تھیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ علی گڑھ کے اس شہرۂ آفاق پروفیسر کی قوت کا اصل سرچشمہ علمی جلالت کے بجائے دراصل کمیونسٹ پارٹی کی پشت پناہی ہے۔ خیال ہوا کہ جب مراسلے کے کالم میں اس قسم کے خطوط چھپ رہے ہیں تو ذرا اگلے پچھلے شماروں کو بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھا جائے۔ اب جو پچھلے شماروں کی ورق گردانی کی تو ایسے خطوط کی بھر مار تھی جو اس شہرۂ آفاق پروفیسر کی جلالت علمی، حق گوئی، انصاف پسندی کی حمایت میں رطب اللسان تھے۔ حیدرآباد، تریوندرم، کلکتہ، بمبئی جیسی جگہوں سے عرفان صاحب کی حمایت میں انفرادی خطوط ہی نہیں بلکہ قراردادیں پاس ہوئی تھیں، جن میں کہا گیا تھا کہ عرفان صاحب پر حملہ دراصل علمی آزادی پر حملہ ہے۔ کہاں ملک گیر سطح کی ایک پارٹی جس کے افراد علمی اور سیاسی اداروں میں موجود ہوں اور کہاں علی گڑھ کے وہ معصوم اور جو شیلے طلبا جو اپنے ناخنوں اور دانتوں سے باطل کا مقابلہ کرنا چاہتے ہوں۔ مقابلہ انتہائی غیر متوازن تھا، اور عرفان صاحب کے پاس ایسے ناہموار مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے کا خاصا تجربہ تھا۔

برسوں بعد جب یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے میری واپسی ہوئی تو مجھے عرفانی ٹولے کی سازشوں کا براہ راست سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹی میں تو خیر عرفان صاحب کے حامیوں اور ناصروں کی ایک فوج تھی جنھوں نے میری آمد کو یونیورسٹی کے نظری قالب میں ایک بڑی تبدیلی اور بڑے خطرے کے طور پر دیکھا۔ خود عرفان صاحب نے یو جی سی کے اس وقت کے چیئرمین وید پرکاش صاحب کو خط لکھ کر اس بات سے آگاہ کیا کہ مجھ جیسے غیر علمی، پیمفلیٹیئر اور 'غلبۂ اسلام' کے مصنف کے یونیورسٹی میں پروفیسر کی کرسی پر متمکن ہوجانے سے کس طرح اس دانش گاہ کی سیکولر روایات کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ انھوں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ دلیل بھی دی کہ گاندھی کے سلسلے میں بھی میرے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ پہلے تو میں نے ان کی کبرسنی کا خیال رکھتے ہوئے ان سے اعراض برتنے کو ہی مناسب جانا، لیکن جب ان کی سرگرمیوں کا شور تھمتا نظر نہ آیا تو میں نے بادل ناخواستہ ایک اخباری بیان کے ذریعہ موصوف کی اس دانشورانہ غنڈہ گردی کا سخت نوٹس لیا:

> علی گڑھ، ۲۲ نومبر ۲۰۱۳ء: علی گڑھ ہسٹوریں سوسائٹی اور یونیورسٹی انتظامیہ کے مابین پیدا ہونے والے حالیہ تنازع کو بعض اخبارات نے اکادیمیین بنام ملٹری چپقلش کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں بائیں بازو کے اس واویلے کو مسلم یونیورسٹی پر ان کے ٹوٹتے شکنجے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر راشد شاز نے برج کورس میں

'المدرسہ سوسائٹی' کے ہفت روزہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا جہاں وہ آج 'علی گڑھ کو نئی حریت فکری کی ضرورت' کے موضوع پر گفتگو کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیاں اور دانش گاہیں ایک ایسے ماحول میں اپنے اہداف حاصل نہیں کرسکتیں جہاں کسی ایک گروہ یا شخص نے متبادل نقاط نظر کے لیے تمام دروازے بند کردیئے ہوں۔ گزشتہ تیس چالیس برسوں سے پروفیسر عرفان حبیب اور ان کے ٹولے نے حریت فکری اور یونیورسٹی کے تکثیری علمی ماحول کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ نوبت بایں جارسید کہ جنرل شاہ کے دورِ اقتدار سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ اہم علمی عہدوں پر تقرریوں اور ترقیوں کے لیے بائیں بازو سے راہ و رسم اور ان کی اتباع لازم ہے۔ نام نہاد مارکسسٹوں نے پروفیسر عرفان حبیب کے خیالی بت کا اتنا بڑا ہیولیٰ تراشا کہ عام لوگ مبہوت سے ہوکر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پس پردہ فیصلوں اور آرا کو یونیورسٹی کے معاملات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ شعبہ تاریخ ہی نہیں بلکہ دوسرے متعلقہ اداروں میں بھی اہل علم کے بجائے عرفان صاحب کے کارناموں پر تالی بجانے والوں کی فوج داخل ہوگئی۔ کسی نے اس خیالی اسطورے کی حقیقت معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ دُنیا کی کتنی یونیورسٹیوں میں تخصیصی مطالعہ کا موضوع ہے؟ آپ کا مقابلہ اگر ہے تو علی گڑھ سے باہر ملک کی چند جامعات سے اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے چند کالجز سے۔ یہ ہے ہمارے مورخ کے انٹرنیشنل فیکلٹی ہونے کی حقیقت۔

پروفیسر شاز نے کہا کہ یونیورسٹی کی چہل پہل اور انبساط انگیز علمی زندگی کے لیے لازم ہے کہ یہاں مختلف نقاط نظر کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ طلبا کو اختلاف فکر و نظر کو انگیز کرنے اور اس کے بیچ اپنا علمی سفر جاری رکھنے کا موقع ملے۔ انھیں یہ بتایا جائے کہ تمھارے اساتذہ نے جو علمی کارنامے انجام دیئے ہیں، جو کتابیں لکھی ہیں تم ان پر اضافہ کرسکتے ہو۔ شرط یہ ہے کہ تم اپنے اساتذہ کو محقق اور جویائے حق کی حیثیت سے دیکھو، ان کا بت نہ بناؤ، ان کی پرستش نہ کرو اور نہ ہی علمی طور پر ان کو حرف آخر سمجھو۔ پروفیسر شاز نے اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی برادری نے اب تک عرفانی ٹولے کے بے بنیاد علمی پروپیگنڈے کا محاکمہ کرنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔ حالانکہ ان کے سب سے اہم علمی کارنامے *Atlas of the Mughal Empire* کا حال یہ ہے کہ مشہور خریطہ نویس جوزف شوآرٹس برگ اس کاوش کو

Amateurish یعنی نوسکھیا پن پر محمول کرتے ہیں۔ جن کے بقول محض تین معروف نقشوں پر تکیہ کرنے کے سبب مصنف کوئی الگ راہ بنانے اور اپنی تصنیف کو ایک بڑے علمی تجزیاتی مطالعے اور تعلیمی وثیقے میں بدلنے میں ناکام رہے ہیں۔

پروفیسر شاز نے مزید کہا کہ عرفان حبیب صاحب مغل خریطہ نویسوں میں صرف صادق اصفہانی کا نام لیتے ہیں، جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میدان میں دوسرے اہل فن ناپید تھے۔ مسلم علما کے یہاں خریطہ نویسی کی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ عرب اور فارس کو چھوڑیئے، مغل ہندوستان میں اہل علم کے ذاتی کلیکشن میں مختلف انداز کے نقشے پائے جاتے تھے۔ مہاراجہ جے پور کے کلیکشن سے مقامی اور عالمی سطح کے چار چار میٹر لمبے خریطے کی بازیافت بھی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ عرفانی اٹلس اس سلسلہ کی پہلی کاوش نہیں ہے، گوکہ یہ بہت سے سابقہ مآخذ کا دانستاً تذکرہ نہیں کرتا۔

یہ پوچھے جانے پر کہ ان کی اصل تصنیف *The Agrarian System of Mughal India* کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ پروفیسر شاز نے کہا کہ اہل علم اسے ایک اچھی کاوش کے طور پر ضرور دیکھتے ہیں، لیکن نظری اعتبار سے ان کے دعاوی محل نظر ہیں۔ پروفیسر عرفان حبیب کا یہ دعویٰ کہ مغل اشرافیہ نے کسانوں کا اس قدر استحصال کیا کہ وہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق حکومت کے خلاف ہوگئے، صداقت کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔ گزشتہ برسوں میں فرینک پرلن، ڈیوڈ واش بروک اور سنجے سبرامنیم جیسے حضرات نے عرفان حبیب اور شیریں موسوی کے ان بے بنیاد دعاوی سے ہوا نکال دی ہے کہ اتنے بڑے تناسب میں لگان وصول کی جاتی تھی کہ نچلی سطح پر معیشت کے نمو کا کوئی راستہ نہیں بچ پاتا تھا۔ فرینک ایلس نے حساب و کتاب کے گوشوارے سے یہ ثابت کردیا ہے کہ عرفان حبیب اور شیریں موسوی کے دعاوی اپنے داخلی تضادات کے سبب زمیں بوس ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عرفان صاحب اپنے معتقدین کے نزدیک Polymath (شیخ الکل) ہیں۔ ان جیسا بڑا اسکالر علی گڑھ کی سرزمین نے اب تک نہیں دیکھا۔ وجہ یہ ہے کہ عرفان حبیب اپنے علمی مدمقابل یا خود سے برتر اہل علم سے ان کی زندگی میں نہیں ٹکراتے۔ ایڈورڈ سعید پر حملے کے لیے انھیں سعید کی موت تک انتظار کرنا پڑا۔ ان کا علمی قد و کاٹھ اس لیے ناقابل تسخیر ہے کہ وہ زندہ لوگوں سے مکالمہ نہیں کرتے۔ گزشتہ دنوں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے سلسلے میں جب ان کا بیان آیا تھا اس وقت میں نے اس خواہش کا

اظہار کیا تھا کہ یہ تاریخ کا مسئلہ نہیں بلکہ عمومی ملّی مسئلہ ہے، لہٰذا عرفان صاحب کو چاہیے کہ وہ ایک کھلے مباحثہ میں اپنے دلائل رکھیں۔ لیکن جو لوگ فریق مخالف سے مرنے کے بعد دو دو ہاتھ کرنا مناسب سمجھتے ہوں، جو پرماتما سرن کے سرقہ شدہ مسودے پر اپنے شاگردوں کو Ph.D بخشواتے ہوں اور جو انتہائی بے حیائی سے اس کی اشاعت پر پیش لفظ میں یہ لکھتے ہوں کہ تاریخ قندھاری کے انگریزی ترجمہ میں بڑی محنت شاقہ کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور شاگرد یہ لکھتا ہو کہ اس کام میں اسے ہر قدم پر عرفان حبیب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی حاصل رہی ہے، ایسے لوگوں کے طلسماتی علمی قلعوں کی بنیاد میں نہ جانے کتنے پرماتما سرن دفن ہیں۔ کاش کہ کوئی تحقیق کا جویا اس راز کی نقاب کشائی کر سکے۔

اس بیان کے شائع ہوتے ہی ان کے خیمہ میں خاموشی چھا گئی۔

***

ایک دن گنگا ڈھابے پر کامریڈ احمد کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ صغیر بھائی پر نظر پڑی۔ ان کے ساتھ دو صاحبان اور بھی تھے جن سے میں واقف نہ تھا۔ میں نے گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ پتہ چلا کہ وہ طلبا کے ایک وفد کے ساتھ دہلی میں ملّی قائدین سے ملاقات کی غرض سے آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا قیام جامعہ ملیہ میں ہے اور یہ لوگ آج ہی سید شہاب الدین اور سید امین الحسن رضوی سے مل کر آئے ہیں۔ صغیر بھائی علی گڑھ میں شعبۂ قانون کے سینئر طالب علم تھے۔ میں نے پوچھا کیا اندازہ ہے، یونیورسٹی کب تک کھل پائے گی؟ بولے، کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہر طرف پولیس کا پہرہ ہے۔ وائس چانسلر سید حامد اپنی ضد پر قائم ہیں، وہ طلبا کے آگے جھکنے کو تیار نہیں۔

طلبا آخر چاہتے کیا ہیں؟ کامریڈ احمد نے مسئلہ کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش کی۔

بولے: اب تو بہت سی باتیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہوگئی ہیں۔ کوئی ایک مطالبہ نہیں، پہلے تو طلبا صرف عرفان حبیب کے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے، اب آفتاب کی شہادت نے معاملہ کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ 'رضوی صاحب نے تو سید حامد سے مصافحہ کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا'، ایک صاحب جو ان کے ساتھ ہی آئے تھے انھوں نے بتایا۔ بولے: انھوں نے وائس چانسلر سے برملا کہا تھا کہ آپ کے ہاتھ معصوم طالب علم کے خون میں رنگے ہیں۔

اچھا واقعی! میں نے ان سے تصدیق کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صاحب کچھ بولتے، صغیر بھائی نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ بولے، ارے بھئی اس قسم کی روایتیں تو ایسے موقعوں پر اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔ یہ

بھی اسی قبیل کی بات ہے جیسے کمیونسٹ حلقوں میں اس بات پر تالی پیٹی جاتی ہے کہ عرفان صاحب کی کتابیں آکسفورڈ اور کیمبرج میں چلتی ہیں۔ ہر حلقہ کو پروپیگنڈہ کے لیے کچھ نہ کچھ مسالہ تو چاہیے ہوتا ہے۔ سنا تھا کہ کوئی انکوائری بیٹھی تھی، اس کا کیا ہوا؟ کامریڈ احمد نے پوچھا۔

بولے: ارے بھئی یہ کوئی سنجیدہ فکری نزاع نہیں جسے مصالحت یا مفاہمت سے سلجھایا جاسکے۔ یہ تو اقتدار کی لڑائی ہے۔ کمیونسٹوں نے برسہا برس سے یونیورسٹی کو یرغمال بنا رکھا ہے، وہ آسانی سے اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے والے نہیں۔

وائس چانسلر تو معقول آدمی ہیں، پھر وہ کمیونسٹوں کی اس چال کو کیوں نہ سمجھ پائے؟ میں نے صغیر بھائی سے جاننا چاہا۔ بولے: ذاتی طور پر سید حامد میں جتنی بھی خوبیاں ہوں، وہ ایک روایتی بیوروکریٹ ہیں اور بیوروکریٹ ہمیشہ منظم گروہوں اور یونین بازوں کے آگے جھک جاتا ہے۔ سید حامد شاید ذاتی طور پر یہ چاہتے ہوں کہ ان کے عہد میں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی سے جو نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں اس کا فائدہ اٹھایا جائے۔ مسلم اقلیت کے لیے کچھ ٹھوس منصوبہ بندی کی جائے لیکن جو لوگ پہلے سے اس یونیورسٹی پر قابض ہیں وہ اقلیتی کردار کو اپنے لیے ایک خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

'آخر ایسا کیوں، یہ تو ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا معاملہ ہے۔' میری اس معصومیت پر صغیر بھائی مسکرائے۔ بولے: کمیونسٹ لابی جو اب تک یونیورسٹی پر قابض تھی اسے اندیشہ ہے کہ اقلیتی کردار کی بحالی کے بعد یونیورسٹی کورٹ پر جسے یونیورسٹی پر مقتدرِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے، مسلم مجلس مشاورت، جماعت اسلامی اور اے ایم یو ایکشن کمیٹی جیسی تنظیموں کا قبضہ ہوجائے گا۔ انھیں اقلیتی کردار کی بحالی میں اپنا اقتدار تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اچھا! مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا، کامریڈ احمد نے حیرت کا اظہار کیا۔ میں تو اسے رجعت پرستی بنام روشن خیالی کی جنگ سمجھتا تھا۔

جی ہاں کمیونسٹ حضرات تو اپنے خوشنما بیانات سے کچھ ایسا ہی تاثر دیتے رہے ہیں، اب یہ بات کسے معلوم کہ صرف پچھلے تین سالوں کے دوران عرفان حبیب صاحب نے درجہ تین اور درجہ چار کے ملازموں کی دوسو سے زائد ہڑتالوں کو منظم کیا ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی مختلف یونینوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ وہ درجہ چار کے ملازمین کے لیے بھوک ہڑتال بھی کر چکے ہیں اور ان ہتھکنڈوں سے وہ رفتہ رفتہ ایک ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے ہیں۔ اب اقلیتی کردار کی بحالی نے ان کے عزائم پر پانی پھیر دیا ہے۔

مگر باہر تو یہی تاثر ہے کہ وہ یونیورسٹی کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ رجعت پسند اور فرقہ

پرست طاقتوں کو لگام دینا چاہتے ہیں۔ احمد کے اس تاثر پر صغیر بھائی کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ بولے: یہ حضرات تو دوسروں کو رجعت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں، لیکن اپنا حال یہ ہے کہ ذرّہ برابر مخالفت کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ جو ان کے گروپ میں نہیں ہے وہ یا تو فرقہ پرست ہے یا رجعت پسند۔ حد تو یہ ہے کہ طلبا یونین کے لیڈران بھی ان کی نظروں میں Fundamentalist اور فرقہ پرست ہیں۔ حالانکہ یہ عام طالب علم ہیں، ان کا کسی نظری خیمے سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل بات یہ ہے، یہ کہتے ہوئے صغیر بھائی نے چائے کی پیالی رکھی، جیکٹ کے بٹن کھولے، کرسی آگے کو کھسکائی جیسے اب سنہری دھوپ میں انبساط کے ساتھ داستان کا اگلا حصہ سنانے والے ہوں۔ بولے: مسلمان سولہ سال سے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک چلا رہے تھے۔ ایمرجنسی کے بعد جب دوبارہ مسز گاندھی برسرِ اقتدار آئی تھیں، انھوں نے اپنے الیکشن منشور میں اقلیتی کردار لوٹانے کی بات کی تھی۔ مرادآباد کے خونی حادثہ کے بعد اس بات کی کہیں زیادہ ضرورت تھی کہ کانگریس کے مسلم ووٹ بینک کو بچانے کے لیے کوئی ایسا علامتی قدم اٹھایا جائے جو مسلمانوں کو کانگریس کی بہی خواہی کا یقین دلا سکے۔ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں نئے بل پیش کرنے کی توقع کی جا رہی تھی۔ ان ہی دنوں انڈین ایکسپریس کے نامہ نگار کو عرفان حبیب نے ایک ایسا انٹرویو دیا جس سے اقلیتی کردار کی مہم کو آخری مرحلہ میں زک پہنچ سکتی تھی۔ وہ اس وقت سوشل سائنسز کے ڈین کے عہدے پر فائز تھے۔ بس یہ سمجھو کہ انھوں نے اقلیتی کردار کی مہم کو سبوتاژ کرنے کی اپنی آخری سی کوشش کر ڈالی۔ بل تو خیر پاس ہو گیا لیکن جن لوگوں نے سولہ سال تک اس مشن کے لیے قربانیاں دی تھیں ان کے لیے یونیورسٹی کے اندرون سے خود اس کے ایک ٹیچر کی بے وفائی ناقابل برداشت بن گئی۔ طلبا مشتعل ہو گئے اور یونیورسٹی میں محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اچھا تو یہ کہانی ہے اس قضیے کے پسِ پردہ۔ دیکھیے چیزیں ہوتی کیا ہیں اور نظر کیا آتی ہیں۔ کہاں کی روشن خیالی اور کیسی رجعت پسندی۔ دیکھو بھئی میں کہتا ہوں نا (value-loaded) اصطلاحوں سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔

۲۴

سُرخ جال

جے این یو میں میرا قیام طویل ہوتا جاتا تھا۔ اب ہمارے شب و روز کی ترتیب یہ تھی کہ صبح لائبریری سے کوئی کتاب ایشو کرالاتا۔ دن کا کچھ وقت اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں لگاتا۔ مختلف قسم کی انسائیکلوپیڈیا اور ضخیم حوالہ جاتی مجلدات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا۔ کبھی کبھی بڑی حیرت انگیز معلومات کا سراغ لگتا۔ ایک دن بیسویں صدی کے سائنسی اور تہذیبی ارتقا پر کوئی باتصویر مرقع ہاتھ لگ گیا۔ صبح سے شام تک اسی کی ورق گردانی میں گزر گئے۔ ان کتابوں کے درمیان جتنا وقت گزارتا، حیرت و استعجاب میں مسلسل اضافہ ہوتا۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب، کس طرف سے، روشنی کا کوئی روزن اچانک وا ہو جائے۔ ان ہی دنوں میرا تعارف ٹی ایس ایلیٹ (T. S. Eliot) اور ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کی شاعری سے ہوا۔ مارکسزم کے بالاستیعاب مطالعہ کی بھی یہیں توفیق ہوئی۔ ایلیٹ اپنے لب و لہجہ کے سبب ایسا لگتا جیسے ہماری حسیت سے قریب تر ہوں۔ روشن خطوط میں ان کے شعری مجموعے آنکھوں کو بھلے لگتے۔ زبان و بیان کا آہنگ دل کو کھینچتا۔ گو کہ ان کا پوری طرح سمجھنا آسان نہ تھا، لیکن معانی کی ایک بنیادی سطح بھی شعرخوانی کا لطف دے جاتی۔ میں اکثر کوئی شعری مجموعہ لیے دور درختوں کی اوٹ میں کسی چٹان پر جا بیٹھتا۔ سرسبز و شاداب ٹیلوں کی اوٹ میں چڑیوں کی چہچہاہٹ اور نگاہوں کے سامنے مسجد قوت الاسلام کے قطب مینار کا منظر، اور پھر جاڑے کی سنہری خوشگوار دھوپ میں گاہے بہ گاہے ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے، اور اس منظرنامہ میں بلند آہنگی سے ایلیٹ کی شاعری کا پڑھنا۔ ایک دن ایلیٹ کی مشہور نظم ہولومین (The Hollow Men) کو پڑھتے ہوئے جب ان لائنوں تک پہنچا کہ

Our dried voices, when
We whisper together
Are quiet and meaningless

اور بقول شاعر اپنا حال یہ ہے کہ

Shape without form, shade without colour,

Paralysed force, gesture without motion;

یہ کہانی ایک مردہ خرابے کی تھی جہاں خیال اور حقیقت کے مابین اور حرکت اور عمل کے مابین ایک سایے جیسا ابہام پایا جاتا تھا۔ بقول شاعر یہی نوحہ ہے اپنی اس چھوٹی سی کائنات کا جہاں تصور اور تخلیق کے مابین اور جذبات اور اس کے ردِّعمل کے مابین بھی سایہ ہی سایہ ہو۔

This is the way the world ends
Not with a bang but with a whimper.

زندگی کی بے لطفی کا یہ نوحہ جہاں انسان کو اپنے ہر عمل پر امر مستعار کا دھوکہ ہو، جب ہر چیز اپنی اصل میں کھوکھلی لگے اور زندگی میں چبائے ہوئے لقموں کا تعفن داخل ہوجائے تو فرد کو خواب کی دُنیا میں بھی جائے فرار نہیں ملتی۔ کیا مجال کہ وہ خواب میں بھی آنکھ کھولنے کی جرأت کر سکے۔

ان دنوں شریعتی کے حوالے سے مغرب کی بے دماغ نقالی کا بھی بڑا چرچا تھا۔ بائیں بازو کے طلبا کی مجلسوں میں جب بھی بیٹھا اور گفتگو آگے چلی تو بات بورژوا اور پرولتاری کے مابین ازل سے جاری کشمکش پر آ پہنچی۔ کامریڈ طلبا و طالبات نے اس مارکسی تعبیر کو ایک ازلی و ابدی حقیقت کے طور پر کچھ اس طرح اپنی گرہ میں باندھ رکھا تھا کہ اس کے علاوہ تعبیر و تفہیم کے کسی اور منہج کے بارے میں سننے کے روادار بھی نہ تھے۔ ان کے درمیان جب بھی بیٹھا ان کے ایمان کا درجۂ حرارت ہمیشہ بلند پایا، سو کسی سنجیدہ گفتگو کا امکان باقی نہ رہا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے ہمارے ان نوجوانوں کے ہاں بھی تعبیر و عمل کے مابین کسی منحوس سایے نے پڑاؤ ڈال دیا ہو۔ میں ان ہی خیالات میں نہ جانے کب تک گم رہتا کہ نیچے جھاڑیوں کی اوٹ سے کوئی بلندی کی طرف آتا دکھائی دیا۔

ارے یہ تو احمد ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ ارے حسن بھائی! آپ یہاں کہاں؟ مجھے تو آپ کی تلاش تھی۔ میں نے بڑھ کر حسن بھائی کو گلے لگایا۔

بولے: ہم لوگ آپ کی تلاش میں مجنوں کے ٹیلے کی طرف گئے تھے، اچھا ہوا آپ مل گئے۔ میں کل ہی بمبئی سے واپس آیا ہوں، اب ارادہ ہے کہ جلد از جلد پی ایچ ڈی مکمل کرلوں۔ احمد سے آپ کی آمد کا پتہ چلا سو ڈھونڈتا ہوا یہاں آ پہنچا۔ حسن ادریسی زبان و ادب کے ایک سینئر طالب علم تھے۔ شعر گوئی کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ مطالعہ وسیع اور عزائم بلند تھے۔ فلم انڈسٹری میں قسمت آزمائی کے خیال سے کئی بار بمبئی کا چکر لگا چکے تھے اور غالباً انھیں اسکرپٹ رائٹنگ میں کوئی چھوٹی موٹی شراکت بھی مل گئی تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں ایک طرح کی سیمابیت تھی۔ کوئی کہتا کہ یہ سب یکطرفہ ناکام عشق کے سبب ہے۔ گرلس ہاسٹل کے راستے میں گھنٹوں پتھر کی لاٹ پر بیٹھے رہنا اور غالباً اس خیال سے حظ حاصل کرنا کہ کب وہ اس راہ سے گزرے اور

اس کی ایک جھلک دِکھائی دے۔حسن بھائی کے بارے میں اس قسم کی روایتیں عام تھیں۔حالانکہ جے این یو میں چلمن والے عشق کا رواج تھا اور نہ ہی اس تکلف کی ضرورت تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس قسم کی روایتوں سے حسن بھائی کی پریشاں خیالی، سیماب فکری اور ذہنی تشنج کی ایک ایسی تصویر بن گئی تھی کہ ان پر ایک نارمل انسان ہونے کا گمان کم ہی ہوتا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد حسن بھائی سے مل کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔

بہت عمدہ جگہ منتخب کی ہے، یہاں سے مہرولی کا منظر کتنا بھلا لگتا ہے۔ انھوں نے پاس والی پتھر کی ایک سل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''اور اس بلندی سے قطب مینار کتنا قریب لگتا ہے۔ پرانے وقتوں میں مسجد قوت الاسلام کی کیا شان رہی ہوگی۔'' احمد نے اس منظرنامے پر کچھ اس انداز سے تبصرہ کیا جیسے وہ ان پتھروں کے نیچے دبی تاریخ کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہوں۔

'اب نہ تو شوکتِ اسلام کے مظاہر ہیں اور نہ ہی قوتِ اسلام کے علمبردار۔ اب تو بس کچھ کامریڈ باقی رہ گئے ہیں جو نگاہِ حسرت سے ان مناظر کو تکا کرتے ہیں۔' میں نے احمد کو زچ کرنے کی کوشش کی۔

کامریڈ بھی تو اصلی نہیں، ہم لوگوں نے تو دراصل اپنی شخصیتوں پر کامریڈ کا خول ڈال رکھا ہے۔حسن بھائی نے وضاحت کی۔ بولے، تم اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتے کہ اپنی شخصیت کے اوپر ایک اجنبی شخصیت کو لادے پھرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔کبھی کبھی تو بالکل ایسا لگتا ہے کہ آپ بالکل اس کے رنگ میں رنگ گئے ہیں، لیکن پھر آپ کے اندرون میں کوئی چٹکی لیتا ہے، یاد دلاتا ہے کہ تم وہ نہیں ہو، تمھاری بِنا میں تو دراصل کچھ اور ہی ہے۔

آپ نے بالکل صحیح جگہ انگلی رکھی ہے۔ یہ آواز صرف اندرون سے نہیں آتی، آپ کے اردگرد وہ لوگ جنھیں آپ اپنا انصار و اعوان بناتے ہیں، انھیں اخوتِ باہمی کے سبب کامریڈ گردانتے ہیں، وہی لوگ جب پارٹی میں آپ کی گرفت مضبوط ہوتے دیکھتے ہیں یا آپ کلیدی عہدوں تک پہنچنے والے ہوتے ہیں تو اپنی حرکتوں سے آپ کو ایسی زک پہنچاتے ہیں کہ آپ کو یاد آجائے کہ آپ وہ نہیں ہیں جس کا دَم بھرتے ہیں۔ آپ کی بِنا میں اب بھی اسلام کا عنصر باقی ہے، پھر آپ کی وفاداری پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔آپ نے صحیح کہا، دو گدھوں کی سواری میں آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔

'فری تھنکرس کا بھی تو ایک گروپ ہے۔'

جی ہاں ابتداً تو میں نے اسی گروپ سے وابستہ ہونے کا سوچا تھا، لیکن ان کا گروپ چھوٹا تھا، کچھ لوگ فیشن میں خود کو فری تھنکر تو کہتے تھے لیکن سیاسی وسماجی طور پر یہ لوگ بھی حاشیے پر تھے۔ مرکز میں بائیں

بازو کی طلبا تنظیموں کا قبضہ تھا، سو میں نے سوچا کہ جب یونیورسٹی میں ایک بھرپور زندگی جینا ہے تو کیوں نہ کمیونسٹوں کے ساتھ ہی ہولیا جائے۔

مگر آپ تو ایک دینی ادارے سے آئے تھے؟ آپ کے لیے یہ ایک مشکل فیصلہ رہا ہوگا۔ میں نے احمد سے پوچھا۔

بولے: مشکل ہی نہیں میرے لیے تو ناممکن سا فیصلہ تھا۔ میرے پرانے دوستوں میں سے جس نے بھی سنا دل تھام کر رہ گیا۔ بعضوں نے کفر والحاد کی پھبتی کسی، بعضوں نے قطع تعلق کر لیا۔

مگر آپ کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی۔ دیوبند کا ایک فارغ التحصیل اچانک جے این یو میں آ کر کامریڈ بن جائے۔

مجھے کیا سوجھتی، حسن بھائی سے پوچھو۔ یہی مجھے اِدھر لے کر آئے تھے لیکن تب بھی ہمارے اندر ایک جذبۂ صادق تھا۔

جذبۂ صادق؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ہاں جے این یو میں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اصحاب کہف کے کسی غار میں دس بارہ سال گزار کر آیا ہوں۔ یہ ایک بدلی ہوئی دُنیا تھی جہاں میرا سکہ چلتا نہ تھا۔ اب جو میں دیوبند میں اپنے گزرے ہوئے شب و روز پر نظر ڈالتا تو حیرت ہوتی کہ اب تک ہم اپنی ہی دُنیا سے غافل کس طرح ایک خیالی جزیرے میں نظر بند رہے۔ باہر کی دُنیا سے ہمارا رشتہ تقریباً منقطع تھا۔ اب جو مجھے ایک نئی دُنیا سے واسطہ پڑا تو میں نے سوچا کہ اگر یہاں بھی سمٹے سمٹائے مولویانہ خول میں کنارے کنارے گزر گئے تو پھر ایک جدید دانش گاہ میں آنے کا کیا فائدہ۔ ایک بھرپور طالب علمانہ زندگی کی طلب مجھے بائیں بازو کے خیمے تک لے گئی۔

تو کیا آپ اپنے اس فیصلہ پر پشیمانی محسوس کرتے ہیں؟

بولے: پشیمانی کیسی، یہ تو ایک سوچا سمجھا اجتہادی فیصلہ تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے افسوس ہوتا۔ ہمارے بعض ساتھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے دین کا سودا کر لیا۔ بھلا مسلمان کے دل سے بھی کہیں ایمان نکل سکتا ہے۔

'مگر یہ سب ایک نفسیاتی مخمصے کا معاملہ رہا ہوگا، بیک وقت دو متضاد شخصیتوں کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھرنا، ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف احمد۔'

اسے مانگے کی شناخت کا مسئلہ (Borrowed Identity Syndrome) کہتے ہیں۔ حسن بھائی نے

معاملہ کی پرت کھولنے کی کوشش کی۔ بولے: جب آپ کسی اجنبی شناخت کو کسی مجبوری کے تحت اختیار کرتے ہیں تو آپ کی یک قطبی شخصیت میں کئی متبادل قطب جنم لینے لگتے ہیں۔ بسا اوقات معاملہ آپ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے، آپ کو خود اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ آپ کا اصلی قطب کون سا ہے۔ میرے اوپر بھی ایک زمانے میں ایسی کیفیت گزری ہے کہ میرے ذہن سے میری اپنی اصل شناخت محو ہو جاتی، میں اردگرد کے ماحول اور افراد سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتا کہ کیا بتاؤں، یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ایک دن لیموں پانی کے اسٹال پر میں نے لیموں پانی کا آرڈر دیا۔ سامنے میز پر تازہ لیموں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ سوچا خود ہی اسے نچوڑ لوں۔ اب جو نچوڑنے کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو میں یکے بعد دیگر مختلف گلاسوں میں لیموں نچوڑنے لگا۔ دکاندار نے مجھے روکنے کی کوشش کی، مگر میں کہاں رکنے والا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے ایک دوست نے بڑی مشکل سے مجھے اس بات پر قائل کیا کہ میں یہاں گاہک ہوں، دکاندار نہیں۔

'عجیب! یہ تو بڑی تکلیف دہ صورت حال ہے'۔

بولے: جب آپ کسی مستعار شناخت کو اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں تو وہ آپ سے قیمت طلب کرتی ہے۔

'مگر آپ جس ذہنی تشنج سے گزرے ہیں اس کے بارے میں تو زبانِ خلق پر طرح طرح کی کہانیاں ہیں'۔ یہ سن کر حسن بھائی کے چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

بولے: یہاں بھی معاملہ بیک وقت دوہرے خول میں جینے کا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب میں متشدد کمیونسٹ تھا۔ خود کو ادنیٰ مارکسسٹ کہنے میں فخر محسوس کرتا۔ ان ہی دنوں اولڈ کیمپس کے قریب سڑک کی دوسری جانب ایک بوسیدہ مسجد کے کھنڈر کا سراغ ملا۔ اس علاقے میں مسلم آبادی برائے نام تھی۔ یونیورسٹی کے کچھ مسلمان ملازمین اور طالب علموں نے اس مسجد کی بازیابی کے لیے وہاں ضروری مرمت کے بعد جمعے کی نماز شروع کر دی۔ اب مسلمان طلبا پر یہ ذمہ داری آن پڑی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمعے کی نماز میں شریک ہوں تا کہ مسجد پر ہمارا دعویٰ مضبوط ہو جائے۔ میں ٹھہرا متشدد کمیونسٹ۔ عرصہ سے جمعے کی نماز سے غافل، لیکن یہ وقت اسلام کی حمایت میں اپنا وزن ڈالنے کا تھا۔ احمد سے پوچھو! اس وقت کس طرح ہم لوگوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ہم لوگ بھی اس مہم کا حصہ بن گئے۔ ایک دن جمعہ کی نماز کے لیے ٹوپی لگائے دوسرے مسلم طلبا کے ساتھ بس میں داخل ہو رہا تھا کہ میری نگاہ ورشا پر پڑی جو پچھلے دروازے سے اتر رہی تھی۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں، میں حسب معمول مسکرایا مگر اس کے چہرے پر حیرانی اور خفگی کے آثار نمایاں تھے۔ بعد میں اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم تو نرے بنیاد پرست نکلے۔ میں تو تمھیں روشن خیال سمجھتی

تھی۔ میں نے اپنے تئیں بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔ اسے میرا کمیونزم ڈھونگ لگا۔ ایسا لگا جیسے میری مسلم شبیہ کے اچانک اظہار سے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ بس اتنی سی بات تھی۔
یہ کہہ کر حسن بھائی خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر مجلس پر اسی طرح خاموشی طاری رہی۔ پھر بولے، بھائی بات یہ ہے کہ جب آپ اپنے کندھے پر بیک وقت دو آدمیوں کو اٹھائے پھرتے ہیں تو ایک مرحلہ آتا ہے جب آپ کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ اس میں سے کس شناخت کو آپ باقی رکھیں گے اور کسے قربان کر دیں گے۔ میں نے مسجد کو ترجیح دی اور محبّت قربان کر دی۔

'مگر یہ فیصلہ آپ کے لیے بڑا مشکل رہا ہوگا' بولے: میرے لیے تو یہ سب اچانک ایک جھٹکے میں ہو گیا۔ ہاں اس صورت حال کو تسلیم کرنے اور اس موقف پر جم جانے میں ضرور مشکلیں پیش آئیں، البتہ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو بے چارے بھرپور زندگی جینے کے شوق میں زندگی بھر ادنیٰ مارکسسٹ بنے پھرتے ہیں۔ ان کے اندرون سے گاہے بہ گاہے کوئی آواز تو آتی ہوگی، پتہ نہیں وہ اس سے کیسے نباہ کرتے ہیں۔

'یہ بھی تو نظام ہی کا ایک جبر ہے کہ اس ملک کے مرکزی اسٹیج پر کوئی کلیدی رول ادا کرنے کے لیے اور دُنیا کی نعمتوں میں اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی شناخت کی آنچ دھیمی کرنا پڑتی ہے یا کسی اجنبی شناخت کا سہارا لینا پڑتا ہے'، میں نے صورت حال کی سنگینی کی طرف توجہ دلائی۔

پھر تو مولویت میں ہی عافیت ہے۔ زندگی بھر مدرسہ اور خانقاہ کے جزیرے میں پڑے رہو۔ باہر کی دُنیا میں کیا ہو رہا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا، احمد نے کہا۔

بولے: ارے بھئی سودا تو وہاں بھی دل کی موت کا ہے۔ بڑے بڑے مشائخ کی گردنوں میں کانگریس کی اتباع کا پٹہ پڑا ہے۔ ایک آزاد مسلم زندگی جو دُنیا سے اپنا جائز حصہ طلب کر سکے، اس کے امکانات تو بہت معدوم ہیں ورنہ اس بات کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی کہ مسلمان اجنبی قالب کی تلاش میں نکلیں، حسن بھائی نے گفتگو کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

میں نے سوچا یہ کیسا نظامِ جبر ہے کہ عام ناظرین کو اس کے جبر کا کچھ بھی اندازہ نہیں۔ استاذی وقار حسین کی مجلس میری نگاہوں میں جھلملا اٹھی جو اکثر کہا کرتے تھے کہ اس کی سب سے بڑی شناعت یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنی اصل شناعت اور خباثت پر مطلع بھی نہیں ہونے دیتا۔

۲۵

معرکۂ کفر و اسلام

ادھر علی گڑھ میں معرکۂ کفر و اسلام نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ طلبا کے خلاف انتقامی کارروائیوں میں شدت آ گئی تھی، گویا اس بات کے آثار ہویدا تھے کہ یہ آگ اب آسانی سے ٹھنڈی ہونے والی نہیں۔ طلبا کی نظر میں وائس چانسلر سید حامد کا ہر قدم اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی سے عبارت تھا۔ دوسری طرف سید حامد طالب علم لیڈروں کو سماج دشمن عناصر کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ اس محاذ آرائی کے پیچھے دراصل بائیں بازو کی سیاست تھی، جس کا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکار ہو گئے تھے۔ ویسے تو سید صاحب بڑے جہاندیدہ تھے۔ بات کی تہہ تک بآسانی پہنچ جاتے لیکن عرفانی ٹولے کے پروپیگنڈے اور ان کے عزائم کو سمجھنے میں ان سے سخت چوک ہوئی اور اس کی انھیں اور یونیورسٹی کو بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ حالانکہ اپنی ذاتی زندگی میں وہ کسی روایتی مسلمان سے کم نہ تھے۔ وہ اپنی مادرِ درسگاہ کے وقار کی بحالی کے مشن پر آئے تھے، لیکن بائیں بازو کی سیاست نے انھیں ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کیا جو بے دین، ضدی اور حمیت ملّی سے عاری ہو اور جو اپنے طالب علموں کے لیے شفقت و محبّت کے عنصر سے یکسر خالی ہو۔ گو کہ اس منفی شبیہ کا ان کی حقیقی شخصیت سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس تاثر کو زائل ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ بلکہ کہیے کہ وہ جب تک علی گڑھ میں رہے ان کی شخصیت پر اسی پروپیگنڈے کا پردہ پڑا رہا۔ ایک بار جب وہ لندن کے سفر سے واپس آئے تھے ان کے پاس Peter Watson کے ایک مضمون کا تراشا تھا جو غالباً ٹائمز لندن کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا، کہنے لگے بڑا فکر انگیز مضمون ہے۔ مسلمانوں کے زوال کے سلسلے میں بعض اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے، اُردو حلقوں میں بھی اسے پڑھا جانا چاہیے۔ میں نے پیٹر ویٹسن کا نام پہلی بار ان ہی کی زبانی سنا جو بعد میں مصنف کی بعض وقیع کتابوں تک میری رسائی کا ذریعہ بنا۔

ایک بار حبیب ہال میں طلبا اور پرووسٹ کے مابین محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ معاملہ ڈسپلن شکنی تک جا پہنچا۔ بعض طلبا پر تادیبی کارروائی کا خطرہ تھا۔ وہ لوگ میرے پاس آئے۔ میں نے ثالثی کے لیے حامی بھر لی۔ انھیں لے کر سید حامد صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ کسی میٹنگ میں تھے۔ چند منٹ کے لیے

باہر آئے، پوچھا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ یونیورسٹی کی حیثیت ایک علمی قبیلے کی ہے اور آپ اس کے سردار ہیں۔ قبیلے میں جب نچلی سطحوں پر کوئی واقعہ ہوجاتا ہے یا لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو بات قبیلے کے سردار تک پہنچتی ہے۔ ہم آپ کے پاس اسی امید کے ساتھ آئے ہیں کہ پرووسٹ اور طلبا کے مابین جو ناچاقی ہوئی ہے اور اس سبب دلوں میں جو دوریاں پیدا ہوئی ہیں انھیں دور کرنے کے لیے آپ دونوں فریقوں کو بلا کر سمجھادیں۔ یہ سن کر سید صاحب مسکرائے۔ بولے: میں اپنا یہ فریضہ ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا، آپ لوگ مطمئن رہیں۔ ہم لوگ خوش خوش واپس آئے۔ تادیبی کارروائیوں کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

ایک بار طلبا نے پراکٹر کو یرغمال بنالیا جو کسی ہنگامے کو فرو کرنے کے ارادے سے حبیب ہال کے دورے پر تھے۔ مطالبات میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ پرووسٹ فی الفور استعفیٰ دیں۔ ہنگامہ شام سے شروع ہوا اور آدھی رات تک شدت اختیار کرگیا۔ پراکٹر صاحب کو باہر نکالنے کی کوئی سبیل نہ رہی۔ پولیس کی مداخلت ایک نئی مصیبت کھڑی کرسکتی تھی۔ رات ایک بجے ہم لوگ تین چار طلبا کے ساتھ وی سی لاج پہنچے۔ راستے میں شوکت بھائی ملے جو حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلے تھے۔ جوش جہاد سے سرشار! کہنے لگے: 'ایس ایس ہال اور وی ایم ہال سے ہوتا ہوا آرہا ہوں، لڑکے ہر طرح تیار ہیں'۔ اب انھیں میں کیا بتاتا کہ میں تو معاملہ کو ٹھنڈا کرنے نکلا ہوں۔ رات ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہوگا۔ سید حامد ایک بڑی میز کے گرد اپنے انتظامی عملے اور حکومتی اہلکاروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ پرووسٹ کو فی الفور برخاست کرنے کا حکم جاری کردیں تو لڑکوں کا اشتعال ٹھنڈا ہوسکتا ہے اور شاید پراکٹر کی رہائی کی سبیل بھی پیدا ہوجائے۔ انھوں نے کسی تامل کے بغیر دراز سے لیٹر ہیڈ نکالا اور ان کی برخاستگی کی تحریر لکھ کر میرے حوالے کردی۔ ہال میں جب یہ خبر پہنچی تو معاملہ ٹھنڈا ہوگیا اور پراکٹر بحفاظت نکل آئے۔

ایک بار ڈرامہ کلب کے کسی پروگرام میں کوئی مخرب اخلاق سین اسٹیج ہوگیا۔ صورت حال نے نزاع کی شکل اختیار کرلی۔ اسلام پسند اور کمیونسٹ طلبا کے مابین تلواریں کھنچ گئیں۔ سید صاحب نے ڈرامہ کلب کے ذمہ داروں کو طلب کیا۔ میں اتفاق سے اس وقت وی سی لاج میں ملاقاتیوں کے کمرے سے متصل بیٹھا تھا۔ میں نے انھیں ذمہ داروں کا سخت محاسبہ کرتے سنا۔ واقعہ یہ تھا کہ سید صاحب نہ تو ضدی تھے اور نہ ہی روایت بیزار بلکہ وہ اسلام اور کفر کے مابین جاری جھڑپ (کراس فائر) میں پھنس گئے تھے۔ لیکن وہ کرتے بھی کیا۔ اس دور میں یہ تاثر عام تھا کہ بائیں بازو کی حمایت کے بغیر کیمپس کی زندگی میں کامیابی کا حصول کچھ آسان نہیں۔ مرکز مطالعہ تاریخ میں دو مولوی صاحبان کی سرگرمیاں اس خیال کی تائید کرتی تھیں جو اپنی تمام تر اسلام پسندیوں کے باوجود سیاسی طور پر بائیں بازو کا ہی حصہ سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کو سید

صاحب کی کوششوں سے رہائی نصیب ہوئی۔ یونیورسٹی میں ایسے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو بائیں بازو کی سیاست سے بیزار تھے، مگر اسلامی حلقوں میں بھی ان کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ زیدی سسٹرس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جو ایک بھرپور علمی اور سماجی زندگی جینا چاہتی تھیں۔ لیکن علی گڑھ کا روایتی معاشرہ ان کی جولانیوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ جب یہ بہنیں سائیکل پر سوار ہو کر کیمپس میں نکلتیں تو روایتوں کے کتنے ہی تاج محل زمیں بوس ہو جاتے۔ زمیندارانہ معاشرے کے اقدار نے اسلام کا جو ہیولا تشکیل دیا تھا، اس میں ان جیسی خواتین کے لیے سماجی رول کی گنجائش خاصی کم تھی۔ لہٰذا ان کے لیے اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ بحالت مجبوری بائیں بازو کے نظری سائبان میں پناہ لیں۔ کفر و اسلام کی یہ ہنگامہ آرائی دراصل دھوپ اور چھاؤں کا کھیل تھی۔ جو لوگ زندگی کے مرکزی اسٹیج پر اپنے لیے کسی کلیدی رول کے متلاشی ہوتے وہ دھوپ چھاؤں کے فراق میں رہتے۔ نئی وفاداریوں کو کبھی بخوشی اور کبھی بہ کراہ قبول کر لیتے۔ البتہ جن کے لیے یہ بات اہم تھی کہ وہ جو ہیں وہی رہیں تو ایسے لوگوں کے لیے ہر زمانے اور ہر جگہ کی طرح یہاں بھی زندگی آسان نہ تھی۔

علی گڑھ جسے اسلامیانِ ہند اپنا علمی اور فکری قلعہ سمجھتے تھے اور جس کے خصوصی اختیار کی بحالی کے لیے انھوں نے سولہ سال تک مسلسل تحریکیں چلائی تھیں، اسی علی گڑھ میں امکانات و مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے لازم سمجھا جاتا تھا کہ فرد اپنی اصل شناخت کے بجائے ایک اجنبی شناخت کا قالب اختیار کرے۔ خود کو مسلمان کہنے کی بجائے ادنیٰ مارکسسٹ کہنے پر مجبور ہو۔ دل سے آپ خواہ کچھ بھی ہوں جب تک آپ بائیں بازو کی سایۂ عاطفیت میں پناہ نہیں لیتے، بعض شعبوں میں تو آپ پر ترقی کے دروازے بالکل نہیں کھل سکتے تھے۔ شعبۂ تاریخ میں بعض مولوی صاحبان کی سرخ حکمتِ عملی کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، جس سے یہ تاثر مزید گہرا ہوتا تھا کہ اپنی اسلامیت کو جب تک سرخ قبا میں نہ چھپایا جائے شدت پسند مسلم ہونے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اقلیتی کردار کی بحالی کے بعد بھی نہ تو علی گڑھ میں اور نہ ہی علی گڑھ سے باہر ملّی حلقوں میں جشن کی کوئی کیفیت پیدا ہو سکی۔ طلبا کو شدت پسند اور مجرم باور کرانے میں بائیں بازو نے اپنے سارے ترکش خالی کر دیئے۔ یونیورسٹی مسلسل کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ بڑی تعداد میں طلبا کے اخراج کے بعد جب حالات معمول پر آئے اور علمی زندگی کی رونق پھر سے بحال ہوئی تو معزول شدہ طلبا کے لیے ان کی اپنی طالب علمانہ حیثیت کو برقرار رکھنا ہی بنیادی مسئلہ بن گیا۔ جب انسانوں سے ان کے بنیادی حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں تو انھیں یہی بات نعمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی تمام مسرتوں سے محروم کم از کم زندہ تو ہیں۔ ملّی شناخت پر غیر معمولی اصرار کے بجائے اب احتجاجی طلبا اس بات کو غنیمت جانتے کہ تادیبی کارروائی سے بچ بچا کر انھیں کم از کم امتحان میں شرکت کی اجازت مل جائے اور وہ اپنی ڈگریاں لے

کر باہر کی دُنیا میں اپنی تگ و تاز کے لیے امکان تلاش کرسکیں۔

ان تادیبی کارروائیوں سے یونیورسٹی تو راستے پر آگئی لیکن انتظامی مشینری میں بائیں بازو کی سبقت برقرار رہی۔ مانگے کی شناخت کا عذاب بدستور جاری رہا۔ شعبۂ تاریخ جو اس گمراہی کا مرکز تھا وہاں سے طلبا میں اپنی اصل سے ہٹ جانے اور دقیانوسی شناخت کو خیرباد کہنے میں مقابلے کی کیفیت رہتی۔ ایک طالب علم نے جوشِ ترقی پسندی میں ٹائمز آف انڈیا کو ایک مراسلہ میں تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ مدت سے 'گونگا قرآن' ایک بار پھر بولنے لگا ہے۔ صاحبزادے ایک روایتی مسلم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ شعبۂ تاریخ میں راہ یاب ہونے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ اس طرح کی باتوں پر دینی حلقوں میں اشتعال پیدا ہوتا۔ طلبا کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑتے اور یہ سرخ مجاہدین بآسانی اپنے ادنیٰ مارکسسٹ اساتذہ کے نورِ نظر بن جاتے۔ کئی سالوں بعد ایک بار ایک ایسے ہی طالب علم سے میری ملاقات لندن کے ایک علمی جلسہ میں ہوگئی۔ ابتداً تو کچھ کھنچے کھنچے سے رہے پھر جب برف پگھلی تو پتہ چلا کہ یہ حضرت بھی اندر سے پکے مسلمان ہیں بلکہ مجھ سے بھی کہیں بڑھ کر، متوارث اسلام کے مسلّمات کو تنقید و تجزیہ کی میزان پر پرکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی خیال آیا شاید یہ تقلیبِ ذہنی قیامِ لندن کی برکات کے سبب ہو جہاں ان دنوں بڑی تیزی کے ساتھ یونیورسٹی کیمپسوں میں حزب التحریر اور دوسری احیائی تحریکوں کے اثرات بڑھتے جاتے تھے، مگر حقیقت کچھ اور نکلی۔ بڑی سادگی اور معصومیت سے اپنی سرخ جیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر انھوں نے قبائے سرخ زیب تن نہ کی ہوتی تو یہاں اس مجلس میں آج مجھ سے ملاقات کا یہ امکان پیدا نہیں ہوتا۔

نظری قبا کی تبدیلی دراصل To be اور Not to be کا سوال تھا۔ یہ بقا اور کامرانی کی ایک ایسی جنگ تھی جس میں بہتوں کے لیے کامیابی کے امکانات محدود تھے۔ ہمارے ایک دوست جو آگے چل کر ایک صوبائی حکومت میں زنداں کے نگرانِ اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے، انھیں ایک دن جمعہ کی نماز میں نہ پا کر جب میں خیریت دریافت کرنے ان کے کمرے میں گیا تو پتہ چلا کہ انھوں نے بھی قبائے سرخ زیب تن کرلی ہے مگر انھیں بہت جلد اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ وہ اپنی اصل سے دور جانے میں ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو علی الاعلان 'گونگے قرآن' کی مذمت میں مراسلہ لکھ بیٹھتے ہیں۔ گویا

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

والی کیفیت بنی رہتی۔

۲۶

شناخت بالجبر

علی گڑھ میں ڈھائی تین سال قیام کے بعد جب میں گھر لوٹا تو وہاں ایک دُنیا بدل چکی تھی۔ اتنے قلیل عرصے میں ابّا بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوجائیں گے، ان کے بالوں کی سیاہی پر سفیدی غالب آجائے گی، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ میری نگاہیں گھر میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو تلاش کرتی رہیں، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے۔ البتہ نسبتاً بڑی عمر کے دو بچے متحرک دکھائی دیئے۔ پہلے تو یہ گمان ہوا کہ شاید پڑوس کے ہوں پھر جب بہت دیر تک اپنے بھائیوں کی کوئی سن گن نہ ملی اور ان دو نسبتاً بڑی عمر کے بچوں کو گھر جیسی مانوسیت کے ساتھ مستقل مقیم دیکھا تو دل نے کہا یہ کوئی اور نہیں وہی دونوں چھوٹے بھائی ہیں جنھیں وقت کے ہاتھوں نے اس صورت میں متشکل کردیا ہے۔ جب میں گیا تھا تب ابّا کی گفتگو میں صورت حال کی تبدیلی کے لیے ایک عزم مسلسل کا اظہار پاتا اور وہ خود کو اس انقلاب کے مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کرتے۔ اب ان کی گفتگو کا بنیادی محور یہ تھا کہ وہ کسی طرح اس خواب کو اپنے بچوں تک منتقل کردیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار بچپن میں **ما تعبدونَ من بعدی** کی تفسیر پر آکر وہ کس طرح بے چین ہو اُٹھے تھے، تب ان کی زبان سے بمشکل یہ الفاظ نکلے تھے، ہاں بڑی مسئولیت ہے بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اب وہ توحید کی اس مشعل کو اپنے بچوں کے ہاتھوں میں تھما دینا چاہتے تھے۔ ایسا لگتا جیسے ان کا ہر جملہ اس سوال سے عبارت ہو **مَا تعبدونَ مِن بعدی؟**

ابّا کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کی فتوحات کی داستانوں کو بڑے ذوق وشوق سے سنتے، ان کی جزئیات میں جھانکنے کی کوشش کرتے۔ انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ نظری اور گروہی معرکہ آرائیوں نے جدید سیکولر دانش گاہوں میں بھی طلبا کے لیے کیسی کیسی آزمائشیں کھڑی کر رکھی ہیں۔

زاہدہ زیدی کا تعلق بائیں بازو سے تھا، وہ ہمیں امریکی ادب پڑھاتی تھیں۔ شومئ قسمت وہ میری ٹیوٹر قرار پائیں لیکن بات دو تین کلاسز سے آگے نہ بڑھ پائی اور مجھے اپنا ٹیوٹر تبدیل کرنا پڑا۔ دوسری طرف اسلوب انصاری جیسے اساتذہ بھی تھے جنھیں اپنی راسخ العقیدگی پر سخت اصرار تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ

کبار اساتذہ کی ایک مجلس سے احتجاجاً اس لیے اُٹھ آئے تھے کہ وہاں ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی شان میں کچھ ایسے جملے کہے تھے جس میں سوئے ادب کا پہلو نکلتا تھا۔ گویا یونیورسٹی کی چہار دیواریوں میں نظری وابستگی کو بڑا دخل تھا۔ ابّا میری اس ذہنی الجھن کو بھانپ گئے۔ کہنے لگے کہ ہمارے لیے اصل امتحان تو یہی ہے کہ ہم ہر حال میں اپنی اصل پر قائم رہیں۔ اَصلُھا ثَابِۃٌ و فرعُھَا فِی السَّمَاء میں اسی بات کی طرف تو اشارہ ہے۔ اہلِ حق اگر اپنی بات کہنے میں لیت و لعل کا شکار ہوئے تو کلمۂ طیبہ کے نمو کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ اور یہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے کوئی نئی صورت حال نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سے ہی ان پر نئی نئی شناختیں تھوپی گئیں۔ انھیں ان ناموں سے پکارا گیا جن کے نہ وہ متحمل تھے اور نہ ہی سزاوار۔ منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے حصے میں صرف دھوکہ آیا۔ یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلو بدلا پھر فرمایا کہ یہ دھوکہ دونوں طرف ہوا، یہاں بھی اور سرحد کے اس پار بھی۔

بولے: پاکستان تو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، لیکن جناح نے حصول پاکستان سے چند دن پہلے پاکستانی کانسٹیٹیوئنٹ اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صریح الفاظ میں پاکستان کی دینی اساس کی نفی کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ خواہ کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں ریاست کو اس سے کچھ بھی سروکار نہیں۔ بقول ان کے آنے والے دنوں میں کسی کو اس ملک میں نہ ہندو رہنا تھا اور نہ مسلمان کہ ہندو یا مسلمان ہونا فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔ سیاسی طور پر سبھوں کی حیثیت ریاست کے شہری کی تھی۔ اس وقت بہت سے لوگوں کو جناح کے اس نئے لب و لہجے سے سخت وحشت ہوئی۔ اگر نئی ریاست میں نہ کسی کو مسلمان رہنا تھا اور نہ ہندو بلکہ یہ سب فرد کا ذاتی معاملہ تھا تو پھر پاکستان بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو متحدہ ہندوستان میں بھی ہوسکتا تھا۔ تحریک پاکستان کے غبارے میں 'پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ' جیسے نعروں نے جو ہوا بھری تھی جناح کی تقریر نے بالکل ابتدائی مرحلہ میں اس غبارے سے ہوا نکال دی۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان ایک نئی آزمائش بن کر سامنے آیا۔ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر بنا تھا اس لیے اسلام اور پاکستان کو ایک سکہ کا دو رُخ سمجھا جانے لگا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے لازم ٹھہرا کہ وہ ہندوستان سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے اس پاکستان سے اپنی برأت کا علی الاعلان اظہار کریں جس کی بنا میں اسلامی ریاست کا تصور کارفرما تھا۔

پھر تو بڑی آزمائش کی گھڑی رہی ہوگی؟

بولے: ہاں، مسلمان راتوں رات اس ملک میں مجرم بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو مسلم لیگ کی تحریک سے وابستہ نہیں تھے، انھیں بھی اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر پاکستان کی ہجوسرائی کو ایک

سیاسی کلیے کے طور پر اختیار کرنا پڑا۔ دیکھتے دیکھتے اس ملک میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک نئی قبیل پیدا ہوگئی۔ ان نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے لازم قرار پایا کہ وہ اس ملک میں اپنے حقوق کے لیے جب بھی آواز بلند کریں یا کلمۂ احتجاج زبان پر لائیں تو اس موقع پر پاکستان کے لیے چند کلمۂ بد یا مذمت کے الفاظ ضرور ادا کریں تاکہ ان کی آہ وکراہ پر ملک دشمنی کا گمان نہ ہو۔ نیشنلسٹ مسلمان بھی دراصل ایک جبری شناخت تھی۔ یہ ایک ایسی قبائے مستعار تھی جس میں تقسیم ہند کے بعد بڑے بڑے مسلم سورماؤں نے اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ بیچارے کرتے بھی کیا تقسیم ہند نے ان کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اب تم اسی سے اندازہ لگاؤ کہ راجا آف محمودآباد جو مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور جنھیں جناح کا دست راست سمجھا جاتا تھا ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ خود اپنے ملک میں اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ شاید وہ اس صورت حال کے لیے تیار نہ تھے، انھوں نے فی الفور مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے اس بات کا برملا اعلان کیا کہ ان کی پارٹی سے اسٹریٹجک سیاسی غلطی ہوئی ہے۔ اب اس نئی بدلی صورت حال میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دے ڈالا کہ انھیں ہندوستان کی طرف سے جنگ کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے خواہ یہ جنگ پاکستان کے خلاف ہی کیوں نہ لڑنی پڑے۔ ایک صاحب تھے ایم اے سلام جو مدراس کی صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے اہم لیڈر تھے انھوں نے بھی اس بات کے اعلان میں عافیت جانی کہ آندھرا کے مسلمان ہندوستانی ریاست کے تئیں وفادار ہیں اور وہ اس کی حفاظت میں اپنے خون کے آخری قطرہ تک نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

اور جو لوگ پہلے سے ہی کانگریس میں شامل تھے یا جو مسلم لیگ کی تحریک سے تعلق خاطر نہیں رکھتے تھے، کیا انھیں بھی نیشنلسٹ مسلمانوں کی قبا میں پناہ لینا پڑی؟

بولے: مسلمان خواہ کسی بھی قبیل کا ہو نئے ہندوستان میں اگر اسے پناہ مل سکتی تھی تو وہ اسی صورت میں کہ وہ اپنے نیشنلسٹ ہونے کا ثبوت دیتا رہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ امتحان اتنا آسان نہ تھا مجھے یاد ہے کہ آزادی سے چند ماہ پہلے گاندھی جی نے جب یہ بات کہی تھی کہ قومی اور صوبائی ریاستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مکمل انصاف سے کام لے تو اس پر ہندو پریس میں بڑا شوروغوغا ہوا تھا۔ پریس والوں کا کہنا تھا کہ ہم نیشنلسٹ مسلمانوں کے سلسلے میں تو ایسا سوچ سکتے ہیں، لیکن عام مسلمانوں کو اس درجہ پر فائز کرنا خطرناک غلطی ہوگی کہ ان کے دل پاکستان کی محبّت سے مملو ہیں، وہ مسلم لیگ کی تحریک میں شریک رہے ہیں، راتوں رات ان کی وفاداری نہیں بدل سکتی۔

یہ ملک کا عمومی مزاج بن گیا تھا یا صرف احیا پرست ہندو تحریکیں اس خیال کو ہوا دے رہی تھیں؟

بولے: بڑے بڑے بظاہر معتدل ہندو رہنما بھی فرقہ پرستی کے اسی دھارے میں بہہ رہے تھے۔ تم نے رام منوہر لوہیا کا نام تو سنا ہوگا۔

ہاں، ان کا تو سوشلسٹ لیڈر کی حیثیت سے سیکولر حلقوں میں بڑا اعتبار ہے۔

بولے: تمھیں حیرت ہوگی کہ لوہیا جیسے لیڈران بھی تقسیم کے بعد، غالباً یہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی کسی میٹنگ کا واقعہ ہے، لوگوں کو پاکستان کے خلاف محاذ آرائی کی دعوت دیتے ہوئے یہ کہتے سنے گئے کہ میں ہندوستانی مسلمانوں سے خاص طور پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے اسلحوں سے دست بردار ہوجائیں، ہندوستان کے وفادار شہری بنیں اور اگر ضرورت پڑے تو پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک سے جنگ کے لیے تیار رہیں۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اخبارات دیکھنا اس عہد کی سچی تصویر سامنے آجائے گی۔ ایک صاحب تھے گووند و لّب پنتھ، یہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کا بھی ہندوستانی مسلمانوں سے یہی مطالبہ تھا کہ وہ ملک سے وفاداری کو اپنا شعار بنالیں۔ انھوں نے صراحتاً یہ بات کہی تھی کہ ہندوستان کے ہر مسلمان پر یہ لازم ہوگا کہ وہ پاکستانی حملہ آوروں سے لڑتا ہوا اپنے خون کا نذرانہ پیش کرے۔ انھیں چاہیے کہ اپنے دل کو ٹٹولیں اور ابھی فیصلہ کرلیں کہ انھیں پاکستان ہجرت کرنی چاہیے کہ نہیں۔

یہ تو ایک یلغار کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اس قدر سخت نفرت کے جذبات امڈ آنے کا آخر سبب کیا تھا؟ ابھی چند برسوں پہلے تک تو خلافت تحریک میں ہندو اور مسلمان باہم شیر وشکر دکھائی دیتے تھے، بلکہ قیادت کی کمان بھی بڑی حد تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ سینتالیس تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں پر یہ زمین اس قدر تنگ ہوگئی کہ خود ان کے وطن میں ان سے وفاداری کا ثبوت مانگا جانے لگا اور انھیں اپنی اصل دینی اور قومی شناخت کے علی الرغم نیشنلسٹ آئیڈنٹیٹی میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا؟

میرے اس سوال پر والد صاحب نے ایک لمحہ کو توقف اختیار کیا جیسے تاریخ کا وہ سرا تلاش کر رہے ہوں جس کے بیان سے اس صورت حال کی صحیح تصویر سامنے آجائے۔ بولے: دراصل ہم جسے آزادی کہتے ہیں بہت سے ہندو زعما اسے قدیم بھارت کے احیا کے طور پر دیکھ رہے تھے اور یہ خیال صرف احیا پرست ہندوؤں کا نہ تھا بلکہ کانگریس کی قدآور شخصیتیں بھی ڈھکے چھپے اسے ہزار سالہ مسلم عہد حکومت کے خاتمہ کے طور پر دیکھتی تھیں۔ ایک صاحب تھے بابو سمپر نانند، یہ یوپی حکومت میں کانگریس کے وزیر تعلیم تھے۔ آزادی سے چند ہفتوں پہلے انھوں نے ایک اخباری مضمون میں برملا اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ازمنۂ قدیم میں بھی ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ تھا۔ ہمیں پاکستان کے الگ ہونے کا تو دکھ ہے، کیا پتہ یہ پھر آگے

چل کر ہم سے آملے البتہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم آزادی کی شکل میں ایک ایسی قیمتی چیز کو حاصل کرنے جارہے ہیں جو ایک ہزار سال پہلے اس ملک نے کھودی تھی۔ بقول سمپر نانند: تھانیسر کی جنگ میں محمود غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج کی شکست سے بھارت نے اپنی خودی (سَوَا) کھودی تھی جس کے بعد ہمارے ہاں سائنس اور فلسفہ میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔ ان ہزار سالوں میں کوئی آوِشکار ہمارے ہاں نہ ہوسکا۔ اس طرح کی باتیں اس وقت کے رسائل و جرائد میں بکثرت ملیں گی۔ کبھی موقع ملے تو علی گڑھ کی لائبریری میں اخبارات و رسائل کی پرانی فائلیں دیکھنا۔ تمھیں اس بات کا اندازہ ہوسکے گا کہ اس ملک میں آزادی کی صبح مسلمانوں پر کتنی سخت آزمائشیں لے کر آئی تھی۔ بہت سے لوگ جن کا پاکستان کی تحریک سے کوئی فکری اور نظری تعلق نہیں تھا، انھوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ منقسم ہندوستان میں ان کے لیے جینا مشکل ہوگیا ہے تو وہ یہ کہتے ہوئے پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے کہ اب اس ملک میں جو لوگ رہ جائیں گے ان کی پوری زندگی یہ ثابت کرنے میں گزر جائے گی کہ وہ اس ملک کے سچے پکے اور وفادار شہری ہیں۔

ابھی گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مکتبہ کے سامنے ایک رکشہ آکر رکا۔ دیکھو انھیں اُترنے میں مدد کرو۔ ارے یہ تو ابّا کے پرانے دوست ہیں مقامی کالج میں ریاضی کے پروفیسر۔ آج ان کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔ ذکی صاحب کے چہرے پر اب وہ پہلی سی تازگی نہ تھی۔ مجھے دیکھ کر مسرت سے کھل اٹھے۔ یہ جان کر کہ ان کے آنے سے پہلے یہاں مسئلہ مسلم شناخت کا زیر بحث تھا، ایک آہِ سرد بھری۔ بولے: انھوں نے ہماری اصل شناخت پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑی بڑی ترکیبیں رچیں۔ کبھی کہا کہ ہم اقلیت ہیں، ہمارا مقام حاشیہ پر رہنا ہے۔ حالانکہ نظری اعتبار سے ہم تب بھی اکثریت کا درجہ رکھتے تھے لیکن ہمارے مقابلہ میں ایک مصنوعی اکثریت کا ہیولا تراشا گیا اور اسے ہندو اکثریت کا نام دیا گیا، حالانکہ ہندو ہونا نہ کوئی نظریہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہب۔ یہ تو ایک عمومی اصطلاح تھی جو اہلِ عرب و فارس اس خطہ کے ساکنین کے لیے بلاامتیاز مذہب وملت استعمال کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یہاں مختلف مذاہب اور دیوی دیوتاؤں کے ماننے والوں کے مختلف اور متضاد طائفے تھے۔ ذات پات کی ابدی تقسیم نے مختلف طائفوں کو باہم متصادم اور متحارب کر رکھا تھا۔ اس مکروہ صورت حال پر پردہ ڈالنے کے لیے ہندو مذہب کا مصنوعی ہیولیٰ تراشا گیا اور اس مصنوعی منظر نامے میں مسلمان سب سے بڑی امت ہونے کے باوجود اقلیت قرار پائے۔ یہ کہتے ہوئے ذکی صاحب نے اپنی عینک اتاری، پانی کا ایک گلاس طلب کیا پھر قدرے توقف کے بعد بولے: ایک چیز ہوتی ہے forced identity یعنی وہ چیز جو لوگ آپ پر تھوپ دیتے ہیں، آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ تم فلاں ہو، حالانکہ ہم وہ ہوتے نہیں۔ اس طرح کی مخالفانہ تصویر گری کو میں شناخت بالجبر کہتا

ہوں۔ مسلمانوں کو اس ملک میں اقلیت کہا گیا اور اتنی کثرت سے کہا گیا کہ بہت سے مسلمانوں کو اس بات پر یقین آ گیا کہ ہم واقعی اقلیت میں ہیں، وہ خود بھی اپنے آپ کو اقلیت کہنے اور سمجھنے لگے۔

'یہ بالجبر والی اصطلاح آپ نے خوب استعمال کی'۔عبدالمتین صاحب نے مداخلت کی۔ بولے: اس میں تو بالجبر والی شناعت بھی آ گئی۔

ذکی صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ بولے: 'جب آپ کو وہ کچھ باور کرایا جاتا ہو جو دراصل آپ ہوتے نہیں تو کتنی بے بسی معلوم ہوتی ہوگی ذرا اس بات کا اندازہ کیجیے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی ہم پر ایک مصنوعی شناخت تھوپی گئی۔ ہمیں محمڈن کہا گیا لیکن ہم نے اس شناخت کو پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا۔ ہم آج بھی مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن اقلیت والی شناخت تو کچھ ایسی چپکی کہ اب ہم خود ہی اقلیت کی حیثیت سے حکومت سے مراعات کے طالب رہتے ہیں'۔

قوموں کی زندگی میں شناخت اس قدر اہم رول ادا کرتی ہے مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا۔ حالانکہ ابا سے بارہا یہ بات سنی تھی کہ آپ جو سوچتے ہیں وہی ہوتے ہیں۔ لیکن تب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ انسان کا self-perception اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس قدر اہم رول ادا کرتا ہے۔

۲۷

بہتّر کھانوں کا دسترخوان

آج جمعہ کا دن تھا لیکن مکتبہ میں وہ پہلی سی چہل پہل نہ تھی۔ نہ تو شمہ چچا کی شمپنی آ کر رکی، نہ ہی علامہ خورش کھانے کی فرمائش کرتے دکھائی دیئے۔ نواب پیغمبر پور کے انتقال کی خبر ابھی چند دن پہلے ہی آئی تھی۔ پتہ چلا کہ انھوں نے بڑی کسمپرسی کے عالم میں وفات پائی۔ آخری دنوں میں والد صاحب نے بھائی جان کو ان کی خبر گیری پر مامور کر رکھا تھا۔ کسے خبر تھی کہ ایک رئیس زادہ اپنے آخری دنوں میں کوڑی کوڑی کو محتاج دُنیا والوں کے لیے نشانِ عبرت بن کر رہ جائے گا۔ کہتے ہیں کہ پروفیسر ایک دن عالم اضطراب میں تھے۔ پلاؤ کی قاب ادھوری چھوڑ کر اٹھے۔ خالم مخول کی گردان کرتے ہوئے جامع مسجد کے لیے نکلے جہاں وہ کبھی کبھی راتوں کو قیام کرلیا کرتے تھے۔ اس بات کو دو سال ہونے کو آئے، کسی کو نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا۔ پروفیسر کے اس طرح اچانک غیاب کی خبر سن کر مجھے جامعہ ملیہ کے معروف صاحبِ قلم اور دانشور انور علی خاں سوز یاد آئے جو انگریزی زبان میں مسلم مسائل پر اپنی بیباک تحریروں کے لیے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ واقفین کہتے ہیں کہ ان کے اندر بھی ایک مضطرب روح بستی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں پر جو گزری اور جو گزر رہی تھی بھلا اُن سے بہتر اس حادثۂ فاجعہ سے کون واقف ہوسکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک دن گھر سے نکلے اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہوگئے۔ عزیز و اقارب اور دوست احباب نے دلّی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ نہ ملے۔ شاید قدرت کو ان پر رحم آ گیا تھا۔ یہ ملک اب ان جیسے مضطرب نفسوں کے قیام کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔

مکتبہ میں اب نئی نسل کے نوجوانوں کا ڈیرہ تھا۔ مستقبل کے متلاشی تاریخ کے تحلیل و تجزیہ میں مشغول نوجوانوں کے پاس طرح طرح کے سوال ہوتے۔ جب شمالی ہند کے مسلمانوں کو یہ معلوم تھا کہ پاکستان بننے کی شکل میں بہار اور اتر پردیش کے علاقے ہندوستان ہی میں رہ جائیں گے تو انھوں نے مسلم لیگ کا ساتھ کیوں دیا؟ انھیں پتہ تھا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان نہیں جاسکتے، پھر تقسیم کے اس خالی الدماغ منصوبے کی مخالفت میں کیوں نہیں اُٹھ کھڑے ہوئے؟ کیا تقسیم ایک سازش تھی یا مسلم لیگ کی قیادت واقعی ایسا چاہتی

بھی تھی؟ ایک دن عبدالمعز نے پوچھا کہ سنا ہے پاکستان کا خیال محض ایک بارگیننگ چپ (Bargaining Chip) تھا۔ اس دھمکی کے ذریعہ جناح کانگریس کی قیادت سے زیادہ سے زیادہ مطالبات منوانا چاہتے تھے۔

۱۹۴۰ء تک تو صورت حال یہی تھی، والد صاحب نے کہا۔ لاہور کے اس جلسہ میں جسے قراردادِ پاکستان کے نام سے جانا جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ مسلم خودمختار ریاستوں کی تصویر ابھرتی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی الگ ملک یا تقسیم وطن کے بجائے مسلم ثقافتی خطوں کے قیام کی بات ملتی ہے۔ ویسے بھی ہندوستان ہمیشہ سے وفاق کی ریاست رہا ہے۔ اس قسم کے ثقافتی خطوں کی بات جو ایک ہی سیاسی وحدت کے اندر ہوں کچھ عجب نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے بعد صورت حال اتنی تیزی سے بدلی کہ حالات پر کسی کا قابو نہ رہا۔

'تو کیا پاکستان حادثاتی طور پر وجود میں آ گیا؟'

یہ کہنا تو مشکل ہے۔ ساری لڑائی اس بات کی تھی کہ مسلمان ڈھیلے ڈھالے وفاق میں اپنے ثقافتی مراکز کو محفوظ دیکھتے تھے اور کانگریس ایک مضبوط مرکز کے ذریعہ ملک کو کنٹرول کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کشمکش کا نتیجہ ایک غیر فطری حل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ ایک پاگل پن تھا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خدا کی زمین پر ریڈ کلف نے ایک ایسی لائن کھینچی جس کی خون آشامی نے لاکھوں لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک پوری تہذیب تباہ ہوگئی۔

اگر یہ نہ ہوتا تو دلّی اور لکھنؤ کی کیا رونق ہوتی۔ حیدرآباد اور بھوپال میں علم و ادب کی دل بستگی کے کیسے کیسے امکانات ہوتے، عبدالمعز نے اپنے چشم تصور سے گم گشتہ مستقبل کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کی۔

بولے: گو کہ یہ سب کچھ اچانک ہوا لیکن حالات تو ایک مدت سے اسی رخ پر جا رہے تھے۔ مسلمان ایک مدت سے خیالی دُنیا میں رہ رہے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی انھوں نے سنبھلنے کی کوشش نہ کی۔ پھر پے در پے ایسے حملے ہوتے رہے جسے وہ سہار نہ پائے۔ باضابطہ ایسے قوانین بنائے گئے جن کا مقصد مسلمانوں کو ان کی املاک سے بے دخل کرنا تھا۔

اچھا!

ہاں جیسے املاکِ متروکہ کا قانون (Evacuees Property Act) اور دشمن کی املاک کا قانون یعنی (Enemy Property Act)۔

اور اس پر مسلمان سیاسی قائدین نے کوئی احتجاج نہ کیا؟

بھلا وہ کیا کرتے، اس مہم کی کمان براہ راست سردار پٹیل کے ہاتھوں میں تھی۔ پنتھ، کھر اور شکلا جیسے وزرائے اعلیٰ مسلمانوں کو دیوار سے لگا دینے کے لیے اپنی تمام تر مساعی جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ تو

اس صورت حال کا صرف ایک پہلو ہے خود مسلمانوں میں اس بات کی سمجھ نہ تھی کہ اس نئی بدلتی صورت حال سے وہ کس طرح نبرد آزما ہوں۔ زمین داری کے خاتمے نے مسلمانوں کو چشم زدن میں آسمان سے زمین پر دے مارا تھا۔ مسلمان بیروزگار ہو گئے، ان کی آمدنیوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے نوابوں کا حال یہ ہوا کہ کچھ دنوں تک تو وثیقوں پر کام چلتا رہا، جو انھیں انگریزوں نے عطا کیے تھے، پھر افلاس وتنگ دامانی نے اپنے ڈیرے جمائے۔

یہ وثیقے کیا ہوتے تھے؟

عارضی بیکاری بھتّہ کہہ لو۔ پھر جب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو ان نوابوں نے ہندو ساہوکاروں سے قرض لینے شروع کر دیئے اور پھر ان سودی قرضوں کے چکر میں ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں اور محلات رستوگی ساہوکاروں کے قبضے میں چلی گئیں۔

انھوں نے اپنی بچی کھچی املاک کو ہی اگر صحیح طریقے سے سنبھالا ہوتا تو شاید آج لکھنؤ کے مرکزی مقامات پر مسلمانوں کا عمل دخل نظر آتا۔

تم صحیح کہتے ہو، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ لوگ کام کرنے کو ہیچ سمجھتے تھے۔ انھیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ان کی جائیداد واملاک مناسب قیمتوں پر فروخت ہو کر خود ان کی اپنی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کریں۔ وہ اس بات کو معیوب سمجھتے تھے کہ لوگ یہ کہیں کہ ان کی فلاں کوٹھی بک گئی یا فرنیچر اور قیمتی املاک فروخت ہو گئیں۔ وہ اسے سماجی طور پر اپنی تذلیل کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ ہمارے عزیزوں میں ایک صاحب تھے۔ نواب بریول کے نام سے جانے جاتے، بڑے طنطنے میں رہتے۔ حالات بدل گئے تھے مگر دماغ میں وہی عظمت رفتہ کا جنون تھا۔ باورچی خانہ میں جلانے کے لیے جب ایندھن نہ رہا تو قیمتی فرنیچر پر کلہاڑی چلوا دی۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ ایک ایک فرنیچر کے بدلے سوکھی لکڑیوں کی ایک پوری ٹال آپ کو بآسانی مل سکتی ہے، لیکن نواب صاحب کے لیے یہ بات قابل قبول نہ تھی۔ انھیں یہ بات ستائے دیتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ وہ دن بھی آ گیا کہ نواب صاحب اپنے گھر کا فرنیچر بیچنے لگے ہیں۔ محرم کے موقعوں پر نواب صاحب شربت کی سبیل لگاتے۔ شکر کے بٹے کے بٹے کنویں میں ڈال دیئے جاتے۔ وہ تو اچھے دنوں کی بات تھی۔ اب نہ تو محرم کی وہ رونق رہی اور نہ ہی 'بول محمدی یا حسین' کے نعروں میں وہ پہلا سا جوش وخروش جس میں ہندو اور مسلمان سبھی اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ کنویں کا زمانہ رخصت ہوا، اب یہ کام بہت کم پیسوں میں زیادہ مہذب انداز سے اسٹیل کے بڑے بڑے کنستروں سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن نواب صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ تو رمضان اور عید کے چاند کے اعلان کے لیے بھی توپ داغنے کو زیادہ قرین

اسلام سمجھتے تھے۔ لوگوں نے بہت سمجھایا، اب ٹیکنالوجی ترقی کر گئی ہے، یہ کام سائرن سے بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن نواب صاحب کا کہنا تھا کہ توپ کے گولے داغے جانے سے شوکت اسلام کا جو اظہار ہوتا ہے وہ سائرن سے ممکن نہیں۔

* * *

پرانے جاہ و حشم کی آخری رُت مجھے اپنے ننھال میں دیکھنے کو ملی۔ میری عمر اس وقت یہی کوئی نو دس سال کی رہی ہوگی۔ زمینداری تو رخصت ہوگئی تھی، لیکن نانا نے اپنی ترکیبوں سے اپنی عملداری کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ خود کاشت زمینوں کے نام پر اب بھی ان کے پاس قطعات اراضی کا تا حد نگاہ سلسلہ تھا جس کے اندر چلنے پھرنے، سیر سپاٹا کرنے اور شکار کے لیے نکل جانے میں کچھ اسی قسم کا احساس ہوتا جیسے اب بھی کوئی چھوٹی موٹی ریاست آپ کی دسترس میں ہو۔ ہفتہ میں دو دن گاؤں میں بازار لگتے، لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ ہوتا، اپنے مسائل کے حل کے لیے انصاف کے متلاشیوں کا مردان خانہ میں اژدہام رہتا۔ نانا نے اپنی عملداری میں اب مقامی سرپنچ کے منصب کو داخل کر لیا تھا، لیکن یہ سب مصنوعی ترکیبیں آخر کب تک کفایت کرتیں۔ لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کا رشتہ راجا اور پرجا کا نہ تھا۔ بغاوت کی ہلکی آگ سینوں میں جلتی رہتی، آنکھوں میں مروّت کا پانی باقی تھا سو اکثر کو اس کے اظہار کی تاب نہ ہوتی لیکن ایک بے خبری تھی یا اسے تجاہل عارفانہ کہیے جس سے شاید اس تلخ صورت حال پر پردہ ڈالنا مقصود تھا۔ اچھے دنوں کے وہی پرانے مشاغل اب بھی جاری تھے۔ کبھی ان سے فرصت ملتی تو شکار کے لیے نکل جاتے، بڑا لطف آتا۔ خاص طور پر یہ احساس کہ اس عملداری میں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں، احتساب اور جواب دہی سے بے نیاز۔

نانا کو بہتّر کھانوں کا شوق تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آتا کہ اتنا بڑا دسترخوان سجتا کس کے لیے ہے۔ صبح سے شام تک مختلف قسم کی ڈشیں بنتی رہتیں۔ شیشے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں مختلف قسم کے اچار، مربّے اور چٹنیاں اس پر مستزاد ہوتیں۔ کھاتے تو وہ دو ہی وقت تھے اور ان کی خوراک بھی زیادہ نہ تھی، لیکن انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ بہتّر ڈشوں کی روایت میں کوئی کمی رہ جائے مبادا لوگ اسے ان کے ادبار پر محمول کریں۔

بڑے دسترخوان کے علاوہ نانا کا ایک اور شوق بڑے خاندان کی تمنا تھی۔ ابھی پہلی بیوی کے انتقال پر انھوں نے دوسری شادی کی تھی کہ اسی اثنا کسی شادی کی تقریب میں ایک اور بھلی صورت پر نظر پڑ گئی۔ پرانی آن بان کا تقاضہ تھا کہ اسے بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا جائے۔ سیانے کہتے کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ مومن کو اپنے کنبہ میں برکت کی دعا کرنی چاہیے۔ گھر میں ماموؤں اور خالاؤں کی فوج ظفر موج کے علاوہ

ایسے ملازموں کی بھی بڑی تعداد تھی، جو پشتوں سے خدمت پر مامور تھے۔لڑکیوں بالیوں کی کلکاریوں پر ایک جشن مسلسل کا گمان ہوتا۔ان خادماؤں کے نام بھی عجیب ہوتے۔کوئی گلبدن کہلاتی تو کوئی چاندنی، کسی کا نام خوشبو ہوتا تو کوئی رسیلا کہی جاتی۔ان شب و روز کو دیکھ کر بھلا کسے یقین آتا کہ باہر حالات بدل چکے ہیں۔نانا نے اپنے تیئں حالات پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی،لیکن آخر کب تک! وہ اس اجڑتے ہوئے جاہ و حشم کی تاب نہ لا سکے۔ایک دل کے دورے نے ان کا کام تمام کر دیا۔ان کے بعد بڑے ماموں نے جاہ و حشم کو برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی۔وہ نئے زمانے سے شاید زیادہ آشنا تھے۔انھیں اندازہ تھا کہ وہ ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ان کے اعصاب بھی جواب دے گئے۔بڑے ماموں کی موت کے بعد اب خاندان میں نرے بونے (pigmies) رہ گئے تھے۔انھیں نہ اپنے پرانے جاہ و حشم کا کوئی شعور تھا اور نہ ہی پدرم سلطان بود کا خمار۔ان میں سے بعضوں نے اپنی عامی صورت حال سے صلح کر لی اور بعض کبیدہ خاطر ہو کر خلیج کے ممالک میں ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔بہتر کھانوں کا دسترخوان آج بھی جب میری نگاہوں میں جھلملاتا ہے،نوعمر لڑکیوں کی کلکاریاں میرے کانوں میں گونجتی ہیں اور نانا کی عملداری میں شکار کے مشاغل یاد آتے ہیں تو یہ سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا ہے۔کسے معلوم تھا کہ تقسیمِ ہند کے صرف چند سالوں کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کے جاہ و حشم کی باتوں پر خواب کا گمان ہوا کرے گا۔

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب تھے جو مغربی یوپی کے کسی شہر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ ختم ہوئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ جوتوں کی دکان کھول لو۔ حلال رزق کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔'نہیں! کل تک جو لوگ ہمیں سلام ٹھوکتے تھے میں اب ان کے پیروں میں جوتے پہناؤں گا'، انھوں نے اس تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔انھیں فن دندان سازی کا تھوڑا بہت تجربہ تھا،لیکن اپنے شہر میں یہ پیشہ بھی رئیسانہ شان سے ہم آہنگ نہ تھا،سو قسمت آزمائی کے لیے گھر سے دور بہار کے ایک دور افتادہ شہر میں آ پڑے۔یہاں کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ کوئی شخص ان کی مرضی کے بغیر ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا۔

'بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس نعمتِ عظمیٰ کو جو اس ملک میں انھیں سیاسی تفوّق کی شکل میں مل گئی تھی بالکل قدر نہ کی۔وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ برقرار رہے گی۔قدرت بار بار متنبہ کرتی رہی مگر ہم نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا' ابّا نے عبدالمعز کی متجسس آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔بولے: ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں۔مسلمان تعلقہ دار اور زمیندار انگریزوں سے وثیقے اور سند پا کر مطمئن تھے کہ چلیے کسی طرح جھوٹے تفاخر کو سہارا مل گیا مفت خوری کی کچھ اور گنجائش نکل آئی۔

'۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۹۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس مدت میں تو مسلمان بہت کچھ پلان کر سکتے تھے' عبدالمعز نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

کیسے کرتے وہ ذہنی طور پر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں رہے۔ حتیٰ کہ تقسیم کے بعد بھی جب ۱۹۵۱ء میں زمینداری کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان ہو گیا، چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور تعلقہ داروں کا حال یہ تھا وہ نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے پر مصر رہے۔ ایک مدت سے انھیں خوشامدیوں میں گھرے رہنے کی عادت تھی، ان کے پاس اپنی زمین جائداد کو سنبھالنے کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ یہ جو تم کہانیوں میں پڑھتے ہو کہ نواب صاحب کے ہاں سانپ نکل آیا، نواب صاحب گھبرائے، خادمہ کو آواز دی کہ کسی مرد کو بلانا۔ خادمہ کو شاید تفریح سوجھی اس نے نواب صاحب کو یاد دلایا: 'خیر سے حضور بھی تو مرد ہی ہیں'۔ یہ سن کر نواب صاحب کی خود شناسی بیدار ہو اٹھی۔ بولے: 'ارے ہاں تم نے بروقت یاد دلایا، لانا تو میری چھڑی اور دیکھنا کہاں ہے میری جوتی'۔ جب تک نواب صاحب کسی اقدامی فیصلہ تک پہنچتے سانپ یہ جا وہ جا نالی سے رخصت ہو گیا۔

'کمال کے لوگ تھے!' عبدالمعز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

'ایک اور دلچسپ واقعہ ہے، بچپن میں سنا تھا، پتہ نہیں اس میں کتنی صداقت ہے۔ مگر ہے تو اپنے عہد کے سماجی مسائل کا آئینہ دار۔ کہتے ہیں کہ نواب صاحب اور ان کی بیوی کا علاج چل رہا تھا۔ حکیم صاحب نے طبّی جانچ کے لیے دونوں کا قارورہ طلب کیا۔ شومئ قسمت بوتلیں باہم گڈ مڈ ہو گئیں۔ اب نواب صاحب دردِ زہ میں مبتلا بستر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے کہ حکیم صاحب کا بڑا اعتبار تھا اور انھوں نے قارورہ میں حمل ٹھہرنے کی علامتیں واضح طور پر دیکھ لی تھیں'۔

'واقعی عجیب لوگ تھے!' عبدالمعز کے لیے اب اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ بولے: 'کتنا تقلیدی مزاج پایا تھا۔ ابّا صحیح کہتے ہیں نری تقلید سے عقل کند ہو جاتی ہے'، عبدالمعز نے اس لطیفے میں بھی اپنے مسلک اہلحدیث کی فوقیت کا پہلو ڈھونڈھ نکالا۔

تقلید خواہ مذہب میں ہو یا سیاست میں، یہ ہمیں بند گلی میں پھنس جانے کا احساس دلاتی ہے۔ البتہ اس جرم میں صرف ربڑ دماغ مقلدین ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو بزعم خود غیر مقلدین میں اپنا شمار کرتے ہیں ان کے ہاں بھی، اگر غور کرو تو معاملہ کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

'ربڑ دماغ؟ کیا مطلب! میں نے پہلی بار یہ اصطلاح سنی ہے'۔

جس طرح ربر کو جتنا بھی کھینچو وہ دوبارہ اپنی اصل حالت میں واپس آ جاتا ہے اسی طرح بعض لوگ

لاکھ سمجھانے اور دلیل دینے کے باوجود اپنے سابقہ موقف سے چپکے رہتے ہیں۔ باپ دادا کے راستے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اب سنو غیر مقلدین کے منہجِ تقلید کا ایک لطیفہ بھی سن ہی لو۔ ایک صاحب تھے فن حدیث کے ماہر، راویوں کی چھان پھٹک اور اسماء الرجال کے علم میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ ایک دن زارو قطار روئے جارہے تھے۔ شاگردوں نے انھیں اس طرح روتا دیکھ کر پوچھا حضرت کچھ تو بتائیے آخر کون سی مصیبت آن پڑی؟ بولے: 'ارے کیا بتاؤں غضب ہوگیا۔ میری بیوی کا سہاگ اجڑ گیا، میری بیوی بیوہ ہو گئی' یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ شاگردوں نے توجہ دلائی کہ حضرت آپ تو خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ آپ کے رہتے ہوئے بھلا آپ کی بیوی بیوہ کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ سن کر ایک لمحہ کے لیے چونکے جیسے بات سمجھ میں آرہی ہو۔ پھر یہ کہہ کر رونے لگے کہ بھئی تم لوگوں کی بات درست ہے لیکن جن صاحب نے یہ خبر دی ہے وہ ثقہ راوی ہیں، جھوٹ نہیں بول سکتے۔

عبدالمعز شاید اشارہ سمجھ گئے تھے۔ بولے: واللہ حیرت کا مقام ہے، غور کیجیے تو ہر خیمے سے **وجدنا آبائنا کذالک یفعلون** کی صدا سنائی دیتی ہے۔

خیر یہ تو بات سے بات نکل آئی۔ اصل بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انگریز سات سمندر پار سے آکر ہماری قسمتوں پر قابض ہو گئے تو اس کا اصل سبب ہمارے اندرون میں تھا۔ ہم ایک مدت سے پٹی ڈگر سے ہٹ کر سوچنے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ ہر نئے چیلنج کے جواب میں ہمارا جواب پرانا ہوتا۔ ہمارے علما و قائدین حقیقی دُنیا سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ نئے عہد کے سوالات فتاویٰ کی پرانی کتابوں میں تلاش کرتے۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا تو جمہور نے آسمان سر پر اٹھا لیا، شاہ عبدالعزیز نے برطانوی ہند میں سود کی حرمت کو تحلیل و تجزیے کا موضوع بنایا مگر بات آگے نہ بڑھی۔

مگر یہ لوگ تو روایتی مقلدین کے خیمے سے تھے، بلکہ ان کے سرخیل کہہ لیجیے، عبدالمعز نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

بالکل درست! تم نے صحیح سمجھا۔ مگر لوگ ایک انچ بھی پٹی ڈگر سے ہٹنے کے روادار نہ تھے۔ انھیں تو مدت سے تقلیدِ مطلق کا چسکا لگ چکا تھا۔ ایک بند دماغی ان کا مقدر بن گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نوشتۂ دیوار کو نہ پڑھ سکے۔ اپنے گرد ہونے والی پے در پے تبدیلیوں کے باوجود وہ اپنی بنائی ہوئی خیالی دُنیا میں مست رہے۔

'گویا ایک پوسٹ ماڈرن ریئیلیٹی نے انھیں آ لیا تھا' میں نے عبدالمعز پر اپنے درسی علم کی دھاک بٹھانے کے خیال سے کہا۔

والد صاحب نے میری اس مداخلت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ انھیں شاید مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی جلدی

تھی۔ بولے: یہی بند دماغی اگر مذہبی زندگی میں داخل ہو جائے تو ایک میکانکی قسم کی دینداری جنم لیتی ہے، روحِ عبودیت سے خالی۔ ساری توجہ اپنے حصّے کا ثواب اکٹھا کرنے پر لگی رہتی ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ہاتھوں بندگانِ خدا کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ یہ انگریز جو باہر سے آکر ہمارے امور پر قابض ہو گئے تو اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ روایتی اور میکانکی دینداری کے ہاتھوں ہماری اخلاقی حالت تباہ ہو چکی تھی۔ ایک طرف عرس کے میلے، رجب کے کونڈے، بڑے پیر صاحب کی نیاز اور محرم کے تعزیوں کا شور تھا جس سے دینی زندگی پر رونق معلوم ہوتی تھی اور دوسری طرف اسی کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھے آباد تھے جسے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ میں ایک ثقافتی علامت کے طور پر دیکھا جاتا۔ رقص و سرود اور شعر و سخن کے رسیا یہاں اپنی حاضری کو معیوب نہ جانتے۔ ایک مرتبہ والد مرحوم نے اپنے ایک زمیندار دوست کے ساتھ مجھے سفر پر روانہ کر دیا۔ ان دنوں میں مدھوبنی میں دورۂ قران کر رہا تھا، تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ ان صاحب نے راستے میں ایک جگہ قیام کیا، ایک محل نما عمارت تھی، آسائش کا سارا سامان موجود تھا جو اس زمانے میں کسی بڑے رئیس کی کوٹھی میں ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر ٹھہرے پھر تازہ دم ہو کر اگلی منزل کے لیے روانہ ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہم جہاں ٹھہرے تھے وہ دراصل منّی بائی کا مکان تھا۔ والد صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے دوست پر بہت خفا ہوئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے ان مراکزِ فنون و فساد سے آشنا ہوں۔

بہشتی زیور میں بھی تو مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے لکھنؤ کی ایک نیک بی بی کا تذکرہ کیا ہے جن کے میاں دن رات کوٹھے پر پڑے رہتے اور وہ اللہ کی بندی اس صورتِ حال پر احتجاج کے بجائے صبر و شکر پر گامزن وہیں کوٹھے پر کھانا بنا کر بھیجا کرتی، خلق میں اس کا بڑا نام ہوتا۔ عبدالمعز نے اپنی معلومات کو کام پر لگاتے ہوئے ایک اور شہادت فراہم کی۔

بولے: بیٹا یہ اس زمانے کا عام مزاج تھا۔ ہمارے ایک عزیز کے ہاں شادی تھی۔ لڑکے کے پھوپھا کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ اس زمانے کی شادیوں میں روٹھنے منانے کا بڑا رواج تھا۔ بات جب آگے بڑھی اور ان کی ناراضگی نے نازک رخ اختیار کر لیا تو لڑکی کے والد خود اپنے ہاتھوں میں شربت کا گلاس لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر پھوپھا تو ٹھہرے لڑکے والے، وہ اتنی آسانی سے کہاں ماننے والے تھے۔ کہنے لگے جناب اب بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اب صرف شربت سے کام نہ بنے گا اس کے ساتھ شہوت کے لوازم بھی ہونے چاہئیے۔

استغفر اللہ! کیسے کیسے لوگ تھے۔ عبدالمعز نے حیرت کا اظہار کیا۔

ابا کا بیان جاری تھا۔ بولے: زمیندارانہ زندگی کی تن آسانی نے بڑے مفاسد کو جنم دیا تھا۔ عموم بلویٰ کے اس ماحول میں مذہب کا تذکرہ بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ایک دوست تھے ارتضیٰ حسین، ابھی پچھلے سال ان کا انتقال ہوا۔ خدا غریق رحمت کرے۔ شہر کے مضافات میں چندن پٹی نام کا ایک گاؤں ہے جہاں اہل تشیع کی بڑی آبادی ہے، یہ وہیں کے رہنے والے تھے۔

پروین شاکر بھی تو شاید وہیں کی رہنے والی تھیں؟ چندن پٹّی کے تذکرے سے جیسے عبدالمعز کو کچھ اچانک یاد آ گیا ہو۔

بولے: ہاں ان کا خاندان بھی وہیں کا تھا جو بعد میں کراچی کو ہجرت کر گیا تھا۔ تو یہ ارتضیٰ صاحب بڑے بھلے آدمی تھے، بڑے ہی خدا ترس، مطالعہ کے شوقین۔ ایک دن کہنے لگے حافظ صاحب آج محرم کی آٹھویں تاریخ ہے۔ ہر روز مجلس میں بیٹھتا ہوں، مصائب اہل بیت سنتا ہوں مگر دل کی دُنیا میں ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ بڑی بدنصیبی ہے ایسا لگتا ہے جیسے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے ہوں۔ کیا بتاؤں جب دُنیا دار ذاکرین کو مسند پر براجمان دیکھتا ہوں تو ان کے بیان پر ایک میکانکی عمل کا گمان ہوتا ہے۔ میں تو انھیں تاجرانِ خونِ حسین کہتا ہوں۔ ان کی بھاری بھرکم فیس کے بارے میں آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ مسند پر مرصع ڈھلی ہوئی شستہ زبان اور اسٹیج سے اترتے ہی عامیانہ طرز کلام حتیٰ کہ گالم گلوچ۔ اب ان بہروپیوں کا نوحہ سن کر آنکھوں میں آنسو اتریں تو کیسے؟

'گویا اہل تشیع کی اخلاقی صورتِ حال بھی ہماری ہی طرح پتلی تھی۔'

ان کی صورتِ حال تو اور بھی خراب تھی، ان کا غم ایک درجہ بڑھ کر تھا۔ لکھنؤ کے بیشتر نواب شیعہ تھے۔ زبان وادب اور ثقافت کے حوالے سے ان کے ہاں بے جا تعلّی کو بڑا دخل تھا

'وہ تو رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کے عادی تھے'، عبدالمعز نے لقمہ دیا۔

ہاں تم بالکل صحیح سمجھے۔ بے جا تکلفات اور اور تصنع بھری زندگی نے انھیں حقائق کی دُنیا سے بے دخل کر دیا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے زمینداری ایکٹ نے ان کی معاشی شہِ رگ کاٹ دی تھی۔ وہ تو اپنی بیش قیمت شہری املاک کی تنظیمِ نو بھی نہ کر سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جن ساہوکاروں کو انھوں نے اونے پونے اپنی کوٹھیاں فروخت کی تھیں یا جن کے ہاتھوں املاک رہن رکھی تھیں آگے چل کر ان ہی کی سیاست کے شکار ہو گئے۔

اچھا! وہ کیسے؟

بولے: تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ لکھنؤ ہندوستان کا وہ واحد شہر ہے جہاں ہندو۔مسلم فساد نہیں ہوتا، بلکہ مسلم۔مسلم فساد ہوتا ہے۔

'آ آس ں! کیا مطلب؟'

بولے: مسلمانوں کے دو دھڑے شیعہ سنی آپس میں اس شان سے لڑتے ہیں کہ غیروں کو ہم سے الجھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ دراصل ہم اندرونی اور بیرونی ہر دو محاذ پر پسپائی کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو احیا پسند ہندو ہیں جو آزادی کو ویدک بھارت کے احیا کے طور پر دیکھتے ہیں اور جن کے لیے ہمارا وجود قابل نفریں بن چکا ہے۔ دوسری طرف ہم نے باہمی رقابتوں اور مسلکی تنازعات کے لیے خاصی گنجائش پیدا کر لی ہے۔

'تو کیا آزادی سے پہلے شیعہ۔سُنّی کی باہم رقابتیں اس طرح عیاں نہ تھیں؟' میں نے پوچھا۔

بولے: رقابتیں تو تھیں مگر اسی طرح جیسے بریلوی دیوبندی کے جھگڑے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا احساس نہ تھا۔ باہم شادیوں کا رواج تھا۔ قومی نوعیت کے کاموں میں دونوں فرقے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ تم اپنی یونیورسٹی کے معاملے ہی کو لو۔ سرسید کو اپنے شیعہ دوستوں کا بھرپور تعاون ملا، اور صرف اثنا عشری شیعہ ہی نہیں بلکہ آغا خانی اور بوہرہ شیعوں کے نقوش بھی اس کی بنا میں موجود ہیں۔ لکھنؤ کا معاملہ تو ساٹھ کی دہائی میں بگڑا ہے جب سے شیعہ سُنّی تنازعہ میں جن سنگھ کی سیاست داخل ہوئی ہے۔

'جن سنگھ کی؟'

ہاں! یہ بھی ہمارے باہمی نزاع کا ایک عبرت انگیز پہلو ہے۔ جن غیر مسلم ساہوکاروں نے شیعہ نوابوں سے ان کی املاک خریدی تھی اور جس کے سبب ان کی اہل تشیع سے دعا سلام تھی وہی لوگ اب جن سنگھ کی سیاست میں سرگرم تھے۔ سیاسی طور پر لکھنؤ اب تک کانگریس کا گڑھ سمجھا جاتا تھا جہاں سُنّی مدحِ صحابہ کا جلوس نکالتے اور شیعہ اصحابِ ثلاثہ پر تبرّا پڑھتے۔ چنگاری تو موجود تھی، سنگھ کی مداخلت نے اسے شعلہ بنا دیا۔ سنگھ نے سنیوں کے مقابلے میں شیعوں کو اپنا تعاون پیش کیا اور اس کے بدلے انھیں شیعوں کے یکمشت ووٹ مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۷ء کے صوبائی الیکشن میں شہر لکھنؤ کی چاروں کی چاروں اسمبلی نشسوں پر جن سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر تو یہ ہوا کہ ہر چھوٹے بڑے الیکشن کے موقع پر شیعہ سُنّی فساد معمول کی بات ہو گئی۔ ابھی چند برسوں سے یہ آگ ٹھنڈی ہے جب سے جنتا پارٹی کی حکومت نے شیعہ اور سُنّی دونوں فرقوں کے نزاعی جلوسوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔

ابّا کا بیان ابھی جاری ہی تھا کہ جامع مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ 'اچھا اب آپ لوگ نماز کی تیّاری کریں، یہ باتیں تو چلتی ہی رہیں گی' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس برخاست ہو گئی۔

آج مسجد کو جاتے ہوئے نہ جانے کیوں ڈاکٹر کوکب قدر میرزا کا خیال آیا۔ کوکب صاحب شعبۂ اُردو میں استاد تھے مگر ان کا اصل امتیاز یہ تھا کہ وہ آخری تاجدارِ اودھ نواب واجد علی شاہ کے پڑپوتے تھے۔ جب ان سے کوئی یہ کہتا کہ حضور ہم لوگ تو آپ کی پرجا ہیں تو ان کے چہرے پر ایک خواب آسا کیفیت طلوع ہوتی جیسے ماضی پھر سے مرصع ہو کر نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔ ان کی تحقیق و جستجو کی تمام تر تگ و تاز اسی خاندانی حوالے سے قائم تھی۔ کہاں علی گڑھ کی عسرت بھری معلمی اور کہاں اودھ کی عشرت انگیزیاں۔ جب لکھنؤ کے محلات ان کی نگاہوں میں جھلملاتے ہوں گے تو ان کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ نواب واجد علی شاہ اپنی معزولی کے بعد ۳۱ سال زندہ رہے۔ اس عرصے میں بھی ان کے وہی رئیسانہ مشاغل رہے؛ رقص و سرود، شعر و نغمہ اور پری چہروں سے نہ مل پانے کی حسرت۔ انھوں نے مختلف قسم کی ٹھمریاں اور راگ بھیرویں کی دسیوں لَے ایجاد کیں۔ ان کا نغمہ 'بابل مورے نیہر چھوٹو ہی جائے' تو آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے۔ لیکن وہ اس بدلی ہوئی صورتِ حال کے مداوا کے لیے کچھ نہیں سوچ سکے، اتنا بھی نہیں جس کا اظہار شعر و نغمہ سے ہو سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ان سے مسلسل سرگوشی کرتا رہتا تھا کہ تم کوئی اور نہیں اودھ کے تاجدار ہو، معزول ہی سہی مگر ہو تو پچھلی عظمتوں کے امین۔ کہتے ہیں کہ جب وہ اودھ سے جلاوطن کیے جا رہے تھے تو ان کے ساتھ ایک ہزار باورچیوں کی فوج تھی۔ انھیں تاج برطانیہ سے بارہ لاکھ روپوں کی پنشن ملتی تھی۔ کلکتہ کے مٹیا برج میں، جہاں انھوں نے جلاوطنی کے دن گذارے، وہاں بھی انھوں نے ایک چھوٹا سا لکھنؤ آباد کر رکھا تھا۔ ان کی اگلی نسلیں بھی ماضی کے حصار سے باہر نہ نکل سکیں۔ ان کے کانوں میں بھی پدرم سلطان بود کی گونج سنائی دیتی رہی۔ ایک طرح کا paranoia یا خبطِ عظمت ان کا مقدر بن گیا۔ اس طرح کی نفسیاتی کیفیت میں فرد کا تعلق حقیقی دُنیا سے بڑی حد تک منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے عروج (peak) کے لمحات ماضی بعید میں دیکھتا ہے، اسے ایسا لگتا ہے کہ اچھے دن تو گذر گئے اب آگے جو کچھ ہے وہ زندگی کا تلچھٹ ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس مرضِ مزمن کو ماضی گزینی کہتے ہیں۔

ایک نئی ابتدا کے لیے لازم ہے کہ ہم اپنے کمال کی انتہا اپنے ماضی میں دیکھنے کے بجائے مستقبل میں متصور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ 'عظمتِ رفتہ' جیسی ترکیبیں دراصل ایک شکست خوردہ ذہنی رویّے کی حامل ہیں جو ہمیں پہلے ہی مرحلے میں خالی کارتوس ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔

۲۸

شامِ غریباں

نئے تعلیمی سال کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ بہت سے پرانے احباب جو اب تک رسالہ تجدید کی ادارت اور رائٹرز فورم کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں میرے شریک و سہیم رہے تھے، اب نئے تعلیمی کارواں کا حصہ نہ تھے۔ شاہد پرویز اور عادل محمود تو پہلے سے ہی تجارت کا ارادہ رکھتے تھے، قمر عباس اور آلِ علی انگریزی ادب کے طالب علم نہ تھے اور حلیم بھائی چونکہ ایک عالمِ جذب میں رہتے تھے اس لیے ان کے بارے میں کچھ اندازہ نہ تھا۔ ایک دن ہاسٹل کے بیرر نے ایک بڑے سائز کا گندمی لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ چھٹیوں میں آپ کے کوئی دوست دے کر گئے تھے میں نے احتیاط سے الماری میں رکھ دیا تھا پھر یاد نہ رہا۔ کھول کر دیکھا تو لفافے میں پیتل کا ایک انتہائی نفیس پیپر کٹر (paper cutter) ایک چھوٹی سی تلوار کی شکل میں موجود تھا جس پر علم الانسان مالم یعلم کی آیتِ قرآنی کندہ تھی۔ ساتھ میں ایک پتلی سی کاپی تھی جس کے سرورق سے ایک مختصر سا رقعہ ملحق تھا۔ لکھا تھا:

> ’عزیز دوست! سلام و رحمت۔ پتہ نہیں اب کب ملاقات ہو، حالات کدھر لے جائیں۔ سرِدست مجھے اپنی والدہ کی خبر گیری کرنی ہے۔ بھائی کی موت کے بعد وہ اپنے قابو میں نہیں ہیں۔ نقرس کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کو وہ ابھی تک ۱۳ اگست کے سانحے کو بھلا نہیں پائی ہیں۔ وہ دن رات روتی رہتی ہیں۔ کاش کہ ہمیں بھول جانے پر قدرت ہوتی۔ مگر ہمارا کام تو بھولنا نہیں یاد دلانا ہے تا کہ اگلی نسلیں اس بربریت کو روک سکیں۔ تم لوگوں کے اصرار پر کئی بار کچھ لکھنے کی کوشش کی مگر ذہن ساتھ نہیں دیتا۔ موقع ملے تو اس تحریر کی نوک پلک درست کر دینا۔ ارادہ اس کی باقاعدہ اشاعت کا ہے۔ شاید کسی موقع پر علی گڑھ کا ایک چکر لگاؤں۔ تب تک کے لیے خدا حافظ۔
>
> عبدالحلیم صدیقی‘

خط پڑھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ خیال آیا، بے چارے حلیم بھائی پتہ نہیں کس حال میں ہوں۔ ان کا تعلیمی سلسلہ ایک بار پھر بحران کی زد میں تھا۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلّی دی کہ شاید وہ جلد ہی لوٹ کر آئیں،

ملاقات کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ کاپی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ جلی قلم سے لکھا تھا: شامِ غریباں ۱۳ اگست ۱۹۸۰۔ اندازہ ہوا کہ کوئی روزنامچہ قسم کی چیز ہے۔ حاشیے پر لال روشنائی سے طرح طرح کی علامتیں بنائی گئی تھیں۔ کہیں خالی مثلث پر اوپر کی جانب تیر کا نشان بنا تھا تو کہیں بیضوی دائرے کے بیچ میں لکھا تھا: 'وثائق موجود'۔ کہیں لکھا تھا: 'غور طلب' تو کہیں عین تاریخوں کے اندراج سے اوپر ذوالفقار کی چھوٹی سی تصویر بنی تھی۔ تحریر کے خاتمے پر ایک مبہم سا زائچہ وضع کیا گیا تھا جس میں مختلف اعداد و شمار کے بیچ 'سینجلی، سینجلی' کے الفاظ لکھے تھے۔ اب تک حلیم بھائی کی تحریروں کی درستگی کا طریقہ یہ رہا تھا کہ وہ پڑھتے جاتے اور میں سنتا جاتا، درمیان میں انھیں روک کر کوئی مشورہ دے دیتا یا کبھی جملوں کی ساخت میں معمولی تبدیلی کر دیتا۔ اب جو ان کی کاپی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس پر یہ پیچیدہ نقوش و علامتیں نظر آئیں تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دلِ مضطر کو سہارا دینے کے لیے مختلف وادیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ روزنامچے کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی:

علی گڑھ ۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج بخار کا ساتواں دن ہے۔ ڈاکٹر جگر کی لال پیلی گولیوں سے طبیعت اوب گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندرون میں زندگی کی عمارت زمیں بوس ہو گئی ہو۔ کاش کہ خودکشی آسان ہوتی۔ والدہ کا خیال آتے ہی دل کانپ جاتا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ مجھے زندہ رہنا چاہیے تاکہ میں اپنی اس دکھ بھری داستان کو قلم بند کر سکوں۔ لوگوں کو پتہ تو چلے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہی سوچ کر ڈائری لکھنے کی ابتدا کی ہے۔ درد کی امانت سنبھال کر رکھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ خدا مجھے ہمت دے۔

دہلی ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج بچوں کے گھر میں مسلم مجلسِ مشاورت کے اجلاس میں شرکت ہوئی۔ اجلاس تو مجلسِ عاملہ کا تھا مگر علی گڑھ سے کچھ طلبا بھی آ گئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ عیدگاہ میں قتلِ عام کے ایک عینی شاہد کے طور پر شاید مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع ملے گا مگر وہاں تو ہلڑ کی کیفیت تھی۔ کون کس کی سنتا۔ پہلی بار امت کے بڑے بڑے قائدین کو مشاورت کرتے دیکھا۔ مفتی عتیق الرحمان صدر مجلسِ مشاورت کے علاوہ مولانا علی میاں ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، جماعتِ اسلامی کے مولانا محمد یوسف، ابراہیم سلیمان سیٹھ، سید شہاب الدین، مسلم مجلس کے ذوالفقاراللہ اور بھی بہت سے لوگ۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جہاں دو مولوی ہوں وہاں ہر مسئلے پر کم از کم تین رائے ضرور

ہوگی۔ بس وہی صورت حال تھی۔ بات اس وقت بگڑ گئی جب حاضرین کو یہ لگا کہ ہمارے قائدین سخت موقف اپنانے سے کترا رہے ہیں۔ بالآخر اس بات پر اتفاق ہوا کہ ایک وفد مرادآباد جائے مگر کب جائے یہ کوئی بتانے کو تیار نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے قائدین کو اس سلسلہ میں کوئی جلدی نہ تھی۔ ایک تو قتلِ عام کے ایک مہینے بعد میٹنگ بلائی اس پر بھی یہ نہ لگتا تھا کہ کوئی ٹھوس منصوبہ ان حضرات کے پاس ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مرادآباد کے شہدا پر فاتحہ خوانی کے لیے جمع ہوئے ہوں کاش میں اس جلسہ میں شریک نہ ہوتا تو کم از کم اپنے ملی قائدین کے بارے میں رومانی رائے رکھتا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔

مجلسِ مشاورت کی کاروائی کو قریب سے دیکھ کر اس لطیفے پر یقین پختہ ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ابلیس کی مجلس میں بہت سے شیاطین اپنی اپنی کاروائیوں کی رپورٹ دے رہے تھے۔ ابلیس نے جاننا چاہا کہ اللہ کے ان نام لیواؤں کو جو خود کو آخری پیغام کا حامل سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہیں ان کی ہمتیں توڑنے کے لیے تم لوگوں نے کیا کیا؟ یہ سن کر ایک شیطان بڑے فخر سے اٹھا، کہنے لگا مرادآباد میں نمازیوں پر گولیاں چلوائیں، مسلمانوں کے کاروبار تباہ ہو گئے، ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے، اس سے ابھرنے میں انھیں برسوں لگ جائیں گے۔ مگر اس رپورٹ کو ابلیس نے ہلکے میں لیا۔ ایک دوسرے شیطان نے کہا: حضور ہم نے مسلم تعلیمی اداروں میں پھوٹ ڈال دی۔ مگر ابلیس پر اس بات کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں نے مدرسوں میں غور وفکر اور نئے علوم کے راستوں پر روک لگا دی، اسلاف پرستی کو رواج دیا، ایک دوسرے شیطان نے بازی مارنے کی کوشش کی۔ مگر ابلیس پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا اور بھی کسی کے پاس کچھ کہنے کو ہو تو بتائے۔ تب ہی ایک منحنی سا شیطان کھڑا ہوا، بولا: حضور میں نے مسلم مجلسِ مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنیاد رکھوا دی ہے جس کی بنا میں اقدامی عمل سے پہلو تہی کا وہی پرانا فارمولہ ہے یعنی دو اراکین اور تین رائے۔ یہ سن کر ابلیس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس منحنی سے شیطان کو گلے لگا لیا۔ بولا تم نے صحیح ہدف پر نشانہ لگایا اب یہ لوگ ان تنظیموں میں بیٹھ کر اپنے دشمنوں سے ہی دستِ سوال دراز کریں گے، ہر ظلم کے بعد انکوائری کا مطالبہ کریں گے کسی اقدامی عمل پر ان کے اندر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکے گا۔

علی گڑھ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج دہلی سے واپسی ہوئی۔ مرادآباد اب بھی جل رہا ہے۔ ماموں سے فون پر بات ہوئی

بہت مایوس تھے۔ مسلمانوں کی فیکٹریوں کے لائسنس منسوخ کیے جارہے ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں غیر قانونی اسلحے بناتے ہیں۔ پولیس نے بعض غریب مسلم گھروں سے 32 .0 بور کی پستول ضبط کی ہے۔ گویا اب مسلمانوں کو غیر قانونی اسلحہ کے جرم میں پھنسانے کی تیاری ہے۔ مسلمان اور فیکٹری؟ کیسا مذاق ہے۔ ہاں کبھی ایسا تھا پر اب تو ان کی اکثریت مزدوروں پر مشتمل ہے۔ اور مسلمانوں کی یہ فیکٹریاں جن پر اسلحہ سازی کا الزام ہے انھیں تو فیکٹری کہنا بھی تکلف ہے۔ کیا ہوتا ہے ان فیکٹریوں میں؟ ایک چھوٹی سی دھونکنی والی بھٹّی، ایک سائکل کا پرانا ریم، لوہے کے کسنے اور کھولنے والے کچھ فرمے، چند پلاس اور پیچکس اور ایک ڈریلنگ مشین۔ یہ ہے مسلم فیکٹری کا کل ساز وسامان جہاں کٹّے، طمنچے اور پستول تیار ہو سکتے ہیں۔ بعض ماہرفن اصلی پستول کی ایسی نقل تیار کر لیتے ہیں جس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اور اس کی قیمت اصل کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوتی۔ حکومت کے لیے یہ معلومات نئی نہیں ہیں۔ ماضی میں عدالتوں نے یہ مشورے بھی دیئے ہیں کہ ان فنکار ہاتھوں کو ڈھنگ کا کام دیا جائے تاکہ ان کا ٹیلنٹ صحیح کاموں میں صرف ہو۔ مگر حکومت تو مسلمانوں کو بدنام کرنے پر تلی ہے۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی۔ وہ مسلمانوں کے قتل عام کا الزام بھی مسلمانوں پر ہی ڈال دیتی ہے۔

علی گڑھ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء

روز نامہ قومی آواز میں آج یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے کہ مسلم مجلسِ مشاورت کے قائدین کا ایک وفد وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملا ہے۔ خبر جس انداز سے لکھی گئی ہے اس سے یہ تاثر قائم ہوتا جیسے یہ ملاقات ہمارے قائدین کی ایک بڑی حصولیابی ہو۔ پیارے قائدین! حوصلہ رکھیں، ابھی آگے اور بھی بہت سے مرادآباد آئیں گے، وزیر اعظم کے درشن کا آپ حضرات کو موقع ملتا رہے گا۔ مگر یہ ملاقات تو بہت مہنگی ہے۔ ڈھائی ہزار مسلمانوں کے خونِ ناحق اور پورا ایک شہر ویران ہونے کے بدلے آپ کے حصے میں صرف یہ منحوس درشن آتا ہے۔ ہے نا عجیب بات؟

علی گڑھ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خبروں سے واضح ہے کہ مشاورت کا یہ وفد مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کے بجائے دراصل وزیر اعظم کی ایما پر بلکہ ان کی اجازت لے کر مرادآباد کے لیے روانہ ہوا۔ مرادآباد کی ضلعی انتظامیہ نے قائدین کے اس وفد کا استقبال کیا اور انھیں سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ کمشنر اور ڈی آئی جی نے ۱۹ لوگوں پر مشتمل اس وفد کو شہر کے مسلم اور

غیر مسلم عمائدین سے ملوایا۔ یہ وفد صبح گیارہ بجے پہنچا تھا اور اسے شام ڈھلنے سے پہلے شہر سے نکلنے کی جلدی تھی ۔انھیں ڈر تھا کہ ان کا رات میں یہاں قیام خطرے کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیڈری میں خطرہ مول لینے کا اب رواج نہیں۔ چلیے رسم ادا ہوگئی۔ مرادآباد کے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ یئے۔ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔

علی گڑھ، ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

ماموں سے آج پھر گفتگو ہوئی۔ مسلمانوں کو ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔ حکومت مسلمانوں کے کوائف جمع کر رہی ہے: کن لوگوں کا کتنا نقصان ہوا، چھوٹی گھریلو فیکٹریاں کہاں کہاں ہیں، ان میں کس کس عمر کے کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟ ان میں ۱۶ سے ۳۰ سالوں کے نوجوان کتنے ہیں؟ اور اسی قسم کے دیگر سوالات۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت شاید کوئی امدادی پیکج دینا چاہتی ہے، بعض اس بات سے خائف ہیں کہ اگر ان کا مقصد ہماری مدد کرنا ہوتا تو ہمارے نوجوانوں کی فہرست کیوں بنائی جارہی ہے۔ ابھی ان ہی نوجوانوں کی رہائی نہیں ہوسکی ہے جو قتل عام کے بعد گھروں سے اٹھائے گئے۔ پتہ نہیں یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ پولیس اب بھی گھر گھر تلاشی لیتی پھرتی ہے اور جسے جی چاہتا ہے اٹھا لے جاتی ہے۔ کسے مجال کہ مزاحمت کرے۔ مزاحمت کرنے والے یا تو مارے گئے یا جیلوں میں بند ہیں۔ اب تو دب دب کر اور گھٹ گھٹ کر جینے کا رواج ہے۔ ایک عورت نے جس کے شوہر کو پولیس لیے جارہی تھی آواز بلند کی تو پولیس والے نے اس کی گود سے دو سالہ بچے کو لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ سنا ہے تب سے بچہ سکتے میں۔ بے چاری عورت کیا کرے بچے کو دیکھے یا شوہر کو۔ کتنی بے بسی ہے۔ کاش کہ ہمارے قائدین اس صورتِ حال کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے۔ پتہ نہیں خدا نے ہمیں کس کے بھروسے چھوڑ دیا ہے؟ ہماری یہ درگت اسی لیے تو ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ مگر اسلام تو ہماری زندگیوں سے غائب ہے پھر خدا کی نصرت کیسے آئے۔ یہ عجیب مخمصہ ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سرِ عرش تماشا کیا ہے؟

پوری کاپی اسی طرح کے دردناک اندراجات سے پر تھی۔ کہیں غیروں کی ستم ظریفی کا شکوہ تھا تو کہیں اپنوں کی کم نگاہی کا ماتم۔ اوراق اُلٹتے ہوئے میری نگاہ ۳۰ اکتوبر کے ایک اندراج پر اٹک کر رہ گئی۔ لکھا تھا: 'سنا ہے تلافیٔ مافات کے طور پر لکھنؤ میں پیامِ انسانیت کا ایک بڑا جلسہ ہوا ہے۔ قیصر باغ میں بھلے ہندو اور ڈرے سہمے مسلمان ایک ساتھ اسٹیج پر بیٹھے۔ ملک کے ضمیر کو جگانے کی بات کی گئی۔ بتایا گیا کہ یہ فسادات

دراصل حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی، حسد اور تنگ نظری کے سبب برپا ہوتے ہیں۔کیسی عجیب بات ہے اس لطیفے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یا تو ہمارے قائدین واقعی عقل سے پیدل ہیں یا وہ اصل صورتِ حال پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ تو narrative بدلنے کی کوشش ہے۔ اول تو مرادآباد میں کوئی ہندو مسلم فساد نہ ہوا یہاں تو پولیس نے منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ دوم اس کا اصل مقصد مسلمانوں کا حوصلہ توڑنا ہے تاکہ وہ اپنی تنظیمِ نو کا خیال دل سے نکال دیں اور کانگریس کا ووٹ بینک بن کر رہیں۔ پھر اس بات کو ہم کیوں نہیں کہتے؟ لگتا ہے مرادآباد کے مظلوموں کی آہ و بکا ان پرشور تقریروں میں گم ہو جائے گی۔ یاللعجب!'

میں نے کاپی بند کی۔ایک نظر پیپر کٹر پر ڈالی۔اس کی تراش خراش میں نفاست نمایاں تھی۔ میں نے سوچا ایک زمانہ تھا جب اصحابِ علم اور اصحابِ سیف کے حلقے باہم ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ امت کا دانشور اور خطیب، فنِ سپہ گری اور شہہ سواری کا بھی ماہر ہوا کرتا تھا۔مگر جب سے سیف و قلم کا تعلق ایک دوسرے سے ٹوٹ گیا امت میں قیادت کا 'گفتار ماڈل' عام ہو گیا۔بڑے بڑے حوادث کے جواب میں ایک جلسہ کرنا مسئلہ کا حل سمجھ لیا گیا۔

حلیم بھائی کی ڈائری خاصی طویل تھی۔اس میں تاریخی اعتبار سے بہت سی کام کی باتیں تھی ہر صفحہ درد و کرب سے لبریز تھا مگر اس کے باوجود اس میں وہ کیفیت نہ تھی جو حلیم بھائی کے زبانی بیان کو سن کر پیدا ہوا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں ۱۳ راگست کی شامِ غریباں کا بیان کرتے اور ان ماؤں کی گریہ زاری کی مقامی لب و لہجے میں تصویر کشی کرتے جن کے معصوم بچّے عیدگاہ میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے تو کلیجہ منہ کو آجاتا۔ایسا لگتا ان کے منہ سے الفاظ نہیں غم و اندوہ کے دلخراش پیکر نکل رہے ہوں۔خیال آیا کاش حلیم بھائی صرف ۱۳ راگست کی شامِ غریباں پر پوری کتاب لکھ ڈالتے۔ یہ سوچ کر میں نے مسودہ کو احتیاط سے الماری میں رکھا اور کھڑکی سے باہر حبیب ہال کے اندرونی لان میں دیکھنے لگا جہاں گلابی جاڑے کی دھوپ میں کچھ طلبا اخبار بینی کا لطف لے رہے تھے اور کچھ ان خبروں پر تبصرے میں مصروف تھے۔ یہاں بھی قیادت کا گفتار ماڈل سکہ رائج الوقت تھا۔

۲۹

علی گڑھ میگزین

ایک دن سورتی صاحب کی مجلس میں قیادت کے 'گفتار ماڈل' کا ذکر چھڑ گیا۔ پہلے تو یہ اصطلاح سن کر مسکرائے پھر کسی قدر سرزنش کے انداز میں بولے ہر جلسے اور ہر میٹنگ کو گفتار ماڈل کہہ کر مسترد کر دینا قرینِ انصاف نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں۔ کلام کا بھی اپنا اثر ہوتا ہے، وزن ہوتا ہے۔ کوئی بات دل کی گہرائیوں سے نکلے تو اپنا اثر دکھاتی ہے۔ **فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرة شراً یرة** کا یہی تو مطلب ہے۔ منکرات کے خلاف زبان کھولنا، سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا، یہ سب فن کلام کے سہارے ہی تو انجام پاتا ہے۔ کلام انقلاب کی پہلی منزل ہے۔

'مگر یہ جو روز روز کے جلسے ہیں ان کو آپ کیا کہیں گے؟'، میں نے احتجاج کیا۔ حکومت بار بار یہ یقین دہانی کراتی ہے کہ اس کا مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں۔ اور پرسنل لا بورڈ والے بار بار یہ بیان دیتے ہیں کہ وہ پرسنل لا میں مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ پھر ایک کے بعد دوسرا بڑا جلسہ منعقد ہوتا ہے اور حکومت اس دوران یہی یقین دہانی کراتی رہتی ہے کہ اس کا پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں۔ ان باتوں کا آخر کیا حاصل ہے۔ یہ سن کر سورتی صاحب مسکرائے۔ بولے: ارے بھئی اسے کلام نہیں حب کلام کہتے ہیں، یعنی ایسی بات جس کے پیچھے عمل کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ بعض قومیں حبِ کلام کی عادی ہو جاتی ہیں۔ یہ جو تم شیعہ ذاکرین کی مجلس میں مناقبِ اہل بیت سنتے ہو اور ہر جملے پر سامعین تحسین کے نعرے بلند کرتے ہیں یا سُنّی عظمتِ صحابہ کے جلسوں میں مناقبِ شیخین کی باتیں ہوتی ہیں تو ان کا بنیادی مقصد فی نفسہ یہ جلسے ہوتے ہیں۔ یہاں بیان کی آنچ بلند رکھنے کے لیے اکثر تاریخی حقائق کو بھی قربان کر دیا جاتا ہے۔ جہاں بیان فی نفسہٖ اہم ہو جائے، جلسے جلوس مسائل کا حل سمجھ لیے جائیں وہاں کلام بے عملی کا نقیب بن جاتا ہے۔

'اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ ہر کلمہ کا وزن ہوتا ہے، کلمۂ حق رائگاں نہیں جاتا؟'

بولے: اس کلمے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ تو سقراط کو زہر کا پیالہ پلواتا ہے، حلّاج کی جان کے

درپے آجاتا ہے۔تم اقبال انصاری کے پروگراموں میں نہیں جاتے، بڑے زندہ مسائل زیر بحث لاتے ہیں۔دانشور بننا چاہتے تھے مگر بن گئے دولت مند۔سعودی عرب میں وقت ضائع کر آئے۔ جری آدمی ہیں آپ ان سے ملتے رہیں۔

اقبال صاحب شیکسپیئر تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے لیکن ان کا اصل جوہر کلاس سے باہر کھلتا تھا۔کبھی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹوں پر بحث تو کبھی پولیس ریفارم کی باتیں،کبھی انسانی حقوق کی دستوری ضمانتوں کا حوالہ تو کبھی مسلم کش فسادات کا ذکر جسے وہ پوگرم یعنی نسل کشی سے تعبیر کرتے۔ بلا مبالغہ وہ ایک شخص نہیں ایک انجمن تھے۔ان کی جولانیوں کا میدان مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ملک بھر میں حقوق انسانی کے لیے کام کرنے والی انجمنوں سے ان کے گہرے رابطے تھے۔ان کی میٹنگوں میں ہونے والی گفتگو سے خطرے کی بو آتی۔ایک بار غالباً کسی فساد کے موقع پر ہم لوگ طلبا کی طرف سے ایک محضر نامہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ خیال آیا کیوں نہ اقبال صاحب کو ایک نظر دکھا دیا جائے۔ رات کے نو بج رہے تھے، مگر صبح اس کا اجرا بھی ضروری تھا۔اس بے وقت آمد پر بھی انھوں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔مسودہ کی نوک پلک درست کر دی۔رخصت کرتے ہوئے بولے: ارے بھئی دو تین لوگوں کو اس بات پر مامور رکھیے، میں تو ہمہ وقت حاضر ہوں، آپ لوگوں کو اگر کچھ ہو جائے تو کم از کم دو تین لوگ ضمانت کے لیے تو فوری تیار رہیں۔انھیں اندازہ تھا کہ اس ملک میں حسّاس اور زندہ موضوعات پر کلام کرنا دراصل خطرات کو دعوت دینا ہے۔

ان دنوں میں شعبۂ انگریزی کی ادبی انجمن کا سکریٹری بھی تھا جس کے چھوٹے بڑے جلسے گاہے بہ گاہے منعقد ہوتے رہتے۔اساتذہ میں ظہور عثمانی صاحب بڑی پابندی سے شرکت کرتے۔عثمانی صاحب کا علم گہرا تھا ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر بھی اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔فارسی اشعار کے فی البدیہہ ترجمے وہ اس شان سے کرتے چلے جاتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ان جلسوں میں چائے کافی کے اہتمام کے لیے ہم لوگ آپس میں چندہ کر لیتے۔ایک بار دوستوں نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اگلے پروگرام میں اسلوب انصاری صاحب کو صدارت کی دعوت دی جائے اور چائے بھی ان کی طرف سے ہو جائے۔تجویز معقول تھی مگر اسلوب صاحب خشک آدمی تھے، ان کے علمی دبدبے اور شخصیت کے جلال سے بڑے بڑے لوگ کانپتے تھے۔ وہ جب آرٹس فیکلٹی کے کاریڈور سے گذرتے تو طلبا کا شور تھم جاتا،شمشاد مارکیٹ سے گذرتے تو 'جب پیار کیا تو ڈرنا کیا' کی ریکارڈنگ سنتے ہوئے سرمست لڑکے بار ادب میں کچھ اس طرح کھڑے ہو جاتے جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔میں نے ہمت جٹائی، اسلوب صاحب نے میری معروضات سنیں، ایک لمحے کو توقف کیا، پھر میری طرف نگاہ اٹھائے بغیر ہی بولے: 'کیوں نہیں، کیوں نہیں'۔ لیجیے صاحب چائے کی دعوت

پکی ہوگئی۔ میں کمرے سے باہر آیا، مجھے اپنی شوخی پر حیرت ہوئی۔ خیال آیا اگر وہ نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتے تو میرا کیا ہوتا۔ پروگرام کے خاتمے پر میں نے اسلوب صاحب کی ضیافت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ چائے فی نفسہ اہم نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ کس کے ساتھ پی گئی ہے۔ میری اس بات کو بعض احباب نے نیازمندی پر محمول کیا اور اسے علی گڑھ کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی حالانکہ استاد اور شاگرد دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے توقیر وشفقت کا جذبہ باہمی تھا۔ ایک بار شعبے کی ایک سالانہ تقریب میں طلبا کی طرف سے مجھے مسٹر شیڈوِل کا خطاب دیا گیا۔ شیڈول ایک بسیار نویس متشاعر قسم کا شخص تھا اس کی طرف مجھے منسوب کرنے کا مطلب میری تحریری صلاحیتوں کا مذاق اڑانا تھا۔ گو کہ ان خطابات کی اہمیت ہنسی مذاق سے زیادہ نہ ہوتی تھی لیکن اسلوب صاحب سے نہ رہا گیا انھوں نے اپنے اختتامی کلمات میں اس بات کا سخت نوٹس لیا۔ اس خطاب کو بدذوقی پر محمول کیا اور اسے میری نسبت حقیقت سے پرے قرار دیا۔

اب اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ ایک دن جعفر ذکی صاحب، جو آگے میرے مربی اور سپروائزر بھی ہوئے، نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور بولے اسلوب صاحب کی خواہش ہے کہ آپ علی گڑھ میگزین کی ذمہ داری قبول کرلیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! مگر جب کوئی چیز اتنی آسانی سے مل رہی ہو تو بندے کا پھیلنا لازم ہے۔ سو میں نے کہا: میں اس بارِ گراں کو قبول کرنے کو تیار ہوں مگر میری کچھ شرائط ہیں۔ وہ کیا؟ انھوں نے جاننا چاہا۔ وہ یہ کہ مجھے اپنی ٹیم بنانے کی آزادی ہو۔ بولے اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

جعفر ذکی صاحب کے دفتر میں لکڑی کی ایک دیوہیکل الماری کھڑی رہتی تھی۔ پتہ چلا یہی میگزین کا دفتر ہے۔ الماری کے ساتھ ہی انھوں نے کمرے کی چابی بھی مجھے عنایت کردی اور میں نئے شمارے کی منصوبہ بندی میں لگ گیا۔ ایک دن پرانے شماروں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے میری نگاہ علی گڑھ میگزین کے ہیومر نمبر (humour number) پر جا پڑی۔ یہ ۱۹۶۱ء کا خاص شمارہ تھا جو کسی محمد صدیق کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ ادارتی نقطۂ نظر سے یہ شمارہ پیشہ ورانہ مہارت کا بھرپور اظہار تھا۔ ہر مضمون اپنی جگہ مناسب، ہر تحریر کی نک سک درست۔ لکھنے والوں میں کچھ ایسے نام نظر آئے جو میرے لیے اجنبی نہ تھے۔ مشتاق احمد یوسفی جنھوں نے اس شمارے میں شائستگی کی مذمت میں اپنا زورِ قلم صرف کیا تھا، آگے چل کر دُنیائے مزاح کے شہنشاہ کی حیثیت سے جانے گئے۔ محمد حامد انصاری جنھوں نے کھیل کود کے پیتھولوجی کو موضوعِ سخن بنایا تھا آگے چل کر نائب صدر جمہوریہ کے منصب تک پہنچے۔ انور صدیقی جنھوں نے ڈائننگ ہال کی ستم گری کا خاکہ اڑایا تھا، آگے چل کر جامعہ ملّیہ میں صدرِ شعبہ اور پھر میری پی ایچ ڈی کے ممتحن قرار پائے۔ محمد حسن جنھوں نے اپنے مضمون ''کلچر کی خودکشی'' میں میرس ہال کے ایک ثقافتی پروگرام کو موضوع گفتگو بنایا تھا وہ

اب اُردو کے معروف نقاد اور جے این یو میں اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ مونس رضا جنھوں نے اپنے مضمون میں ممتحن حضرات کی خبر لی تھی، اب ایک معروف جغرافیہ داں کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے بانیوں میں بھی ان کا نام آتا تھا اور اس وقت دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ایس زین العابدین جنھوں نے ۱۹۹۴ء کے عنوان سے مستقبل کے ایک خیالی سفرِ علی گڑھ کی روداد لکھی تھی۔ زین صاحب کی ادارت میں جدہ سے نکلنے والا امور اقلیات کا جرنل اپنے بلند پایہ علمی معیار کے باعث قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہیومر نمبر کے جواز پر دلیل قائم کرتے ہوئے فاضل مدیر نے لکھا تھا: 'ہماری زندگی غم و اندوہ سے اس قدر بوجھل ہو گئی ہے کہ اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان کلفتوں کو کچھ دیر تج کر زندگی پر کسی اور زاویے سے نگاہ ڈالی جائے۔ اگر ہم کھل کر قہقہہ لگانے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو کم از کم مسکرانے کی کوئی سبیل تو ضرور ہی پیدا ہو جائے'۔

عالیہ کاظمی، جو اس وقت ایم اے کی طالبہ تھیں، نے چند ادبی لطائف رقم کیے تھے۔ لکھا تھا: ایک بار جوناتھن سوئفٹ نے یہ سوال اٹھایا کہ جب سرکار ہر چیز پر ٹیکس لگاتی ہے تو نسوانی حسن اس سے مستثنٰی کیوں ہے؟ مگر مشکل یہ تھی کہ نسوانی حسن کا تخمینہ لگانا آسان نہ تھا، سو اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ اس کام کو خود خواتین کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح بدصورت سے بدصورت خاتون سے بھی ٹیکس کی شکل میں معقول رقم وصول ہو جایا کرے گی۔ ایک دوسرا لطیفہ میکسم گورکی کے حوالے سے تھا۔ ایک بار گورکی کسی سرائے میں قیام پذیر ہوئے جہاں انھیں رات بھر کھٹملوں نے پریشان کیے رکھا۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سرائے کی مالکن سے اس بات کی شکایت کی۔ مالکن نے تکرار کیا، بولی نہیں جناب ہمارے ہاں ایک مجرد کھٹمل کا وجود بھی نہیں ہے۔ گورکی نے برملا کہا: میں مجرد کی بات کب کہہ رہا ہوں میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ سب شادی شدہ اور کثیر العیال ہیں۔ ایک لطیفہ برنارڈ شا کی بابت تھا۔ ایک بار شا موسیقی کی مجلس میں بیٹھے تھے جہاں ایک شخص وائلن بجا رہا تھا۔ شا کچھ دیر وائلن کی آواز سنتے رہے پھر بولے: آج مجھے اس شخص کو وائلن بجاتے ہوئے دیکھ کر پیڈیروسکی کی یاد آ رہی ہے۔ 'مگر پیڈیروسکی تو وائلنسٹ نہیں تھا' کسی نے کہا۔ 'تو یہ کب ہے؟' شا نے جواب دیا۔

رسالے کے پچھلے صفحے پر ایک اشتہار چھپا تھا جس میں اگلے شمارے کو سٹائر نمبر (Satire Number) کے طور پر نکالنے کا اعلان تھا۔ پتہ نہیں اس منصوبے کا کیا بنا البتہ اس شمارے کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں کسی زندہ اور حساس موضوع پر ایک خاص شمارے کی ترتیب کا خیال گردش کرنے لگا۔

۳۰

نیلی

گرمی کی آمد کے ساتھ ہی خالد میاں اپنے موبائل ریستوراں کو دھکیلتے ہوئے حبیب ہال کے اندرونی دروازے تک لے آتے۔ صبح صبح جب آلو کے پراٹھوں کی اشتہا انگیز خوشبو ہاسٹل کے کمروں میں پھیلتی تو مختلف سمتوں سے ناشتے کی فرمائش آنے لگتی۔ ایک روپے میں گرما گرم پراٹھے، اوپر سے ٹماٹر کی چٹنی مفت۔ اگر دل عیاشی پر کچھ زیادہ ہی آمادہ ہو تو ساتھ میں آملیٹ کا آمیزہ بھی لگوا لیجیے۔ غالباً اتوار کی کوئی صبح تھی یا چھٹی کا کوئی دن، بالائی منزل سے جہاں میرا قیام تھا، خالد میاں کو آواز دے رہا تھا کہ میری نظر شمسی پر پڑی جو چند طلبا کے ساتھ لان میں پڑی کرسیوں پر براجمان ناشتے کے ساتھ اخبار بینی کا لطف لے رہے تھے۔ غالباً شمسی نے میری آواز سن لی تھی۔

'ارے بھئی نیچے اترو نیچے! کبھی تو زمینی حقائق کا سامنا کرو!' اس نے آوازہ کسا۔

میں نے شمسی کی دعوت قبول کرنے میں ہی عافیت جانی۔ جب سے ایم اے کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں میں غیر نصابی سرگرمیوں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ ادھر اساتذہ مستقل تلقین کرتے رہتے کہ ایم اے کی پڑھائی ارتکاز چاہتی ہے، کامل یکسوئی کے بغیر گوہر مطلوب حاصل نہیں ہوسکتا۔ شیکسپیئر کے خصوصی مطالعات اور عالمی ادب کے اضافی پرچے نے، جس میں روسی، فرانسیسی، جرمن اور دیگر زبانوں کے ضخیم ناول اور کلاسیکی ادب پارے شامل تھے، کسی دوسری سرگرمی کے لیے گنجائش کم ہی چھوڑی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا کے مختلف حلقوں میں درس و ارشاد کا سلسلہ ہی نہیں رکا بلکہ اخبارات و رسائل دیکھنے کی بھی فرصت نہ رہی۔ شمسی کے لہجے میں ایک طرح کا شکوہ تھا۔ کہاں صبح و شام کی مجلسیں، پرانی کتابوں پر تازہ بحثیں اور کہاں اب شعبۂ انگریزی کے ایک کمرے میں دیر رات گئے تک اعتکافِ مسلسل۔

نیچے لان میں مسلم مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے، یار ہمارے ملّی قائدین بھی خوب ہیں۔ حکومت بار بار یقین دہانی کراتی ہے کہ اس کا پرسنل لاء میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں اور ہمارے قائدین کہتے ہیں کہ پرسنل لاء میں مداخلت کی کوئی کوشش ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ یہ

قصہ کیا ہے یار۔ یہ لوگ اصل مسائل کو زیر بحث کیوں نہیں لاتے؟ اب بتایئے نیلی میں اتنا بڑا فساد ہوا پھر بھی امت میں کوئی اشتعال، کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔

ہاں یار تین ہزار مسلمان مار دیئے گئے اور وہ بھی صرف سات گھنٹوں کے اندر، ایک دوسرے طالب علم نے تائید کی۔

تین ہزار تو سرکاری اعداد و شمار سے قریب ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں ہوگی۔

دس ہزار! میں نے حیرت پوچھا۔

ہاں بعض صحافیوں نے نیلی کے قتل عام کو جنگ عظیم دوم کے بعد بہیمیت کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیا ہے۔

اور اس ظلم کا انداز بھی تو دیکھیے کتنا وحشیانہ ہے۔ نیلی اور اس کے اطراف میں بنگالی مسلمانوں کی آبادیوں پر چہار طرف سے لوگ اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا جا رہا ہو۔ ڈھول تاشے کی آوازیں، جیے اے اہوم (مادر آسام زندہ آباد) کے نعرے اور بھالے برچھیوں اور جدید اسلحوں سے لیس انسانوں کے غول کے غول ان آبادیوں کا محاصرہ تنگ کرتے گئے۔ پہلے گھروں کو آگ لگائی، پھر زندہ انسانوں کو نکال کر کھلے میدان میں لائے اور پھر باقاعدہ قتلِ عام کا آغاز ہوا۔ عورتوں اور بچوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔

جانتے ہو ایسا کیوں؟ شمسی نے مداخلت کی۔ بولے: بات یہ ہے کہ وہ ہماری نسل کشی کے درپے ہیں۔

’سنا ہے مسز گاندھی نے جائے حادثہ کا دورہ کیا ہے اور اب صدر جمہوریہ بھی وہاں جانے والے ہیں۔ کیا واقعی حکومت کو مسلمانوں کی بے بسی پر ترس آ گیا ہے۔‘

ارے بھئی یہ سب سیاسی داؤ پیچ ہے۔ یہ سارا فساد مسز گاندھی کی سیاسی انانیت اور ضد کے سبب ہی تو برپا ہوا ہے۔

اچھا! میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہاں انڈیا ٹوڈے (*India Today*) کی رپورٹ میں لکھا ہے، شمسی نے اپنے تھیلے سے انڈیا ٹوڈے کا تازہ شمارہ نکالتے ہوئے کہا۔ بولے: عام طور پر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ آسام میں الیکشن کے لیے فضا سازگار نہ تھی۔ اپوزیشن کی بیشتر پارٹیاں بی جے پی، جنتا پارٹی اور لوک دل کے دونوں دھڑے الیکشن کے بائیکاٹ کی پرزور مہم چلا رہے تھے۔ اٹل بہاری واجپائی جنھیں عام طور پر معتدل لیڈر خیال کیا جاتا ہے اور

جنھیں ان کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک جمعیۃ العلمائی مولوی نے بھارت کا انمول رتن قرار دیا تھا، حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ بات کہہ دی تھی کہ جو ایک بار سوئم سیوک ہوجاتا ہے وہ ہمیشہ سوئم سیوک ہی رہتا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر اپنی شعلہ بار تقریر میں اس بات کا اشارہ دیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

'غیر ملکی باشندے یہاں آ گھسے ہیں اور حکومت کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے۔ اگر یہ پنجاب میں آئے ہوتے تو پتہ ہے کیا ہوتا! لوگ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر پھینک چکے ہوتے۔'

ایسی صورت میں مسز گاندھی نے ہر قیمت پر الیکشن کرانے کی ٹھان لی۔ چونکہ الیکشن کے بائیکاٹ کو عوامی حمایت حاصل تھی اس لیے کانگریس کے حامی بنگالی مسلمانوں نے ووٹ ڈالنے کا عندیہ ظاہر کیا تو ایک تصادم کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بس یہ سمجھیے کہ سیاسی کراس فائر میں بنگالی مسلمان خواہ مخواہ پھنس گئے۔

'گویا یہاں بھی مسلمان کانگریس کی سیاست کا شکار ہو گئے۔'

ہاں جانتے ہو آسام میں مسلمانوں کی آبادی پینتیس فیصد کے قریب ہے۔ کشمیر کے بعد یہ واحد صوبہ ہے جہاں مسلمان عددی اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ مسز گاندھی چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کا مجموعی ووٹ ان کی جھولی میں پڑتا رہے۔ اب تک روایتی طور پر آسام میں کانگریس کی حکومت مسلمانوں کی بدولت ہی قائم رہی ہے۔

'اور کوئی مسلم خاتون وزیر اعلیٰ بھی تو رہی ہیں۔'

انورہ تیمور کی بات کر رہے ہیں آپ؟ وہ تو صرف دو مہینے وزیر اعلیٰ رہ پائیں، لیکن ان نمائشی عہدوں کے لیے اصل قیمت تو عوام کو دینی پڑتی ہے۔

گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ نیلی میں اتنا بڑا حادثہ ہوا اور مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ اِدھر دس بارہ دنوں سے میں لوگوں کی گفتگو میں نیلی کا تذکرہ سنتا لیکن مجھے اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ ذرا رک کر پوچھ لوں کہ یہ نیلی کیا بلا ہے؟ طلبا کرکٹ کے کھلاڑیوں، ورلڈ کپ، ویسٹ انڈیز، اسٹیفی گراف اور ان جیسے دسیوں غیر مانوس الفاظ کا ذکر کرتے۔ کچھ الفاظ کچھ دنوں بعد گفتگو سے غائب ہوجاتے۔ میں نے سوچا یہ نیلی بھی اسی قبیل کی کوئی چیز ہوگی، جس کا جاننا میرے لیے ضروری نہیں۔ مجھے نہ کھیلوں میں دلچسپی تھی اور نہ اس کی کوئی معلومات۔ ابھی چند دن پہلے ایم اے سالِ اوّل اور سالِ دوئم کے طلبا کے مابین کرکٹ کا مقابلہ طے پایا تھا۔ دونوں کلاسوں کی لڑکیاں اپنے اپنے ہم جماعتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میچ دیکھنے آئی تھیں۔ کھیلنے والوں میں بھی غیر معمولی جوش و خروش تھا کہ اس قسم کے مواقع شِولری (chivalry) کے

اظہار کے لیے علی گڑھ کی روایت پسند سوسائٹی میں قابل قبول سمجھے جاتے تھے۔ دوسرے دن طالبات نے میری غیر حاضری کا شکوہ کیا۔ بولیں: تم نہیں آئے، بہت لطف آیا، ہم لوگوں نے تمھیں بہت مِس کیا۔ میں نے مصروفیت کا بہانہ بنایا، معذرت کی، پوچھا کون جیتا؟ بولیں ہم لوگ۔ میں نے پوچھا: کتنے گول سے؟ یہ سن کر وہ سب ششدر رہ گئیں۔ بعضوں نے قہقہہ لگایا اور بعضوں نے کہا ٹھیک ہی کیا تم نہیں آئے۔ میں نے سمجھا یہ نیلی بھی شاید کسی طالبہ کا نام ہو، خود کو اس ذکرِ خیر سے دور رکھنا ہی مناسب معلوم ہوا، لیکن اب جو انڈیا ٹوڈے کا تازہ شمارہ ہاتھ میں آیا اور اس کے سرورق پر جلتے مکانوں کی تصویر کے ساتھ The Burning of Assam کی سرخی دیکھی تو دل اندر سے دہل سا گیا۔ اپنی غفلت پر سخت غصہ آیا۔

انڈیا ٹوڈے نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ بارہ فروری ۱۹۸۳ء کو جب مسز گاندھی ایئر فورس کے ہیلی کاپٹر سے گوہاٹی آئی تھیں تو انھیں یہ بات خوب معلوم تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک ایسا بم لے کر آئی ہیں جو خود ان کے ہاتھوں میں پھٹ سکتا ہے۔ انھوں نے سخت حفاظتی حصار میں الیکشن کے ان جلسوں کو خطاب کیا جہاں خطرات کم تھے اور جن میں سے بیشتر کا تعلق مسلم علاقوں سے تھا۔ گویا وہ پینتیس فیصد (35%) مسلم ووٹوں کے بل پر الیکشن جیتنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے مسلم کارڈ کا بڑی عیاری کے ساتھ استعمال کیا۔ اپوزیشن کی ساری پارٹیاں الیکشن کے خلاف تھیں۔ خود سرکاری ایجنسیوں کا اندازہ یہ تھا کہ ستاسی لاکھ ووٹروں میں سے صرف بیس فیصد لوگ ہی حق رائے دہی کا استعمال کر پائیں گے اور وہ بھی صرف مسلم اکثریتی علاقوں میں۔ ایسا اس لیے کہ دوسری پارٹیاں الیکشن کے بائیکاٹ کی مہم چلا رہی تھیں۔ ٹیلیفون کے رابطے اور دیہی علاقوں کو ملانے والے پل تباہ کیے جا رہے تھے۔ اپوزیشن ہر قیمت پر الیکشن کے انعقاد کے خلاف تھی اور اس کے پیچھے کچھ اسی قسم کی عوامی تحریک تھی جو بہار میں جے پرکاش کی تحریک کے دوران دیکھنے میں آئی تھی۔ بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر۔ ایسی صورت میں مسز گاندھی ہانکے پکارے مسلمانوں کو پولنگ بوتھ میں لانا چاہتی تھیں تاکہ الیکشن کی خانہ پری ہو سکے۔ صورت حال یہ تھی کہ مقامی سرکاری ملازمین نے الیکشن ڈیوٹی میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ آسام طلبا یونین اور گن پریشد نے اٹھارہ دنوں سے تحریک عدم تعاون چلا رکھی تھی۔ مختلف فوجی اور نیم فوجی دستوں کے ڈیڑھ لاکھ جوان اس دھماکہ خیز صورت حال سے نپٹنے کے لیے آسام کے مختلف علاقوں میں تعینات تھے۔ بیشتر سیاسی لیڈران یا تو گرفتار کر لیے گئے تھے یا روپوش ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں کانگریس کو مسلمانوں کی مسیحائی کا دعویٰ تھا۔ مرکزی وزیر ریلوے غنی خاں چودھری جو اندرا کانگریس کے رہنما تھے وہ مسلمانوں سے برملا کہتے پھرتے تھے کہ اگر انھوں نے کانگریس کو ووٹ نہ دیا تو ان کے دشمن انھیں دوبارہ بنگلہ دیش میں پھینک دیں گے۔ مسلمان خوف زدہ تھے اور اس خوف میں انھوں

نے کانگریس کے لیے ووٹ کرنے کی ٹھان لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی ہٹ دھرمی اور غلط سیاست کے خلاف جو عوامی غیظ و غضب کا طوفان اٹھ رہا تھا، مسلمان اس طوفان کے نشانے پر آ گئے۔ انڈیا ٹوڈے کا کہنا تھا کہ مسز گاندھی کی ان غلطیوں کے لیے کوئی ان سے سوال نہیں کرے گا بلکہ اس کی قیمت ملک اور قوم کو ادا کرنی پڑے گی۔

ناآگہی میں کتنی عافیت ہے، میں نے سوچا۔ آسام کے مسلمانوں پر ایک قیامت گزر گئی اور مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگی۔ ان دنوں میں جرمن مصنف ٹامس مان کی مشہور زمانہ ناول *Buddenbrooks* کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ مصنف نے ایک تاجر فیملی کی تین چار نسلوں پر مشتمل واقعات کو کچھ اس طرح قلمبند کیا تھا جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ پہلی نسل جس تجارت کو اپنی جدوجہد سے ترقی کی بلندیوں پر پہنچاتی ہے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی نسل تک آتے آتے یہ سب کچھ اس طرح تباہ و برباد ہو جاتا ہے کہ اس خاندان کے نام لیواؤں کے پاس صرف ایک یاس بھرا قصہ رہ جاتا ہے۔ یعنی پہلی نسل جو فتوحات حاصل کرتی ہیں اگلی نسلیں اس جاہ و حشم کو برقرار نہیں رکھ پاتیں۔ سیاست ہو یا تجارت ہر جگہ یہ (Buddenbrooks effect) یکساں کارگر نظر آتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ اگلی نسلوں کو جاہ و حشم تو منتقل ہوتا ہے، لیکن اس جاہ و حشم کو وجود میں لانے والے نصب العین (mission statement) سے ان کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔ مغل ہوں یا عثمانی ترک یا روم و فارس کی سلطنتیں، ان سب کے زوال میں Buddenbrooks effect کی کارفرمائی بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ ناول میں دکھایا گیا تھا کہ چوتھی نسل تک پہنچتے پہنچتے ایک متمول خاندان کچھ اس طرح تباہ ہوا کہ ایک بچی کے علاوہ خاندان کا کوئی فرد باقی نہ بچا۔ نیلی میں بھی مسلمانوں کو ایک منظم نسل کشی کا سامنا تھا۔ کیا ہندوستانی مسلمان بھی تباہی کے اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ ان کے مشن اسٹیٹمنٹ کو کیا ہوا؟ وہ کانگریس کی سفاک سیاست کا شکار کیسے ہو گئے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

میں نے بہت سوچا لیکن کوئی واضح تصویر ابھر کر سامنے نہ آ سکی۔ ایک دن شمشاد مارکیٹ سے گزرتے ہوئے انڈیا ٹوڈے کے تازہ شمارے پر نظر پڑی، جس کے سرورق پر معصوم بچوں کی اجتماعی تدفین کا منظر دکھایا گیا تھا۔ میدان میں ہر طرف بچوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے یہ شمارہ خرید لیا۔ رسالے میں بعض دل دہلا دینے والی تصویریں تھیں۔ لکھا تھا کہ ایسا لگتا ہے کہ حملہ آور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو سرے سے فنا کر دینا چاہتے تھے، بلکہ ان کا یہ بھی منصوبہ تھا کہ کوئی عورت باقی نہ بچے جو مستقبل میں مسلم بچوں کو جنم دے سکے۔ صبح آٹھ بجے سے قتلِ عام شروع ہوا جو دن بھر بلکہ بعض رپورٹوں کے مطابق

رات دیر تک جاری رہا۔ رپورٹر نے ایک عجیب بات یہ لکھی تھی کہ اٹھارہ فروری کو یہ قتلِ عام ہوا ہے، اس کے چند ہی دنوں بعد جب مسز گاندھی جائے وقوع کا معائنہ کرنے پہنچی ہیں تو انھیں اس قتلِ عام کا کوئی نشان دیکھنے کو نہیں ملا۔ تو کیا اتنی تیزی سے سارے آثار مٹا دیئے گئے۔ رپورٹ تو یہ کہتی ہے کہ انسانی خون کی کثرت سے کھیتوں میں پانی کا رنگ لال ہو گیا تھا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے کٹے پھٹے جسم، مُثلہ اور مسخ شدہ حالتوں میں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ درد و کرب کا یہ منظر نامہ اتنی سرعت کے ساتھ کیسے غائب ہو گیا۔ میں نے رسالہ کے سرورق پر اپنی یادداشت کے لیے یہ مختصر سا نوٹ لکھا:

> 'نیلی میں انسانوں پر جو قیامت گزری ہے اس کی کربناکی کا عام لوگوں کو کوئی اندازہ نہیں۔ اموات تین ہزار ہوں یا دس ہزار، ان کی تعداد سے کرب کی شدت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کاش کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ مرنے والے بے جان نمبر نہیں بلکہ ہماری طرح گوشت پوست کے عام انسان تھے اور انھیں بھی زندگی صرف ایک بار جینے کو ملی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا قتلِ عام ہمارے اجتماعی حافظے میں محفوظ رہ پائے گا؟'

اس واقعہ کو عرصہ گزرا۔ سال ۲۰۱۳ء کے آخری ایام تھے۔ میں اپنے تصنیفی مشاغل کے سلسلے میں علی گڑھ میں مقیم تھا۔ ان ہی دنوں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے برج کورس کے تعلیمی تجربہ کے لیے مجھے پروفیسر شپ کی پیشکش ہوئی۔ بعض رسمی کارروائیوں کی خانہ پری کے لیے زندگی میں پہلی بار تعلیمی اسناد کی ضرورت پیش آئی۔ اسی تلاش میں پرانی فائلوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے انڈیا ٹوڈے کا وہ شمارہ نظر آیا جس پر میرا نوٹ آج بھی اسی طرح چپکا ہوا تھا۔ اس تحریر پر نظر پڑتے ہی بس یہ سمجھیے کہ ۱۹۸۳ء کا وہ کربناک منظر نامہ پھر سے نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ان ہی دنوں مکیکو کیمورہ (Makiko Kimura) کی کتاب *The Nellie Massacre of 1983* شائع ہو کر آئی تھی جو حسنِ اتفاق سے میرے مطالعہ کی میز پر موجود تھی۔ تیس سال کے اس طویل عرصے میں نیلی کے قتلِ عام پر لکھی جانے والی تحریروں کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم تھی۔ مکیکو ایک جاپانی مصنفہ ہیں جو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں تحقیقی مطالعہ کے لیے آئی تھیں۔ قدرت نے ان سے یہ کام لے لیا۔ اس کے علاوہ دو ہزار آٹھ (۲۰۰۸ء) میں ہیمندر نارائن کی ایک مختصر سی کتاب شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا *25 Years on... Nellie still haunts*۔ ہیمندر نے لکھا تھا کہ میں ان دنوں انڈین ایکسپریس کا نامہ نگار تھا اور میں نے اس قتلِ عام کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں بہت دنوں سے اس درد کو اپنے اندرون میں سمیٹے ہوا تھا۔ میں نے اسے لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ لوگ مجھ سے

پوچھتے ہیں کہ تم نے پچیس سال بعد یہ کتاب کیوں لکھی تو میرا جواب یہ ہے کہ میں اس کرب کو آخر کب تک چھپائے رکھتا۔ میرے لیے اس کا لکھنا گویا اندرونی کرب سے رہائی کی ایک صورت ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ سوباسری کرشنن کی ایک ڈاکومینٹری What the Fields Remember بھی ان ایام کی یاد دلاتی ہے جب خیرالدین اپنے دو بچوں کو لے کر بھاگ رہے تھے۔ چھوٹے بچے کو انھوں نے اپنی پیٹھ پر باندھ رکھا تھا اور بڑے کی انگلیاں تھام رکھی تھیں۔ یہ تینوں باپ بیٹے بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ اچانک کسی نے ایک تیز دھار کے اسلحہ سے ان کے بچے پر حملہ کر دیا۔ بچہ دفعتاً ڈھیر ہو گیا۔ اب انھوں نے پیٹھ پر بندھے بچے کو لے کر سامنے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ اس لمحہ پیچھے سے ان پر تیز دھار کے اسلحہ سے دوسرا وار پڑا۔ انھوں نے تیرنے کی کوشش کی۔ پلٹ کر دیکھا تو ہمت جواب دینے لگی۔ ان کے بچے کا سر دو حصوں میں کٹ کر مخالف سمتوں میں جھول رہا تھا۔ خیرالدین کہتے ہیں کہ آج بھی یہ منظر جب میری نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو میری راتوں کی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے بتیس لوگ اس قتلِ عام میں کھوئے ہیں۔ مجھے انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں آج بھی انصاف کی تلاش میں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہوں، مگر انصاف ملے تو کیسے؟ حکومت نے اس حادثے کی تحقیقات کے لیے جو تیواری کمیشن مقرر کیا تھا اس کی رپورٹ منظرِ عام پر نہیں لائی گئی۔ چھ سو صفحات کی اس رپورٹ کو بعد میں بعض لوگوں نے حقِ اطلاعات کے تحت حاصل کیا۔ اس رپورٹ میں جن لوگوں کو ملزم ٹھہرایا گیا تھا، اوّل تو ان میں سے ایک بڑی تعداد پر پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔ پھر جن دو سو ننانوے لوگوں پر فردِ جرم عائد کی گئی تھی انھیں بھی ۱۹۸۵ء کے آسام معاہدے کے تحت جو وزیراعظم راجیو گاندھی اور پرفولا کمار مہنتا کے مابین طے پایا تھا، عام معافی دے دی گئی۔ خیرالدین اور دوسرے متاثرین اس ناانصافی پر چیخ اٹھے۔ انھوں نے ۲۰۰۷ء میں ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن نقار خانے میں طوطی کی سنتا کون ہے۔

اگست ۲۰۰۷ء میں جب مکیکو کیمورہ اپنے دوسرے تحقیقی دورے پر وہاں پہنچی ہیں تو، اتنے سال گزرنے کے بعد بھی، انھیں ہر طرف درد و کرب کی وہی داستان سننے کو ملی۔ کسی نے کہا کہ میرے خاندان کے ستّر لوگ مارے گئے، کسی نے بتایا کہ میری ماں کو چھبیس زخم لگے تھے لیکن وہ معجزاتی طور پر بچ گئیں، البتہ ہم نے اپنے خاندان میں سترہ لوگ کھو دیئے۔ بعض لوگ تو آج بھی مسز گاندھی کے ان وعدوں کا ذکر کر رہے تھے جو انھوں نے بازآبادکاری کے سلسلے میں نیلی کے مسلمانوں سے کیے تھے۔

’اندرا گاندھی نے ہم سے ووٹ دینے کو کہا تھا اور پھر جب وہ قتلِ عام کے بعد یہاں آئیں تو انھوں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ’جو ہوا سو ہوا، البتہ آپ لوگوں کو یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔

میں آپ کی بازآبادکاری میں ہر ممکن مدد کروں گی۔ میں ہر طرح سے آپ کے لیے حاضر ہوں۔
آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔' انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس جگہ کو ایک مثالی گاؤں بنائیں
گی۔ گھر اور سڑکیں بنائی جائیں گی۔ ہاسپٹل، اسکول اور پولیس اسٹیشن قائم کیے جائیں گے لیکن
ہمیں دو ہزار روپوں اور چھتوں کے لیے تین بنڈل ٹن کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔'

کیمورہ کہتی ہیں کہ بعض لوگوں نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ مسلمان متاثرین کو معاوضے کے نام پر صرف پانچ ہزار روپے دیئے گئے جبکہ حملہ آوروں میں سے مرنے والے خاندان کو پینتیس ہزار روپے کا معاوضہ پیش کیا گیا۔ بعضوں نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ ابھی حال ہی میں بہار سے تعلق رکھنے والے اڑتالیس لوگ بالائی آسام کے علاقے میں مارے گئے۔ سماج وادی پارٹی نے ان میں ہر ایک شخص کے متعلقین کو معاوضے کے طور پر ایک لاکھ روپے پیش کیے۔ آسام حکومت نے تین لاکھ، وزیراعظم منموہن سنگھ نے دو لاکھ اور بہار حکومت نے ایک لاکھ کی رقم پیش کی۔ اس طرح مجموعی طور پر یہ رقم سات لاکھ ہوگئی۔ منموہن سنگھ نے اپنے وزیراعظم بننے کے بعد دہلی کے سکھ مخالف فسادات میں مارے جانے والے لوگوں کے لیے بھی معاوضہ کی رقم بڑھا کر سات لاکھ کردی تھی۔ پھر یہ مسلمانوں کا خون ہی اتنا ارزاں کیوں ہے جنھیں صرف پانچ ہزار کے معاوضے پر ٹرخا دیا گیا ہے۔

ملکیکو کیمورا کو پڑھتے ہوئے مجھے نیلی کے ان مسلمانوں پر بڑا ترس آیا جو آج بھی مسز گاندھی کے وعدوں کا خواب سجائے انصاف کے منتظر ہیں۔ نیلی اور اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی مسز گاندھی کی قائم کردہ ان مثالی بستیوں میں لوگوں کو انصاف تو کیا ملتا البتہ اس جہنم جہنم زندگی نے چھوٹی بڑی کلفتوں کی اہمیت ان کی نظر میں ختم کردی ہے۔ اب ظلم و بربریت کا بڑے سے بڑا واقعہ بھی نیلی کے رِستے زخموں کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اکانومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی کے مطابق (محولہ ۲۰؍مئی ۱۹۹۵ء) جولائی ۱۹۹۴ء میں زیریں آسام کے بارپیٹا ضلع میں بوڈو دہشت گردوں کے ہاتھوں ایک ہزار بنگالی مسلمان قتل کردیئے گئے۔ ہزاروں لوگ زخمی ہوئے۔ ساٹھ سے زیادہ گاؤں جلا کر خاکستر کردیئے گئے، حتیٰ کہ جو لوگ حکومت کے ذریعہ لگائے گئے پناہ گزیں کیمپ میں مقیم تھے، انھیں بھی بے رحمی سے قتل کردیا گیا۔ لیکن اس حادثے پر کسی عمومی بے چینی کا اظہار شاید اس لیے نہیں ہوسکا کہ مسلمانوں کا قتلِ عام اب اس ملک میں معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔

انڈیا ٹوڈے کے سرورق پر جو نوٹ چپکایا گیا تھا وہ میرے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چپکا کہ اب ہر وقت یہ فکر ستانے لگی کہ کون سا ایسا قدم اٹھایا جائے جو ہمارے اجتماعی حافظے میں ان کرب ناک یادوں کو

محفوظ کرسکے۔ میں نے سوچا یادیں امانت ہوتی ہیں اور اجتماعی یادوں کی حیثیت قومی امانت سے کم نہیں۔ جو قومیں اپنی یادداشت کو محفوظ نہیں رکھ پاتیں وہ دشمنوں کے لیے مسخ شدہ اور گمراہ کن تاریخ نویسی کا راستہ کھلا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور اگر تاریخ کے بیانات گمراہ کن ہوں تو ان سے سبق و عبرت حاصل کرنے کے بجائے مومن ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے ملک میں جہاں حکومتیں اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے راتوں رات شواہد کو ضائع کر دینے اور خود کو مجرم کے بجائے مسیحا بنا کر پیش کرنے میں یدِطولیٰ رکھتی ہوں۔

ان ہی دنوں ایک رات پروفیسر میرے خواب میں آئے۔ آج ان کے جذب پر غضب حاوی تھا۔ اچکن غبار آلود، خون میں لت پت، کچھ دیر خالم مخول کی گردان کرتے رہے پھر کہنے لگے: یہ عذاب دَم لیتا ہے، ٹھہرتا ہے مگر اپنے اختتام کو نہیں پہنچتا۔ کوئی خدا سے کہے کہ وہ اب بس بھی کرے۔ میں نے جب اس اجمال کی تفصیل چاہی تو انھوں نے عالم غضب میں ہوا میں اپنی مٹھی بلند کی۔ بولے: تم نہیں دیکھتے جو لوگ کل تک یہاں حکمراں تھے آج وہی لوگ کتنے بے بس بنا دیئے گئے ہیں۔ ہائے تقسیمِ وطن کے وہ دلدوز مناظر۔ بڑے بڑے رؤسا اور شرفا کو ذلت کی قبا زیب تن کرنا پڑی۔ نازک اندام مسلم دوشیزائیں جانوروں کی طرح ہانک لی گئیں۔ کل جن کی طرف کوئی نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا، زمانے کے ہاتھوں وہ کیسے روندی گئیں۔ اور پیاری فا ا ط ط مہ ن ...... ننھی معصوم بچی، میری بہن، محض بارہ سال کی ـ جانتے ہو کیا کیا درندوں نے اس کے ساتھ۔ پہلے تو اسے دوسری عورتوں کی لٹتی عصمت کو دیکھنے پر مجبور کیا گیا اس کے لیے یہی صدمہ کیا کم تھا پھر اسے اجتماعی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ کہتے تھے مار ڈالیں گے مگر نہ جانے کیوں چھوڑ دیا۔ جان تو بچ گئی مگر وہ تو اندر سے پہلے ہی مر چکی تھی، وہ اپنا غم کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ کسے الزام دیں، کس سے منصفی چاہیں؟ پروفیسر نے ایک دلخراش آہ بلند کی اور بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

فاطمہ اب آسمانوں میں اپنے رب کے پاس ہے۔ جنت کے باغات میں ٹہل رہی ہے۔ میں نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے میری سادہ لوحی پر حیرت کا اظہار کیا۔ بولے: تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ دُنیا کی کچھ بھی خبر نہیں۔ آخری بار میں نے اسے نیلی کے قتلِ عام میں دیکھا۔ پروفیسر شاید آپ کے حافظہ میں چیزیں خلط ملط ہوگئی ہیں، شاید اسی لیے وقت کا شاعر 'چھین لے مجھ سے حافظہ میرا' کی دعائیں مانگتا ہے۔ بولے: بالکل فضول یہ بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ پچھلی یادیں اگر محو بھی ہو جائیں تو نئے حوادث اس سے کہیں تلخ یادوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور یہ تلخ یادیں مسلسل رِستی رہتی ہیں۔ بڑے سے بڑا حادثہ اگر اپنے انجام

کو پہنچ چکا ہوتو اس سے آپ سنبھالا لے سکتے ہیں، زندگی کے منتشر تانے بانے کو پھر سے مرتب کر سکتے ہیں، لیکن اگر حادثہ ایک امر مسلسل بن جائے تو یہی یادیں صحت مند تناظر فراہم کرنے کے بجائے ایک نا قابل علاج رِستا زخم بن جاتی ہیں، ایک ایسا ناسور جس سے رہائی کی امید دم توڑ دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب ابد تک اسی صورت حال میں زندگی جینا ہے۔ اس ہلا مارنے والی گھٹن کے بیان کی ان الفاظ میں تاب نہیں جو عام صورت حال کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ سچ پوچھو تو یہی ہے ہندوستانی مسلمانوں کا اصل کرب۔

'پھر یادوں کی تجلی سے مستقبل کی شاہراہ کیسے روشن کی جائے؟'

بولے: ممکن ہے، قصص و حکایات کے ذریعے بعض باتیں گا ہے گرفت میں آجائیں یا قاری کو ایسا لگے کہ حقیقت یہیں قریب سے دل کے تاروں کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے۔ یہ جو آسمانی کتابوں کا اسلوب ہے جہاں قصص و تماثیل کا سہارا لیا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی تو یہی ہے کہ عالی خیالات اور غیر معمولی حوادث کی ترسیل عام انسانی زبان کے ذریعہ نہیں ہوسکتی۔ کسی صاعقہ کا بیان ایک نئی لغت چاہتا ہے۔ نیٹشے نے شاید اسی لیے *Thus Spake Zaratustra* میں ایک آسمانی اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی۔ خیال تو گرفت میں نہ آیا، ہاں اس فراق میں وہ اپنا محور کھو بیٹھا۔ زبان پر جب آپ اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں تو وہ لڑکھڑاتی اور زمیں بوس ہوجاتی ہے۔ کبھی زبان ٹوٹتی ہے اور کبھی بیان کرنے والے کے اندرون میں کوئی چیز کچھ اس طرح منہدم ہوتی ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ یہ جو آپ بعض لوگوں کو ہکلاتے دیکھتے ہیں تو یہ دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا لاشعور کسی غیر معمولی حادثہ کے سبب مجروح ہوجاتا ہے اور اکثر انھیں اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ مجروح لاشعور والے لوگ اپنی صورت حال کا کوئی واقعی تجزیہ بھی نہیں کر پاتے۔

میں نے پوچھا: اس مرض کہن کا کوئی علاج بھی ہے یا اب ہندوستانی مسلمانوں کو اسی رِستے زخموں کے ساتھ جیئے جانا ہے؟ بولے: کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج نہ ہو۔ اس سلسلے کی پہلی منزل مرض کی تشخیص ہے۔ کرب مسلسل کے قیدی گھٹ گھٹ کر جینے کے ایسے عادی ہوجاتے ہیں کہ وہ اس سے نکلنے کو ایک امر محال سمجھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ظلم مسلسل کے عادی ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں ہندوستانی مسلمانوں کی یہ درگت بنی ہے وہ بھی چین سے نہیں رہ پاتے، ان کا ضمیر انھیں کچوکے لگاتا ہے، بے چین کیے رہتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس ضمیر نہیں ہوتا، یہ درست نہیں۔ مظلوم کی آہ و کراہ میں تو پھر بھی خدا کی نصرت اور رحمت کے وعدے ملتے ہیں جس کے سہارے وہ اپنے زخم کی مرہم پٹی کرسکتا ہے۔ ظالم کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنی بے چینی اور خفت مٹانے کے لیے مزید ظلم کا راستہ اختیار کرے۔ ایک شیطانی گرداب دائری اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ جب زبان بیان کی متحمل نہ ہو تو لکھنے والا پھر لایعنی الفاظ کی بازیگری سے خود کو اور دوسروں کو دھوکہ کیوں دے۔

'یہ جو تم میری بیاض دیکھتے ہو تو بھئی یہ آڑی ترچھی لکیریں اس لیے کھینچ رکھی ہیں کہ ظلم کے مقابلہ میں خاموشی سے بغلولی بہتر ہے۔ خالم خول!'

مجھے ایسا لگا جیسے ایک کربناک گھٹن ان کی شخصیت پر مرتسم ہو گئی ہو۔ ٹوٹی، پچکی بغلولی بلکہ مجذوبی شخصیت اپنے اندر ایک الست کی شا کی جو زبان حال سے یہ کہہ رہی ہو کہ اے ربِ کائنات تو نے میری روح کو کیوں مجروح کردیا۔ جسم کا زخم تو دکھائی دیتا ہے لیکن روح جب ایک بار اپنا شاکلہ کھودے تو صرف ایک ناقابلِ انگیز کرب رہ جاتا ہے، ایک رِستا ہوا زخم مسلسل، ایک ابدی اور دائمی عذاب۔

میں نے پوچھا: 'پھر ہندوستانی مسلمان اس سانحۂ عظمیٰ کی کوئی یادگار، کوئی نشانی کیوں نہیں قائم کرتے؟ ہمارے ہاں تو حسین کے غم کی ایک زندہ روایت موجود ہے، نوحوں اور مرثیوں، سوزخوانوں کے الم انگیز بیانیے، ذاکروں کی معجز بیانیاں، ان سب کے باوجود ہم اپنے کرب کو اب تک دُنیا کے سامنے کیوں نہ لا سکے۔ اہل یہود کی طرح اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ اس حادثۂ عظمیٰ کا کوئی میموریل ہی قائم کردیتے جہاں Never Again کی تختی آویزاں ہوتی۔'

بولے: اہل یہود کے مقابلہ میں ہمارا زخم کہیں گہرا ہے، افسوس کہ ہمیں اس کا اندازہ نہیں۔ اہل یہود اپنی تلخ یادوں کے میوزیم اس لیے بنا سکے کہ وہ پوسٹ ٹراما میں جیتے تھے، اس کے برعکس ہندی مسلمان خود کو ایک کرب مسلسل (Continuing Traumatic Disorder) کی صورتِ حال میں پاتے ہیں۔ اگلی نسل کا کرب پچھلی نسل سے زیادہ کربناک ہو جاتا ہے۔ نئے چیلنج کے آگے پرانے خطرات چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ کرب کا گراف مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ حادثہ اپنی انتہا کو پہنچے جب تو مسلمان اس وقوعہ کا کوئی علمی تجزیہ کریں، یہاں نہ تو گیس چیمبر ہیں اور نہ ہی Concentration Camp، یہاں سب کچھ ایک نامحسوس عمل ہے جس کا صحیح اندازہ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ مقام قائدین کو بھی نہیں۔

۳۱

یرغمال قیادت

مجھے ابّا کی وہ بات بار بار یاد آتی کہ ایک نسل تو اس فریب کاری کو سمجھنے میں گزر جائے گی۔ پھر خیال آتا کہ اگر ہماری نسل نے فہم وادراک کا کام مکمل کرلیا تو کیا عجب کہ قدرت اگلی نسل کو اقدامی عمل کے لیے منتخب کرلے۔ خیال آیا کیوں نہ علی گڑھ میگزین کو مسئلہ کی تفہیم کے لیے استعمال کیا جائے اور اس شمارے کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر خصوصی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا جائے۔ احباب نے اس خیال کا استقبال کیا اور ایک خصوصی نمبر کی تیاری میں اس موضوع پر شائع شدہ کتابوں اور رسائل وجرائد کے خصوصی شماروں کی چھان بین کا کام شروع ہوگیا۔ اس سلسلہ میں جو پہلی دو کتابیں میرے ہاتھ لگیں وہ دو اسمتھوں کی تھیں؛ ایک ڈونالڈ یوجین اسمتھ کی *India as a Secular State* اور دوسری ولفرڈ کینٹول اسمتھ کی *Islam in Modern History*۔ پہلی کتاب میں مصنف نے آثار وشواہد کی روشنی میں دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ ہندوستانی سیکولرازم کی حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا۔ گو کہ یہ کتاب بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی، لیکن اس کو پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ پانی گہرا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر کسی خصوصی شمارے کی تیاری وسیع الجہات مطالعے کی طالب ہے۔ پھر ایڈیٹر کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہو وہ اس کی نظر میں ہو تاکہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ متقدمین کے کاندھوں پر کھڑا ہو کر نئے راستے کی نشان دہی کرسکے۔ اِدھر نصابی سرگرمیوں کا بوجھ اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب دوسرے تعلیمی سال کی ابتدا ہوگئی۔ ہمارے دونوں نائب مدیران نے اپنی الگ راہ نکال لی تھی۔ منوج یادو جو آگے چل کر سی بی آئی کے اعلیٰ عہدیدار مقرر ہوئے اور سہیل احمد جو مدھیہ پردیش میں جیلوں کے منتظم اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے یہ دونوں اپنے اپنے ہال کی میگزین نکالنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ اسی دوران ایک دن یہ اطلاع آئی کہ شعبہ کی طرف سے طلبا وطالبات کا گروپ دہلی میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی کتاب میلے میں شرکت کے لیے جائے گا۔ گویا موضوع پر نئی اور نادر کتابوں کی دستیابی کا ایک سنہری موقع قدرت نے بیٹھے بٹھائے فراہم کردیا تھا۔ اسلوب صاحب کی قیادت میں کتاب میلے کی سیر، بھلا اس سے

بڑی خوش نصیبی کیا ہوسکتی تھی۔ دیر شام ڈھلے واپسی ہوئی۔ بس میں نشستوں کا اہتمام کچھ اس طرح تھا کہ اگلی صف میں اسلوب صاحب اور ان کے معتمد خاص ڈاکٹر رضوان الدین، جن کے ذمہ ویسے تو سمینار لائبریری کی دیکھ ریکھ کا کام تھا، لیکن ان کی زیادہ تر توجہ طلبا کی اخلاقیات پر نظر رکھنے میں صرف ہوتی تھی، تشریف فرما تھے۔ تین چار گھنٹے کا سفر، بس جب آگے بڑھی تو طلبا و طالبات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں باہم گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔ رفعت اور فریدہ مجھ سے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں تہذیب و شائستگی کے خاص سانچے میں ڈھلی تھیں۔ شعر و ادب کا ذوق ان میں رچا بسا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں طلبا کے مقابلے میں کچھ اس جوش و خروش سے حصہ لیتیں جیسے اپنے علمی تفوق کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ فطرتاً شوخ و چنچل طبیعت کے باوجود سر ہمیشہ دوپٹے سے ڈھکا ہوتا اور جب وہ اپنے خاص انداز میں سلام کرتیں تو ایسا لگتا کہ مخاطب کا دل انھوں نے اپنی مٹھی میں لے لیا ہو۔ سفر جب آگے بڑھا تو رفعت نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مجھے کلام اقبال سنانا چاہتی ہے۔ اس نے اپنی مترنم اور دلکش آواز میں لوح بھی تو قلم بھی تو۔۔۔ گانا شروع کیا۔ ایک کے بعد دوسری نظم اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اساتذہ کے کلام کا اسٹاک ختم ہوگیا۔ سفر ابھی باقی تھا اور اس نے شاید یہ محسوس کیا کہ میرے اشتیاق میں ابھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اب اس نے ایک فلمی نغمہ الاپنا شروع کیا، دے دے پیار دے، دے دے پیار دے۔۔۔۔ وہ پورے ذوق و شوق سے گا رہی تھی اور میں ایک عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ اگلی نشست پر اسلوب صاحب، بیچ میں میں اور پچھلی نشست پر رفعت کی نغمہ سرائی۔ دے دے پیار کا نغمہ، جب اسلوب صاحب کے کانوں سے ٹکرایا تو انھوں نے رضوان صاحب سے تشویش کا اظہار کیا۔ رضوان صاحب نے اپنی لمبی گردن اور محاسبانہ نگاہوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے: کچھ نہیں، شاز صاحب کو لڑکیاں نغمے سنا رہی ہیں۔ یہ سن کر اسلوب صاحب کو قدرے اطمینان ہوا۔ بولے: اچھا اچھا۔ اور ان کی تشویش رفع ہوگئی۔ دوسرے دن یہ قصہ رضوان صاحب نے ہم لوگوں کو سنایا۔

مسلم مسائل پر علی گڑھ میگزین کے خصوصی شمارے کی اشاعت کا پروگرام سنتے ہی بعض لوگوں نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ میں شدت پسند خیال کا آدمی ہوں اور یونیورسٹی میگزین کو اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ ایک صاحب جو کج کلاہی کے لیے مشہور تھے انھوں نے میرے اندر ایک ریڈیکل اور سخت گیر نوجوان کا پیکر ڈھونڈ نکالا۔ حالانکہ میرا 'لبرل ازم' ہر خاص و عام پر عیاں تھا۔ جو شخص مہ رخوں کی مجلس میں بیٹھ کر ان سے دے دے پیار دے کا نغمہ سن سکتا تھا اس پر اسلامی شدت پسندی کا الزام چہ معنی دارد؟ مگر

بگڑتی ہے جب ظالم کی نیت نہیں کام آتی دلیل اور حجت

میگزین ابھی تیاری کے مرحلے میں تھا کہ میرے مشفق استاد اور میگزین کے نگرانِ اعلیٰ اسلوب انصاری صاحب ریٹائر ہوگئے۔ اس دوران ایم اے کا رزلٹ بھی آ گیا تھا جس میں میری پہلی پوزیشن آئی تھی، لیکن یہ بات بھی میرے حق میں نہ جاتی تھی کہ اب میں تکنیکی اعتبار سے طالب علم نہیں رہ گیا تھا۔ نئے نگراں نے پہلی ہی میٹنگ میں میرے دم خم کو توڑنے کے لیے اس نکتے کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ انھوں نے میرا تحریر کردہ اداریہ اندیشوں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ جابجا نشانات لگائے پھر فرمایا: میاں ابھی آپ کے کریئر کی شروعات ہے۔ آگے چل کر آپ کو بڑے عہدوں پر پہنچنا ہے۔ اس طرح کی تحریر لکھ کر آپ اپنے کریئر میں آگ لگا رہے ہیں۔ آپ ابھی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میرے لیے تو اس بات کا امکان باقی ہے کہ آنے والے دنوں میں مجھ پر یہ نزاکتیں منکشف ہوجائیں مگر میں اپنی عمر کے اس حصے میں جو باتیں سمجھ رہا ہوں وہ۔۔۔ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ صورت حال کو بگڑتا دیکھ کر جعفر ذکی صاحب نے مداخلت کی اور غیر معمولی طوالت کے بہانے بعض پیراگراف کے حذف کرنے پر مجھے آمادہ کرلیا۔

اِدھر کج کلاہوں کے حلقے میں یہ افواہ گشت کرتی کہ وائس چانسلر سید حامد صاحب کو میری شدت پسند طبیعت کے سبب میگزین کے سلسلے میں تشویش ہے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ ان دنوں جب بھی میری ان سے ملاقات ہوتی وہ اسی طرح شفقت و محبّت سے پیش آتے۔ تکنیکی طور پر گو کہ میں اب طالب علم نہیں رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہاسٹل میں میرے قیام کی منظوری دے رکھی تھی اور میگزین کی مالیات میں اس قدر اضافہ کردیا تھا کہ یہ خصوصی شمارہ پچھلے تمام شماروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تعداد میں شائع ہوا۔

میگزین کی اشاعت کے بعد تحسین اور حوصلہ افزائی کا سب سے پہلا خط مولانا علی میاں ندوی کا آیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

> 'علی گڑھ میگزین کا خصوصی نمبر ۱۹۸۴ء حال ہی میں ملا۔ معلوم نہیں تاخیر سے شائع ہوا یا ہم کو تاخیر سے پہنچا۔ آپ کے قلم کے سطور اور اپنا انٹرویو پڑھا، مسرت و اطمینان ہوا۔ آپ کی انگریزی تحریری صلاحیت کا اتنا اندازہ نہ تھا جتنا کہ اس شمارہ سے معلوم ہوا۔ آپ کے یہ مضامین آپ کے درخشاں ادبی و صحافتی مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ اللہ اس کو صادق کرے۔ آپ کو اپنی اس صلاحیت کو پروان چڑھانا چاہیے اور اس کو مزید ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے انٹرویو اندیشہ و شک کے ساتھ پڑھنا شروع کیا لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ میرے خیالات کی صحیح ترجمانی ہے۔ اس میں اکثر ضروری باتیں آ گئی ہیں۔ اس پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔'

مولانا علی میاں سے میرے مراسم کو اب ایک مدت ہو چکی تھی۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ گاہے بہ گاہے ندوہ میں ان کا مہمان ہوتا۔ کبھی ان کے آبائی وطن رائے بریلی کا چکر بھی لگ جاتا۔ ایک بار ان کی خصوصی دعوت پر رمضان کے چند ایام بھی رائے بریلی میں گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے مولانا کو جس قدر قریب سے دیکھا انھیں حسنِ سلوک، شائستگی اور اخلاق وتہذیب کے اعلیٰ مدارج پر پایا۔ البتہ میں اس وقت ٹھٹکا جب عصر کی نماز کے بعد شرکا کے آگے املی کے بیج کے ڈھیر لگا دیئے گئے تا کہ معتکفین مختلف اذکار و وظائف میں مشغول رہ سکیں۔ مریدوں کو مشغول رکھنا اہل سلوک کا پرانا وطیرہ رہا ہے۔ ان دنوں مجھ پر رسول اللہ کی زیارت کی دُھن سوار تھی۔ یہ شوق اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ میں اہل سلوک کی ہر آزمودہ ترکیب اور ہر مجرب نسخہ کو آزمانا چاہتا تھا۔ ایک دن خاص طور پر اس بارے میں گفتگو کے لیے مولانا علی میاں صاحب کے حجرے میں داخل ہوا۔ مولانا ایک چارپائی پر تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے غالباً اپنی کسی کتاب کا پروف پڑھ رہے تھے۔ فرش پر مختلف اطراف میں ان کے مریدین اور شاگرد بیٹھے تھے۔ انھوں نے حاضرین کو کمرہ خالی کرنے کا عندیہ دیا۔ فرمایا: یہ میرے عزیز ہیں کچھ باتیں کرنے آئے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے پوچھا کہ کیا عالم بیداری یا رؤیا میں رسول اللہ کی زیارت ممکن ہے؟ انھوں نے سیوطی اور دوسرے علما کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ہاں کیوں نہیں۔ اس طرح کی گفتگو سے میرے اندر ملاقات کا شوق تو مزید بھڑک اٹھا لیکن اس مقصد کے لیے کسی واضح راستہ کا تعین نہ ہو سکا کہ اہل سلوک کی دُنیا میں کوئی بندھا ٹکا فارمولہ ہر شخص کے لیے یکساں کارگر نہیں ہو سکتا۔ مولانا کی ان ہی شفقتوں اور عنایات کا اثر تھا کہ جب میں نے مسلم مسائل پر علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ نکالنے کا فیصلہ کیا تو مجھے ان سے اس مسئلہ پر انٹرویو کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں خط و کتابت کے بعد تاریخوں کا تعین ہوا اور میں متعینہ وقت پر ٹیپ ریکارڈر لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مولانا شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آج ان کی طبیعت بھی کِھلی نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے ادب اسلامی پر اپنی ایک تصنیف عنایت فرمائی اور اقبال کا یہ شعر پڑھا:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اب میں نے ٹیپ آن کیا اور انٹرویو با قاعدہ شروع ہوا۔ میرے پہلے ہی سوال پر مولانا ٹھٹکے۔ فرمایا: آپ نے تو ادب پر انٹرویو کا کہا تھا۔ غالباً مولانا کو التباس ہو گیا تھا۔ میں نے صفائی دی۔ بتایا کہ علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ مسلم مسائل پر شائع ہو رہا ہے جس کے لیے میں خاص طور پر آپ سے انٹرویو کے لیے

حاضر ہوا ہوں۔ بولے: یہ ایک حساس موضوع ہے اور میری طبیعت کو انٹرویو سے مناسبت نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سوالات لکھ کر دے دیں، میں ان کے جوابات بھجوادوں گا۔ میں نے بالمشافہ گفتگو پر اصرار کیا لیکن مولانا کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ میں ان کے عقیدت مندوں میں سے تھا اور میرے اصرار میں بھی عقیدت مندوں کا سا انداز نمایاں تھا، یعنی راضی بہ رضا۔ انٹرویو نہ لے کر بھی میں نے اسے اپنی کامیابی پر محمول کیا اور خوش خوش وطن کی راہ لی۔ میں نے جب یہ نامکمل انٹرویو والد صاحب کو سنایا تو انھوں نے میری معتقدانہ اندازِ گفتگو پر تشویش کا اظہار کیا۔ بولے: انسان کو پروپیگنڈے سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا میں بڑی خوبیاں ہیں، صاحبِ تصنیف ہیں لیکن وہ اس فن میں تنہا نہیں ہیں۔ تم ان سے طالب علم کی طرح استفادہ کرو، معتقد بننے کے لیے تو بہت سے لوگ موجود ہیں۔

میں جب بھی ندوہ جاتا مولانا کی فرشی مجلس میں خصوصی اکرام کا مستحق سمجھا جاتا۔ کبھی کبھی ایسی صورت حال بھی آئی کہ ان کی اپنی چارپائی کے علاوہ کوئی اور کرسی دکھائی نہ دی، جب بھی میں نے مریدوں کے سے انداز میں فرش پر بیٹھنے کو گوارا نہ کیا۔ مولانا ان نزاکتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھ جیسے طالب علم سے اکرام کا معاملہ کیا۔ انھیں میرے اندر شاید کوئی مرید تو نظر نہ آیا البتہ میگزین کی اشاعت کے بعد انھوں نے میری ادارت میں پرسنل لاء بورڈ کے انگریزی رسالہ کے اجرا کی فی الفور توثیق فرمادی۔ انھوں نے ۱۴؍دسمبر ۱۹۸۵ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

> 'لکھنؤ میں حسنین سید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک آپ کا ذکر رہا۔ آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے مسرت ہوئی۔ انگریزی رسالے کی تجویز معقول ہے۔ آپ مولانا رحمانی صاحب کو بھی تجویز بتائیں۔'

جلد ہی مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کا خط آیا کہ رسالہ کا بجٹ بنائیے۔ کام کا آغاز کردیجیے۔ اگلے مہینے دہلی میں عاملہ کا جلسہ ہے اس موقع پر اگر آپ آجائیں تو مناسب رہے گا۔ ابھی یہ بیل منڈھے نہ چڑھی تھی کہ مجھے اپنی پی ایچ ڈی کے سلسلے میں انگلینڈ کا سفر پیش آگیا اور یہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۲ء تک کا عرصہ مولانا علی میاں سے میری قربت اور ان کی خصوصی توجہ وشفقت کا زمانہ رہا۔ کبھی دہلی، کبھی لکھنؤ اور کبھی تکیہ کلاں میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچ جاتا۔ مولانا بھی مجھ سے خاص شفقت کا معاملہ کرتے۔ ندوہ کے ایک سفر کی بابت میں نے ان دنوں علی گڑھ میگزین میں کچھ اس طرح لکھا تھا:

> '۲۲ ستمبر کو جب میں وہاں پہنچا ندوہ کا موسم خاصا خوشگوار تھا۔ ایک طالب علم نے گیسٹ ہاؤس

تک پہنچنے میں میری مدد کی۔ پتہ چلا کہ مولانا ابھی رائے بریلی سے آنے ہی والے ہیں۔ چند لمحوں بعد کسی کار کی آواز سنائی دی۔ مولانا تشریف لے آئے تھے۔'اچھا آپ آ گئے' مولانا نے شفقت بھری آواز میں کہا۔ کچھ دیر میں چائے آ گئی مولانا نے اصرار کیا کہ میں بسکٹ بھی لوں۔ ہم لوگ ادبی اور مذہبی امور پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اپنی ادبی تقریروں پر مشتمل ایک کتاب منگوائی اور میری حیثیت سے بڑھ کر میری قدر افزائی کرتے ہوئے بعض مقامات سے کچھ اہم سطریں پڑھ کر سنائیں۔ اقبال کے چند اشعار پڑھے۔ باقاعدہ گفتگو کے لیے دوسرے دن کا وقت طے پایا۔ دوسرے دن شام کے وقت طلبا یونین کی رسم تنصیب کی تقریب بھی تھی۔ مولانا نے اصرار کیا کہ میں ایک رات مزید قیام کروں تاکہ اس میں میری شرکت ہو سکے۔'آپ ہمارے عزیز ہیں، مہمان ہیں میری خواہش ہے کہ آپ اس تقریب میں ضرور شریک ہوں' ان کا چہرہ سکینت سے پر اور محبّت سے معمور تھا، ان کی روشن آنکھوں میں شفقت و مسرت کی جھلک تھی، انھوں نے میرے رکنے پر اصرار جاری رکھا'۔

(بحوالہ علی گڑھ میگزین [انگریزی] ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۹)

اس کثرتِ ملاقات سے بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ شاید وہ مجھے کسی بڑے رول کے لیے تیار کر رہے ہیں، البتہ برسوں کے اس تعلق کو اس وقت سخت صدمہ پہنچا جب دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد میں نے دہلی میں ملّی پارلیمنٹ کے پہلے قومی اجلاس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ انہدام کے بعد مسلمانوں پر سخت مایوسی طاری تھی۔ ملّی قیادت زمیں بوس ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں ایک نئے طرزِ فکر کے ساتھ امت کی تنظیم نو کی اس آواز کو بڑے پیمانے پر پذیرائی مل رہی تھی۔ مہینوں کی جدوجہد کے بعد ہم لوگوں نے مئی کی سخت جھلستی ہوئی گرمی میں دلّی کے ماؤلنکر ہال میں ملک بھر کے مضطرب مسلمانوں اور خاص طور پر نوجوان قیادت کو اس جلسہ میں طلب کیا تھا۔ علی میاں سے اپنے قریبی مراسم کے سبب مجھے یہ توقع تھی کہ اس انقلابی مشن پر مولانا اپنا دستِ شفقت ضرور رکھیں گے۔ مجھے ان سے شرکت کی توقع تو نہ تھی البتہ ان کے تائیدی پیغام کے لیے میں نے اپنے بھائی فہیم اختر صاحب کو خاص طور پر ان کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا نے میرا خط پڑھا۔ تائید کے مسئلہ پر تحفظ کا اظہار کیا۔ بولے: موجودہ صورت حال میں، میں کسی نئی قیادت کو سامنے لانا مناسب نہیں سمجھتا۔ برادرِ مکرم نے بہت کہا کہ آپ تحریری طور پر اس خط کا جواب دے دیجیے مگر انھوں نے اس زبانی پیغام پر اکتفا کرنا ہی مناسب جانا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا سے میرے مراسم میں وہ پہلی سی گرم جوشی نہ رہی۔ ہم دونوں اپنی اپنی دُنیا میں کام کرتے رہے۔ میری ان کی آخری ملاقات ان دنوں

ہوئی جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ مولانا اس حملہ سے بڑی حد تک نکل آئے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں اپنی کتاب 'ہندوستانی مسلمان: ایام گم گشتہ کے پچاس برس' پیش کی۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ مسرت کا اظہار کیا پھر خادم کو آواز دے کر 'قرآنی افادات' نامی کتاب کا ایک نسخہ منگوایا۔ بولے: لیجیے میری طرف سے اسی ضخامت کی یہ کتاب قبول کیجیے۔ شام کی عمومی مجلس میں جہاں مولانا عبداللہ عباس اور کچھ دوسرے حضرات بھی بیٹھے تھے، میرے ایک رفیق عبدالحمید سوانور جو اس سفر میں میرے ساتھ تھے، انھوں نے مولانا سے استفسار کیا کہ ڈاکٹر (راشد شاز) صاحب کا موقف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک عرصہ سے سیاسی ارتداد کے نرغے میں ہیں، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ مولانا نے سوال سنا، خاموش رہے۔ شاید وہ کسی ایسی گفتگو کے موڈ میں نہیں تھے۔ جب انھوں نے کئی بار اسی سوال کو مختلف انداز سے پوچھنے کی کوشش کی تو عبداللہ عباس صاحب کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے اس اصرار کو سوئے ادب پر محمول کیا۔ میں مولانا کی عیادت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ان کی عمر اور صحت کا بھی تقاضا تھا کہ اگر طبیعت آمادہ نہ ہو تو اس قسم کے حساس موضوع پر گفتگو کے لیے اصرار نہ کیا جائے۔

مولانا علی میاں سے قربت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس عہد کی بعض اہم شخصیات، لیڈروں اور علما سے پہلی بار ان ہی مجلسوں میں متعارف ہوا۔ ایک بار علی میاں کی خصوصی دعوت پر بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں شریک ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں میگزین کے خصوصی نمبر کی تیاری میں مشغول تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی قیادت کو قریب سے دیکھنے، سننے اور اس سے بالمشافہ تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ یہ فرشی مجلس تھی جس میں شرکا کی تعداد تیس، چالیس سے زیادہ نہ تھی۔ نمایاں لوگوں میں ابراہیم سلیمان سیٹھ، سید شہاب الدین اور بورڈ کے عہدے داروں میں مولانا علی میاں اور منت اللہ رحمانی صاحبان شامل تھے۔ اس موقع پر مجاہد الاسلام قاسمی نے ایک مربوط اور مبسوط تقریر کی تھی اور شاید اسی لیے انھیں نئے ابھرتے ہوئے نوجوان عالم کی حیثیت سے دیکھا جا رہا تھا۔ قرارداد کی تیاری اور میمورنڈم کی ڈرافٹنگ کا سارا کام سید شہاب الدین صاحب نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ مسودہ جب تیار ہو گیا تو مولانا نے ایک نظر قرارداد پر ڈالی۔ بلند آہنگی سے پڑھتے ہوئے ہر نکتہ کو مناسب بتایا اور عاملہ کی یہ دوروزہ مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔ ان دو دنوں میں کبھی کھانے کی میز پر اور کبھی چائے کے وقفے کے دوران مجھے ان دور دراز سے آئے ہوئے قائدین سے تبادلے کا خوب خوب موقع ملا۔ ایک بات جو اس عہد کے قائدین میں دیکھی وہ ان کا انکسار اور چھوٹوں کے لیے خاص شفقت تھی۔ البتہ یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی ملّی قیادت کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ بات بحث و

مباحثہ اور قرارداد کی تیاری سے شروع ہوئی اور وزیراعظم سے ملاقات اور ان کو میمورنڈم پیش کرنے پر ختم ہوگئی۔ قرارداد اور میمورنڈم والی اس ملّی قیادت کا آنکھوں دیکھا حال میں نے علی گڑھ میگزین کے خصوصی شمارے میں کچھ اس طرح لکھا تھا:

'آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا دوروزہ اجلاس کوئی بڑا جلسہ نہ تھا، جیسا کہ آل انڈیا کے لفظ سے تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ویسٹرن کورٹ کا کمرہ نمبر چار اس اجلاس کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ یہ ایک وسیع وعریض کمرہ تھا جہاں فرشی مجلس آراستہ تھی۔ مقررہ وقت پر جب میں وہاں پہنچا تو دور دور تک کسی میٹنگ کے آثار نہ تھے۔ کچھ دیر بعد لوگ آنے لگے۔ حضرت مولانا قسم کے لوگ، مذہبی قائدین، اسلامی قانون کے شارحین اور اس قبیل کے دوسرے لوگ۔ میں نے دیکھا ایک صاحب، جو ستر کے لپیٹ میں ہوں گے، درمیانہ قد، فربہ بدن، سفید براق طویل داڑھی اور ہاتھ میں ایک قدیم طرز کا عصا لیے وارد ہوئے۔ یہ تھے مولانا منت اللہ رحمانی، بورڈ کے سکریٹری اور مونگیر کی خانقاہ کے سجادہ نشین۔

میں نے مولانا رحمانی سے اپنا تعارف کرایا۔ پتہ چلا کہ وہ میرے خاندان سے بخوبی واقف ہیں اور میرے بارے میں پہلے سے ہی بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہم لوگ وہیں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور مولانا کی شفقت ومحبّت سے جلا پاکر میں نے مسلم مسائل پر ان سے گفتگو چھیڑ دی۔ ان کی گفتگو سے ایسا لگا جیسے مولانا مسلم عوام سے سخت نالاں ہوں۔ انھیں اپنی قوم کو پھر سے ایک نئی زندگی عطا کرنے کی کچھ امید نہیں رہ گئی تھی۔

'مولانا کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس وقت ہندوستانی مسلمان خوف و ہراس کی فضا میں جی رہے ہیں اور جو قوم عدم تحفظ کا شکار ہو وہ آگے بڑھنے اور پر اعتماد منصوبہ بندی میں خاطرخواہ حصہ نہیں لے سکتی۔ میں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی بات رکھ دی۔

بولے: مسئلہ کا کوئی فوری حل ممکن نہیں۔ یہ ہماری ہزار سالہ تاریخ کی پیداوار ہے۔ ہمارے پرکھوں نے جو کیا ہے اسے آج ہم بھگت رہے ہیں۔'

اس سے نجات کا بھی کوئی راستہ ہے مولانا! کیا علما اور مذہبی قائدین عظمت رفتہ کی بازیابی میں کوئی رول ادا کرسکتے ہیں؟ پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی میں نے انھیں یہ مشورہ دے ڈالا کہ کس طرح علما ایک مؤثر رول ادا کرسکتے ہیں۔

بولے: 'عزیزم! آپ کو صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں۔ اخلاقی طور پر مسلمان بہت ہی

خستہ حال ہیں، وہ بھروسے کے قابل نہیں۔ علما پر انھیں اعتماد نہیں۔ علما اب مؤثر نہیں رہ گئے ہیں۔ ان کے اندر کذب بیانی آ گئی ہے۔ شدید آپسی اختلافات ہیں۔ بڑی افسوس ناک صورت حال ہے۔' مولانا مسلم قوم سے بہت مایوس تھے۔ میرے راست سوالات نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ گفتگو کے آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ نوجوان ہیں۔ آپ لوگ خود تو میدان میں نہیں آتے، سارا الزام ہم لوگوں کے سر ڈال دیتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ آپ جیسے لوگ آگے آئیں۔ گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مولانا علی میاں ندوی تشریف لے آئے۔ اب تک ہماری فرشی مجلس میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو چکے تھے۔ دہلی کے ایک مقامی بزرگ نے کسی کے انتقال کی خبر سنائی اور یہ شکوہ کیا کہ مولانا قحط الرجال بڑھتا ہی جاتا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ مستقبل سے خوف زدہ ہوں۔ حال تو ان کی گرفت سے پہلے ہی پھسل چکا تھا۔'

بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے بعد مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ہم جسے مسلمانوں کی اجتماعی ملّی قیادت سمجھتے ہیں اس کی حقیقت ایک سراب اور واہمہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ بیشتر قائدین نے اپنی اپنی خانقاہوں، تکیوں، اداروں، انجمنوں اور مدرسوں میں انتظام و انصرام کی کمان سنبھال رکھی ہے۔ ان کی گوناگوں تنظیمی اور سماجی مصروفیات اس بات کی اجازت ہی کب دیتی ہیں کہ وہ امت کے مسائل کا باقاعدہ تحلیل و تجزیہ اور مستقبل کے لیے کوئی مؤثر پلاننگ کر سکیں۔ اور پھر کسی ایسی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی ملک گیر تنظیمی ڈھانچہ بھی تو نہیں۔ اپنی موجودہ صورت حال میں یہ حضرات زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتے ہیں کہ کسی ہنگامی صورت حال پر کوئی میٹنگ طلب کر لیں۔ پھر قرارداد، میمورنڈم، اخباری بیانات اور زیادہ سے زیادہ وزیر اعظم سے بالمشافہ ملاقات کے ذریعہ انھیں اپنے موقف سے آگاہ کر دیں۔ مگر عوام تو ان حضرات کی طرف بڑی پُرامید نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ وہ ان کی ایک اپیل پر بڑے بڑے اجلاس کے لیے وسائل کا انبار لگا دیتی ہے۔ اسے دین کے نام پر خرچ کرنے کا جو تصور عطا کیا گیا ہے اس کی پوری پاسداری کرتے ہوئے وہ مسجدوں اور مدرسوں کو دل کھول کر چندہ دیتی ہے۔ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں اور قربانی کی کھالیں خوشی خوشی مولویوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ بورڈ کی ایک آواز پر شریعت کے تحفظ کے لیے عامۃ الناس کے غول کے غول سڑکوں پر نکل پڑتے ہیں۔ عام لوگ تو اسی تاثر کے ساتھ جیتے ہیں کہ ایک بیدار مغز، بے لوث اور صالح قیادت ہمارے جملہ امور پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ کاش کہ انھیں پتہ ہوتا کہ عدیم الفرصت مسلم قائدین کے اس کارواں کے پیش نظر مروجہ نظام (status quo) کو برقرار رکھنے کے علاوہ سرے سے کسی منصوبہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔

ایک دن برآمدے میں گرین لیبل کی ارغوانی چائے سے شغل کر رہا تھا کہ میرا پڑوسی عبداللہ افغانی ادھر آ نکلا۔ عبداللہ ارغوانی چائے کا شیدا تھا، اچھے دنوں میں ماسکو میں انجینئرنگ کا طالب علم رہ چکا تھا۔ اب علی گڑھ میں اسی نامکمل تعلیم کی تکمیل میں مصروف تھا۔ ان دنوں شہر کے بعض علاقوں سے ہندو مسلم کشیدگی کی خبریں آ رہی تھیں۔ بات ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر چل نکلی۔ میں نے کہا: بدقسمتی سے ہمارے ہاں کسی متحدہ اور مشترکہ کوشش کا فقدان ہے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی قیادت ہے اور نہ ہی کوئی منصوبہ بندی۔ ہمارا گراف مسلسل نیچے گر رہا ہے۔ یہ سن کر عبداللہ نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بولا: ایسا لگتا ہے تم غلط لوگوں کی صحبت میں پڑ گئے ہو۔ حلقۂ احباب بدلو، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ نیا اخبار لگوا لو۔ پھر خود ہی کہنے لگا کہ جب میں ماسکو میں تھا تو ہمارے روسی احباب کہتے تھے کہ افغانیوں میں بڑا میل جول ہے، اتحاد ہے اور اسی اتحاد کی بدولت انھوں نے روس جیسی عسکری قوت سے ٹکر لے رکھی ہے۔ اِدھر افغانستان سے روز خبریں آتی تھیں کہ کس طرح مجاہدین کے مختلف گروہ اپنے حلقۂ اثر میں دوسرے گروہوں کو دیکھنے کے بالکل روادار نہ تھے۔ ایک یہودی لطیفہ ہے۔ تم بھی سنو بات سمجھ میں آ جائے گی۔ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نے ہا کر سے کہہ کر اپنے ہاں ایک عرب اخبار لگوا لیا۔ جب اس کے یہودی دوستوں کو پتہ چلا تو انھیں سخت حیرت ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کہ تم یہودیوں کا اخبار چھوڑ کر عرب اخبار کے خریدار کیسے بن گئے؟ اس نے بتایا کہ یہودی اخبار پڑھتے پڑھتے میں ڈپریشن کا مریض ہو گیا تھا۔ جب دیکھو یہی خبریں پڑھنے کو ملتیں کہ یہودیوں میں آپس میں اتحاد نہیں۔ اسرائیل کے مستقبل کو خطرہ ہے۔ یہودیوں کی نئی نسل تورات کی تعلیمات سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس عمل کو روکا نہ گیا تو یورپ اور امریکہ میں یہودی اپنی شناخت کھو دیں گے۔ کبھی خبر آتی کہ ملّی اور قومی پروجیکٹ کے لیے یہودی تاجر اور سرمایہ دار اپنا پیسہ خرچ کرنے سے کتراتے ہیں۔ مسلسل مایوس کن خبریں پڑھتے پڑھتے میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اب عرب اخبار پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ریاست اسرائیل کو ٹیکنالوجی اور عسکری ہر دو سطح پر تمام عالمِ عرب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسرائیل کا معیارِ زندگی امیر ترین عرب ملکوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ پر بھی ہمارا قبضہ ہے۔ سب سے زیادہ نوبل پرائز بھی یہودیوں کے حصّے میں آتے ہیں۔ امریکی پالیسی سازوں پر بھی ہمارا زور چلتا ہے، ہماری حمایت کے بغیر کوئی امریکی صدر الیکشن نہیں جیت سکتا۔ گویا ہم یہودیوں نے پوری دُنیا کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ جب سے میں نے عرب اخبار پڑھنا شروع کیا ہے ایک عالمِ ترنگ میں رہتا ہوں۔

عبداللہ قہقہے بکھیر کر چلے گئے مگر میری فکرمندی ان باتوں سے کہاں کم ہونے والی تھی۔ میں نے سوچا یہ جو ہر طرف قیادت کے بحران کا چرچا ہے، قحط الرجال کا شکوہ ہے تو ایسا کیوں نہ ہو۔ ہم قائدین بنا کب

رہے ہیں ہماری ساری توجہ تو متبعین اور مریدین بنانے پر ہے۔ مستقبل کے لیے بیدار مغز اور حوصلہ مند نوجوانوں کی نئی قیادت تو وہ تیار کرسکتا ہے جسے خود قیادت کے اعلی مقام کا شعور ہو، جو اس راہ کی پیچیدگیوں سے واقف ہو۔ یہاں جو لوگ ہماری قیادت پر قابض ہیں ان میں سے بیشتر حضرات یا تو سجادہ نشیں اور پیر قسم کے لوگ ہیں یا مدرسوں اور مساجد کے متولیان جنھیں یہ منصب وراثت میں ملا ہے۔ پیر تو مرید ہی بنائے گا اگر اس نے قائد بنا دیا تو اس کی اگلی نسلیں کیا کریں گی؟

میں نے بہت غور کیا کہ آج جو لوگ قیادت کی کرسیوں پر متمکن ہیں انھیں قائد کس نے بنایا؟ مسلم عوام نے یا حکومت نے؟ عوام کالانعام بے چارے اس پوزیشن میں کہاں! حکومت جس سے بات کرتی ہے، جسے اہمیت دیتی ہے، بالفاظِ دگر جسے قائد کے طور پر پروجیکٹ کرتی ہے وہ اس امت کا قائد بن جاتا ہے۔ حال ہی میں حکومت نے مسلم قیادت میں تبدیلی کا عندیہ دیا تھا جس پر بورڈ کے سکریٹری جنرل مولانا منت اللّٰہ رحمانی کو خاصی تشویش تھی۔ انھوں نے ۲۲ رجنوری ۱۹۸۶ء کے ایک مکتوب میں مجھے لکھا تھا:

'حکومت ہمارے کس بل کو جانتی ہے۔ ہماری صفوں میں انتشار شروع ہو گیا ہے۔ بورڈ کی اصلی طاقت پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کا ایک ہونا تھا، صد حیف کہ اس میں شگاف پڑ گیا۔ ایک جماعت مسلم پرسنل لا کانفرنس کے نام سے قائم ہوئی ہے اور اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کانفرنس سے حکومت کا کیا اور کیسا تعلق ہے غور کرنے کی بات ہے۔ ان حالات میں ہم نے سعی کی تھی کہ دفعہ ۱۲۵ کا معاملہ جلد سے جلد تر طے ہو جائے۔ باتیں ہوئیں، معاملہ ختم ہوا۔ حکومت ہی کی فرمائش پر بورڈ کی طرف سے دفعہ ۱۲۵ کی ترمیم کا مسودہ مرتب کر کے پیش کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۳ دسمبر کا ہے۔ ذمہ داروں نے کہا تھا کہ دو چار روز میں یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن آج ایک ماہ گزر گیا، حکومت خاموش ہے جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اب ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ ساری گفتگو ایک فریب تھی اور ہم نے دھوکہ کھایا۔ ان حالات میں بورڈ کے کام کو اور تیز کرنا ہے، حکومت پر اثر ڈالنے کی کوشش کرنا ہے۔'

گویا یہ بات بڑی حد تک حکومت کی صوابدید پر تھی کہ وہ جسے چاہے اور جب تک چاہے مسلمانوں کا قائد تسلیم کرے اور جب چاہے ایک نئی قیادت کھڑی کر لے۔ ایسی صوررت میں مسلمانوں کا قائد بننا تلوار کی دھار پر چلنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا، ایک طرف حکومت کے لیے قابل قبول ہونا اور دوسری طرف مسلمانوں کا اعتماد برقرار رکھنا۔ یہ یرغمال مسلم قیادت امت کے لیے کیا کرتی اس کے لیے تو اپنا وقار بحال رکھنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

۳۲

رہ نوردِ شوق

نومبر کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ میں قدوائی ہاسٹل میں اپنے کمرے کی بالکنی میں بیٹھا ارغوانی چائے کو ہلکی دھوپ سے دو آتشہ کرنے میں مصروف تھا کہ میرے پاس وائس چانسلر سید حامد صاحب کا ایک قاصد آیا۔ بولا: 'آپ کے لیے ڈی ایس ڈبلیو آفس میں کوئی اہم پیغام ہے آپ فوراً ڈین صاحب سے ملیں'۔ ان دنوں ڈی ایس ڈبلیو آفس میں کسی طالب علم کی طلبی خطرے کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر اس کی پشت پر وائس چانسلر آفس بھی ہو تو سمجھ لیجیے کہ خطرہ بڑا ہے۔ ابھی گذشتہ سال حبیب ہال کے ہنگاموں کے بعد جن طلبا کا ہاسٹل سے اخراج ہوا تھا ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ پتہ نہیں اب کیا معاملہ ہو، میں نے اس اندیشے کے ساتھ ڈی ایس ڈبلیو آفس کا رخ کیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ میری نظر معاون ڈین شمس الدین صاحب پر پڑی۔ بڑی شفقت سے ملے۔ فرمایا: یونیسکو اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے باہمی تعاون سے کراچی میں نوجوان ایڈیٹرس کی ایک بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی ہے۔ وائس چانسلر صاحب کی خواہش ہے آپ اس میں یونیورسٹی کی نمائندگی کریں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کانفرنس میں شرکت کی حامی بھر لی۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کو اپنی شرکت کی آمادگی کا ٹیلیکس بھیج دیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میرے پاس پاسپورٹ نہ تھا اور ان دنوں اس کا حصول کچھ آسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں پاسپورٹ آفس شاستری بھون میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر جو لوگوں کی طویل قطار اور شور و ہنگامے کی کیفیت دیکھی تو دل ڈوبنے لگا۔ پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ جب اپنی باری آئی تو پتہ چلا کہ اول تو پاسپورٹ بننا دو چار دنوں کی بات نہیں، دوم یہ کہ مطلوبہ کاغذات کی فہرست کافی طویل ہے۔ بڑی مشکل سے دوپہر تک پاسپورٹ آفیسر تک رسائی ہو سکی۔ اسے شاید میری پریشاں حالی اور مسکین صورت پر رحم آ گیا۔ اس نے کانفرنس سے متعلق کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھے پھر فکرمندی کے انداز میں کہنے لگا کہ آپ کی کانفرنس میں وقت بہت کم ہے، جب تک مطلوبہ کاغذات نہ ہوں ہم آپ کو پاسپورٹ جاری نہیں کر سکتے۔ میں بھی کہاں آسانی سے ہار ماننے والا تھا۔ میں نے اسے شوقِ سفر کا حوالہ دیا، کانفرنس کی اہمیت بتائی۔ آدمی

بھلا تھا بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ بولا مجھے پتہ ہے پاسپورٹ نہ ملا تو آپ کا یہ سفر مارا جائے گا، ایک اوسر (موقع) آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دیکھیے ایک ترکیب ہے اگر آپ کسی گزیٹڈ آفیسر یا ممبر پارلیمنٹ سے توثیقی خط لے آئیں تو راستہ نکل سکتا ہے۔ ممبر پارلیمنٹ کا ذکر سنتے ہی میرے چشمِ تصور میں ابراہیم سلیمان سیٹھ کے نام کی وہ تختی جھلملانے لگی جو اُردو زبان میں لکھی ہونے کے سبب میری توجہ کا مرکز بنی تھی۔ میں نے پاسپورٹ آفیسر سے فائل لی اور تقریباً بھاگتا ہوا سیٹھ صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچا جو سڑک کے دوسری جانب واقع تھی۔ گھنٹی بجائی، سیٹھ صاحب نے دروازہ کھولا۔ آنے کا سبب دریافت کیا اور بلا تاخیر متعلقہ کالم میں اندراجات لکھ کر مختلف قسم کی مہریں لگا دیں۔ ایک خط الگ سے پاسپورٹ آفیسر کے نام بھی دیا جس میں میری شان میں توصیفی کلمات لکھے تھے۔ آدھ پون گھنٹے بعد جب میں اس خط کے ساتھ پاسپورٹ آفیسر کے پاس پہنچا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ بولا: آپ نے اتنی جلدی یہ سب کیسے کرلیا۔ خیر پانچ بجنے کا انتظار کیجیے آپ کو پاسپورٹ تیار ملے گا۔

توقع تھی کہ کراچی ایئر پورٹ پر کانفرنس کا عملہ استقبال کے لیے موجود ہوگا۔ مگر یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کانفرنس ملتوی ہوگئی ہے اور اس کی اطلاع بذریعہ ٹیلیکس ہماری یونیورسٹی کو بھی ارسال کردی گئی تھی۔ میں چونکہ اپنی تیاری کے سلسلے میں علی گڑھ سے کئی دن پہلے نکل چکا تھا اس لیے بروقت مجھے اس کی اطلاع نہ ہو سکی۔ خیر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کانفرنس نہ سہی سفر تو ہوا، اصل چیز تو سفر ہے جسے اہلِ نظر نے وسیلۂ ظفر بتایا ہے۔ بلکہ اصل ہدف تو سفر ہی ہونا چاہیے ورنہ منزل تو جمود کا علامیہ ہے۔ بقول شاعر

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

ہمارے میزبانوں نے میری دلچسپی کی رعایت سے میرے لیے چار پانچ دنوں کا ایک بھرپور پروگرام ترتیب دے ڈالا جس میں مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کا دورہ، تاریخی مقامات کی سیر، اہلِ دانش سے گفتگو اور کراچی یونیورسٹی میں طلبا و اساتذہ سے اجتماعی ملاقاتیں شامل تھیں۔ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے سربراہ پرانے علیگ نکلے انھوں نے اپنے حلقۂ احباب کی ایک ایسی بزم سجائی جہاں ہر شخص علی گڑھ کے بارے میں باریک بیں تفصیلات کا طالب تھا۔ شمشاد مارکیٹ میں کیا اب بھی طلبا کے جمگھٹے اسی طرح لگتے ہیں، گراموفون پر نغمے اسی طرح بجتے ہیں، کیفے ڈی پھوس کا کیا حال ہے اور اس طرح کے دسیوں سوالات جن سے ایسا لگتا تھا کہ پرانے علیگیوں کی یہ نسل اپنے زمانے کے علی گڑھ کی تلاش میں ہو۔ نوسٹیلجیا کی کیفیت جب ذرا کم ہوئی تو گفتگو سنجیدہ موضوعات کی طرف چل نکلی۔ ایک صاحب جن کا نام غالباً نظامی تھا انھوں نے کچھ سوالات اٹھائے۔ بولے: کیوں بھئی سنا ہے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار دوبارہ بحال ہو گیا ہے۔

اس سے کچھ فائدہ بھی ہوگا یا یہ سب ہوائی باتیں ہیں؟اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کرتا ایک دوسرے صاحب نے فرمایا: ارے بھئی بات قانون کی نہیں، بات تو نیت کی ہے۔ ان کم بختوں کی نیت اگر درست ہوتی تو پاکستان ہی کیوں بنتا؟ میں نے عرض کیا کہ اقلیتی کردار کی بحالی سے اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ مسلمانوں کو نفسیاتی اور جذباتی سطح پر کچھ سہارا ملا ہے۔ قانونی اعتبار سے پارلیمنٹ نے یونیورسٹی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی فلاح و بہبود کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ ایک اعتبار سے حکومت نے مسلم ہندوستان میں علی گڑھ کے روایتی رول کو تسلیم کیا ہے۔

یہ تو بڑی اہم ڈیولپمنٹ ہے، ان کے منہ سے نکلا۔

جی ہاں اور اس سلسلے میں یونیورسٹی نے اقدامی عمل کے طور پر مرکز فروغ تعلیم و ثقافت مسلمانانِ ہند کے نام سے ایک باقاعدہ ادارہ بھی قائم کر دیا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اتنے بڑے کام کے لیے اضافی فنڈ کہاں سے آئے گا۔ اور اس سمت میں عملی پیش رفت بھی تو اسی وقت ہوگی جب یونیورسٹی میں امن و امان بحال رہے۔ جب سے نیا ترمیمی ایکٹ آیا ہے، یونیورسٹی کفر و اسلام کی معرکہ آرائی میں مبتلا ہے۔ یہ معرکہ ٹھنڈا ہو تو کام کی بات سوچی جائے۔ میں نے تفصیلات کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

بولے: کفر و اسلام کی جنگ ابھی بھی وہاں جاری ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی یہ جھگڑے تھے۔ اس زمانے میں کمیونسٹوں کی قیادت تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب صاحب کے ہاتھوں میں تھی اور علی گڑھ کی روایت پسند فکر کی کمان پرووائس چانسلر یوسف حسین خان نے سنبھال رکھی تھی۔ ان دنوں تاریخ کے شعبے میں کچھ متنازع تقرریوں کے خلاف بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔

محمد مجیب جامعہ والے تو ان ہی کے بھائی تھے نا، ایک صاحب نے دریافت کیا۔

بولے: جی ہاں اور اس وقت جن صاحب نے علی گڑھ میں مارکس ازم کا علم بلند کر رکھا ہے وہ حبیب صاحب کے صاحب زادے ہی تو ہیں۔

اچھا! مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ اللہ اللہ صاحب زادگان کا دور شروع ہو گیا ہے۔ وہی ہنگامے، وہی معرکے، وہی اسلام، وہی کفر، علی گڑھ کی بھی عجیب دُنیا ہے۔

ہمارے زمانے میں یاور جنگ وائس چانسلر تھے۔ انھیں نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے میڈیکل کالج میں جہاں انٹرنل طلبا کے لیے پچھتّر فیصد نشستیں محفوظ ہوتی تھیں اسے گھٹا کر پچاس فیصد کر دیا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ اس طرح مسلم طلبا کا تناسب مزید کم ہو جائے گا، مگر وہ نہ مانے۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ دراصل ان کی پشت پر عبدالکریم چھاگلہ کا ہاتھ تھا جو اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے۔

چھاگلہ تو پرانے لیگی تھے، ایک صاحب نے تبصرہ کیا۔

بولے: جی ہاں مگر جب وہ اپنے اصل سیکولر روپ میں سامنے آئے تو بڑے خطرناک ثابت ہوئے۔ انھوں نے یاور جنگ کو اس لیے بھیجا کہ وہ علی گڑھ کو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح اپنے روایتی رنگ و آہنگ سے دور کردیں۔ آپ کو پتہ ہے حیدرآباد پر 'پولیس ایکشن' کے وقت یاور جنگ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اب وہ چھاگلہ کی ایما پر علی گڑھ فتح کرنے کی مہم پر آئے تھے۔ چھاگلہ نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ یونیورسٹی کورٹ کی اہمیت ختم کردی۔ انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ یونیورسٹی حکومت کا قائم کردہ ادارہ ہے جس پر دستور کی دفعہ ۳۰ کا اطلاق نہیں ہوتا جو اقلیتی اداروں کو تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ وہ تو کہیے کہ ڈاکٹر محمود علی گڑھ کی حمایت میں بروقت کھڑے ہوگئے۔ وہ علی گڑھ کے طالب علم بھی تھے اور کانگریسی بھی مگر جب علی گڑھ پر بن آئی تو انھوں نے کانگریس سے وفاداری پر یونیورسٹی کی وفاداری کو ترجیح دی اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا۔ نظامی صاحب! یہ بھی دیکھیے کتنی عجیب بات ہے سید محمود جیسے کانگریسی کو علی گڑھ کو بچانے کے لیے بڑھاپے میں ستیہ گرہ کی کال دینا پڑی۔ انھیں ایسا لگا کہ آزاد ہندوستان میں ایک بار پھر مسلمانوں کو اپنی آزادی کی جنگ لڑنی پڑ رہی ہو۔

مجلس کے خاتمے کے بعد بزرگ علیگیوں کا یہ قافلہ مجھے الوداع کہنے کے لیے میری کار تک آیا۔ ایک صاحب نے فرطِ محبّت میں میرا ہاتھ تھام لیا، کہنے لگے: علی گڑھ ہماری آخری امید ہے، ہماری جمع پونجی ہے اسے سنبھال کر رکھیے گا، اس کے بغیر ہم لوگ یہاں روٹ لیس محسوس کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ الوداع کے لیے ہاتھ بلند ہوئے اور ہماری کار آگے بڑھ گئی۔

۳۳

ت سے تفنگ

ہماری اگلی منزل لاہور تھی جہاں سے چند دن بعد دہلی کے لیے ہماری واپسی کا سفر طے تھا مگر لاہور میں جو کچھ مجھے نظر آیا اس نے دید کی خواہش میں مزید اضافہ کر دیا۔ اپنے بزرگ کرم فرما نعیم صدیقی صاحب سے ملاقات کے لیے جب میں منصورہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کلاشنکوف بردار نوجوانوں کی ٹولیاں جگہ جگہ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ مہمان خانہ ہو یا مسجد، سبزہ زار ہو یا انتظامی دفاتر ہر جگہ ان حضرات کی چلت پھرت سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسلامی تحریک اب مسلح معرکہ آرائی کے مرحلے میں داخل ہوگئی ہو۔ پتہ چلا کہ پشاور سے افغان مجاہدین کا کوئی قافلہ آیا ہے۔ یہ بندوق بردار نوجوان دراصل حفاظتی عملے کا حصہ ہیں۔ افغان جہاد کے بارے میں میری معلومات اخبارات و رسائل کی مرہونِ منت تھیں۔ اب جو اتنی ساری بندوقیں نوجوان ہاتھوں میں دیکھیں اور انھیں جذبۂ جہاد سے سرشار پایا تو ایسا لگا جیسے جہادی عزائم کو رومانویت کے پر لگ گئے ہوں۔ برصغیر میں پھر سے ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور نگاہوں میں جھلملانے لگا۔ اپنی محرومی پر افسوس ہوا۔ خیال آیا میں بھی نہ جانے کس دُنیا میں رہتا ہوں۔ ایک ایسے دور میں جب اسلام کے عالمی غلبہ کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے، میرا اس جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں۔

مہمان خانہ میں کھانے کی میز پر اور کبھی مسجد کے صحن میں جہادی قائدین سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایک دن عشا کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا کہ میری نگاہ اپنے پڑوسی مہمان رمضان مرادوف پر پڑی جو میری ہی طرح دن بھر کی مصروفیت نپٹا کر اپنے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ مرادوف سے میرا پہلے بھی کئی بار آمنا سامنا ہوا تھا لیکن کبھی تفصیلی تعارف کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آج انھوں نے خود پہل کی۔ فرمایا کہ اگر آپ زیادہ تھکے نہ ہوں تو کیوں نہ ساتھ میں چائے پی جائے۔ اب جو گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو پتہ چلا کہ مرادوف چیچنیا کے رہنے والے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے صحافی ہیں۔ عام طور پر اسلام آباد میں قیام رہتا ہے اور جہاد افغانستان ان کی خاص دلچسپی کا موضوع ہے۔ ان کے ہاتھ میں عربی رسالہ الجہاد کا تازہ شمارہ دیکھ کر میں نے پوچھا: آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا واقعی سرخ افواج اب حوصلہ ہار رہی

ہیں؟ بولے: اس میں دو رائے نہیں کہ سوویت یونین میں افغان جنگ کے سلسلہ میں سوچنے کا انداز بدل رہا ہے۔ روسی اس جنگ کو مزید طول دینا نہیں چاہتے۔ اس اعتبار سے اسے مجاہدین کی کامیابی سمجھنا چاہیے، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد کیا ہوگا۔ اصل چیلنج جنگ نہیں بلکہ جنگ کے بعد ملنے والی ممکنہ فتح ہے، جس کے لیے ہمارے پاس کوئی تیاری نہیں۔

'جنگ کے بعد؟ کیا مطلب؟ اس کے بعد تو ایک آزاد اسلامی ریاست ہوگی جہاں مجاہدین أمرھم شوریٰ بینھم کے مطابق اجتماعی زندگی کا نقشہ ترتیب دیں گے۔'

بولے: تمھاری باتوں میں بڑی معصومیت ہے۔ کاش کہ عملی زندگی بھی اتنی ہی سادہ ہوتی۔

میں نے کہا: بہت سے لوگ مجاہدین کی باہمی رزم آرائیوں کے سبب مستقبل کے افغانستان میں باہمی خانہ جنگی کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ یہ ایک قنوطی طرزِ فکر ہے ہمیں اس سے نکلنا چاہیے۔

بولے: میں اس خطرے کی بات نہیں کرتا، میرا درد کچھ اور ہے۔ ہم لوگوں نے جہاد افغانستان کو خالص اسلامی جہاد باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اسے فرضِ عین قرار دیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ پوری امت پر یہ جہاد فرض ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مختلف ملکوں سے شوقِ شہادت سے سرشار نوجوانوں کی کھیپ کی کھیپ اس جہاد میں شرکت کے لیے آرہی ہے۔ انھیں تو یہی لگتا ہے کہ افغانستان اس دور کا مدینہ ہے۔ جہاد کے خاتمہ کے بعد جب امریکہ اپنی پشت پناہی ختم کر دے گا تو اسلامی اخوت پر مبنی اس نظریۂ جہاد کا کیا ہوگا۔ پھر اس جہاد کو فرض عین سمجھنے والے لوگ کدھر جائیں گے؟

'آپ مستقبل کے اندیشوں سے کیوں پریشان ہیں۔ کیا عجب کہ آزاد افغانستان بین الاقوامی سطح پر نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز بن جائے۔'

بولے: آپ کی باتوں میں معصوم آرزو کا غلبہ ہے، جوش وخروش ہے، حقیقت پسندی کا آمیزہ ذرا کم کم ہے۔ اس بات کو ذرا اس طرح سمجھیے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے الجہاد میگزین کے صفحات اُلٹے۔ **عشاق الحور** کے ایک کالم کی طرف اشارہ کیا، بولے: دیکھیے کسی مجاہد کی داستان ہے جس کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ اس جنگ میں مجاہدین پر خدا کی خاص عنایات کی بارش ہو رہی ہے۔ شہیدوں کی لاشوں سے کستوری اور مشک وعنبر کی مہک آتی ہے۔ ان خوشبوؤں کے سبب دور سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں قریب ہی کسی شہید کا لاشہ پڑا ہے۔ بمبار طیارے جب بمباری کے لیے آتے ہیں تو چڑیوں کا ایک جھنڈ مثلِ سحاب ان کے نیچے کچھ اس طرح آجاتا ہے کہ انھیں اپنا ٹارگیٹ دکھائی نہیں دیتا۔ بسا اوقات یہ چرند و پرند اپنی غیر مرئی قوت کے سبب ان بموں کو اوپر ہی فضا میں روک لیتے ہیں۔ لوگوں نے ان جنگوں میں باقاعدہ فرشتوں کو

آسمانوں سے اترتے ہوئے دیکھا ہے جو مجاہدین کے دوش بدوش گھوڑوں پر سوار دشمنوں سے لڑتے ہیں۔ان صاحب کی ایک کتاب بھی ہے، یہ اس رسالہ کے مدیر بھی ہیں۔شاید آپ ان کے نام سے واقف ہوں، ان کا نام عبداللہ عزام ہے۔آپ وہ کتاب ضرور دیکھیے جو انھوں نے جہاد میں پیش آنے والے معجزات و کرامات پر لکھی ہے۔ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں جو انھوں نے مختلف راویوں کی زبانی اپنی کتاب میں جمع کر دی ہیں۔ ایک شہید کے بارے میں لکھا ہے جس کا نام، جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، غالباً ابن جنت تھا۔کئی دن بعد اس کی لاش قبر سے نکالی گئی تا کہ اسے آبائی قبرستان میں منتقل کیا جا سکے۔ کہتے ہیں کہ نوجوان کے والد نے شہید کی لاش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بیٹے! اگر تو واقعی خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے تو مجھے کوئی ایسی نشانی دکھا جس سے تیری شہادت کے مقبول ہو جانے پر مجھے یقین ہو جائے۔ یہ سننا تھا کہ شہید کے لاشہ میں حرکت ہوئی، اس نے اپنے والد کو سلام کیا، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کوئی پندرہ منٹ تک اپنے باپ کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لیے رہا۔راوی کہتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اس طرح کی باتوں سے جہاد افغانستان کا درجۂ حرارت تو بلند ہو گیا، لیکن ہم نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح ہم نے اپنے نظریۂ شہادت کی بنیادیں ہلا دیں۔

اچھا! مجھے یہ اندازہ نہ تھا۔اس قسم کی باتیں بھی جوشِ جہاد میں ثقہ علما نے لکھ رکھی ہیں۔عبداللہ عزام تو، میرے خیال میں، سلفی جہادی اخوانی خیمے کے آدمی ہیں۔ان کے ہاں تو اس قسم کی کرامتوں پر زور نہ ہونا چاہیے، میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: یہ تو بس ایک مثال ہے ورنہ ان کی تحریروں اور تقریروں کو سن کر تو ایسا لگتا ہے کہ ملائے اعلیٰ میں بھی اس وقت افغانستان کا مسئلہ سرِ فہرست ہے اور خدا ہر قیمت پر مجاہدین کو فتح و کامرانی عطا کر دینا چاہتا ہے۔ انھوں نے مختلف راویوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی مجاہدین کے جسموں پر لگی، مگر بے اثر۔ ٹینک انھیں روند گیا مگر ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔تین تین سو نیپام بم ان کی صفوں پر گرائے گئے لیکن کیا مجال کہ ایک بھی پھٹا ہو۔ایک شہید کے بارے میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے مرنے کے بعد بھی کلاشنکوف کے دستہ پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔لوگوں نے بہت کوشش کی مگر شہید کے ہاتھ سے اسلحہ نہ نکال پائے۔ پھر جب اس کے والد نے اس سے کہا کہ یہ اسلحہ تمھارا نہیں بلکہ مجاہدین کی ملکیت ہے تو شہید نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ایک شہید کی لاش سے دور آسمانوں میں روشنی کی ایک لکیر جاتی ہوئی دیکھی گئی۔اور اس طرح کے دسیوں واقعات جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ افغان جہاد ایک آسمانی منصوبہ ہے جس کو خدا کی خاص نصرت و تائید حاصل ہے۔کل جب حقائق کی دُنیا میں مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے تو نہ صرف یہ کہ

جہاد اور اس کے طریقۂ کار کے سلسلے میں بددلی پیدا ہوگی بلکہ خدا سے ہمارا اعتبار ہی اٹھ جائے گا۔

مگر یہ تو ایک شخص کا ذاتی رویہ ہے، اسے آپ پورے جہاد پر کیسے منطبق کر سکتے ہیں۔ میں نے عبداللہ عزام کے نظری حصار سے جہادِ افغانستان کو آزاد کرانے کی اپنی سی ناکام کوشش کی۔

بولے: عزام محض ایک شخص نہیں اور نہ ہی کسی انجمن یا مدرسۂ فکر کا نام ہے۔ جہاد افغانستان کے تناظر میں ان کی حیثیت بابائے جہاد کی ہے۔ نظری طور پر وہ تمام مجاہدین کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ افغان جہاد کو عالمی اسلامی پروجیکٹ بنانے میں ان کا بنیادی رول ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی میز سے ایک کتاب اٹھائی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ ہے وہ کتاب جسے اس جہاد کی نظری بائبل کی حیثیت حاصل ہے۔

میں نے کتاب کے سرورق پر ایک نگاہ ڈالی، یہ دراصل ایک عربی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اصل کتاب کا نام کچھ اس طرح لکھا تھا: **الدفاع عن أراضی المسلمین أهم فروض الأعیان**۔ ۱۳۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۹۷ صفحات پر مشتمل ایک فتویٰ شامل تھا جس میں یہ باور کرایا گیا تھا کہ سلف سے خلف تک تمام فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب دارالاسلام کے ایک انچ پر بھی دشمن قابض ہوجائے تو تمام مسلمان مرد و عورت پر جہاد ایک فرض عین بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بیٹے کے لیے باپ کی اور بیوی کے لیے شوہر کے اجازت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ عزام کے اس فتویٰ پر وقت کے کبار علما نے اپنے تائید کی مہر ثبت کر رکھی تھی۔ سعودی عرب کے شیخ ابن باز اور شیخ عثیمین سے لے کر مصر کے شیخ منیع، یمن کے شیخ عمر سیف اور دسیوں علما کی تائید اس فتویٰ کو حاصل تھی۔

میں نے عبداللہ عزام کا نام تو بارہا سنا تھا لیکن جہاد کے نظری منظرنامے میں مجھے ان کی اس کلیدی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ میں نے کہا: جب وقت کے تمام ہی کبار علما اس جہاد کو فرض عین قرار دینے پر متفق ہیں تو کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہم ایک خدائی اسکیم کے تحت آگے بڑھ رہے ہیں۔ افغانستان مستقبل میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ شاید خدا کو ہمارے ہاتھوں کوئی بڑی تبدیلی لانا مقصود ہے۔

بولے: کاش کہ آپ کی بات صحیح ہوتی۔ ہماری صفوں کا یہ اتحاد، میدان جہاد سے آنے والی معجزات و کرامات کی کہانیاں اور سب سے بڑھ کر جہاد جیسے فریضہ کو بین الاقوامی سطح پر منظم کرنا، ان سب کے پیچھے رضائے الٰہی سے کہیں زیادہ تائید امریکی کارفرما ہے۔

'مگر امریکیوں کی تو یہ مجبوری ہے اور کیا پتہ یہ بھی اسی خدائی منصوبہ کا حصہ ہو'

میری اس بات پر مرادوف مسکرائے۔ بولے: اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ ایک اسٹریٹیجک پارٹنرشپ کا

معاملہ ہے۔ اگر صرف اس قدر سمجھا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ امریکہ نے اپنے دشمن کا زور توڑنے کے لیے ہماری مدد کی ہے اور ہم اس صورت حال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب ہم اس جنگ کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھتے ہیں۔ دیکھیے معجزات و کرامات کے بیان سے وقتی طور پر تو جوش و خروش میں اضافہ ہوسکتا ہے، لیکن ان خوش گمانیوں سے ہماری فکری الٰہیات کی جڑیں ہل جاتی ہیں۔ آج ہم نے فرض کفایہ کو فرض عین بنا دیا۔ فلسطین اور افغانستان کو جہاد کی سرزمین قرار دیا اور اس سبب کہ افغانستان میں مجاہدین کی صف بندی کے لیے ایک کھلی فضا اور بین الاقوامی حمایت حاصل ہے، ہم نے افغان جنگ کو فلسطین پر مقدم کر دیا۔ لیکن کل جب جنگ ختم ہوگی امریکی ہماری پشت پناہی سے منہ موڑ لیں گے تو ہمارے لیے اس جنگ کو فرضِ عین کہنا اور اس پر جمے رہنا مشکل ہوجائے گا۔ جنگی اسٹریٹجی تو بدلتی رہتی ہے۔ آج امریکی ہمارے ساتھ ہیں، عجب نہیں کل کوئی اور اپنی مصلحتوں کے تحت ہمارے ساتھ آ کھڑا ہو، لیکن نظری پوزیشن تو روز روز نہیں بدلی جاسکتی۔ آج کا فرضِ عین امریکی سرپرستی ہٹ جانے کے بعد فرض کفایہ نہیں بن سکتا۔ اگر ہم نے ان باتوں کو نہیں سمجھا تو جنگ کے بعد جب دُنیا بھر میں جہاد کی تبلیغ کے لیے کھلی چھوٹ نہ ہوگی اور جب آج کی طرح امریکہ اور یورپ کے شہروں میں جہاد افغانستان کی حمایت میں آپ کو تقریروں کی اجازت نہ ہوگی، اس وقت آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ امریکی سرپرستی کے غیاب نے پوری دُنیا کی اسلامی تحریک پر مایوسی اور محرومی کی طناب کھینچ دی ہے۔

رات خاصی ہوچکی تھی۔ میں نے استاذ رمضان مُرادوف سے اجازت لی۔ میں نے سوچا مرادوف بے جا وساوس کا شکار ہیں۔ جن لوگوں نے محض اپنے جذبۂ شہادت کے بل بوتے پر سرخ افواج کو پسپائی پر مجبور کیا ہے کل وہ امریکی پشت پناہی کے غیاب میں بھی مسئلہ کا کوئی حل ضرور نکال لیں گے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ جو امریکہ ایران میں اسلامی تحریک کے درپے ہے، جو ایرانی ملاؤں کے نزدیک شیطانِ بزرگ کی حیثیت رکھتا ہے وہی امریکہ افغانستان میں اسلامی جہاد کا حامی و ناصر اور پشت پناہ کیوں بن گیا ہے؟ کیا واقعی مرادوف کی باتوں میں صداقت ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری گردنیں خطے میں امریکی مفادات اور عالمی سطح پر امریکی تفوق کو برقرار رکھنے میں استعمال ہورہی ہیں۔ خیال آیا شنیدن کے بود مانند دیدن، کیوں نہ خود اپنی آنکھوں سے حقائق کا مشاہدہ کیا جائے۔ سنا ہے کہ پشاور میں درۂ خیبر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر میلوں میل افغان مہاجرین کے کیمپ آباد ہیں، جن میں مجاہدین کی تربیت گاہیں بھی ہیں اور ان کے دفاتر بھی۔ بین الاقوامی پریس کے نمائندوں نے بھی اِن دنوں اسی شہر میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اور دُنیا بھر سے آنے والے بیرونی مجاہدین کے استقبال کے لیے بھی اسی شہر میں دفاتر اور مہمان خانوں کے دروازے کھلے

ہیں، سو کیوں نہ پشاور کو کوچ کیا جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کل صبح مجھے بالاکوٹ کے تحقیقی اور علمی سفر پر نکلنا تھا جس کے انتظامات محب مکرم نعیم صدیقی صاحب کی خاص عنایتوں سے پہلے ہی طے پا گئے تھے۔

ایک دن میں نے نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں مولانا مودودی کے دو خطوط پیش کیے۔ مولانا مودودی نے بڑے ابّا (حسنین سیّد) کے نام اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھا تھا کہ ہم لوگ چھبیس سال سے پاکستان کو دارالاسلام بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے ایسا لگتا ہے کہ اب اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آپ کچھ دن رک کر تشریف لائیں تا کہ ہم پوری شان کے ساتھ دارالاسلام میں آپ کا استقبال کر سکیں۔ خط پڑھ کر نعیم صاحب نے فرمایا: ہاں مولانا پر امید کا ایک ایسا دور بھی گذرا ہے۔ بات برصغیر میں اسلامی تحریک کی تاریخ پر چل نکلی۔ بالاکوٹ کے شہدا کا ذکر بھی آیا۔ غالباً انھوں نے میرے اشتیاق کو بھانپ لیا۔ میز سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس پر یہ تحریر لکھی:

’برادرم عبدالہادی صاحب! انڈیا سے عزیز راشد شاز آئے ہیں، یہ بالاکوٹ جانا چاہتے ہیں۔ انھیں راستے اور موسم کی رہنمائی دیجیے‘۔

یہ رقعہ گویا بالاکوٹ کے سفری انتظام کی رسید تھا۔ جب میں بالاکوٹ پہنچا تو پتہ چلا کہ یہاں پہلے سے ہی میری آمد کی ہلچل ہے۔ سردی زوروں پر تھی۔ یخ بستہ ہوائیں ایسا لگتا جسم میں سرایت کر رہی ہوں۔ مغرب سے کچھ پہلے ہماری کار جامع مسجد پہنچی جس سے متصل ایک دریا بہتا تھا اور جس کے کنارے گرم پانی کے چشمہ سے لوگ وضو کر رہے تھے۔ مغرب کی نماز میں میری آمد کا اعلان ہوا کہ ایک نوجوان محقق اور اسی راہِ عزیمت کے ایک مسافر ہمارے درمیان آج موجود ہیں۔ میرے لیے اچانک اتنے بڑے مجمع کو خطاب کرنا ایک بڑا امتحان تھا جو بفضل الٰہی بخوبی اپنے انجام کو پہنچا۔ دوسرے دن آثار و شواہد کی زیارت کرتے ہوئے جب میں سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کی قبروں تک پہنچا تو ان کی سادہ اور ویران قبروں پر منت کے دھاگے اور دعاؤں کے رنگ برنگے جھنڈے دیکھ کر مولوی کفر توڑ بہت یاد آئے جو سیّد صاحب کے قریبی رفقا میں تھے اور جو بعد تک زندہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں شرک و بدعت مٹانے کی اتنی جلدی ہوتی کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی امام باڑہ، تعزیہ رکھنے کا چوکہ یا قبر و درخت پر منّت کے دھاگے اور دعاؤں کے جھنڈے دیکھتے تو اس پر اپنے عصا کی آہنی انی سے پل پڑتے اور اسے نیست و نابود کر کے ہی دم لیتے۔ ان کے اسی جذبۂ استیصالِ شرک و بدعت کے سبب ان کا نام مولوی کفر توڑ پڑ گیا تھا۔

اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود تحریک مجاہدین باہمی رزم آرائیوں اور غیر حقیقی اہداف میں الجھ کر رہ گئی۔ میں نے جب اس سفر کے بارے میں اپنا تنقیدی تاثر مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں زبانی

پیش کیا تو انھوں نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ باندازِ تادیب فرمایا کہ صرف اسلامی تحریکوں کا انسائیکلو پیڈیا بننے سے کام نہیں چلے گا، آپ کو عملی میدان کے لیے بھی تیاری کرنی چاہیے۔ اس زمانے میں تحریک مجاہدین کی ناکامی کے اسباب پر میں نے کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی تھی:

'...(ایک) سبب جو بہت واضح ہے اور جس کا اندازہ یقیناً اس تحریک کے کارکنوں کو بھی رہا ہوگا وہ غلبۂ اسلام کے سلسلے میں حقیقی دشمن کے تعین کی غلطی سے متعلق ہے۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف اور خود شاہ اسمٰعیل کی کتابوں میں کثرت سے اس حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ نظامِ اسلامی کے قیام میں اصل روڑا انگریز تھے جو اپنی قوت و سیادت سے بڑی تیزی سے ہندوستان پر چھاتے جا رہے تھے۔ سید صاحب کے عہد میں ہی دلی انگریزوں کی پنشن خوار ہو چکی تھی، مسلمانوں کے سیاسی زوال کی کسک ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔...... سید صاحب اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ فیصلہ کن لڑائی انگریزوں سے ہونی ہے اور اسی لیے وہ مدینۃ الاسلام کی تلاش میں سرحد تک گئے بھی تھے، لیکن اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اتنی بڑی قوت سے مقابلے کے لیے ان کی تیاری بہت تھوڑی تھی۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کم ہی کی گئی کہ یہ تہذیب جو مانندِ طوفان بڑھتی چلی آتی ہے اس کی اساس کن بنیادوں پر ہے اور اس کی جڑوں پر ضرب کیسے لگائی جاسکتی ہے؟ ------ یہ اللہ والوں کی سنت ہرگز نہیں ہے کہ دشمن تو ہر طرح کے جدید آلات حرب سے لیس ہو، جدید قسم کے میزائیل، لڑاکا طیارے اور خطرناک بموں کے ساتھ میدان جنگ میں آ گیا ہو اور ہم جوشِ ایمانی میں محض مچھر دانی کے ڈنڈوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔'

(محولہ غلبۂ اسلام، ص ص ۳۱، ۳۲، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء)

ان دنوں ہر پل ایسا لگتا تھا جیسے عالمِ اسلام میں ایک نئی صبح کی آمد آمد ہو۔ ایران میں شیطانِ بزرگ امریکہ کو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ اِدھر افغانستان میں مجاہدین نے سرخ افواج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان دنوں میں نے 'اسلامی انقلاب کا دستور العمل' کے نام سے تین سو صفحات پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بھی لکھی تھی، جس میں جمہوری طریقۂ کار سے لے کر فوجی بغاوت تک کے تمام مروّجہ اور معروف نسخوں کو بروئے کار لانے کی وکالت کی گئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت مشفق ومکرم محمد صلاح الدین، مدیر 'تکبیر انٹرنیشنل'، کراچی کے ہاتھوں انجام پانی تھی۔ افسوس کہ ان کے دفتر پر حملے اور آتش زنی کے واقعات نے اس اسکیم پر پانی پھیر دیا اور چند سالوں بعد خود انھیں بھی جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

***

اپنے دل و دماغ میں صبحِ انقلاب کی ایک رومانوی تعبیر سجائے میں پشاور پہنچا جسے اس وقت عالمی جہاد کے epicentre کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا مجاہدین کے ایک کیمپ میں ہوا جو شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ جگہ جگہ چیک پوسٹ پر نوجوان پہرہ دے رہے تھے۔ عصر کی نماز ایک عارضی عمارت کی زیریں منزل میں ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ عمارت یا تو زیر تعمیر تھی یا پھر کیمپ کے لیے اسی قسم کی عارضی اور نامکمل عمارت بنانے کا رواج تھا۔ تہہ خانے میں ٹھنڈک شدید تھی۔ نماز کے لیے مسلح مجاہدین نے جب اپنے اپنے اسلحے کھول کر اپنے سامنے فرش پر رکھ دیئے تو ایسا لگا کہ

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سایے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

ان دنوں یوسف اسلام کا نغمہ Afghanistan is Islam خاصا مقبول ہو رہا تھا۔ وہ Cat Stevens سے نئے نئے یوسف اسلام بنے تھے۔ مغرب کے ایک مشہور مغنّی کا اسلام قبول کرنا ہی کیا کم بڑی بات تھی، اب جو انھوں نے اسلام کو سراپا افغانستان بتایا تو ایسا لگا کہ جہاد افغانستان کے بغیر اسلام کی ہر تعبیر بے معنی ہے۔ شرق سے غرب تک جہادِ افغانستان کے سلسلے میں ایک غلغلے کی کیفیت تھی۔ ایک ایسا رومان انگیز غلغلہ جس میں عقلی تحلیل و تجزیے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

ان کیمپوں کا دورہ کرتے ہوئے میری نگاہ ان معصوم بھولے بھالے بچوں پر پڑی جو اپنے لٹے پٹے خاندان کے ساتھ یہاں مقیم تھے اور جو اب مہاجر اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا خاندان جنگ کی آگ سے محفوظ رہا ہو۔ اکثر بچے یتیم اور عورتیں بیوہ تھیں۔ ان کے اردگرد دُنیا کس طرح بدل گئی تھی اس کا اندازہ اس نئے قاعدہ سے ہوتا تھا جو حروف شناسی کے لیے یہاں انھیں ان کیمپوں میں پڑھایا جا رہا تھا۔ الف سے اللہ، اللہ ایک ہے۔ ب سے بابا، بابا مسجد جاتے ہیں۔ پ سے پنج یعنی پانچ، اسلام کے پانچ ستون ہیں۔ ت سے تفنگ یعنی رائفل، جواد نے مجاہدین کے لیے رائفل خریدی ہے۔ ج سے جہاد، جہاد فرض ہے، بابا جہاد کو گئے ہیں۔ د سے دین، ہمارا دین اسلام ہے۔ ریاضی کی کتابوں میں بھی جمع تفریق سکھانے کے لیے اسلحوں کی تصویروں کا سہارا لیا گیا تھا۔ طالب علم کو یہ سوال حل کرنا تھا کہ اگر دس روسی کافروں میں سے پانچ مارے گئے تو باقی کتنے بچے؟ اس وقت تو کسی نے اس طریقۂ تعلیم کے نفسیاتی پہلو پر توجہ نہ دی کہ ہم جوشِ جہاد میں سرشار تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کتابیں بھی امریکہ سے مرتب ہو کر آئی تھیں۔ امریکی سینیٹر چارلی وِلسن کے حوالے سے بعد میں یہ بات بھی پتا چلی کہ امریکی جنگِ ویتنام کا بدلہ افغانستان میں لینا چاہتے تھے۔ جب پچیس ہزار روسی فوجی فنا کے گھاٹ اتر گئے تو وِلسن

نے کہا تھا کہ جنگ ویتنام میں اٹھاون ہزار امریکی فوجی مارے گئے تھے۔ ابھی تو تینتیس ہزار کا حساب باقی ہے۔ وہ افغانستان کے آخری شہری تک روس سے لڑنا چاہتے تھے: (to fight the Russians to the last Afghan)۔ وہ تو کہیے کہ روس دوملین افغانیوں کی جان لے کر ہی واپس چلا گیا ورنہ امریکہ تو آخری افغانی مسلمان تک جہاد جاری رکھنا چاہتا تھا۔

ان کیمپوں سے گذرتے ہوئے یتیم معصوم بچوں کے چہروں پر خوف و یاس کی جو کیفیت دکھائی دی اس نے پہلی بار مجھے نغمۂ جہاد کے پیچھے چھپی درد و کرب کی دُنیا سے آگاہ کیا۔ تاحدنظر محروموں کی یہ بستیاں جنھیں دیکھ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا، بھلا سرحد کے اس پار کیا صورتِ حال رہی ہوگی جہاں اس وقت بھی بموں کی برسات جاری تھی۔ بستیوں کی بستیاں قبرستان بن گئیں، شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے، بے شمار کھاتے پیتے خاندان مہاجر اور خانہ بدوش بننے پر مجبور ہوئے۔ دس لاکھ تو اس وقت تک جنگ میں کام آچکے تھے لیکن جو لوگ ہمیشہ ہمیش کے لیے معذور ہو گئے، جو عورتیں بیوہ ہوئیں اور جو بچے یتیم ہوئے ان کی صحیح تعداد کسے معلوم۔ یہ کہیے کہ پورا ایک ملک تباہ ہو گیا اور ہم ان سب کے باوجود امریکی نصاب کے مطابق اپنے بچوں کو ت سے تفنگ اور ج سے جہاد پڑھا رہے تھے۔

اگلی صبح حزب اسلامی کے امیر گلبدین حکمت یار سے ملاقات کے لیے مخصوص تھی۔ فجر سے ذرا پہلے ہمارے میزبان نے جگایا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ شہر کے مضافات میں واقع ایک بڑے کمپاؤنڈ میں پہنچے جہاں اس وقت چند کلاشنکوف بردار سکیورٹی کے نوجوانوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ مجھے ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھایا گیا جہاں میز پر دُنیا بھر کے اخبارات و رسائل قدرے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ میری نظر نیشنل جیوگرافک میگزین کے سرورق پر پڑی جس پر ان دنوں ایک افغان مہاجر بچی شربت گلہ کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کا خوف سمٹ آیا تھا۔ آگے چل کر یہ تصویر افغان مہاجرین کی بے بسی اور حرماں نصیبی کے علامیے کے طور پر مشہور ہوئی۔ ابھی میں میگزین کے صفحات کو اُلٹ پلٹ ہی رہا تھا کہ پرسکون اور ویران کمپاؤنڈ میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا ہوئی۔ یکے بعد دیگرے سنہرے رنگ کی تین یکساں دیو ہیکل گاڑیاں کمپاؤنڈ میں داخل ہوئیں۔ اندر سے سکیورٹی کے مسلح نوجوان برآمد ہوئے اور انھوں نے کمپاؤنڈ کے مختلف حصوں پر اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ پھر کچھ نوجوانوں نے گاڑیوں سے ملاقاتیوں کے کمرے تک دورویہ حصار بنا لیا۔ اسی دوران پچھلی گاڑی سے حکمت یار برآمد ہوئے۔ آج ان کے سبز عمامہ پر سنہری دھاریاں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا انھوں نے جہادِ افغانستان کے خالصتاً اسلامی جہاد ہونے اور اس معرکہ میں حزب اسلامی کے

بنیادی رول کی وضاحت کردی۔ مستقبل کے سلسلے میں وہ خاصے پُرامید نظر آئے۔ افغان دھڑوں کی باہمی چپقلش کے سلسلے میں انھوں نے میرے اندیشوں کو باطل قرار دیا۔ شاید وہ جنگ کے ان فیصلہ کن مراحل میں ان حساس موضوعات پر گفتگو قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر کی اس گفتگو میں میں نے حکمت یار کو ایک اچھا مدبر اور کریم النفس انسان پایا۔ انھیں اس بات کا احساس تو ضرور تھا کہ امریکی اور دوسری مغربی طاقتیں جہاد میں ان کی پشت پناہی کررہی ہیں، لیکن وہ اس بات سے غافل بھی نہیں تھے کہ امریکی ایجنڈا ان کے اپنے افغانی اسلامی ایجنڈے سے مغائر ہے۔

ناصر باغ، جہاں نیلی آنکھوں والی لڑکی رہتی تھی، اس کیمپ کی بھی، ان دنوں کچھ اور ہی شان تھی۔ دُنیا بھر کے عمائدین، کیا شرق اور کیا غرب، وہاں اپنی حاضری کو خوش بختی جانتے۔ کبھی برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر افغانیوں کو یہ یقین دہانی کرانے آتیں کہ ’ آزاد دُنیا کے دل آپ کے ساتھ ہیں‘ اور یہ سن کر فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ کبھی امریکی صدر رونالڈ ریگن، وزیر خارجہ جورج شلٹز اور وزیر دفاع اپنی برجر کی آمد پر ہمارے جوشِ جہاد میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا۔ کبھی نائب صدر بش کی زبان سے مجاہدین کے حق میں کلمۂ خیر سن کر ہم پھولے نہیں سماتے۔ اس کیمپ میں کبھی جاپانی وزیراعظم کی آمد ہوتی تو کبھی ترک وزیراعظم ترگت اوزال اور سعودی فرمانروا شاہ خالد، مجاہدین کی ہمت افزائی کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لے آتے۔ اللہ اللہ کیا دن تھے جب ہمارے جہاد کے صفِ اوّل کے قائدین کارٹر، ریگن، تھیچر اور بش ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ائمہ جمعے کے خطبوں میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ **اللّٰھم دمر دیارھم و شتت شملھم و فرق جمعھم** کی بددعائیں کرتے ہوئے **والروس والصین وسائرہ دھریین** کی سراحت بھی ضروری سمجھتے۔ کسے پتہ تھا کہ آنے والے دنوں میں مغرب کے یہی جہادی کمانڈر جو آج مجاہدین کے ساتھ تصویریں کھنچوانا باعث توقیر جانتے ہیں، ہماری پشت پناہی سے اس طرح ہاتھ کھینچ لیں گے کہ ہمارا جہاد، دہشت گردی اور ہمارا شوقِ شہادت، ناقابلِ معافی جرم قرار پائے گا۔

۳۴

بیگوا چوربہ

پشاور کے اس سفر پر کوئی دس سال گزرے ہوں گے۔ بوسنیا میں جنگ بند ہو چکی تھی۔ ڈائٹن معاہدے کے بعد حالات معمول پر آ رہے تھے۔ میں ایک امن کانفرنس میں شرکت کے بعد زغرب کے اسلامی مرکز میں مقیم تھا جہاں میری ملاقات ایک عرب نژاد سابق مجاہد عبدالرحمٰن سے ہوئی۔ روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، سیاہ گھنگھریالے بال، عمر یہی کوئی تیس پینتیس کے لپیٹ میں ہوگی۔ مرکز کے بیرونی حصے میں ایک چھوٹا سا بازار لگا تھا جہاں بوسنیائی عورتیں کھانے پینے کی چیزیں فروخت کر رہی تھیں۔ میری نگاہ خشک گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر اٹک کر رہ گئی۔ خیال ہوا کل شام کے کھانے میں بیگووا چوربہ (بے کا شوربہ) میں شاید اسی گوشت کے چھوٹے چھوٹے قتلوں کی آمیزش رہی ہوگی۔ اور کیا عجب کہ وہ کوفتے جو بلقان کے علاقوں میں آ کر چوفٹے بن گئے ہیں ان کی بنا میں بھی یہی خشک گوشت استعمال ہوتا ہو۔ میری دلچسپی دیکھ کر ایک عرب نوجوان میری رہنمائی کے لیے سامنے آئے۔ پتہ چلا کہ یہ دراصل smoked meat ہے جسے ایک خاص درجۂ حرارت پر کچھ اس طرح پکایا جاتا ہے کہ یہ بہت دنوں تک استعمال کے قابل رہ سکے۔ بات جب آگے بڑھی تو پتہ چلا کہ بوسنیائی مہاجرین کا یہ قافلہ اب سرائیو کی طرف لوٹنے کو ہے۔ ابتداً تو مجھے عبدالرحمٰن پر بوسنیائی مسلمان ہونے کا گمان ہوا کہ ان کا رنگ عام عربوں کے مقابلے میں کہیں صاف تھا لیکن جب گفتگو آگے بڑھی تو ان کے انگریزی تلفظ سے عربیت جھلکنے لگی۔ پتہ چلا کہ وہ شامی سعودی ہیں جو کوئی بارہ سال پہلے جہادِ افغانستان میں شرکت کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ جہاد نے ان کی زندگی کا رخ کچھ اس طرح بدلا کہ ان کے لیے دوبارہ وطن واپسی اور معمول کی زندگی جینے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔

میں نے پوچھا: تمھارا نام عبدالرحمٰن الدوسری تو نہیں؟ یہ سن کر ان کے چہرے پر ایک چمک آئی۔ مسکرائے، بولے: تم دوسری کو کیسے جانتے ہو؟

ان کے بارے میں ذرائع ابلاغ میں کچھ باتیں آتی رہی ہیں۔

بولے: ہاں وہ میرے دوستوں میں ہیں۔ ہم لوگ افغانستان میں ساتھ رہے، پھر جب حالات

بدلے تو ادھر نکل آئے۔

اب آگے کیا پروگرام ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: اب تو بقا کی جنگ ہے۔ Survival کا مسئلہ ہے۔ خود بوسنیا کی سرزمین اب ہمارے لیے تنگ ہوگئی ہے۔ تم نے ڈائٹن معاہدے کا ذکر تو سنا ہوگا۔ جنگ بندی کی اہم شرطوں میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ بیرونی مجاہدین بوسنیا کی سرزمین سے نکال دیئے جائیں گے۔

'پھر آپ اب تک کس طرح ٹکے ہوئے ہیں؟'

بولے: ایک مختصر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے مقامی عورتوں سے شادی کر لی، وہ مغربی جاسوسی ایجنسیوں کے راڈار پر بھی نہیں آئے اور ذرائع ابلاغ بھی ان سے ناواقف ہے۔ اب وہی لوگ یہاں رہ گئے ہیں۔ اس میں بھی دو چار ایسے ہیں جنھیں مغربی میڈیا نے خطرناک دہشت گرد کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ بیچارے اپنے قیام کی قانونی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایک تو یہی ہمارے دوست الدوسری ہیں جنھیں ابوعبدالعزیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک اور صاحب ہیں ابوحمزہ جن کا تعلق شام سے ہے۔ انھیں مغربی میڈیا نے ابوحمزہ المصری کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابوحمزہ کا سخت گیر امیج بیٹھے بٹھائے ابوحمزہ السوری کے سر منڈھ گیا ہے۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد میں نے محسوس کیا کہ عبدالرحمٰن کی روشن مسکراتی آنکھوں میں سنجیدگی اتر آئی ہے۔ خاص طور پر جب انھیں یہ پتہ چلا کہ میں دو ڈھائی سال پہلے بھی زغرب کے اس مرکز میں آیا ہوں تب ایک جنگ مخالف انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی یورپ کی ایک کانفرنس اس سفر کی تقریب بنی تھی۔ اُن دنوں اس مرکز میں لٹے پٹے بوسنیائی مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ یتیم معصوم بچوں اور ستائی گئی بیوہ عورتوں کی آہ و بکا سے فضا مشتعل اور مضطرب رہا کرتی تھی۔ یہ سب سن کر ایسا لگا جیسے عبدالرحمٰن کی یادوں کے دریچے اچانک کُھل گئے ہوں۔

بولے: آپ نے بھی کس زمانے کی یاد تازہ کر دی۔ وہ تو جہاد کا موسم تھا۔ ہم سب شوقِ شہادت میں مچلے جاتے۔ عرب بریگیڈ (El-Mudzahidin) کی اس وقت بڑی اہمیت تھی۔ سرب اور کروٹ ہمارا نام سن کر ہی کانپتے۔ آپ اندازہ کریں کہ ساٹھ ہزار امریکی فوجیوں کا بحری بیڑہ کروشیا اور سربیا کے ساحلوں پر لنگر انداز تھا، لیکن انھیں زمین پر اترنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس وقت بوسنیا کی سرزمین پر عرب مجاہدین کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ ہم مرنے کے لیے لڑتے تھے، شہادت ہمارا مطلوب و مقصود تھا، جبکہ دشمن اپنی جان بچانے کے لیے لڑتا تھا۔ اس زمانے میں سیاہ لباس میں ایک عرب

مجاہد بھی نظر آجاتا تو دشمنوں کے اوسان خطا ہو جاتے۔

'سیاہ لباس! کیا مطلب؟ عرب مجاہدین کیا بلیک کمانڈوز جیسی کوئی تربیت لے کر آئے تھے؟'

بولے: نہیں ان معنوں میں نہیں۔ شروع سے ہی ہماری یونٹ نے سیاہ یونیفارم اختیار کر رکھا تھا۔ اصل میں ہم لوگ افغانستان کے محاذ سے لوٹے تھے۔ ہم نے سرخ افواج کو شکست دی تھی۔ ہمارا مورال بہت بلند تھا۔

کتنے عرب مجاہدین بوسنیا میں شہید ہوئے ہوں گے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: ہمارے شہدا کی تعداد تین چار سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہمارا نام ہی دشمنوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر دیتا تھا۔

'اب جنگ کے خاتمے کے بعد آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟ بلکہ میں اگر یہ پوچھوں کہ اس پورے عمل میں آپ نے کیا کھویا اور کیا پایا تو آپ کیا کہیں گے؟'

میرے اس سوال پر انھوں نے لمحہ بھر کے لیے توقف اختیار کیا۔ آنکھیں بند کیں، اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھکا جیسے کوئی اہم نکتہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر کہنے لگے: پچھلے کئی مہینوں سے اسی سوال نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ صرف میرا ذاتی مسئلہ نہیں۔ پوری اسلامی تحریک کے لیے سنجیدہ غور وفکر کا موضوع ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جامعہ ملک سعود کا ایک طالب علم شوقِ جہاد میں مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ایک ایسے مرحلے میں آپہنچے گا، جب عالم اسلام کو اس کے جہادی عمل کی ضرورت نہیں رہ جائے گی اور جب خود اسے مقبول عام اسلامی تحریکیں از کار رفتہ اور معطل عنصر کے طور پر دیکھیں گی۔ ان کے لیے افغانستان سے لے کر بوسنیا تک کی زمین تنگ ہو جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے عبدالرحمٰن کچھ روہانسے سے ہو گئے۔ میں نے سوچا، عبدالرحمٰن اسلامی تحریک کے جوہر قابل ہیں۔ وہ ایک قیمتی تجربے سے گزرے ہیں۔ کیوں نہ ان کے ذاتی کوائف کی کچھ سن گن لی جائے۔ کیا عجب کہ اس طرح عصر حاضر کی اسلامی تحریک کے گم کردہ راستوں کی نشان دہی آسان ہو جائے۔

میں نے پوچھا: آپ کو پہلے پہل افغانستان جانے کا خیال کیسے آیا؟ ایک طالب علم کے لیے تو یہ مشکل فیصلہ رہا ہوگا۔

بولے: یہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ میں گرمی کی چھٹیوں میں جدہ میں مقیم تھا۔ ان دنوں افغان جہاد کا بڑا چرچا تھا۔ نوجوانوں کی بعض ٹولیاں شوق وتجسس میں پشاور ہو آئی تھیں۔ ان ہی کی زبانی یہ پتہ چلا کہ پشاور مدینۃ الجہاد بن چکا ہے۔ دُنیا بھر سے مجاہدین کی ٹولیاں یہاں آتی رہتی ہیں۔

جا بجا **مکتب الخدمات للمجاهدین** کی شاخیں قائم ہیں۔ ہر طرف جہادی نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لوگ جوشِ جہاد سے سرشار ہیں۔ میدان کارزار سے مسلسل معجزات و کرامات کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے عہد صحابہؓ کے ایام پھر سے لوٹ آئے ہوں۔ خیال آیا پشاور کچھ دور نہیں۔ بیسویں صدی کے اس امّ المعرکہ کو کیوں نہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اسے ایک طرح کی جہادی سیاحت کہیے۔ ابتدا میں تو میرے سفر کی یہی نوعیت تھی۔ تلاش، تجسس اور سرزمین جہاد کی زیارت کا شوق۔ ایک دن جمعہ کے خطبہ میں شیخ عبداللہ عزام کو سننے کا موقع ملا۔ بس نہ پوچھیے ان کی باتوں نے میرے دل کی دُنیا بدل ڈالی۔ ان کی باتوں سے ایسا لگا کہ افغانستان عنقریب عالمِ اسلام کے نئے دارالخلافہ کی حیثیت سے ابھرے گا۔ فلسطین کی آزادی اور اسلام کے عالمی غلبہ کا راستہ بھی، ایسا لگتا تھا، افغانستان سے ہو کر گزرتا ہے۔ شیخ عزام کی تقریر نے مجھے ایک جہادی سیاح سے حقیقی مجاہد میں بدل دیا۔

'وہ خواب جو اس وقت آپ نے دیکھا تھا اس کے بارے میں اب آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟'

میری اس غیر متوقع مداخلت پر عبدالرحمٰن چونکے۔ شاید وہ اس راست سوال کے لیے تیار نہ تھے۔ بولے: میں اس خواب کو مسترد تو اب بھی نہیں کرتا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم سے شاید معاملات کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ جہاد کے لیے صرف خلوص اور للّٰہیت ہی کافی نہیں ہوتا، معاملہ فہمی بھی بڑی اہم چیز ہوتی ہے۔ اب جو میں غور کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جہاد افغانستان کو بڑی طاقتوں نے اپنے مقاصد کے لیے ہائی جیک کر لیا۔ خلیجی ممالک جو اسلامی بیداری کی تحریک سے خائف تھے، انھیں اس بہانے معرکۂ جہاد کو دور دراز کی سرزمین میں منتقل کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے خون اور ان کے مالی وسائل خطے میں امریکی مفاد کے ضامن بن گئے۔ جہاد کو جب تک امریکی سرپرستی حاصل رہی، ہمارا مورال بلند رہا۔ لیکن جیسے ہی امریکی سائبان ہٹا ایسا لگا کہ ہم کھلے آسمان کے نیچے آ گئے ہوں۔

'پہلی بار آپ کو جہاد کے ہائی جیک ہونے کا احساس کب ہوا؟'

بولے: ۱۹۸۹ء میں افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد امریکی سائبان غائب ہو گیا۔ مجاہدین آپس میں لڑنے مرنے لگے۔ ۱۹۹۲ء میں کمیونسٹ حکومت گر گئی مگر مجاہدین ایک متبادل حکومت کے قیام پر متفق نہ ہو سکے۔ ان تین برسوں میں ہی اسلامی جہاد کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ ان ہی دنوں بوسنیا میں معرکہ گرم ہو رہا تھا۔ عزت بیگو وچ یورپ کے عین قلب میں ایک آزاد مسلم ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اُدھر پاکستانی میزبانوں نے بھی عرب مجاہدین کے لیے ملک چھوڑنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ ہمارے لیے اپنے اپنے ملکوں میں جانا کچھ آسان نہ تھا۔ بوسنیا میں امید کی ایک نئی کرن دکھائی دی۔

ہمارے بہت سے ساتھیوں نے بوسنیا کی طرف کوچ کرنے کا پروگرام بنالیا۔

بوسنیا کا تجربہ کیسا رہا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: یہاں قیادت کا اختلاف تو نہ تھا، لوگ عزت بیگووچ کی ذات پر متحد تھے مگر یہاں بھی ہمیں ان ہی لوگوں کی منافقت کا سامنا تھا جو ہمارے ہمدرد تھے اور ہماری سرپرستی کا دم بھرتے تھے۔ امریکہ بھلا کیوں چاہتا کہ یورپ میں ایک آزاد مسلم ریاست قائم ہو۔

'مگر امریکہ اور آزاد دُنیا تو شروع سے بوسنیا کی حمایت کرتی رہی ہے۔'

بولے: جی ہاں مغربی ذرائع ابلاغ تو یہی باور کراتے رہے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اب آپ ہی دیکھیے سربیا اور سلووینیا کے مابین ۱۹۹۱ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو اسے امریکی مداخلت نے صرف چند دنوں میں روک دیا۔ سربیا اور کروشیا کے مابین جنگ ختم کرنے میں بھی انھیں صرف چند ہفتے لگے۔ لیکن مسلمانوں کو سبق سکھانے اور بوسنیائی مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے سربوں کو چار سال کا وقت دیا گیا اور اس دوران مہذب دُنیا خاموش تماشائی بنی مسلمانوں کا قتلِ عام دیکھتی رہی۔ حد تو یہ ہے کہ جو عرب مجاہدین افغانستان میں امریکی حلیف تھے وہ جب اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے بوسنیا پہنچے تو انھیں اسی آزاد دُنیا کے آزاد پریس نے دہشت گرد کے روپ میں پیش کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مغرب کی نگاہ بدلتے ہی خلیجی ممالک نے بھی ہم سے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔

'مگر میں نے تو سرکاری سطح پر سعودی عرب میں بوسنیا اور چیچنیا کی حمایت میں مہمیں چلتی دیکھی ہیں۔ پرنس سلطان نے تو بوسنیا کی حمایت کے لیے باقاعدہ اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کر رکھی تھی۔'

بولے: سعودی امداد تو مغربی امدادی ایجنسیوں کو آتی تھی، بھلا اس سے مجاہدین کا کیا تعلق۔ مجاہدین کے ہاتھوں میں تو وہی کچھ آتا تھا جو انفرادی طور پر خلیجی ممالک کے تاجران بھجواتے تھے۔ مِلان میں ایک صاحب تھے شیخ انور شعبان، ان کے عرب ممالک میں بڑے رابطے تھے، ان کا بوسنیائی مجاہدین پر بڑا دبدبہ تھا۔ یہ کہیے کہ بلقان کے عبداللہ عزام تھے۔ ابھی دو سال پہلے وہ ایک چیک پوائنٹ پر شہید کر دیئے گئے۔

تو گویا بوسنیا کا تجربہ بھی کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ میں نے عبدالرحمٰن کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔

بولے: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ بوسنیا میں ہماری آمد کا بڑا فائدہ ہوا۔ ایک تو یہی کہ اخلاقی طور پر مقامی مجاہدین کا حوصلہ بلند ہوا۔ ثانیاً بوسنیائی مسلمان دین سے غافل تھے، ان کے اندر شراب اور خنزیر کی حرمت کا تصور بھی واضح نہ تھا۔ ہم لوگوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی کوشش کی۔ بعض بستیوں کو ہمارے

ساتھیوں نے اسلامی خطوط پر منظم کرنے کا پروگرام بھی بنایا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ جب بوسنیائی ریاست کا چراغ گل ہونے کو تھا، ہماری آمد سے میدانِ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ میں اسے ناکامی تو نہیں کہتا، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ڈائٹن معاہدے کے سبب ہم لوگ میدانِ جنگ میں جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار گئے۔

'کہیں تو کوئی بات ہے جو شاید ہماری گرفت میں نہیں آ رہی ہے ورنہ افغانستان میں جہاد کے دس سال اور چار پانچ سالوں پر مشتمل بوسنیا میں ایک آزاد مسلم ریاست کی جدوجہد اپنے منطقی نتائج تک پہنچنے سے پہلے ہی کمھلا گئی۔ آخر ایسا ہوا کیوں؟'

بولے: تخصیص کے ساتھ تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں یہ ضرور لگتا ہے کہ یہ سب کچھ عمومی غلغلے کی ایک کیفیت تھی۔ نئی صبح کا خواب ہی کچھ ایسا سرور انگیز تھا۔ خطبا و علما کی معجز بیانیاں اس پر مستزاد۔ آپ سچ کہتے ہیں اس مسئلہ پر گہرے تحلیل و تجزیے کی ضرورت ہے۔ کاش کہ کوئی صاحبِ فکر اسے تفصیلی محاکمہ کا موضوع بنائے۔

عبدالرحمٰن کی یہ گفتگو میرے حافظے میں کہیں دب کر رہ گئی۔ برسوں بعد ریاض کی ایک علمی مجلس میں بوسنیا کے نائب صدر کو سننے کا اتفاق ہوا۔ جلسہ کی صدارت شہزادہ ترکی الفیصل کر رہے تھے۔ میرے اس سوال پر کہ بوسنیا میں ایک آزاد مسلم ریاست کا خواب کیوں کر دھندلا گیا؟ انھوں نے بڑے کرب سے بتایا کہ او آئی سی کے اجلاس میں ایک آزاد مسلم ریاست کو تسلیم کرنے کی جب بات آئی تو ممبر اراکین نے سوسو مصلحتیں تراشیں۔ انھوں نے اپنی برادری میں ایک نئے مسلم ملک کے داخلے کے سارے دروازے از خود بند کر دیئے۔ بولے: کہاں کی اسلامی اخوت اور کون سی امت مسلمہ۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا، آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے سوچا عبدالرحمٰن سچ ہی کہتا تھا۔ یقیناً کوئی بات تو ہے کہ ہم بر بنائے مصلحت بہت سی باتیں زبان پر لانا نہیں چاہتے۔ مگر جب تک کھل کر گفتگو نہیں ہوتی یہ کیسے پتہ چلے گا کہ آخر پانی مرتا کہاں ہے؟

۳۵

مسکین اقلیت

پشاور سے واپسی پر ابھی چند دن بھی نہ گذرے تھے کہ ریاض کے سفر کی تقریب نکل آئی۔ مسلم نوجوانوں کی انجمن الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی کی جانب سے ایک سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس مسلم اقلیتوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے بلائی گئی تھی اور اس میں میرے مجوزہ مقالے کا ابتدائی خاکہ منظور ہو گیا تھا۔ ابتداً تو مجھے اس بات پر غصہ تھا کہ غیر تو غیر اب اپنے بھی ہمیں 'اقلیت' سمجھتے اور اسی حیثیت سے ہمارے مسائل کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر مقالہ لکھنے بیٹھ گیا کہ جب تک بین الاقوامی فورمز پر اپنے موقف کو دلائل و براہین کی روشنی میں پیش نہ کیا جائے محض رنج وغم کے اظہار سے کچھ حاصل نہیں۔ ان ہی دنوں ایک امریکی ماہر عمرانیات لوئس وِرتھ (Louis Wirth) کی ایک تحریر میری نظر سے گذری تھی جس میں انھوں نے لفظ اقلیت کے سیاسی اور نفسیاتی مضمرات پر گفتگو کی تھی۔ مصنف کا کہنا تھا کہ کسی انسانی گروہ کو اقلیت قرار دے کر دراصل ہم اسے قومی دھارے سے الگ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اسے یہ باور کراتے ہیں کہ وہ عام لوگوں سے الگ کوئی مسکین قسم کی مخلوق ہیں۔ خود اقلیت کہے جانے والے گروہ کو اپنے بارے میں رفتہ رفتہ اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے مختلف ہیں (they are a people apart)۔ ایسے لوگوں کو معاشرے میں عام طور پر کم تر سمجھا جاتا ہے، معاشرہ میں ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور قومی زندگی میں ان کا عمل دخل برائے نام بھی نہیں ہوتا۔ بقول لوئس ان کا لوگوں سے الگ (apart) ہونا ممتاز ہونے کے معنوں میں نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی مخلوق کے معنوں میں ہوتا ہے جو بوجوہ زندگی کے مرکزی اسٹیج پر کوئی رول ادا کرنے سے قاصر ہو، حاشیہ پر رہنا جن کا مقدر بن گیا ہو۔ ایسے لوگ آبادی کے اعتبار سے اگر ساٹھ فیصد بھی ہو جائیں تو ان کی کثرتِ تعداد ان کی محرومی، بے بسی اور مسکینی کا مداوا نہیں کر سکتی۔ لوئس کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار ایسا لگا جیسے اپنے آپ کو اقلیت تسلیم نہ کرنے کا شدید داعیہ، جو میں اپنے اندر میں بچپن سے پاتا تھا، اسے علمی دلائل و براہین کی اساس فراہم ہو گئی ہو۔

میں نے سوچا ہندوستانی مسلمان جو صدیوں سے اس ملک کے مرکزی اسٹیج پر قائدانہ رول ادا کرتے

آئے ہیں اچانک انھیں اس واہمہ پر کیسے یقین آ گیا کہ وہ اقلیت ہیں، مسکین ہیں اور ان کی جگہ مرکزی اسٹیج کے بجائے اب ہمیشہ ہمیش کے لیے حاشیہ پر رہنا طے کردی گئی ہے۔ پتہ چلا کہ ۱۸۷۱ء میں پہلی بار انگریزوں نے مردم شماری کے ذریعہ یہ عقدہ کشائی کی کہ اس ملک میں اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد صرف پندرہ فیصد ہے جبکہ مسلمان اور دلت اقوام پینتالیس فیصد آبادی پر مشتمل ہیں۔ اب اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو برہمن یا چھتری شمار کرانے کے بجائے ایک ایسی شناخت میں پیش کریں جس میں دوسری اقوام کی عددی قوت بھی ان کے حصہ میں آجائے۔ ہندو حالانکہ کوئی قوم نہیں تھی اور نہ ہی یہ کسی مذہب کا نام تھا۔ یہ تو انڈس ویلی میں رہنے والی قوموں کو عربوں کا دیا ہوا نام تھا۔ عرب اہل ہند کو ہندوس سے مخاطب کرتے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں نے اس نئی مبہم شناخت کو اپنے لیے کچھ اس طرح اختیار کیا کہ اس میں شودر/ دلت، آدی باسی بلکہ بعض مراحل میں تو جین اور سکھ بھی اسی خانے میں آ گئے۔ اور ان متضاد اور متخالف انبوہِ عظیم کی سربراہی پر اونچی ذات کے ہندو کچھ اس طرح متمکن ہو گئے کہ مسلمانوں کو مجموعۂ اضداد کے اس سمندر میں اپنا وجود تحلیل ہوتا ہوا نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنے تحفظ کی فکر ستانے لگی۔ وہ اس بات کو فراموش کر گئے کہ صدیوں سے اس ملک میں ان کی عددی قوت کا تناسب اس سے مختلف نہیں رہا ہے۔ اور یہ کہ کبھی بھی اس ملک میں ایک بین الہنود (Pan-Hindu) شناخت کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا جس میں متضاد عقائد و نظریات رکھنے والی قومیں سما گئی ہوں۔

لوئس کی یہ تحریر میرے لیے بڑی چشم کشا ثابت ہوئی۔ جس بات کو میں بچپن سے محسوس تو کرتا تھا، لیکن عقلی طور پر اس کی توجیہہ سے قاصر تھا، لوئس کی اس تحریر نے اسے زبان فراہم کردی تھی۔ اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو 'اقلیت' قرار دینے کے پیچھے دراصل کون سے نفسیاتی اور سیاسی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ اقلیت بن جانے کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ اب ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مسکینی اور محرومی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے بھی کسی جمہوری نظام میں فیصلہ کن حیثیت تو ہمیشہ اکثریت کی ہوتی ہے۔ اور جہاں سب کچھ اکثریت کی ایما پر ہوتا ہو وہاں اقلیت ہونے کا احساس بھی ایک دائمی عذاب سے کم نہیں۔

میں نے بہت غور کیا مسلمان تو ہمیشہ سے برصغیر میں عددی اعتبار سے تھوڑے ہی رہے ہیں۔ ہندوستان پر ہی کیا موقوف عہد عمرؓ میں جب اسلامی ریاست کی سرحدیں غیر معمولی طور پر وسیع ہو گئیں اور جب آگے چل کر بغداد، دمشق، قاہرہ جیسے مراکز وجود میں آ گئے، تب بھی اسلامی ریاست کے ان اہم شہروں میں مسلمانوں کا عددی تناسب چار پانچ فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ پھر کیا بات تھی کہ اس قلیل عددی تناسب کے

باوجود اقصائے عالم میں ان کا ڈنکا بجتا تھا۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ان کے قافلے کچھ اس شان سے حرکت میں رہتے کہ انھیں عدل وقسط کے قیام پر مامور کیا گیا ہے۔ تب انھیں ان کی عددی قلت محرومی اور بےبسی کا احساس نہیں دلاتی۔ تب 'اقلیت' جیسی مذموم اصطلاح سے ان کے حواس ناآشنا تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ میں ہمیشہ سے ایک چھوٹا گروہ عظیم اکثریت پر حکمرانی کرتا رہا ہے حتیٰ کہ موجودہ جمہوری ڈھانچہ میں بھی تیس پینتیس فیصد ووٹ لانے والی پارٹیاں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرلیتی ہیں۔ خود امریکہ میں جو لوگ صدارتی طریقۂ انتخاب کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہوتے ہیں انھیں بھی 'اقلیت کی حکمرانی' کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ گویا تعداد میں تھوڑا ہونا فی نفسہٖ کوئی عیب نہیں۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب بعض قومیں اپنی قلت تعداد کو اپنی قوت سمجھنے کے بجائے اسے اپنی کمزوری پر محمول کرنے لگتی ہیں اور اس خیال کی اسیر ہوجاتی ہیں کہ وہ دوسروں سے کمتر ہیں، بےبس اور مجبورِ محض ہیں اور یہ کہ ان کے لیے اب سیادت کے مرکزی اسٹیج پر کوئی رول نہیں رہ گیا ہے۔ تعداد میں کم ہونا ایک بات ہے اور اقلیت ہونا یا اقلیت کی نفسیات میں مبتلا ہوجانا بالکل ہی دوسری بات۔

ریاض کی اس کانفرنس میں شرکت کے بعد مجھے اس بات پر یقین واثق ہوگیا کہ دُنیا بھر میں مسلم اقلیات کو جو مختلف النوع قسم کے مسائل درپیش ہیں اس کا ایک بنیادی سبب وہ نفسیاتی حصار ہے جو ہم نے از خود اپنے گرد قائم کر رکھا ہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مسلم انجمنوں کے سربراہان سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا کہ ان حضرات کے دل ودماغ پر پیمبرانہ مشن سے کہیں زیادہ ایک ثقافتی اور مشرقی گروہ ہونے کا احساس حاوی ہے۔ ان کی ساری تگ ودو اس امر پر ہے کہ انھیں ایک اقلیتی، مذہبی اور ثقافتی گروہ کی حیثیت سے میزبان معاشرے میں زندگی جینے کی سہولتیں میسر آجائیں اور بس۔ گویا انھوں نے ابتدا سے ہی مغرب کے معاشرے میں خود کو حاشیہ پر رکھنے کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ امریکہ جیسے ملک میں جہاں سفید فام اقوام کا غلبہ ہے، اطالوی اور لاطینی قومیں کبھی بیرونی عناصر کے طور پر دیکھی جاتی تھیں، پھر رفتہ رفتہ انھیں سفید فاموں کا سا اعتبار حاصل ہوگیا۔ شمالی آئرلینڈ سے ہجرت کرنے والے لوگ جو اپنے کیتھولک عقیدے کے سبب انگلستانی حکمرانوں کے ظلم وستم کا شکار رہے، امریکی معاشرے میں صدارت کے اہم منصب پر فائز ہوئے۔ اہل یہود جن کی ایک قابل ذکر آبادی نازی جرمنی کے ظلم وستم سے تنگ آکر امریکہ کی طرف ہجرت کو مجبور ہوئی، انھوں نے بھی خود کو اقلیت یا مجبورِ محض تصور کرنے کے بجائے خود کو امریکی معاشرے کا انجن قرار دے ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل حرفت سے لے کر اہل فن تک اور اہل سیاست سے لے کر اہل تجارت تک ہر میدان میں اہل یہود نے اپنی سبقت کا جھنڈا گاڑ دیا۔

بعضے کہتے ہیں کہ سفید فام بننا بھی ایک تدریجی مرحلہ ہے۔ ہوسکتا ہے اس بات میں جزوی صداقت ہو، لیکن اصل بات جس سے انکار ممکن نہیں وہ یہ ہے کہ زندہ قومیں معاشرے کی متحرک مشین کا کمال حکمت کے ساتھ مطالعہ کرتی ہیں اور پھر اس امکان کی تلاش میں لگی رہتی ہیں کہ کب انھیں ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہونے کا موقع مل جائے۔ اس کے برعکس جو لوگ ابتدا سے ہی خود کو اقلیت قرار دے ڈالیں یا زیادہ سے زیادہ ایک تہذیبی اکائی کے طور پر خود کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں ہوں، وہ قیادت جیسے بارِ عظیم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ پہلی نسل کے مسلمان جب عدل وقسط کے قیام کے لیے عسکری فتوحات کے جلو میں مختلف بلاد و امصار میں پہنچے تو انھیں مختلف ملکوں میں مختلف قسم کی زبان وثقافت سے سابقہ پیش آیا، انھوں نے مدعو معاشرے کے متحرک انجن میں اپنے لیے ڈرائیونگ سیٹ تلاش کی۔ وہ اس معاشرے میں تبدیلی کا علامیہ بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ اس عمل میں ان کی اصل عرب ثقافت تحلیل ہوگئی۔ نئی زبانیں اور نئی تہذیبیں وجود میں آئیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی ایک اعتبار سے سفید فام بننے کا عمل ہے۔

* * *

ایک دن مرکزِ خزامیٰ کی لابی میں ہم چند احباب بیٹھے تھے۔ کانفرنس کا کلیدی اجلاس ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ شرکا کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں باہم گفتگو میں مصروف تھیں۔ ایک صاحب جو برطانیہ سے تشریف لائے تھے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی اقلیتی حیثیت پر یہ کہہ کر اعتراض وارد کردیا کہ اوّل تو اتنی بڑی تعداد اقلیت کے زمرے میں نہیں رکھی جاسکتی۔ ثانیاً سرکاری اعداد وشمار ہندوستانی مسلمانوں کی عددی قوت کی صحیح عکاسی نہیں کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ آزادی کے وقت برصغیر میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی نو کروڑ تھی۔ منقسم ہندوستان میں چار کروڑ مسلمان رہ گئے تھے۔ پانچ کروڑ مشرقی اور مغربی پاکستان کے حصے میں آئے۔ اب آپ ہی دیکھیے اس وقت بنگلہ دیش اور پاکستان کی مجموعی آبادی کتنی ہے اور اس تناسب سے چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کا تخمینہ کیا بنتا ہے۔ آپ کو اپنی صحیح عددی قوت کا اندازہ ہوجائے گا۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بولے: یہ بڑے راز کی بات ہے جو میں نے آپ پر آشکار کردی ہے۔ بات جب آگے بڑھی تو ایک ہندوستانی مندوب نے اس خدشہ کا اظہار کیا مبادا ہماری تعداد کی کثرت کہیں ہمیں اقلیت کے زمرے سے خارج کرنے کا سبب نہ بن جائے۔ اس طرح ہم ان مراعات سے بھی محروم ہوجائیں گے جو ہمیں اقلیت قرار دیئے جانے کے سبب حاصل ہیں۔ ڈاکٹر ساجد جو اب تک خاموش تھے ہماری یہ گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ساجد برطانیہ کی ایک امدادی انجمن کے مشیر تھے۔ یہی کوئی پینتس چالیس کے لپیٹ میں ہونگے۔ بولتے تو ایسا لگتا جیسے کلاس روم میں طلبا سے مخاطب ہوں،

جیسے خاص اسی موضوع پر تیار ہو کر آئے ہوں۔ کہنے لگے ارے بھئی جس قوم کا سب کچھ چھن چکا ہو اسے اب کس چیز کے چھننے کا غم ہوسکتا ہے۔ اقلیت کے دستوری تحفظات کے زمرے سے تو ہندوستانی مسلمان کب کے باہر آ چکے ہیں۔ کاش کہ انھیں اس بات کا علم ہوتا۔

کیا مطلب؟ میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لینا مناسب جانا۔

بولے: ۱۹۴۸ء کا ڈرافٹ کانسٹی ٹیوشن پڑھا ہے آپ نے؟ پھر آپ کو اس بات کا اندازہ کیسے ہو کہ ۱۹۴۸ء کا مسودۂ قوانین جب ۱۹۵۲ء میں طویل بحث و مباحثے اور ترامیم کے بعد آئین ہند کی شکل میں سامنے آیا تو اس کی روح بدل چکی تھی۔ مسلمان دستوری تحفظات کے دائرے سے باہر آ چکے تھے اور یہ سب کچھ اتنی عیاری کے ساتھ ہوا کہ بڑے بڑوں کو اس تبدیلی اور اس کے پیش آمدہ مضمرات کا اندازہ نہ ہوسکا۔

میں نے دستور ساز اسمبلی کی بابت تو بہت کچھ سنا تھا اور اس کی بعض بحثیں بھی میری نظر سے گزری تھیں، لیکن مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ۱۹۴۸ء کے مسودہ اور ۱۹۵۲ء کے منظور شدہ دستور میں اس قدر بنیادی نوعیت کا کوئی فرق ہے۔ میں نے پوچھا اس امر پر آپ کچھ مزید روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

بولے: کیوں نہیں، میرا تو تحقیقی مقالہ ہی اس موضوع پر ہے۔ میں نے ان دو وثیقوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلم اقلیات کو جن تحفظات کی ۱۹۴۸ء کے مطبوعہ مسودہ میں ضمانت دی گئی تھی، بعد کی ترامیم میں ان تحفظات کو یکسر کالعدم قرار دے ڈالا اور یہ سب کچھ جمہوریت، سیکولرازم اور ڈیموکریسی کے خوشنما نعروں کے جلو میں ہوا۔

میں نے کہا: براہ مہربانی تخصیص کے ساتھ بتائیے۔

بولے: ۱۹۴۸ء کے مسودہ میں اقلیتوں کے لیے مقننہ میں محفوظ نشستوں کا وعدہ تھا۔ سرکاری نوکریوں میں ان کا کوٹہ متعین کیا گیا تھا۔ کابینہ میں ان کی نمائندگی کو یقینی بنانے کی بات کی گئی تھی۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی سفارش کی گئی تھی کہ ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے جو اقلیتوں کی نمائندگی کو یقینی بنائے اور اس امر کی مسلسل نگہبانی کرتا رہے۔ ۱۹۴۶ء کی دستور ساز اسمبلی جس کیبینٹ مشن پلان کے تحت وجود میں آئی تھی اس کی بنیاد ہی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ لیکن آنے والے دنوں میں گفتگو کا رخ پوری طرح بدل گیا۔ پہلے تو شیڈول کاسٹ کو اقلیت کے خانے سے نکال کر ہندو قوم میں شامل کر دیا گیا۔ بقول کے ایم منشی جو اس بحث کے سرخیل تھے، شیڈول کاسٹ کو اقلیت سمجھنا درست نہیں تھا۔ ان کے نزدیک ہریجن ہندو قوم کا ہی حصہ تھے۔ انھیں اس وقت تک ہی مراعات دینی چاہئیں جب تک کہ وہ ہندو قوم میں ضم نہ ہو جائیں۔ منشی کی پیش کردہ اس ترمیم کو اسمبلی نے قبولیت عطا کر دی۔

اچھا تو پہلے شیڈول کاسٹ بھی اقلیت کے زمرے میں آتے تھے! میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ہاں! نہ صرف یہ کہ وہ اقلیت کے زمرے میں رکھے گئے تھے بلکہ امبیڈکر تو یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی طرح انھیں بھی جداگانہ انتخاب کے ذریعہ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں نمائندگی ملے۔

پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

ہوتا کیا۔ گاندھی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ ۱۹۳۲ء میں گاندھی نے پونا میں ورت رکھا کہ وہ ہریجنوں کے لیے جداگانہ انتخاب کو کسی قیمت پر تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ ہریجنوں کو اقلیت سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ ہریجنوں کا سیاسی وزن ہندوؤں کے پلڑے میں ڈالنا چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔

مگر ہریجن تو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے اچھوت تھے، انھیں مندروں میں داخلے کی اجازت بھی نہ تھی۔ گاندھی نے تو ایک اعتبار سے بڑا جرأت مندانہ اجتہاد کر ڈالا۔

بولے: گاندھی مستقبل کو دیکھ رہے تھے۔ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ آنے والے دنوں میں قوت کا عددی کھیل اہمیت اختیار کر لے گا۔ ہریجن اگر ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئے تو انھیں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلم معاشرے میں مذہبی اور سماجی انصاف کے امکانات زیادہ دکھائی دیں گے۔ انھوں نے اسی خطرے کے پیش نظر چھوت چھات کی مخالفت میں تحریکیں چلائیں اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ ہریجنوں کو ہندو زمرے میں شامل کر لیا جائے۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

'مگر گاندھی تو ۱۹۴۸ء میں ہی رخصت ہو گئے، مسودۂ قوانین میں ترامیم تو بعد تک ہوتی رہیں'

بولے: انھوں نے بنیاد رکھ دی تھی، بعد والوں نے ان ہی خطوط پر ہریجنوں کو پہلے تو اقلیت کے زمرے سے خارج کیا، پھر اقلیتوں کو ملنے والے تحفظات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اس سے اقلیت اور اکثریت میں عدم اعتماد اور دوری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

'گویا ۱۹۴۸ء کے مسودہ میں مسلمانوں کے لیے کہیں بہتر امکانات تھے؟'

بالکل! بعض باتیں تو بڑی اسٹریٹجک نوعیت کی تھیں۔ مثلاً یہی جداگانہ انتخاب جسے مختلف بہانوں سے ختم کر دیا گیا۔ اس کے بدلے ہریجنوں کو تو دس سال کے لیے خصوصی دستوری تحفظ کی بات کہی گئی البتہ مسلمان ان تحفظات سے باہر رہ گئے۔ اقلیتوں کی کابینہ میں نمائندگی کے مسئلہ کو بھی مختلف بہانوں سے ٹال دیا گیا۔ بس یہ سمجھو کہ ۱۹۴۸ء کے ڈرافٹ کانسٹیٹیوشن سے لے کر اکتوبر ۱۹۴۹ء کے ڈرافٹ کانسٹیٹیوشن کے وجود میں آتے آتے اقلیتوں کو دیئے جانے والے سارے تحفظات صرف شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب

کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے۔

تو گویا امبیڈکر نے صرف اپنی قوم کا خیال کیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بولے: نہیں یہ کہنا تو زیادتی ہوگی۔ امبیڈکر خود اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے، وہ تنِ تنہا اونچی ذات کے ہندوؤں کا مقابلہ کر رہے تھے، انھیں گاندھی جیسے مہاتما کا سامنا تھا جو ہر قیمت پر ہندوؤں کی بالادستی کو یقینی بنانا چاہتا تھا۔

'مگر گاندھی نے تو شودروں کے حق میں تحریک چلائی، انھیں ہریجن یعنی خدا کا بندہ بتایا، مندروں میں ان کے داخلے کی راہ ہموار کی.....'

بس بس رہنے دو! اسی پروپیگنڈے نے تو ہمارے دل و دماغ کو مسموم کر رکھا ہے۔ انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بولے: گاندھی کو سمجھنا ہے تو امبیڈکر کو پڑھو جب ہی تمھیں پوری اسکیم سمجھ میں آئے گی۔ انگریزوں نے مردم شماری میں شودروں کو ہندو مذہب کے خانے میں ڈال دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار کروڑ تھی، یعنی برصغیر کی مسلم آبادی کا نصف۔ شودروں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کا دعویٰ تھا جب کہ شودر بڑی تعداد میں اسلام، عیسائیت اور سکھ مت اختیار کر رہے تھے۔ صرف پنجاب میں ۱۸۸۱ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان ان کا تناسب ۴۴ فیصد سے گھٹ کر ۲۹ فیصد رہ گیا تھا۔ ایسی صورت میں ہندوؤں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر اس سیلاب کو نہ روکا گیا تو اونچی ذات کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ بقول سوامی ویویکانند 'ہندوؤں کے دائرے سے نکل جانے والا ایک شخص صرف ہمیں ایک آدمی سے محروم نہیں کرتا بلکہ ہمارے دشمن میں ایک آدمی کا اضافہ کر دیتا ہے'

'وویکانندا بھی اس طرح سوچتے تھے! ان کی روشن خیالی کا تو شکاگو کی مذہبی پارلیمنٹ کے حوالے سے بڑا چرچا ہے۔'

بولے: اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا تو غالباً اپریل ۱۸۹۹ء کے پربودھ بھارت کے شمارے میں ان کا انٹرویو دیکھ لینا۔ تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہندو زعما اس صورتِ حال سے کس قدر پریشان تھے۔ ہندو مذہب میں جو اصلاحی تحریکیں چلیں اس کے پیچھے بھی دراصل اپنے خیمے کا استحکام تھا، شودروں کو تبدیلیٔ مذہب سے روکنا تھا۔ آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی نے تو شودروں کو پاک کرنے کے لیے شدھی کی تحریک چلائی۔ پنجاب میں جات پات توڑک منڈل بھی آریہ سماجی مشن کا حصہ تھا، جس نے چھوت چھات کے خلاف اپنے سالانہ جلسے میں امبیڈکر کو خطاب کی دعوت دی تھی مگر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ امبیڈکر ہندو بالادستی کو ہی سرے سے تسلیم نہیں کرنا چاہتے، وہ شودروں کو ہندو خیمے سے نکال لے جانا چاہتے ہیں تو انھوں نے

خطاب کی یہ دعوت واپس لے لی۔

'پھر تو امبیڈکر پر یہ امر بڑا شاق گذرا ہوگا'

وہ تو خیر ان باتوں کے عادی تھے۔ انھوں نے اپنے مجوزہ خطبے میں لکھا تھا کہ ہندو سوسائٹی کی حقیقت ایک واہمے سے زیادہ نہیں۔ ہندو ایک اجنبی زبان کا لفظ ہے، کسی قدیم سنسکرت ماخذ میں اس کا ذکر نہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس لفظ کا استعمال نہیں ملتا۔ پھر ہندو سوسائٹی کہاں سے وجود میں آ گئی۔ ہاں یہاں مختلف ذاتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ امبیڈکر تو ہندوازم کو اچھوتوں کی دائمی تعذیب گاہ (veritbale chamber of horrors) سے تعبیر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تعذیب گاہ سے نکلنے کے لیے انھوں نے بالآخر تبدیلیٔ مذہب کا راستہ اختیار کیا۔

'گاندھی بھی تو ذات پات اور چھوت چھات کے خلاف تھے انھوں نے...'

'ارے ارے تم پھر پروپیگنڈے کی زبان بولنے لگے' انھوں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ بولے: لگتا ہے تم نے لوئس فشر جیسے لوگوں کو پڑھ رکھا ہے۔

'جی آپ نے درست سمجھا'، میں نے اپنا جرم قبول کیا۔

فشر جیسے مصنّفین نے گاندھی کا ایک ایسا آسمانی ہیولیٰ تراشا کہ ساری زمینی حقیقت پس پشت چلی گئی۔ گاندھی ان کے نزدیک خدا کے فرستادہ ہیں، عام انسان نہیں۔ ایک ہوتی ہے سوانح نگاری اور ایک ہوتی ہے hagiography، جسے ملفوظات نویسی بھی کہتے ہیں۔ گاندھی کو شروع سے اچھے ملفوظات نویس مل گئے۔ تمھیں حیرت ہوگی کہ ہندوستان واپس آنے سے پہلے ہی گاندھی اپنی دو سوانح لکھوا چکے تھے۔ یہ دونوں سوانح جنوبی افریقہ میں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔ فرانسیسی سوانح نگار غوما غولوں نے ۱۹۲۴ء میں جب گاندھی کی سوانح *Mahatama Gandhi: The Man Who Became One with the Universal Being* شائع کی تھی اس وقت تک وہ گاندھی سے ملے بھی نہیں تھے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ 'کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں' جس نے گاندھی کو ایک شاطر سیاستداں کے مقام سے اٹھا کر انھیں مہاتما کے منصب پر فائز کر دیا۔

شاطر سیاست داں؟ میرے خیال میں اب آپ زیادتی کر رہے ہیں، میں نے احتجاج کیا۔

بولے: ارے بھئی حقیقت تو یہی ہے، آپ چونکہ انھیں تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھنے کے عادی رہے ہیں اس لیے آپ کو میری باتیں عجیب لگ رہی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایک شخص تحریک تو کھادی اور چرخے کی چلاتا ہو پر اس کے آشرم کا خرچ جی ڈی برلا جیسے مل مالکان اٹھاتے ہوں، جو شخص جنوبی افریقہ

ہیں ہندوستانی سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے انگریز حکمرانوں سے سانٹھ گانٹھ رکھتا ہو، مقامی سیاہ فام باشندوں کو حقیر سمجھتا اور انھیں کچل ڈالنے میں انگریزوں کا معاون رہا ہو، جو ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک میں شامل ہوکر اسے Non-Cooperation Movement (تحریک عدم موالات) کا ہراول دستہ بنا دیتا ہو اور پھر جب اس تحریک میں جان پڑ جاتی ہو تو ۱۹۲۲ء میں اچانک، یک طرفہ طور پر، مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر، ستیہ گرہ کے خاتمے کا اعلان کر دیتا ہو اور اس طرح اس کے ساتھ چلنے والی تحریک خلافت اچانک خود کو بیاباں میں محسوس کرتی ہو -- تو آپ ہی بتائیے ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے؟

ڈاکٹر ساجد کا بیان ابھی جاری تھا کہ صدر دروازے پر کچھ ہلچل ہوئی۔ پتہ چلا کہ ہوٹل شیراٹن کو جانے والی بس اب روانگی کے لیے تیار ہے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ اب ہم لوگ بس میں آ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر ساجد کی گفتگو سے ایسا لگتا تھا جیسے مہاتما کی شخصیت پر پڑی تقدس کی نقاب آہستہ آہستہ سرکتی جا رہی ہو۔ میں نے سوچا ڈاکٹر ساجد باخبر آدمی لگتے ہیں، پتہ نہیں ان سے پھر گفتگو کا موقع ملے یا نہیں ان سے کیوں نہ دستور ساز اسمبلی کی وہ باتیں معلوم کی جائیں جو ان کے تحقیقی مطالعہ کا خاص موضوع رہی ہیں۔ میں نے کہا: خیر امبیڈکر اور گاندھی کی چشمک کو چھوڑیے، یہ بتائیے کہ جب مسودہ قوانین میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کی جا رہی تھیں اس وقت مسلم اراکینِ اسمبلی نے ان تبدیلیوں پر کوئی احتجاج کیوں نہ کیا؟

بولے: احتجاج کون کرتا۔ ابتدا میں دستور ساز اسمبلی میں اٹھائیس (۲۸) مسلم اراکین تھے۔ ان میں سے دس تو پاکستان کو ہجرت کر گئے۔ باقی جو بچے ان میں سے بعض تو اتنے مبہوت تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اس بدلی ہوئی صورت حال میں کیا کریں۔ غیر مسلم اراکین کے تیور بدل چکے تھے، ان کے لب و لہجے میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ایک صاحبہ تھیں بیگم اعجاز رسول جو دستور ساز اسمبلی کی رکن تھیں۔ انھوں نے تو جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کے لیے اسمبلیوں میں نشستیں محفوظ کرنے کی باقاعدہ مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ریزرویشن اقلیت اور اکثریت کے رشتے میں دراڑ ڈال دے گا۔ اس طرح ہم اکثریت کا دل جیتنے کا موقع کھو دیں گے۔ ذرا سوچیے ولبھ بھائی پٹیل جو اس کمیٹی کی سربراہی کر رہے تھے، بیگم صاحبہ کے دلائل سن کر کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔

عجیب! میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

بولے: ہاں نیشنلسٹ مسلمانوں کی یہی تو مجبوری تھی۔ ان بے چاروں کو ملک سے وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے ہندو آقاؤں کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ لیکن سب لوگ ایسے نہ تھے۔ یوپی کے مولانا حسرت

موہانی، بہار کے حسین امام اور مدراس کے محبوب علی بیگ تو آخر آخر تک متناسب نمائندگی کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔ لیکن ان کی آواز کو یہ کہہ کر دبا دیا گیا کہ متناسب نمائندگی کی باتیں بھی دراصل جداگانہ انتخاب کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل ہوگی۔ پنڈت نہرو نے یہ کہہ کر اس مطالبہ کو دبانے کی کوشش کی کہ ایک مختصر سی اقلیت کے لیے یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ اکثریت اس کے بارے میں یہ سوچے کہ وہ اکثریت پر اعتماد نہیں کرتی اور اپنے آپ کو علیحدہ رکھنا چاہتی ہے۔ پنڈت گووند ولبھ پنت نے اس موقع پر یہ دلیل دی تھی کہ جداگانہ انتخاب سے مسلمان اگر پارلیمنٹ میں پہنچ بھی گئے تو وہ اپنی قلت تعداد کے سبب کسی فیصلہ کن پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ فیصلہ تو اکثریت کے ووٹ سے ہی ہوگا۔ گویا آپ متناسب نمائندگی کے ذریعہ مسلمانوں کو پارلیمنٹ میں بھیجیں یا جداگانہ انتخاب کے ذریعہ مسلم اراکین پارلیمنٹ کی موجودگی یقینی بنائیں، جمہوری تماشے کے مداری اس بات سے خوب واقف تھے کہ آنے والے دنوں میں جمہوریت دراصل اکثریت کے جبر میں بدل جائے گی۔ ایک صاحب تھے زیڈ ایچ لاری، انھوں نے اس خطرے کا اسی وقت ادراک کرلیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جمہوریت میں ہر شخص کو نمائندگی کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی اہمیت ہے کہ ہر نقطۂ نظر کو عددی تناسب کے اعتبار سے نمائندگی ملے۔ مگر یہاں پر جمہوریت کے نام پر اکاون فیصد لوگوں کی حکمرانی کا راستہ ہموار کیا جارہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے جمہوریت تو کسی اعتبار سے نہیں کہہ سکتے۔

بات تو معقول تھی پھر کانگریس کے زعما نے اس پر توجہ کیوں نہ دی؟

بولے: بات جتنی بھی معقول ہو آزادی کے فوراً بعد ایسا لگا جیسے اس ملک پر مسلمانوں کا استحقاق جاتا رہا ہو۔ پٹیل نے واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد اب ہندوستان کے باقی ماندہ علاقوں میں دوقومی نظریہ کی بات آئندہ کوئی نہیں کرے گا۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمانوں کو حکومتی مناصب میں اب کسی نمائندگی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ ایک طرف مسلمانوں کو دستوری تحفظات کے دائرے سے باہر کیا گیا اور دوسری طرف سیکولرازم اور ڈیموکریسی کا پروپیگنڈہ بھی جاری رہا۔ مسلمانوں کے حقوق میں اٹھنے والی آوازوں کو یہ کہہ کر دبایا گیا کہ اس طرح کی باتوں سے ملک کا سیکولر ڈھانچہ کمزور ہوگا۔ فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی سر اٹھائے گی۔ احیا پرست ہندو جو اس ملک کو ہندو راشٹر بنانا چاہتے ہیں انھیں منظم ہونے کا موقع ملے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ وہ خود کو ملک و وطن کے تئیں وفادار ثابت کریں اور دستور کے خالی خولی پٹارے کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھریں، مبادا کل ان سے یہ نفسیاتی سہارا بھی کوئی چھین لے۔ موجودہ ترمیم شدہ دستور کی حقیقت امبیڈکر سے بہتر اور کون جان

سکتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں راجیہ سبھا میں یہ بات کہی تھی کہ 'دستور ہند ایک عظیم الشان معبد تھا جو ہم نے بنایا تو خدا کے لیے تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہاں خدا بٹھائے جاتے، شیاطین براجمان ہو گئے'۔

میرے لیے ڈاکٹر ساجد کی گفتگو میں لطف وانبساط کا بڑا سامان تھا مگر بس اب ہوٹل کے سائبان میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے رخصت کی اجازت لی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

ندوۃ الشباب کی کانفرنس میں دُنیا بھر سے انقلابی نوجوانوں اور معروف مسلم شخصیات کی قابل ذکر تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب اسلامیان کا ہر طرف بول بالا تھا۔ شرق سے غرب تک جدھر نظر اٹھائیے خلیجی سرمایہ اور امریکی سرپرستی، یا کم از کم مغربی نظامِ کفر کے تعارض کے بغیر، اسلامی تحریکیں مختلف قسم کے تعلیمی، ثقافتی، دعوتی اور جہادی منصوبوں میں مصروف دکھائی دیتی تھیں۔ ریاض کا مجمع اسلامیوں کا ایک طرح کا بین الاقوامی کارنیوال تھا جہاں مجھے دُنیا بھر کے اہلِ فکر مسلمانوں سے رابطے کا موقع ملا۔ کانفرنس کے اختتام پر ہمارے پروگراموں کی ترتیب بھی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ ہم لوگ خصوصی طیارے سے مملکت کے مختلف شہروں میں اہم اداروں کی سیر کرتے رہے، لوگوں سے ملتے رہے۔ بہت سی دوستیاں اسی سفر میں کچھ ایسی بنیں کہ تا زندگی رفاقتوں کے یہ بندھ ٹوٹ نہ پائے۔ کانفرنس تو تین چار دنوں میں ختم ہو گئی مگر اسلامیوں کی غلغلہ انگیز بحثیں سچ پوچھیے تو تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ہر پل ایسا لگتا تھا جیسے ہم لوگ صحوۃ کے تابناک لمحات میں جی رہے ہوں، جیسے بہت جلد تاریخ کی کمان دوبارہ ہمارے ہاتھوں میں تھمائی جانے والی ہو۔

۳۶

متاع بالمعروف

صحوۃ کے ان غلغلہ انگیز ایام میں نہ جانے میں کب تک نجد وحجاز کی پر لطف مجلسوں کا لطف اٹھاتا رہتا کہ اچانک ایسا لگا کہ ان محفلوں سے اب دل اچاٹ ہوتا جا رہا ہو۔ ایک صبح حرم مکی کے جوار میں واقع ہوٹل اجیاد میں ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا، دسترخوان پر انواع واقسام کی نعمتیں سجی تھی مگر دل کچھ کھانے پر آمادہ نہ تھا۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ یہ سب اپنی درویش طبیعت کے سبب ہے جسے پر آسائش ہوٹلوں میں نرم وگداز گدّوں پر سونے کے بجائے فرش پر سونا زیادہ پسند ہے اور جسے مرغن اور لذیذ کھانوں کے بجائے ہمیشہ سے سادہ فطری غذا، تازہ پھل اور دال روٹی زیادہ عزیز رہی ہے۔ لیکن چند دنوں میں جب علامات واضح ہونے لگیں تو پتہ چلا کہ یہ کوئی روحانی تجربہ نہیں بلکہ یرقان کا شدید حملہ ہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اسی سفر میں شمالی افریقہ کے بعض ممالک کا بھی لگے ہاتھوں دورہ کر لیا جائے۔ بعض احباب اس بات پر مصر تھے کہ میں اپنی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے لیے برطانیہ کی لائبریریوں کا رخ کروں اور محب مکرم سید حسن مطہر صاحب، جو ان دنوں مسلم ورلڈ لیگ جرنل کے مدیر اعلیٰ تھے، نے تو اس سفر کے سارے ضروری انتظامات بھی کر رکھے تھے مگر میرے لیے اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں فی الفور وطن واپس لوٹ آوں۔ دورانِ سفر طبیعت کچھ اس طرح بگڑی جیسے کوئی شکستہ جہاز مسلسل موجوں کے طلاطم میں ہو بلکہ چار گھنٹوں کے ہوائی سفر میں تو کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے یہ زندگی کا آخری سفر ہو۔ دہلی ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی نزلے زکام کا شدید حملہ ہوا۔ بعد از خرابیٔ بسیار بھائی جان کی معیت میں کسی طرح گھر پہنچا۔ ابّا مجھے اس قدر بیمار اور بے حال دیکھ کر پریشان ہو اٹھے۔ کوئی تین بجے صبح کا عمل ہوگا، میں تیز بخار میں تپ رہا تھا جبھی مجھے اپنی پیشانی پر ابّا کی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ وہ میری تپتی پیشانی پر اپنا ہاتھ پھیرتے جاتے اور **یانار کونی برداً و سلاما علی ابراھیم** کا ورد کرتے جاتے۔ نہ جانے ان ہاتھوں میں کیا اثر تھا کہ تھوڑی دیر میں بخار کی شدت جاتی رہی، بے کلی اور بے چینی میں افاقہ ہوا۔ تبھی ابّا کی زبانِ مبارک سے یا مسبب الاسباب کا نعرہ بلند ہوا اور وہ حسب معمول تہجد کی نماز میں مشغول ہو گئے۔

چند دنوں بعد جب طبیعت ذرا بحال ہوئی تو پتہ چلا کہ ملک میں ایک نئے طوفان کی آمد آمد ہے۔ مدت سے بند پڑی بابری مسجد جس میں دسمبر ۱۹۴۹ء کی ایک شبِ تاریک میں بعض شرپسندوں نے رام للّا کی مورتی ڈال کر غاصبانہ قبضہ کی کوشش کی تھی اور جس پر انتظامیہ نے غیر قانونی طور پر نقصِ امن کے بہانے تالا ڈال رکھا تھا وہ اچانک ہندوؤں کے درشن کے لیے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو کھول دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ حکومت کی ایما اور انتہا پسند ہندو تنظیموں کی ملی بھگت سے کچھ اس طرح انجام پایا کہ مسلمان اس کے اسرار و عواقب کا پوری طرح اندازہ نہ کر پائے۔ گزشتہ چند مہینوں سے مسلمانوں کی ملی اور سیاسی قیادت مسلسل حکومت کے رابطے میں تھی۔ شاہ بانو کیس کے ممکنہ اثرات سے بچنے کے لیے ایک نئے بل کا مسودہ حکومت کو پیش کیا جا چکا تھا۔ مسلم علما و دانشوروں کو اس بات کی امید ہو چلی تھی کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی مسلمانوں کے تئیں اپنی ذاتی ہمدردی اور شخصی دلچسپی کے سبب مسئلہ کا کوئی نہ کوئی مناسب حل نکال ہی لیں گے۔ طاہر محمود جو ان دنوں دہلی یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے اور جنھوں نے بورڈ کی ایما پر راجیو گاندھی سے مل کر انھیں نفقہ مطلقہ کے سلسلے میں شریعت کی باریکیوں سے آگاہ کیا تھا ان کی توقعات کا درجۂ حرارت تو اتنا بلند تھا، کہ اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق، وہ ہر طرف یہ کہتے پھرتے تھے کہ مسلمانوں کے مسئلہ کو حکومت میں صرف ایک شخص سمجھتا ہے اور وہ ہے راجیو گاندھی کی ذاتِ گرامی۔ خود وزیر اعظم راجیو گاندھی اس بات کا عندیہ دیتے رہے تھے کہ وہ شاہ بانو کیس سے پیدا ہونے والے 'مداخلت فی الدین' کے ازالے کے لیے جلد ہی ایک بل پارلیمنٹ میں لانے والے ہیں۔

ادھر ۱۹۸۳ء سے مسلم مجلس مشاورت کی طرف سے دہلی کی ان مسجدوں کی بحالی کی تحریک بھی چلائی جا رہی تھی جو آزادی کے بعد سے حکومت کی تحویل میں ہیں۔ اس سلسلہ میں سید شہاب الدین اور دوسرے سرکردہ لیڈروں کی جانب سے مسز گاندھی کو میمورنڈم بھی پیش کیا جا چکا تھا۔ اب راجیو حکومت کے دور میں شاہ بانو تحریک نے مسلمانوں کی جتھہ بندی کا جو ملک گیر منظر پیش کیا اور حکومت جس طرح مسلمانوں کی مذہبی اور ملّی قیادت سے گفت و شنید کرتی نظر آئی، اس سے عام ہندو حلقوں میں بھی یہی تاثر پیدا ہوا کہ حکومت مسلمانوں کے ووٹ کے لیے ان کی خوشامد اور منہ بھرائی (تشٹی کرن) پر اتر آئی ہے۔ بقول علی میاں ندوی، جیسا کہ انھوں نے 'کاروانِ زندگی' میں لکھا ہے، اس عرصے میں وزیر اعظم سے ان کی 'بے تکلف' ملاقاتیں ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی اور روحانی قیادت نے راجیو گاندھی کو کچھ اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ وہ وہی بولتے ہیں جو مسلمان چاہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ شاہ بانو بل پر ابھی گفتگو چل ہی رہی تھی کہ انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے فی الفور بابری مسجد کا تالا کھلوا دیا۔ حکومت کے اس

اچانک اقدام سے مسلم قیادت ایک مخمصہ کا شکار ہوگئی۔ جس وزیراعظم کی معاملہ فہمی اور شریف النفسی کے سلسلے میں وہ اب تک رطب اللساں رہے تھے اس نے حساب برابر کرنے کے لیے مسلمانوں کو تحفظ شریعت اور ہندوؤں کو بابری مسجد میں غاصب رام للاّ کے مورتی کے درشن کی اجازت دے دی تھی۔ مگر مسلمان کرتے بھی کیا۔ ابھی بل کا پارلیمنٹ میں پاس ہونا باقی تھا، وہ پوری تندہی سے مجوزہ بل کے نوک پلک درست کرنے میں لگ گئے۔

ان ہی دنوں پاکستان ٹائمز میں نفقہ مطلقہ سے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا تھا جس میں شاہ بانو کیس میں ہندوستانی سپریم کورٹ کے موقف کی توثیق کی گئی تھی۔ مضمون نگار کا کہنا تھا کہ ایک ایسی بے سہارا عورت کو جس کا طلاق کی صورت میں اب کوئی پرسانِ حال نہ رہ گیا ہو، اس کے گزربسر کے لیے سابق شوہر سے معقول رقم کا حصول عین قرینِ انصاف اور قرآن کی اصل روح کے مطابق ہے۔ **وللمطلقات متاع بالمعروف حقاً علی المتقین** کی تعبیر میں مسلمانوں کے روشن خیال حلقوں کا یہ کہنا تھا کہ متاع بالمعروف ایک ایسی گراں بہا رقم ہے جو مطلقہ کو کسی کا دست نگر بننے سے بچا سکے۔ گویا متقی مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ علیحدگی کی صورت میں بھی اپنی سابقہ بیوی کے سلسلہ میں حسنِ سلوک اور جود وسخا کا مظاہرہ کریں۔ روایتی حلقوں کا کہنا تھا کہ یہ آیت دراصل تلقین وترغیب کی قبیل سے ہے۔ اسے حکم اور قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ دوسری طرف روشن خیال حلقوں کی دلیل یہ تھی کہ کسی نادار اور بے سہارا کی خبرگیری اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تو ویسے بھی اسلام میں ایک مستحسن امر ہے، چہ جائیکہ وہ کوئی ایسی عورت ہو جو خود اس کے اپنے طلاق کے فیصلہ سے متاثر ہوئی ہو، اور جس کے نتیجے میں ایک بے سہارگی کی زندگی اس کا مقدر بن گئی ہو۔ پھر ایک خدا ترس شوہر متاع بالمعروف کی تلقین سے کیوں کر چشم پوشی کرے گا۔ دستور ہند کی دفعہ ۱۲۵ جس کے تحت شاہ بانو کو اپنے سابق شوہر سے گزارہ بھتہ دلانے کی بات کہی گئی تھی، ابتداً دستور میں دفعہ ۴۸۸ کی شکل میں ان محرومین کے لیے وضع کی گئی تھی جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۳ء میں مطلقہ عورتوں کو بھی اس زمرے میں داخل کیا گیا اور یہ بات بھی واضح کردی گئی کہ گزارہ بھتہ کی رقم سابق شوہر کے مالی حیثیت کے مطابق ہو اور ۵۰۰ روپے سے زائد تو ہرگز نہ ہو۔ شاہ بانو کے کیس میں ان کے شوہر کی مالی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کورٹ نے ۱۷۹ روپے ماہانہ کی رقم طے کی تھی۔ بورڈ کے روایتی علما کا کہنا تھا کہ طلاق کی صورت میں جب مطلقہ سے مرد کا کوئی تعلق ہی نہ رہا، وہ اس کے لیے اجنبی بن گیا تو پھر وہ کسی اجنبی عورت کا خرچ کیوں اٹھائے۔ بورڈ نے اس کا حل یہ نکالا کہ مرد سے متاع بالمعروف کے حوالہ سے حسنِ سلوک کا مطالبہ کرنے کے بجائے مطلقہ عورت کے عزیز واقارب پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈال

دی جائے اور اگر اس کے عزیز واقارب اس پوزیشن میں نہ ہوں تو وقف بورڈ اس کی کفالت کا ذمہ لے۔ مسلم علما اس بات سے ناواقف نہیں تھے کہ وقف بورڈ اپنی بدانتظامی اور بدعنوانی کے سبب اپنے ملازمین اور ائمہ مساجد کو معقول تنخواہوں کی ادائیگی سے قاصر ہے۔ ایسی صورت میں بے سہارا مطلقہ عورتوں کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑنا ایک سنگ دلانہ اور مجرمانہ مشورہ ہے۔ مگر انھوں نے شریعت کی جو تعبیر پڑھ رکھی تھی اس میں تلقین وترغیب کو احکام میں بدلنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، پھر وہ بیچارے کرتے بھی کیا۔

کہتے ہیں کہ پاکستان ٹائمز کے اس کو مضمون پڑھنے کے بعد راجیو گاندھی حیص بیص کا شکار ہوگئے تھے۔ غالباً ارون شوری نے انھیں یہ مضمون اس نوٹ کے ساتھ بھیجا تھا کہ ہندوستانی علما نفقہ مطلقہ کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو جس طرح خلافِ شریعت بتارہے ہیں، فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ پڑوسی ملک میں اس بارے میں مسلمان اہل علم کی رائے مختلف ہے۔ راجیو گاندھی نے اس مضمون پر نجمہ ہبت اللہ سے رائے طلب کی جنھوں نے بورڈ کے علما سے تبادلۂ خیال کے بعد بتایا کہ اہل علم کے بعض محدود حلقے ہی متاع بالمعروف کی تشریح میں اس موقف کے حامل ہیں، ورنہ سواد اعظم روایتی علما کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نجمہ ہبت اللہ نے وزیر اعظم کو یہ مصلحت بھی سمجھائی کہ روایتی علما جن کے پیچھے جمہور مسلمانوں کی طاقت ہے، اگر ان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کیا گیا تو کانگریس اپنے مسلم ووٹ بینک سے محروم ہوجائے گی۔ یہ بات راجیو گاندھی کی سمجھ میں آگئی اور انھوں نے مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے پارلیمنٹ سے ایک نئے بل کی توثیق کا ارادہ کرلیا۔ بالآخر بل کا مسودہ تیار ہوا۔ بورڈ کے علما اور ان کے ماہرین قانون نے ایک ایک شق کو خوب چھان پھٹک کر دیکھا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نکتہ پر کسی کی توجہ نہ گئی کہ نئے بل میں بھی سپریم کورٹ کے پرانے فیصلہ کی گنجائش جوں کی توں برقرار رہی۔ نئے بل کی دفعہ 3 میں صریح الفاظ میں لکھا گیا تھا:

> "Not withstanding anything contained in any other law for the time being in force, a reasonable and fair provision and maintenance to be made and paid within the iddat period by her former husband".

حیرت ہے کہ نہ تو ہمارے علمائے عظام کو اور نہ ہی بورڈ کے قانونی ماہرین کو اس بات کا ادراک ہوسکا کہ اس شق میں within the iddat period کے الفاظ آئے ہیں، the iddat period for کے نہیں۔ گویا یہاں اس بات پر سارا زور ہے کہ عدت کے دوران ہی متاع بالمعروف کی ادائیگی کو یقینی بنایا جائے۔ برسوں بعد سال 2001 میں بمبئی ہائی کورٹ نے کریم بنام کریم کے ایک مقدمہ میں اس نکتہ کی عقدہ کشائی کردی کہ یہاں within سے مراد عورت کو ایک مناسب اور معقول رقم عدت کے دوران ہی دلوانے کی بات کہی گئی ہے۔

ستمبر ۲۰۰۱ء میں جب یہ مقدمہ سپریم کورٹ پہنچا تو عدالت عظمیٰ نے اس بات کی مزید توثیق کردی کہ اس قانون کی شق ۳(۱) الف صرف ایام عدت کا احاطہ نہیں کرتی، بلکہ 'مطلقہ کی بقیہ زندگی پر بھی محیط ہے تا آنکہ اس کی کسی دوسری جگہ شادی ہوجائے'۔ البتہ اسے نفقہ کی رقم ایام عدت کے دوران ہی ادا کرنی ہے اور یہ رقم معقول اور مناسب ہونی چاہیے، جو صرف ایامِ عدت کے لیے کفالت نہ کرے کہ یہاں for کا لفظ نہیں بلکہ within کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ تو وہ صریح قانونی موشگافیاں تھیں جن کا بورڈ کے روایتی علما اور ان کے قانونی ماہرین، جن میں عبدالرحیم قریشی، سلمان خورشید اور طاہر محمود جیسے صاحبانِ علم بھی شامل تھے، بروقت ادراک نہ کرسکے۔ بل کا مسودہ جب آخری مرحلے میں آیا تو اس میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی کہ اگر کوئی مسلم خاتون مجوزہ قانون کے بجائے دفعہ ۱۲۵ کے سیکولر قانون کے تحت ہی اپنا مقدمہ فیصل کرانا چاہتی ہے تو اسے اس بات کا بھی اختیار حاصل ہوگا۔ دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے آخری لمحے کا یہ اضافہ پوری شریعت مہم کی نفی تھی۔ شاہ بانو نے بھی تو اسی شق کا فائدہ اٹھا کر اپنے حق نفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔ پھر اگر مسلمان عورت کے لیے اس سیکولر متبادل کا راستہ کھلا ہی رکھنا تھا تو تحفظ شریعت کے نام پر اتنی ہنگامہ خیز مہم کیوں چلائی گئی تھی۔ مسلمانوں کو تحفظ شریعت کے نام پر تو کچھ نہ مل سکا، نئے بل نے پرانی صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ برسوں بعد منی شنکر ائیر نے اس بات کو راجیو گاندھی کی عبقریت پر محمول کیا کہ انھوں نے مسلم خواتین بل میں کچھ ایسی بات رکھ دی کہ روایتی علما نے انھیں شریعت کا پاسبان سمجھا اور نئے بل کے پاس ہوجانے کے باوجود صورت حال میں سرِ مو کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے کمالِ عیاری کے ساتھ مسلمانوں کے مفروضہ تشٹی کرن کے الزام سے بچنے کے لیے انتہا پسند ہندوؤں کو بابری مسجد کا تحفہ عطا کردیا۔ غیر قانونی طریقے سے مسجد کا تالا کھلوا کر سچ پوچھیے تو انھوں نے اوّلین کارسیوک کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا نام رقم کروالیا۔

۳۷

شیوشکتی کا جاپ

وطن مالوف میں میرے قیام کو اب کوئی ایک ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران بیماری کی علامتیں تو جاتی رہیں البتہ نقاہت ابھی باقی تھی۔ اب زیادہ تر وقت یا تو بستر میں لیٹے ہوئے اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں گزرتا یا پھر گاہے بہ گاہے حسب توفیق مکتبہ کی مجلس میں جا بیٹھتا۔ میری بیماری کی اطلاع نجد و حجاز کی سرزمین سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں بھی احباب کے حلقے میں پھیل گئی تھی۔ ایک دن بنارس سے مولانا مقتدیٰ حسن ازہری کا خط ملا جس میں انھوں نے یہ لکھا تھا:

> 'یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی کہ آپ کو یرقان کی شکایت ہوگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو مکمل اور فوری صحت سے نوازے۔' اسی خط میں انھوں نے یہ مشورہ بھی دے ڈالا تھا کہ 'لندن کے لیے آپ کا پروگرام اچھا ہے۔ حالات جب اجازت دیں ضرور تشریف لے جایئے اور وہیں سے دین کی خدمت کا پروگرام بنایئے۔'

مقتدیٰ صاحب سے میری ملاقات ریاض کی اسی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ وہ بھی اکثر ان بے تکلف شبینہ مجلسوں کا حصہ ہوتے جس میں صحوۃ اسلامیہ کے علم بردار بڑے بڑے منصوبے تشکیل دیتے۔ مختلف بلاد و امصار میں اسلامی تحریک کی کامیابیوں اور نئی فتوحات کا تذکرہ ہوتا۔ ان کے مکتوب نے ایسا لگا جیسے ایمان انگیز یادوں کے دریچے کو پھر سے وَا کر دیا ہو۔ مجھے ڈاکٹر عبدالقادر عثمان علی یاد آئے جو تنزانیہ میں امور امت کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جو صرف مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے مختص ہو۔ انھیں میری گفتگو میں فکر فردا کی نہ جانے کون سی آمیزش نظر آئی کہ انھوں نے مجھے اپنے نئے نویلے مرکز کی زیارت کی دعوت دے ڈالی۔

ایک دن کانفرنس کے کسی عشائیے میں شیخ بن باز سے ملاقات کی تقریب نکل آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو جواں سال سعودی شہزادے شیخ کی خدمت میں پھل کاٹ کر پیش کرتے جاتے ہیں۔ شیخ بصارت سے محروم تھے، لیکن بصیرت سے قدرت نے انھیں وافر حصہ عطا کیا تھا۔ چند منٹوں کی ملاقات میں انھوں نے

میرے کوائف کو کھنگالا، پی ایچ ڈی کے موضوع کی بابت پوچھا اور پھر موضوع کے سحر میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ ایک مختصر سی تقریر کرڈالی۔ شیخ سے یہ تعارف اگلی ملاقاتوں اور ان کی مجلسوں میں حاضری کا بہانہ بن گیا۔ ایک دن شیخ کے اصرار پر دوپہر کا کھانا ان کے گھر پر کھانے کا اتفاق ہوا۔ دسترخوان پر ان کے مترجم خاص مولوی لقمان سلفی اور پروفیسر عبدالجلیل بھی موجود تھے، آخر الذکر جامع امام میں انگریزی کے سینئر پروفیسر تھے۔ دعوت وتبلیغ کی مجلسوں میں ان کی بڑی توقیر تھی۔ غیرمسلموں میں دعوت کے کام کا انھیں اچھا تجربہ تھا۔ عبدالجلیل صاحب کا بھی اصرار تھا کہ میں صحوۃ کے اس سفینے میں سوار ہوجاؤں جو فی زمانہ نجد و حجاز کی سرزمین پر رواں دواں ہے اور جس کی تابانی سے عنقریب ایک عالم منور ہونے کو ہے۔ شیخ نے ابھی چندنوالے ہی تناول فرمائے ہوں گے کہ تین چار بدو ہماری سینی کے گرد آبیٹھے۔ وہ اسی سینی سے نوالہ لیتے جاتے اور شیخ کی خدمت میں اپنی معروضات بھی عرض کرتے جاتے۔ کھانے کے اختتام تک انھوں نے بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔ ان کا لہجہ بدویانہ اور درشت تھا۔ اس کے جواب میں شیخ صرف یہی کہتے کہ سنیچر کے دن دفتر میں آنا وہاں اس قضیے کا کوئی حل نکالیں گے، مگر ان بدوؤں پر تین دنوں کی مہلت شاق تھی۔ کہنے لگے تم جھوٹے ہو، بات کو ٹالنا چاہتے ہو، اگر سنجیدہ ہوتے تو اس مسئلہ کو یہیں فی الفور حل کرنے کی کوشش کرتے۔ شیخ دفتر اور گھر کے فرق کی نزاکت بتاتے رہے لیکن ان بدوؤں نے جھوٹے اور مکار ہونے کا الزام ان سے واپس نہ لیا۔ جاتے جاتے یہ کہتے گئے کہ بن باز تمھیں خدا ہی ہدایت دے۔ میں نے دیکھا کہ شیخ کے چہرے پر خفگی کے ذرا بھی آثار نہ تھے۔ بن باز کی مجلسوں میں جب بھی بیٹھا ان کی کھردری، سادہ اور شفاف شخصیت کی عظمت بلکہ ہیبت کا نقش دل و دماغ پر گہرا ہوتا جاتا۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جہیمان اور اس کے انقلابی ساتھیوں کو، جنھوں نے پندرہویں صدی کی پہلی صبح کو حرم مکی میں ایک نئے انقلاب کا علم بلند کیا تھا ان نوجوانوں کی سزائے موت کے حکم نامے پر شیخ نے کس جگر سے دستخط کیے ہوں گے۔ حیرت ہوتی کہ کیا واقعی تعبیر کا اختلاف دین مبین کے مخلص حاملین کو اس طرح باہم متحارب کرسکتا ہے۔

ایک صاحب تھے راشد راجع، امّ القریٰ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ اتفاق سے میں نے کانفرنس کی جس نشست میں ہندوستانی مسلمانوں کے ثقافتی مسائل پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا وہ اس جلسہ کی صدارت کررہے تھے۔ جلسہ کے خاتمے پر انھوں نے مجھے مکہ آنے کی دعوت دی اور وہیں کھڑے کھڑے ایک نوجوان استاد کی حیثیت سے میرا تقرر کرڈالا۔ صحوۃ کے اس سفینے کی سواری کبھی قلب ونظر کو اپنی طرف کھینچتی اور کبھی یہ خیال آتا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور گزر رہی ہے، اس مشکل صورت حال میں ایک نظری اور فکری راستے کی دریافت کا کام کہیں اہم ہے۔ کاش کہ لوگ اس حادثۂ فاجعہ کی حقیقت کو سمجھ پاتے۔

کاش کہ وہ سیکولر ڈیموکریسی کی اس تعذیب گاہ پر مطلع ہو پاتے جس کا عذاب ہی یہ ہے کہ وہ اوشوتز سے بدتر ہونے کے باوجود ایک آزاد جمہوری فضا ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

اب تک شہر میں میرے قیام اور میری بیماری کی اطلاع احباب کے حلقے میں پھیل چکی تھی۔ وقتاً فوقتاً لوگ مزاج پرسی کے لیے آتے رہتے۔ ایک دن اسکول کے کچھ پرانے ساتھی ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے بعض کو کئی برس بعد دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ظفر نے ابھی حال ہی میں بینک کی منیجری کا امتحان پاس کیا تھا۔ سجاد میڈیکل کے تیسرے سال میں تھے اور ان کی گفتگو سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی تھرڈ ائیر سینڈ روم سے باہر نہیں آپائے ہیں۔ آصف کے ہاتھ میں سنڈے میگزین اور انگریزی اخبارات کا پلندہ دیکھ کر میری طبیعت پھڑک اٹھی۔ میں نے کہا واللہ تم اب تک صحیفۂ دجال کے سحر میں مبتلا ہو۔ آصف سے میری ملاقات پچھلے سال بھی ہوئی تھی۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا، اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں منہمک پایا۔ ان کی صبح ان ہی اخبارات و رسائل کی تلاوت سے شروع ہوتی۔ وہ خبروں کو اس انہماک سے پڑھتے جیسے صحیفۂ ربانی پڑھ رہے ہوں۔ تب ہم لوگ اخبارات کو صحیفۂ دجال کہا کرتے جس نے اکثر مسلم گھروں میں تلاوت قرآن کی جگہ لے لی تھی۔ آصف کے پاس ہمیشہ خبروں کا خزانہ ہوتا۔ جزویات اور تفصیلات پر ان کی نظر ہوتی۔ اپنے خاص انداز میں جب وہ ان خبروں کو داستان بنا کر پیش کرتے تو ایسا لگتا جیسے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔ ہم لوگ انھیں ان کی سحر البیانی کے سبب آصف بی بی سی کہا کرتے۔ آج انھوں نے آتے ہی بابری مسجد کا قضیہ چھیڑ دیا۔ بولے: پتہ ہے اب ملک میں آئندہ کیا ہونے کو ہے۔ پھر خود ہی جواب دیا کہ فرقہ پرستی کا عفریت اب آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔

پھر کیا کیا جائے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: کرنے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔ پہلا مرحلہ تو سمجھنے اور منصوبہ بندی کا ہے۔ احیا پرست تنظیمیں ایک عرصہ سے منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ ان کا ایک ایک قدم سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا ہے۔ مسلم قائدین کے اخباری بیانات اور ایکشن کمیٹی کی خالی خولی دھمکیاں ان کا سدباب نہیں کرسکتیں۔

پھر کیا کیا جائے، کچھ تو بتاؤ؟ میں نے پھر پوچھا۔

بولے: غور و فکر۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ سنجیدہ اور پیمبرانہ غور و فکر جس میں غارِ حرا والا ارتکاز شامل ہو تاکہ خدا ہمارے دل میں اس پیچیدہ مسئلہ سے نپٹنے کے لیے ترکیبیں ڈال دے۔ یہ کہتے ہوئے آصف کے لہجہ میں غایت درجہ کی سنجیدگی آگئی۔ بولے: اگر اس مسئلہ کو کمالِ بصیرت سے حل نہ کیا گیا تو آنے والے

دنوں میں اس آگ کی لپٹیں اسلامیانِ ہند کے آشیانوں کو جلا ڈالیں گی۔

ارے بھئی فلسفیانہ باتیں نہ کرو، کوئی عملی ترکیب بتاؤ، ظفر نے مداخلت کی۔

عملی ترکیب تو مشترکہ غور وفکر سے بنے گی۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے قدم صحیح سمت میں اٹھیں۔ اور ہاں یہ جو چار پانچ سالوں میں ملک کے منظرنامے میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے، اس کے حقیقت پسندانہ تجزیے کی ضرورت ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے جب وشوا ہندو پریشد نے ملک بھر میں ایکت ماتا یجنا یعنی ہندوؤں کے ملک گیر اتحاد کی تحریک چلائی تھی اور صرف ڈھائی تین سال کے عرصے میں ملک کا منظرنامہ اتنا بدل گیا کہ آج ہر طرف مسلمانوں کے خلاف نفرت کا آتش فشاں پھٹتا دکھائی دیتا ہے۔

میرے خیال میں ۱۹۸۳ء سے بھی پیچھے جانے کی ضرورت ہے، ظفر نے مداخلت کی۔ بولے: احیا پرست ہندوؤں کی بے چینی تو اسی وقت شروع ہوگئی تھی جب ۱۹۸۱ء میں میناکشی پورم میں بڑے پیمانے پر قبول اسلام کے واقعات پیش آئے تھے۔ انھیں ایسا لگا گویا خطرے کی گھنٹی بج گئی ہو۔

'میناکشی پورم ایک فیکٹر ضرور ہے، لیکن ہمیں ذرا اور پیچھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی غلطی تو میں سمجھتا ہوں کہ جے پرکاش نارائن سے ہوئی' سجاد جواب تک خاموش بیٹھے تھے، انھوں نے اپنا موقف صیقل کرتے ہوئے کہا۔ بولے: جنتا حکومت میں احیا پرست ہندوؤں کو پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ کانگریس آئی کا قلعہ ناقابلِ تسخیر نہیں۔ اور یہ کہ اسلام مخالف پروپیگنڈے اور مسلم دشمنی کی مہم میں وہ بآسانی منافق کانگریس کو مات دے کر اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ تبھی سے آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیمیں مسلم دشمنی کو سیاسی منشور میں بدلنے کی ترکیبیں سوچتی رہی ہیں۔

تمھاری بات درست ہے۔ میناکشی پورم کے واقعات نے انھیں ایک موقع فراہم کر دیا کہ وہ اس ملک میں ہندوؤں کی مظلومیت کا پرشور پروپیگنڈہ کر سکیں۔ ۸۳ء میں تو خیر ملک گیر سطح کی مہم چلائی گئی تھی۔ ملک بھر میں ہندوؤں کو متحد کرنے کے لیے ۹۲ چھوٹے بڑے کارواں کئی مہینوں تک مختلف سمتوں میں متحرک رہے۔

'اس کے پیچھے تو بڑی منصوبہ بندی رہی ہوگی؟'

میرے اس سوال پر آصف نے پہلو بدلا۔ بولے: ارے بھئی آزاد ہندوستان میں بلکہ کہہ لیجیے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کی صدیوں کی تاریخ میں اتنی بڑی کوئی اور تحریک دیکھنے کو نہیں ملتی جو اس قدر منظم انداز سے ملک گیر سطح پر چلائی گئی ہو اور جس میں تمام فرقے کے ہندوؤں کو شامل کیا گیا ہو، حتیٰ کہ وہ دلت

آدیباسی، جین اور سکھوں کے بعض دھڑے بھی جو کبھی بھی ہندومت کا حصہ نہیں رہے۔ ذرا اندازہ کریں کہ صرف ایک کارواں جو کاٹھمنڈو سے رامیشورم کی طرف روانہ ہوا وہ تین لاکھ گاؤں سے ہو کر گزرا۔ پچاس ہزار میل کی مسافت طے کی۔ دوسرا بڑا قافلہ بنگال کے گنگا ساگر سے لے کر سومناتھ کی طرف روانہ ہوا اور تیسرے قافلے نے ہری دوار سے کنیا کماری تک مسافت طے کی۔ میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب گنگوتری کا پانی لے کر ٹرکوں کا قافلہ شہروں اور دیہاتوں سے گزرتا تو ٹھاکر عورتوں کے ساتھ دلت عورتیں بھی برکتوں کے حصول میں ان کے شانہ بہ شانہ نظر آتیں۔ پوری اور دوارکا کے شنکراچاریہ جو ہمیشہ سے چھوت چھات کے حق میں رہے ہیں، انھوں نے بھی نیچی ذات کے ہندوؤں کو اس طرح خلط ملط ہوجانے کی خاموش اجازت دے دی۔

ہندوؤں کے اور بھی تو مٹھ ہیں ان کا کیا موقف ہے؟ ظفر نے پوچھا۔

بڑے مٹھ چار ہیں، دو تو یہی پوری اور دوارکا کے۔ اس کے علاوہ جیوتر پیٹھ اور سیرنگوری کے شنکراچاریہ کو بھی مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں کی طرف سے تو کوئی بیان سامنے نہیں آیا، البتہ پوری کے شنکراچاریہ نرنجنا دیوتر تھا جو اپنے آپ کو ایک سو چوالیسواں جگت گرو کہتے ہیں، وہ مسلسل نفرت کی اس مہم کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حکومت ہندو مخالف ہے جو مسلمانوں کی منہ بھرائی کے لیے مسلم خواتین کے سلسلے میں پارلیمنٹ میں نیا بل لانا چاہتی ہے۔ البتہ دوارکا کے شنکراچاریہ اس ساری مہم کو سیاسی شعبدہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

مسلمانوں کو اس نازک وقت کے لیے پہلے سے ہی تیاری کرنی چاہیے تھی، ظفر نے رائے دی۔

بولے: یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی منظم اور منصوبہ بند مہم کا مسلم علما اور دانشوروں کی طرف سے بروقت نوٹس کیوں نہ لیا گیا؟

پہلی بار ہندوؤں کے ۸۵ مختلف فرقوں کے سادھو سنت ایک مارگ درشک منڈل (یگنہ) میں جمع ہوئے۔ اسی موقع پر ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی صف میں بھارت ماتا کے نام سے ایک نئی دیوی کا اضافہ ہوا۔ آصف نے داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اچھا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ بھارت ماتا کی دیوی جو تصویروں میں شیر پر سوار دکھائی جاتی ہے، ایک تازہ بہ تازہ ایجاد ہے، سجاد نے کہا۔

مگر ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی موجودگی کے باوجود ایک نئی دیوی کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ ظفر نے سوال کیا۔

یہ سن کر آصف مسکرائے۔ بولے: پرانے دیوی دیوتاؤں سے ایک ایسے مذہب کا ہیولیٰ نہیں تشکیل دیا جاسکتا تھا جو ہندوؤں کے مختلف فرقوں کو ایک نکتہ پر مجتمع کر سکے۔ بھارت ماتا کا تصور اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے لایا گیا۔ حالانکہ انھیں خوب معلوم ہے کہ قدیم اکھنڈ بھارت جس میں پاکستان، بنگلہ دیش کے علاوہ نیپال، سری لنکا، بھوٹان، میانمار اور افغانستان تک کی سرحدیں شامل تھیں، اب ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی ایک نئی مصنوعی قومی شناخت کی تشکیل کے لیے لازم تھا کہ سرزمین ہند کو ایک لائق عبادت دیوی کی شکل میں متصور کیا جائے اور ہندو قوم کو اس سرزمین، اس میں بہنے والی ندیاں اور اس کے قدیم تاریخی مذہبی مقامات کے محافظ کے طور پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ ایکت ماتا یجنا کا جلوس جب روانہ ہوا ہے تو ان کے قافلوں میں مختلف ندیوں کے متبرک پانیوں کا کلس برکتیں لٹاتا رہا۔ اس پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوؤں کا وقار ان کی قدیم عبادت گاہوں کی بحالی پر منحصر ہے، اور یہ کہ اس ملک میں جہاں رام کے نام لیوا اکثریت میں ہیں، آج بھی رام للاّ کی مورتی پر بابری مسجد کا قفل پڑا ہے۔ رام چاہتے ہیں کہ ان کے ماننے والے انھیں اس اسیری سے نجات دلائیں۔ مسجد کا تالا کھولا جائے اور ان کے درشن کی اجازت ہر خاص و عام کو ہو۔

' مگر ۱۹۸۳ء کی مہم میں '' تالا کھولو' ' کا مطالبہ شامل نہیں تھا'، ظفر نے واقعات کی ترتیب درست کرنے کی کوشش کی۔

ہاں تم درست کہتے ہو۔ ۸۳ء میں تو صرف زمین ہموار کی گئی۔ تالا کھولنے کی مہم تو اگلے سال شروع ہوئی جب وی ایچ پی نے رام جنم بھومی یجنا سمیتی بنائی اور رام کی مورتی کو سلاخوں کے پیچھے دکھایا اور پھر یہ مورتیاں مختلف شہروں میں اس خیال سے پھرائی گئیں کہ عام ہندوؤں میں رام کی مظلومیت کا تاثر قائم ہو جو اپنے ہی ملک میں آج بھی مسلمان بادشاہوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ تو ستمبر ۱۹۸۴ء کی بات ہے میں اس وقت سیتا مڑھی میں اپنے ننہال میں تھا۔ اس شورش کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ سیتا مڑھی کے بھی اپنے ہنگامے ہیں۔ وہاں سیتا کی جائے پیدائش کے حوالے سے دو مندر ہیں اور دونوں کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ سیتا اسی مقام پر پیدا ہوئی تھیں۔

یعنی بیک وقت دونوں مقام پر؟ سجاد نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ہاں، ایک مندر پورونا دھام میں واقع ہے اور دوسرا اس سے تین کلومیٹر دور جانکی استھان میں۔ دونوں کے پاس اپنے اپنے تالاب ہیں۔ ایک کا نام اُرجیوا کنڈ اور دوسرے کا نام سیتا کنڈ ہے۔ اور دونوں کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ راجا جنک جب قحط سالی کے خاتمہ کے لیے اپنے ہاتھوں میں ہل لے کر اِندر

سے بارش کی پرارتھنا کے لیے نکلےتو ان کے ہل سے تانبے کا کوئی کلس ٹکرایا اور اسی کلس سے سیتا کا ظہور ہوا۔ بعض لوگ جو ہر تنازع میں مفاہمت کا پہلو نکال لیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سیتا کے ظہور کی جگہ تو پورونا دھام ہی ہے، البتہ ان کی چھٹّی کی رسم جانکی استھان میں ہوئی تھی۔

اس وقت تو سیتامڑھی میں حالات کشیدہ رہے ہوں گے۔تم تماش بینوں میں کیسے شامل ہوگئے؟ میں نے ظفر سے پوچھا۔

بولے: اس وقت تو مقامی طور پر ایک جشن کا سماں تھا، البتہ جلوس جیسے جیسے آگے بڑھا اور ہندوؤں کی مظلومیت کا پروپیگنڈا عام ہوا، لوگوں کے جذبات مشتعل ہونے لگے۔ بات فسادات اور قتل وخون تک پہنچی اور سچ پوچھیے تو پھر حالات پوری طرح بے قابو ہوگئے۔

'تمھیں نہیں لگتا کہ رام جنم بھومی مکتی یجنا کی مہم نے ہندوازم کا ایک نیا قالب تشکیل دیا ہے؟' میں نے آصف سے جاننا چاہا۔

بولے: یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ میں تمھیں رام نومی اُتسو کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایودھیا میں سریو ندی کے کنارے لاکھوں رام بھکتوں کے ہجوم کو خطاب کرتے ہوئے ایک سادھو نے بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب تک تو ہم یہ تلقین کرتے تھے کہ 'جوتا کے کانٹا بووے تاہی بووے تو پھول' یعنی جو تمھارے راستے میں کانٹا بوئے، اس کے قدموں میں تم پھول نچھاور کرو۔ لیکن اب میں یہ کہتا ہوں کہ جوتا کے کانٹا بووے تاہی بووے تو بھالا—— وہ بھی ہم کو کیا سمجھے گا پڑا کسی سے پالا۔

اور وہ نعرہ بھی تو رتھ یاتراؤں میں ان دنوں خاصا مقبول ہوا: بچہ بچہ رام کا—— جنم بھومی کے کام کا۔ ظفر نے لقمہ دیا۔

ہاں ایک ملی ٹینٹ ہندوازم اپنے پورے جوبن پر ہے۔ گزشتہ سال اوڈوپی میں سادھوسنتوں کی جو دھرم سنسد منعقد ہوئی وہاں بھی شیوشکتی کا جاپ کریں گے —— اپنی رکشا آپ کریں گے، جیسے نعرے لگائے گئے۔ اس موقع پر پانچ لاکھ کا مجمع تھا۔ مختلف فرقوں کے نوسو سادھو جمع ہوئے تھے، جنھوں نے مشترکہ طور پر اس بات کا عہد لیا کہ وہ اب اپنے آپسی اختلافات بھلا کر نئی ہندو قومیت کی تعمیر کے لیے اپنے آشرموں اور مٹھوں سے نکل پڑیں گے۔ اشوک سنگھل کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی پچھلی چھ سو سالہ تاریخ میں ہندو اتحاد کا ایسا منظر کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس وقت پورا اتر پردیش بارود کے دہانے پر ہے۔ میرٹھ، مرادآباد، سنبھل، بارہ بنکی اور کاشی متھرا سے مسلسل تشویشناک خبریں آرہی ہیں۔ جنگجویانہ ہندوازم کے آگے اب حکومت بھی بے بس دکھائی دیتی ہے۔ آصف نے تشویش کا اظہار کیا۔

'ارے بھئی حکومت کیا بے بس ہوگی وہ تو خود اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔تم یہ بات بھول گئے ابھی دو سال پہلے مسز گاندھی نے مہاراشٹر میں پنچایت الیکشن کے موقع پر شیوسینا کے ساتھ انتخابی اتحاد کیا تھا۔ اور مسز گاندھی تو بھارت ماتا کی استھاپنا تقریبات ۱۹۸۳ء میں شرکت کرنے کے لیے بنفس نفیس ہری دوار بھی تشریف لے گئی تھیں۔کانگریس کے ایک لیڈر تھے داؤ دیال کھنہ وہ اتر پردیش میں کانگریس کے وزیر بھی رہے تھے۔ انھوں نے مسز گاندھی کو یہ خط بھی لکھا تھا کہ انھیں پردۂ غیب سے یہ القا ہوا ہے کہ ایودھیا، وارانسی، متھرا جیسی ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہوں کو اب آزاد کرانے اور انھیں واپس ہندوؤں کے حوالے کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

'ارے بھئی قصہ کیا ہے؟ کبھی انھیں غیب سے القا ہوتا ہے۔کبھی آپ سے آپ اچانک رات کی تاریکی میں مسجد کے اندر بھگوان پرکٹ ہوجاتے ہیں۔کبھی انھیں تعین کے ساتھ وہ جگہ معلوم ہوجاتی ہے جہاں بقول ان کے بھگوان رام پیدا ہوئے تھے'۔

'اور یہ جگہ بدلتی بھی تو رہتی ہے۔کل تک یہ لوگ مسجد کے باہر رام چبوترے کو رام جی کی جائے پیدائش بتاتے تھے اور وہاں رام کے نام کا جاپ ہوتا رہتا تھا اور اب ایک مدت سے رام للّا مسجد کے اندر براجمان ہیں'۔ ظفر نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

'میڈیکل سائنس میں ایک اصطلاح ہے جو دراصل ذہنی مریضوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بسااوقات دماغی چوٹ لگ جانے کے سبب مریض حقیقت کو خود تخلیق کرتا ہے اسے confabulation کا عمل کہتے ہیں۔مثلاً ایک شخص جو صبح سے شام تک ایک کمرے میں بند ہے۔آپ کو اپنی دن بھر کی کارگزاری بتاتے ہوئے یہ بیان کرے گا کہ آج شام وہ ساحل سمندر پر چہل قدمی کرکے آیا ہے جہاں موسم بھی بڑا شاندار تھا اور پرانے دوستوں سے ملاقات میں لطف بھی آیا۔اس طرح کے ذہنی مریض اپنے دعوے میں جھوٹے نہیں ہوتے۔حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ آج وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا اور اس شہر میں جہاں وہ رہتا ہے دور دور تک سمندر نہیں پایا جاتا، یہ ایک قابل رحم صورت حال ہوتی ہے'۔

'تم درست کہتے ہو'، آصف نے کہا۔ ہمارے خیال میں بعض اساطیری کرداروں سے متعلق نئے حقائق کی تشکیل بھی اسی زمرے میں آتی ہے ورنہ اہل فکر ہندوؤں پر یہ بات خوب واضح ہے کہ رام کوئی تاریخی کردار نہیں۔بعض محققین کا خیال ہے کہ ان کا زمانہ ایک ملین سال پہلے تریتا یگ کا ہے۔بعض مورخین چودہویں اور پندرہویں صدی قبل مسیح کو ان کا زمانہ بتاتے ہیں، لیکن کوئی یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ موجودہ ایودھیا واقعی رام چندر جی کا ایودھیا ہے۔اور جب ایودھیا کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا

مشکل ہوتو ان کی جنم بھومی کی نشاندہی کیسے کی جا سکتی ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ بابری مسجد رام چندر جی کی جائے پیدائش پر تعمیر ہوئی ہے تو یہ بات اس لیے بھی درست نہیں کہ تلسی داس نے رام چرتر مانس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔

یہ تلسی داس کس زمانے کے آدمی ہیں؟ ظفر نے پوچھا۔

بولے: 'اسی زمانے کے جب بابری مسجد تعمیر ہوئی۔ ۱۵۲۸ء بابری مسجد کی تعمیر کا سال ہے۔ اس وقت تلسی داس تیس سال کے جوانِ رعنا تھے۔ وہ موجودہ ایودھیا میں رہے اور وہیں انھوں نے اپنی شاہکار کتاب رامائن مرتب کی۔ اگر بابری مسجد رام کی جائے پیدائش پر وجود میں آتی تو تلسی داس جیسے رام کے معتقد اس تکلیف دہ صورت حال کا تذکرہ کرنے سے نہ چوکتے'۔

یہ سب باتیں تو درست ہیں لیکن اس خلط مبحث میں اصل سوال تو کہیں پیچھے رہ گیا۔تم نے یہ بات تو بتائی ہی نہیں کہ اس دھماکہ خیز صورت حال کے تدارک کے لیے ہمیں کرنا کیا چاہیے۔ میں نے آصف کی انسائیکلوپیڈیائی معلومات کو کام پر لگانے کی کوشش کی۔

ہاں تم صحیح کہتے ہو۔آصف تنقید وتجزیہ تو بڑی عالمانہ شان کے ساتھ کرتے ہیں۔اس فن میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں، مگر یہ مسئلے کا حل نہیں بتاتے۔ظفر نے چٹکی لینے کی کوشش کی۔

ارے بھئی تحلیل وتجزیے کی بھی کم اہمیت نہیں۔ڈائیگناسس اگر درست ہوتو بس یہ سمجھو کہ آدھا علاج تو ہو ہی گیا۔سجاد نے لقمہ دیا۔

یہ آپ لوگ مجھ سے ہر مسئلہ کا آخر حل کیوں چاہتے ہیں۔ میں نے تو پیمبری کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ بابری مسجد کے مسئلہ پر ہمیں وہ کچھ نہیں کرنا چاہیے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر ایکشن کمیٹی والے کررہے ہیں۔ایک طرف احیا پرست ہندوؤں کی منصوبہ بندی ہے، برسہا برس کی تیاری ہے اور دوسری طرف ہم اشتعال کے جواب میں اشتعال اور نعروں کے جواب میں جوابی نعروں سے کام چلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس طرح تو ہم ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے آصف نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چونک کو اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت کی اجازت چاہی۔ چلیے اقدامی عمل پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے میں نے دوستوں کو رخصت کیا۔

۳۸

بولتی عمارتیں

مکتبہ میں طب یونانی اور ہومیوپیتھی کی کتابوں کا بڑا وقیع ذخیرہ تھا۔ میں ان دنوں Hemiplegia سے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ بیماری دراصل دماغی چوٹ یا spinal cord کے مجروح ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اگر دماغ کا دایاں حصہ مجروح ہوجائے تو جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہوجاتا ہے اور اگر دماغ کا بایاں حصہ مجروح ہوجائے تو وہ جسم کے دائیں حصے کو پیغام نہیں بھیج پاتا۔ مریض کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اس کا جسم اب اس لائق نہیں کہ دماغ کے فیصلے کو عمل میں لاسکے۔ وہ اٹھنا چاہتا ہے پر اُٹھ نہیں پاتا۔ گویا دماغ اپنی پرانی دُنیا میں جیتا ہے اور اسے اپنے جسم کے مفلوج شدہ ہونے کا چنداں احساس نہیں ہو پاتا اور جب اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے کہ قویٰ اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو اس پر مایوسی کی شدید کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اس بیماری کی تفصیلات پڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا ذہن بار بار بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ہنگامہ خیز بیانات کی طرف منتقل ہوجاتا۔ ایکشن کمیٹی کے قائدین کے پاس اشتعال انگیز بیانوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا لگتا جیسے یہ لوگ Hemiplegia کے شکار ہوں۔ انھیں اس بات کا ذرّہ برابر بھی احساس نہ ہو کہ مدتِ مدید سے ان کے قویٰ مضمحل اور مفلوج ہیں۔ ان کے بیانات تو ایک طرح کی شعلہ فشانی سے معمور ہوتے، لیکن عملی اور اقدامی منصوبہ بندی کا سرے سے کوئی ذکر نہ ہوتا۔

آج سجاد کی زبان سے confabulation کا لفظ سن کر ایسا محسوس ہوا کہ بعض طبی اصطلاحیں سماجی اور سیاسی حقائق کو اپنی تمام تر جزویات کے ساتھ کچھ اس طرح مبرہن کردیتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انتہاپسند ہندوؤں نے نہ صرف یہ کہ ایک دانشورانہ confabulation کے زیر اثر مفروضہ حقائق کی ایک نئی دُنیا تشکیل دی ہے، بلکہ بڑی آسانی سے مظلوم کو ظالم کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ آزادی کے بعد سے زندگی کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کا گراف مسلسل گرتا رہا ہے، لیکن ان کی شاطر دماغی دیکھیے کہ مسلمانوں کی مظلومیت کی یہ داستان کچھ اس طرح مسخ ہوئی کہ اب اس ملک میں ہر طرف 'ہندو خطرے میں ہے' کا شور بپا ہے۔ قبضہ انھوں نے ہماری مسجد پر کیا ہے اور پروپیگنڈہ یہ ہے کہ رام للاّ مسجد کے آہنی دروازوں کے اندر محصور ہیں۔

ہندوؤں کو ان کے درشن کی اجازت نہیں۔ ملک بھر میں رتھ یاتراؤں کے ذریعے رام کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دکھایا جارہا ہے۔ عام بھولے بھالے ہندو اس بات پر ایمان لے آئے ہیں کہ رام اپنے ہی ملک میں قیدی ہیں جبکہ مسلمانوں کی منہ بھرائی کے لیے ایک نئے مسلم خواتین بل لانے کی تیاری ہے۔ میں نے سوچا یہ کیسا ظلم ہے کہ مسلمان جو پچھلے چالیس سال سے اس ملک میں ہر پل موت موت جیتے ہیں، ان ہی کے سر ہندوؤں کی مفروضہ مظلومی کا الزام بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں چانکیہ نیتی۔

ایک دن جب طبیعت میں تازگی اور نشاط کی کیفیت تھی، میں مکتبہ میں جا بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عبدالمعز والد صاحب کو اے جی نورانی کا کوئی تازہ مضمون پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ وہ چند جملے پڑھتے ہیں اور پھر درمیان میں خوبصورتی سے اپنا تبصرہ بھی ٹانک دیتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ دیکھیے بھگوان کے پرکٹ ہونے کی حقیقت سے نورانی صاحب نے کیا خوب پردہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے ایک ریڈیو میسیج کا حوالہ دیا ہے جو ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء صبح ساڑھے دس بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کے نائر کی طرف سے چیف منسٹر گووند بلّبھ، چیف سکریٹری اور ہوم سکریٹری کو ارسال کیا گیا تھا۔ اس پیغام کا متن کچھ اس طرح تھا:

> 'چند ہندورات کے وقت بابری مسجد میں اس وقت داخل ہو گئے جب وہ ویران پڑی تھی اور وہاں انھوں نے ایک مورتی نصب کردی۔ ڈی ایم اور ایس پی اور پولیس فورس موقع پر موجود ہیں، صورت حال قابو میں ہے۔ رات میں حادثے کے وقت پندرہ پولیس والے ڈیوٹی پر تھے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اس کو روکنے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔'

عبدالمعز نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بولے، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ مقامی تھانے میں پولیس نے جو ایف آئی آر درج کیا ہے اس میں بھی بھگوان کے پرکٹ ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سب انسپکٹر رام دوبے نے ایودھیا پولیس اسٹیشن میں ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جو ایف آئی آر لکھی ہے۔ اس ایف آئی آر کے مطابق:

> 'ماتا پرساد کا کہنا ہے کہ جب وہ صبح آٹھ بجے جنم بھومی پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ پچاس ساٹھ لوگ بابری مسجد کے بیرونی دروازے کا تالا توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر داخل ہو گئے تھے اور وہاں انھوں نے شری بھگوان رام کی مورتی رکھی اور اندرونی اور بیرونی دیواروں پر گیروئے رنگ سے سیتا رام لکھ دیا۔ ہنس راج جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے، انھوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ نہ مانے۔ یہ لوگ پی اے سی کی بٹالین کے پہنچنے سے پہلے ہی مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ صبح ضلعی انتظامیہ جائے وقوع پر صورت حال کا جائزہ لینے پہنچی۔ اس کے بعد پانچ چھ ہزار لوگوں کا مجمع جمع ہو گیا جو بھجن گاتا اور

نعرے بازی کرتا رہا،لیکن اسے روک دیا گیا۔ رام داس، رام شکتی داس اور دیگر پچاس ساٹھ لوگ مسجد میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے اس کے تقدس کو پامال کیا۔ ڈیوٹی پر موجود حکومتی اہلکار اور دوسرے لوگ ان واقعات کے شاہد ہیں،لہٰذا ان باتوں کوتحریر کیا جاتا ہے اور اسے فائل کیا جاتا ہے۔'

اب ان دستاویزی شہادتوں کے بعد وی ایچ پی والے کس منہ سے بھگوان کے پرکٹ ہونے کی بات کریں گے۔عبدالمعز نے والدصاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بولے: اصل معاملہ پرکٹ ہونے کا نہیں۔ یہ باتیں تو عوامی پروپیگنڈے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انھیں مسلم تاریخی عمارتوں کے وجود سے چڑ ہے۔ وہ اسے مسلم تشخص کی علامت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انھیں ایسا لگتا ہے کہ ملک کے چپے چپے پر یہ عمارتیں ہر لحہ مسلمانوں کی تاریخی عظمت کو بیان کررہی ہوں۔ یہ چاہتے ہیں کہ مسلم تشخص کی ان علامتوں کو نیست و نابود کردیا جائے اور اس کی جگہ ہندو علامتوں اور تاریخی یادگاروں کو پھر سے زندہ کیا جائے۔تم دیکھو گے کہ آزادی کے فوراً بعد سے ہی یہ مہم بڑے زور وشور سے شروع ہوگئی تھی۔سرکاری سطح پر جس طرح سومناتھ کی تزئین کاری کی گئی اس سے تو یہی لگتا تھا کہ ۴۷ء میں اس ملک سے انگریز نہیں گئے بلکہ محمود غزنوی کی حکمرانی ختم ہوئی۔

سیکولر ہندوؤں نے اس نفرت انگیز مہم کی روک تھام کے لیے کچھ نہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: عملاً تو اس پروگرام میں خواہی نخواہی ہندوؤں کا تمام ہی طبقہ شریک رہا۔ کچھ استثنائی مثالیں البتہ ملتی ہیں جیسے بابری مسجد کے مقفل کیے جانے کے بعد فیض آباد ضلع کانگریس کے سکریٹری اکشے برہمچاری نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسجد کی اصل حیثیت بحال کرنے کے لیے پرزور کوشش کی۔ نہرو نے بھی صوبائی حکومت سے اس واقعہ کے بعد سخت خفگی کا اظہار کیا،لیکن ان سب کے باوجود عملاً مسجد سے مسلمانوں کو بے دخل کردیا گیا اور رام للاّ کی مورت وہاں استھاپت ہوگئی۔

گاندھی اگر زندہ ہوتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی، میں نے کہا۔

بولے: گاندھی کے لیے یہ ایک بڑا اخلاقی چیلنج ضرور ہوتا مگر وہ بھی کیا کرتے۔ آزادی کے فوراً بعد غالباً یہ نومبر ۱۹۴۷ء کی بات ہے، گاندھی نے برلا ہاؤس کی اپنی دعائیہ مجلس میں دہلی کی ان ۱۳۷ مسجدوں کا تذکرہ کیا تھا، جو یا تو منہدم کردی گئی تھیں یا پھر انھیں مندروں میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ نہرو نے بھی وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل کو اس صورت حال پر احتجاج کرتے ہوئے ایک خط لکھا تھا،لیکن ان باتوں سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آزادی کے بعد سے ہی تنگ نظر ہندوؤں کے لیے مسلمانوں کی تاریخی عمارتیں ایک مسئلہ بنی رہیں۔ یہ عمارتیں صرف اینٹ گارے کا ملغوبہ نہ تھیں۔ ان خالی عمارتوں میں بھی مسلمانوں کی

تاریخ بستی تھی۔ دہلی میں جب مسلمانوں کا قتل و خون جاری تھا، پاکستان سے آنے والے شرنارتھی ان کے گھروں اور املاک پر قبضہ کر رہے تھے اور جب ان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ تھی تب دہلی کے مسلمانوں نے ان ہی تاریخی عمارتوں میں پناہ لی تھی۔ کوئی ڈیڑھ دو لاکھ مسلمان اپنے ہی شہر میں مسلم تاریخی عمارتوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ بہت سے تنگ نظر ہندوؤں کو ایسا لگتا تھا کہ جب تک یہ عمارتیں باقی ہیں اس ملک سے مسلمانوں کا صفایا کچھ آسان نہیں۔

'مگر یہ عمارتیں تو ملک کے چپے چپے میں موجود تھیں۔ ان کے نام و نشان مٹانا بھی کچھ آسان نہ تھا۔ پھر انھوں نے اس مسئلہ کا کیا حل نکالا۔ کیا اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا؟ عبدالمعز نے پوچھا۔

بولے: ان عمارتوں کو محض قومی یادگار یعنی National Monument قرار دے ڈالا گیا۔ انھیں ہماری تاریخ سے دانستاً delink کرنے کی کوشش کی گئی۔

اچھا میرا ذہن اب تک ادھر نہ گیا تھا، عبدالمعز نے حیرت سے کہا۔

بولے: 'ہاں اس سلسلے کا سب سے پہلا حملہ تو لال قلعہ پر ہوا جس کی فصیل سے آدھی رات میں نہرو نے جشنِ آزادی کی پہلی تقریر کی۔ یہ ایک بڑا علامتی اقدام تھا جس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اب لال قلعہ کی وراثت کے امین نہرو اور اس کے حواری قرار پائے ہیں۔ اس زمانے میں میرٹھ سے ایک انگریزی اخبار ڈان *(Dawn)* کے نام سے شائع ہوتا تھا، اس میں بعض اہل فکر مسلمانوں نے احتجاجی مراسلے بھی لکھے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک لال قلعہ ان کی سیاسی اور ثقافتی قوت کا علامیہ تھا۔ وہاں جب نہرو نے یونین جیک کو ہٹا کر نئے ہندوستان کا جھنڈا نصب کیا تو اس وقت اہل فکر مسلمانوں کو ایسا لگا جیسے وہ اب انگریزوں کی عملداری سے نکل کر ہندوؤں کی محکومی میں داخل ہو گئے ہوں۔ پتھر کی یہ بے جان عمارتیں سچ پوچھو تو بولنے لگی تھیں۔ حساس دل و دماغ ان آوازوں کو سنتے'۔

'اور وہ شعر بھی تو ہے۔ پہلا مصرع تو مجھے یاد نہیں:

خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار'

عبدالمعز نے لقمہ دیا۔

بولے: ہاں تم نے صحیح سمجھا۔ تم نے مولانا آزاد کی تقریر تو سنی ہوگی کہ 'یہ دیکھو ...... مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں، تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں

جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھااور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔آزاد نے اپنی تقریر کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں کو منتخب کیا۔ وہ ان بولتے میناروں کی آواز بن گئے۔نئی بدلی ہوئی صورت حال میں جب لال قلعہ کی فصیل پر نہرو کا قبضہ ہو چکا تھا،آزاد نے مناسب جانا کہ مسلمان ایک نئی ابتدا کے لیے جامع مسجد کو اس ملک میں اپنے ملّی اسلامی تشخص کے علامیہ کے طور پر استعمال کریں۔

پھر تو آزاد کی اس تقریر پر بڑی لے دے ہوئی ہوگی،تنگ نظر ہندوؤں نے ان کی باتوں کا برا منایا ہوگا؟ عبدالمعز نے کہا۔

بولے: ہاں اس وقت تو دہلی سے مسلمانوں کا انخلا ہورہا تھا۔ان کی ہوا اُکھڑ چکی تھی۔اندیشہ تھا کہ بہت سی دوسری چھوٹی بڑی مسجدوں کی طرح جامع مسجد پر بھی اغیار کا قبضہ ہوجائے۔اگر ایسا ہوتا تو ہندوازم کی تصویر بری طرح مسخ ہوجاتی۔گاندھی اس نکتے سے واقف تھے۔انھوں نے ستمبر 47ء کی ایک پرارتھنا سبھا میں جامع مسجد اور لال قلعہ کی علامتی تاریخی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا، مجھے اصل الفاظ تو یاد نہیں، ان کی کلیات میں دیکھنا بآسانی مل جائے گا، انھوں نے کہا تھا کہ دہلی ملک کا دارالسلطنت ہے جہاں جامع مسجد اور لال قلعہ موجود ہیں۔ یہ مغلوں کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں جواب ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ جولوگ ہندوستان سے مسلمانوں کے نکل جانے کا مطالبہ کررہے ہیں وہ ان کے جانے کے بعد جامع مسجد کا کیا کریں گے۔کیا ہم اس پر قابض ہوجائیں گے۔ذرا سوچیے یہ کتنی خطرناک بات ہوگی۔انھوں نے زور دے کر کہا تھا کہ مسلمانوں کا اس تاریخی مسجد پر حق ہے۔ہم بھی اس کے فن تعمیر پر فخر کرتے ہیں۔کیا ہم اسے زمیں بوس کردیں گے؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس زمانے میں گاندھی کی پرارتھنا سبھا کے حوالے سے ان کے فرمودات اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔ان ہی دنوں ایک پرارتھنا سبھا میں انھوں نے کہا تھا کہ جو لوگ جامع مسجد کو شیومندر میں بدلنے کا خواب دیکھ رہے ہیں یا جو سکھ اسے گرودوارہ بنانا چاہتے ہیں تو وہ یہ جان لیں کہ ایسا کرکے وہ دراصل ہندوازم اور سکھ ازم کی قبریں کھود دیں گے۔کوئی بھی مذہب اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔

پھر ان بولتی عمارتوں کے مسئلے کو تنگ نظر ہندوؤں نے کیسے حل کیا؟ عبدالمعز نے پوچھا۔

بولے: ایک تو یہی طریقہ اپنایا گیا کہ انھیں سیکولر قالب میں ڈھال لیا جائے۔انھیں قومی آثار کے طور پر دیکھا جائے،جن کی جڑیں ہندوستانی قومیت میں ہوں،مسلم شناخت میں نہیں۔

یہ تو خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ساری عمارتوں سے اس کا ثقافتی ماضی کھرچ کر نکالنا،تاریخی پس منظر

سے انھیں آزاد کرنا۔ میں نے اپنی سہولت کے لیے سوال کو کھولنے کی کوشش کی۔

بولے: ہاں اس مقصد کے لیے انھیں عمارتوں کی ترتیب و تنظیم اور ان کے گرد نئے آرائشی ڈھانچے تعمیر کرنے پڑے۔ سب سے پہلے تو ان مسلم عمارتوں کو سیاحتی مقامات کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔ پھر زائرین کی سہولتوں کے لیے ان کے اردگرد انتظامی ڈھانچے تشکیل دیئے گئے۔ اب چونکہ یہ عمارتیں نئے سیکولر ہندوستان کی قومی وراثتوں کی امین سمجھی جاتی تھیں اس لیے اسی تناظر میں ان کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ مثال کے طور پر تاج محل کو لو جو مسلم فنِ تعمیر کے بہترین نمونے کے ساتھ ہی ایک مقبرہ ہے۔ اس کے اردگرد اسی احاطے میں دوسری قبریں بھی موجود ہیں۔ ایک جانب مسجد ہے۔ گویا ہر اعتبار سے اس کی حیثیت مسلمانوں کے ایک مذہبی اور متبرک مقام کی ہے، لیکن جو لوگ اس کا انتظام و انصرام دیکھتے ہیں اور جو اشتہارات دُنیا بھر سے سیاحوں کو یہاں کھینچ لاتے ہیں وہ اسے محض مغل طرز تعمیر کے نفیس ترین نمونے اور عجائب عالم کے ایک نادر شاہکار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

'اب تو بعض لوگ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ تاج محل دراصل قدیم شیو مندر ہے'۔ عبدالمعز نے کہا۔

بولے: ہاں یہ ایک دوسری سطح ہے۔ بعض لوگ ہیں جو ان عمارتوں کی نئی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سب بے سر پیر کی باتیں ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ جھوٹ اگر کثرت سے اور منصوبہ بند طریقے سے بولا جائے تو اس کی گونج بھی، کچھ دیر تک ہی سہی، سنائی تو دیتی ہے۔ ایک صاحب ہیں پی این اوک، یہ سنگھی خیمے کے آدمی ہیں، انھوں نے تاج محل کو تیجو محالیہ یعنی شیو مندر ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ کوئی کتاب بھی لکھی ہے۔ مگر ان باتوں سے حقیقت کہاں بدلتی ہے۔ عمارتیں آج بھی بول رہی ہیں البتہ انھیں سننے کے لیے حساس دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ یہ کہتے ہوئے ابّا نے پہلو بدلا، گھڑی کی طرف نگاہ کی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے، عبدالمعز کہنے لگے یہ جو مغلوں کو اکثر مطعون کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری توجہ لال قلعہ اور تاج محل بنانے پر صرف کر دی، کاش کہ یونیوسٹیاں بنائی ہوتیں تو آج ہمارا حال کہیں بہتر ہوتا، تو اب تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ان تاریخی عمارتوں کو بنا کر بھی کچھ کم بڑا کام نہیں کیا۔ عبدالمعز کی یہ بات سن کر ابّا مسکرائے۔ بولے، یہ سب لغو باتیں ہیں، مخاصمانہ پروپیگنڈہ ہے جس کے ہم لوگ شکار ہو گئے ہیں۔ جس ملک میں اتنی عالیشان عمارتیں بن رہی تھیں تو یہ خود اس بات پر دال ہے کہ یہاں علوم وفنون کو ترقی حاصل تھی۔ تعلیمی ادارے ہر میدان کے لیے افراد پیدا کر رہے تھے ورنہ اتنی بڑی ریاست کے انتظام و انصرام کے لیے رجالِ کار کہاں سے ملتے۔ غیر ملکوں کو اتنے بڑے پیمانے پر مصنوعات کی برآمد کیسے ہوتی جس کے نتیجے میں ملک میں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بات ایسی

ضرورتھی جو سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی۔ ہمیں اس بات کا ضرور محاکمہ کرنا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دشمنوں کے پروپیگنڈوں کے زیر اثر اسلامیانِ ہند کے روشن کارناموں کے سلسلے میں بھی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرلیں۔ اچھا چلو باتیں بہت ہوگئیں، آج اتنا ہی رکھو۔

عمارتیں کس طرح بولتی ہیں، سرگوشیاں کرتی ہیں اور بقول مولانا آزاد بحران کے لمحات میں مینارے کس طرح اُچک کر سوال کرتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلی بار اس وقت ہوا تھا جب ایک سفر کے دوران غیرارادی طور پر اچانک میری نگاہ آگرہ کے قلعے کی فصیلوں سے جاٹکرائی۔ صبح کا جھٹپٹا ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ قلعہ کی فصیلیں دھند میں ڈوبی ہوئیں، ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے ایک زمانہ کی بات کہہ رہی ہوں، جیسے صدیوں کی تاریخ مرصع ہوکر نگاہوں کے سامنے آگئی ہو۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　ہوگئے خاک انتہا یہ ہے

تب قلعہ کی فصیلوں سے گزرتے ہوئے میرے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔ اب جو ابّا نے ان بولتی عمارتوں کا تذکرہ کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ بحران کے لمحات میں یہ تاریخی عمارتیں بظاہر بےجان ہونے کے باوجود ہمارے لیے جذباتی سہارا فراہم کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہمارے فطری مسکن ہوں جنھوں نے ہرلمحہ اپنا آغوش ہم پر وا کر رکھا ہو۔

* * *

سال ۲۰۰۵ء میں قومی پریس میں یہ شور اٹھا کہ مسلمان تاج محل جیسے قومی اور سیکولر ورثے کو جسے World Heritage کی حیثیت بھی حاصل ہے، ایک اسلامی علامت کے طور پر دیکھنے کی تنگ نظری میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اس شور کا پسِ منظر یہ تھا کہ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد، جسے انتہاپسند ہندو غلامی کی یادگار کے طور پر دیکھتے تھے، مسلمانوں میں اپنی تاریخی عمارتوں کے سلسلے میں سخت تشویش پائی جاتی تھی۔ ایودھیا کی طرح کاشی اور متھرا کی مسجدیں بھی نشانے پر تھیں۔ کوئی کہتا کہ دہلی کی جامع مسجد دراصل شیو کا قدیم مندر رہا ہے اور کوئی تاج محل کو شیو یا کالی کا مندر بتاتا۔ اس ہنگامی صورت حال میں یوپی وقف بورڈ کے ذمہ داروں نے سوچا کہ کیوں نہ تاج محل کو وقف املاک کی حیثیت سے رجسٹر کرالیا جائے۔ ۲۰۰۴ء میں فیروزآباد کے محمد عرفان بیدار نے الہ آباد ہائی کورٹ میں اس سلسلے میں مفاد عامہ کی ایک عرضی دائر کی۔ عرفان ۱۹۹۸ء میں ہی سنی وقف بورڈ کو ایک عرضداشت پیش کرچکے تھے، جس میں انھوں نے وقف بورڈ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تاج محل کے متولی کی حیثیت سے اس کی نگہداشت کا کام اپنے ذمہ لے لے۔ کورٹ نے وقف بورڈ کو اس سلسلے میں ضروری اقدامات کی ہدایات دیں۔ وقف بورڈ نے اس سلسلے میں شواہد اکٹھے

کیے۔ بادشاہ نامہ جو عبدالحمید لاہوری کی تصنیف ہے اور جس کا سالِ تصنیف ۱۶۲۹ء تا ۱۶۳۲ء ہے، اس میں اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ شاہجہاں نے تاج محل اور اس سے متعلقہ اراضی اور عمارتوں کو ایک وقف کی حیثیت سے قائم کیا تھا۔ ویسے بھی تاج محل کمپلیکس میں اصل مقبرہ یعنی تاج محل کے علاوہ مختلف قبریں ہیں، مسجد ہے اور تقریباً ساڑھے تین سو سالوں سے شاہجہاں کے عرس کی تقریبات بھی منعقد ہوتی رہی ہیں۔ یہ سب باتیں تاج محل کو ایک مسلم وقف کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے کافی ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن بورڈ کے چیئرمین حافظ عثمان نے جیسے ہی رجسٹریشن کی کارروائی مکمل کی اور وقف کے متعینہ اصولوں کے تحت اس کے انتظام و انصرام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا ارادہ ظاہر کیا، نام نہاد قومی پریس میں ایک بھونچال کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ عثمان کو اس بات پر مطعون کیا جانے لگا کہ انھوں نے ایک قومی تاریخی علامت کو فرقہ وارانہ چشمے سے دیکھنے کی غلطی کی ہے۔ اے ایس آئی جس کے انتظام و انصرام میں اس وقت تاج محل کا نظام ہے، وہ فی الفور سپریم کورٹ جا پہنچا۔ کورٹ نے وقف بورڈ کے رجسٹریشن کو بالآخر التوا میں ڈال دیا اور اس طرح ایک مسلم مقبرے سے نکلنے والی شوکت وعظمت کی داستان نام نہاد سیکولر قومی ورثے کے حصار میں گھٹ کر رہ گئی۔

اس واقعہ کے برسوں بعد جب ملک میں کانگریس کی Muslim Appeasement (بمعنی مسلم دشمنی) کا دور جا چکا تھا اور نریندر مودی کی قیادت میں ملک بھر میں ہندو راشٹر کا غلغلہ بلند تھا، مئی کی ایک تپتی سہ پہر میں ایک ہندو دھرم گرو میرے دفتر تشریف لائے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار ہندو۔مسلم مفاہمے کی تجاویز لے کر آتے رہے تھے اور متعدد ملاقاتوں کے سبب ان سے ایک طرح کی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ بات بابری مسجد قضیہ کے پرامن حل پر چل نکلی۔ کہنے لگے اس بات کا تو میں بھی قائل نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخی عمارتوں اور مذہبی علامتوں کے ملبے پر ہندو مندروں کا قیام ہو مگر مسئلہ یہ ہے کہ عام ہندو جب مسلم تاریخی عمارتوں کو دیکھتا ہے، جب وہ لال قلعہ اور تاج محل کے قریب سے گذرتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ آزاد بھارت میں بھی بونا ہو کر رہ گیا ہو، جیسے اس کا دھارمک ویکتتو مسلمانوں کے مقابلے میں چھوٹا ہو۔

'مگر ایسا تو اس لیے ہے نا کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ مسلم عہدِ حکومت کو ہندوستانی تاریخ کا روشن باب ماننے کے بجائے مسلم حکمرانوں کو بیرونی مداخلت کے طور پر دیکھتا ہے'۔

جی ہاں! بالکل، آپ نے صحیح کہا۔ اسی طرز فکر نے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ خلیج پیدا کر دی ہے۔ اس تاریخ نویسی کی ابتدا تو انگریزوں نے کی، لیکن رفتہ رفتہ یہ ہمارے طرز فکر میں سرایت کر گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم عہدِ حکمرانی کی عمارتیں ہندوؤں کے بعض طبقات کو غلامی کی نشانیاں معلوم ہوتی ہیں۔

'بعض طبقات کو؟ ہمارے خیال میں تو اس تاریخ نگاری نے بڑے بڑے ہندو دانشوروں اور نام

نہاد سیکولر رہنماؤں کے دل و دماغ کو مسموم کر رکھا ہے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہی جس طرح سومنات کی تعمیرِ نو کی تحریک شروع ہوئی اور عین سرکاری سرپرستی میں گاندھی، پٹیل، راجندر پرساد اور کے ایم منشی جیسے اساطین نے اس احیائی منصوبے میں جوش و خروش سے حصہ لیا اس سے تو اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نئے ہندوستان کے سلسلے میں ان حضرات کا خواب کیا تھا'۔

بولے: دیکھیے ایک ہوتی ہے عمارت اور ایک ہوتی ہے اس کی سیاست۔ مسلم حکمرانوں نے جا بجا ایسی پرشکوہ عمارتیں تعمیر کر دیں جو آج بھی ناظرین کو ہر لحہ ان کے جاہ و حشم کا احساس دلا رہی ہیں۔ آزادی کے بعد مغلوں کی تعمیر کردہ دہلی اور انگریزوں کی تعمیر کردہ عمارتوں کو نیا قالب دینے کی کوشش ضرور کی گئی، ناموں کی تبدیلی بھی ہوئی مگر مجموعی منظر نامے سے مسلم عہد کی علامتوں کو محو نہ کیا جا سکا۔ اس کا قلق اونچی ذات کے ہندوؤں کو بھی ہے اور پس ماندہ ذات کے دلت رہنماؤں کو بھی۔ بلکہ میرے خیال میں یہ جو رام مندر کا قضیہ ہے اس کے پیچھے بھی دراصل ایک ہندو ثقافتی اور سیاسی علامت کی تشکیل کی کوشش ہے۔ ابھی پچھلے سال گجرات میں سردار پٹیل کا فلک بوس مجسمہ تکمیل کو پہنچا ہے، دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد کے مقابلے میں اکشر دھام مندر ایک نئے سیاحتی مقام کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ یہ سب دراصل عمارتوں کی سیاست ہے۔ عوامی چہل پہل کے مقامات پر اپنے وجود کو منوانے کی کوشش ہے۔

'جمنا کے کنارے، اکشر دھام سے کوئی چھے سات کیلومیٹر کی دوری پر، دلت پریرنا استھل کے نام سے ایک اور زیارت گاہ بھی تو وجود میں آ گئی ہے'، میں نے اپنے غیر مسلم مہمان کو کریدنے کی کوشش کی۔

بولے: جی ہاں! دلتوں نے اس سلسلے میں بڑی سبک رفتاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ صرف نوئیڈا میں ہی نہیں، لکھنؤ میں بھی دلت پریرنا کندر کے نام سے ایک زیارت گاہ کی استھاپنا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں ایک امبیڈکر میموریل بھی قائم ہوا ہے جہاں امبیڈکر کا ایک قدآور مجسمہ دور سے ہی راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اور یہ ساری تعمیرات مایاوتی کے عہدِ حکومت میں ہوئی ہیں۔ دلتوں کو بھی تو آخر اپنے جاہ و حشم کے اظہار کا موقع چاہیے۔

'تو گویا تعمیرات کی اس دلت سیاست کے پیچھے گہرے معانی پوشیدہ ہیں؟'

بولے: بالکل! حضرت گنج میں جہاں گاندھی کا ایک پرانا مجسمہ نصب چلا آتا تھا اب وہیں اس کے قریب میں امبیڈکر کا ایک دیوہیکل اور نفیس مجسمہ آویزاں کر دیا گیا ہے۔ اس طرح امبیڈکر اور گاندھی کی ازلی جنگ شاہراہِ عام پر آ گئی ہے۔ اتر پردیش میں امبیڈکر اپنے مجسموں کی کثرت کے سبب گاندھی سے کہیں زیادہ مقبول اور جاوداں نظر آتے ہیں۔ مایاوتی چار مرتبہ اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ رہیں، انھوں نے اور کچھ کیا

ہو یا نہ کیا ہو، اس پورے عرصہ میں انھوں نے عوامی مقامات پر دلت قبضے کی مہم پوری تندہی سے جاری رکھی۔
اور اب احیا پسند ہندو اس مہم میں آگے آ گئے ہیں، لیکن کیا وہ ایک فلک بوس رام مندر کی تعمیر سے اس ملک کا جغرافیائی اور ثقافتی منظرنامہ واقعی بدل سکتے ہیں؟ میں نے اپنے مہمان سے پوچھا۔
بولے: رام مندر تو اب جمہور ہندوؤں کے لیے آستھا کا معاملہ بن گیا ہے، اسے تو یہ لوگ اپنی فتح کی علامت کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل منصوبہ تو دراصل راجدھانی دہلی کی تقلیبِ نو کا ہے جسے سنٹرل ویسٹا (central vista) کا نام دیا گیا ہے۔ نئے ہندوستان کی نئی راجدھانی جس پر انگریزوں اور مغلوں کی تعمیراتی چھاپ کے بجائے ویدک بھارت کی شبھ مہورت کا سایہ ہو۔
اپنے مہمان کی اس بے تکلف گفتگو نے مجھے ان کا بڑی حد تک گرویدہ کر دیا۔ میں نے سوچا یہ حضرت سچ ہی تو کہتے ہیں، سنٹرل ویسٹا بی جے پی کے لیے پریرنا کندر سے کم اہم نہیں۔ عوامی منظرنامے پر قبضے اور دہلی کی نظری اور تاریخی تقلیب کا اس سے نادر موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلم دہلی کی تاریخی عمارتیں اور برطانوی عہد کی تعمیرات، نئے ہندو سمراٹ کی تعمیراتی پیوند کاری سے کس طرح اپنا مکالمہ اور مناقشہ جاری رکھتی ہیں۔

۳۹

بے نام حادثہ

ایک دن مکتبہ میں مجلس بزرگاں آراستہ تھی۔ بات بابری مسجد کے قضیے پر چل رہی تھی۔ عبدالمتین صاحب جو ابّا کے پرانے دوستوں میں تھے بولے: حافظ صاحب! بابری مسجد کے اندر اچانک راتوں رات رام للّا کے پرکٹ ہوجانے کو لوگ تمسخر میں اڑا دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے اندھ وشواس کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ایسا جنونی مذہبی فاشزم ہے جس کی نظیر ظلم و جبر کی معلوم تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ بھلا بتایئے ایک لغو اور بے بنیاد خیال کو روحانی اور اخلاقی جواز عطا کرنے کی ترکیب کسے سوجھی ہوگی۔

'جی ہاں اگر یہ دلیل مان لی جائے تو پھر تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔' مولانا افتخار صاحب منیار پوری نے تائید کی۔ بولے: حد تو یہ ہے کہ دوردرشن عین سرکاری سرپرستی میں ایک مذہبی جنون کی آبیاری میں شب و روز مشغول ہے اور حکومت کہتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ شریعت کی حفاظت کے لیے وہ پارلیمنٹ میں نفقۂ مطلقہ کے بارے میں نیا قانون لا رہی ہے۔

'طرفہ یہ کہ بورڈ کے علما راجیو گاندھی کو مسلمانوں کا بہی خواہ سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ بابری مسجد کا تالا بھی تو راجیو گاندھی کی ایما پر کھولا گیا ہے۔' عبدالمتین صاحب نے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔

مگر کانگریسی علما تو اب بھی راجیو گاندھی کی اسلام پسندی اور معاملہ فہمی کے گن گا رہے ہیں۔ ذکی صاحب نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ ارون نہرو نے یہ بات صاف کردی ہے کہ مسلم خواتین بل پیش کرنے سے مسلمانوں کی جو منہ بھرائی ہوئی ہے اس میں توازن قائم کرنے کے لیے ہی دراصل راجیو گاندھی نے بابری مسجد کا تالا کھلوایا ہے۔ آپ نے ارون نہرو کا وہ بیان نہیں پڑھا کہ جب انھوں نے یوپی کے چیف منسٹر سے پوچھا کہ بابری مسجد کا تالا کس کی ایما پر کھولا گیا تو ان کا جواب تھا کہ یہ بات تو وزیر اعظم سے پوچھیے اور جب انھوں نے وزیر اعظم سے اس بارے میں استفسار کیا کہ دوردرشن پر مسجد کا تالا کھلنے اور رام للّا کے درشن کے مناظر کو اس طرح قومی سطح پر کس کی ایما پر براڈکاسٹ کیا جارہا ہے تو

وہ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے صرف مسکرا کر رہ گئے۔

حالات مسلسل دھماکہ خیز ہوتے جا رہے ہیں۔ ابّا نے تشویش کا اظہار کیا۔ بولے: عوامی جوش و خروش کے اس سیلاب میں اب تو ایسا لگتا ہے کہ معاملہ حکومت کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔

'پتہ نہیں یہ اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھے گا' عبدالمتین صاحب نے کہا۔

'اونٹ اگر ایک بار بیٹھ جائے تو غنیمت سمجھیے، پھر نئی منصوبہ بندی کے لیے کچھ تو موقع مل جائے گا۔ یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بیخ کنی کا یہ سلسلہ رو کے نہیں رکتا۔ آزادی کو چالیس سال ہونے کو آئے، ہر روز ایک نئی مصیبت، ظلم کا ایک نیا انداز، کچھ چھن جانے کا نیا احساس۔ ملی گراف کے اس زوال کو آخر کیا نام دیا جائے۔ یہ لوگ اس ملک سے ہمارے تاریخی آثار بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اب تو لگتا ہے کہ عین حکومتی سرپرستی میں ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کی جو تحریک چلائی جارہی ہے تو اب اس ملک میں مسلمانوں کو امن و عافیت کی کوئی صبح نصیب نہ ہوگی'۔

جی ہاں اور غضب تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے وزیر اعظم کی ایما پر ہو رہا ہے جسے بورڈ کے علما کا اعتماد حاصل ہے۔ واقعی بڑی ہلا مارنے والی صورتِ حال ہے۔ ہماری محرومیوں اور حرماں نصیبیوں پر بھی منہ بھرائی کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ہمارے علما و دانشور حکومت کی منافقت کو معاملہ فہمی سے تعبیر کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ضعف کے اس لمحے میں نئے بل کے حوالے سے فتح عظیم کا احساس پایا جاتا ہے۔ کتنی اذیت ناک ہے یہ صورت حال۔ خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد۔ افتخار صاحب نے آہِ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! امر واقعہ تو یہی ہے کہ ہماری موت زندگی پر دستوری، جمہوری تحفظات اور مسلمانوں کی منہ بھرائی کا ایک ایسا خوشنما گنبد قائم کر دیا گیا ہے کہ ہماری آہ و کراہ اور چیخ و پکار اسی گنبد میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ باہر والوں کو اصل صورت حال کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہو پاتا۔ کاش کہ اس اذیت ناک کیفیت کو کوئی نام دیا جا سکتا جس میں ہندوستانی مسلمان گذشتہ چالیس برسوں سے گرفتار ہیں'، ابّا نے کہا۔

نام کچھ بھی دیں، صورت حال کی سنگینی تو ہم سب پر واضح ہے۔ تعذیب اور گھٹن کی ایک ایسی صورت حال جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں۔

نام کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک اس صورت حال کو کوئی مناسب نام نہ دیا جائے لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کس صورت حال سے دوچار ہیں۔ نازی جرمنی میں جب یہودیوں کو نسل کشی کا سامنا تھا تو انھوں نے اس عمل کے لیے anti-semitism اور pogrom جیسے الفاظ کا سہارا لیا۔ لیکن ظلم جس پیمانے پر ہوا تھا اس کے اظہار کو یہ الفاظ کفایت نہ کرتے تھے۔ سو پندرہ بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد تجزیہ نگاروں نے

اہل یہود پر ہونے والے مظالم کے لیے holocaust کا لفظ منتخب کیا۔ اب یہ لفظ کثرتِ استعمال کے سبب نازی جرمنی میں اہلِ یہود پر ہونے والے مظالم کے لیے کچھ اس طرح مختص ہوکر رہ گیا ہے کہ ہولوکاسٹ کا لفظ آتے ہی ایک ایسی بربریت کا تصور ذہن میں آتا ہے جس کی نظیر نہ اس سے پہلے ملتی ہو اور نہ اس کے بعد۔ اسی طرح فلسطینیوں پر ۱۹۴۸ء میں ریاست اسرائیل کے وجود میں آنے کے بعد جو کچھ گزری اس نے ان کی زندگیوں کو پوری طرح تہہ و بالا کردیا۔ تب سے امن وسکون کی کوئی صبح ان کے حصے میں نہ آئی۔ فلسطینی اس صورت حال کو نکبہ سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ایک ایسی صورت حال جس میں سب کچھ تباہ ہوجائے۔ اب نکبہ کا لفظ آتے ہی فلسطینیوں پر گزرنے والی اذیت ناک صورت حال اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ نگاہوں میں روشن ہوجاتی ہے۔ دیریٰسین میں بے گناہ فلسطینیوں کا قتل عام، ان کے گھروں اور ان کی زمینوں سے ان کے جبری انخلا، معصوم بچوں کی چیخ و پکار اور بے بس عورتوں کی آہ و بکا کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کے بیان کے لیے تو ہم اب تک کوئی لفظ ایجاد کرنے سے قاصر رہے ہیں، ہے نا یہ بے بسی کی انتہا۔ ابّا نے سلسلۂ گفتگو کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

بولے: یہاں تو بڑے سے بڑے قتل عام کو بھی فساد کے پردے میں چھپا دیا جاتا ہے، جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ٹکرا جاتے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔ مسلم اسپین میں بھی جہاں مسلمان قتل و غارت گری اور جبری انخلا کے شکار ہوئے وہاں بھی ان کی تاریخی عمارتیں بڑی حد تک محفوظ و مامون رہیں۔ غرناطہ کے محلات اور مسجدوں سے آج بھی مسلم اسپین کی داستانِ عظمت سنائی دیتی ہے، لیکن ہمارا عذاب تو کہیں دو چند ہے۔ انھیں ہماری تاریخی عمارتیں بھی گوارا نہیں۔ یہ اسے ایامِ غلامی کے داغ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں۔ پھر اس صورت حال کو کیا نام دیا جائے جو اذیت کی تمام معلوم شکلوں سے کہیں بڑھ کر ہے اور جس کا سلسلہ رُوکے نہیں رکتا، مبادا تجزیہ نگار رک کر جائزہ لے اور اسے کوئی مناسب نام دے سکے۔

اس دن ابّا کی زبان سے یہ نکتہ سن کر مجھ پر حیرانی کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ تب سے اب تک مجھے مختلف بلاد و امصار میں جانے کا موقع ملا۔ علما و دانشوروں کی صحبتوں میں بیٹھا۔ تاریخ و تہذیب کے تفہیم و تجزیے میں مصروف رہا۔ زبانوں کے بننے بگڑنے اور نت نئی اصطلاحوں کی ایجاد و اختراع پر مطلع ہوا، لیکن علم و عرفان کے ہفت خواں طے کرنے کے بعد بھی جب میں ایک دن اپنے شفیق استاد اور بے تکلف دوست وقار حسین کی مجلس میں بیٹھا تھا اور بات اس تعذیبِ دائمی کے ادراک پہ چل نکلی تو ایسا لگا کہ میرے برسہا برس کی علمی ریاضت، تحلیل و تجزیے کی قوت اور لغت ہائے حجازی کی وسعت بھی اس کیفیت کے لیے کوئی صحیح اور مناسب لفظ وضع کرنے سے قاصر ہو۔

۴۰
خفیہ سرکلر

میری صحت اب اللہ کے فضل سے پوری طرح بحال ہوچکی تھی۔ خیال آیا کیوں نہ اس سال گرمی کے موسم کو برطانیہ کے علمی سفر کے لیے استعمال کیا جائے، مگر ابھی علی گڑھ میں بہت سے کام نپٹانے تھے۔ ایم فل کا زبانی امتحان سر پر تھا۔ والدین سے رخصت لے کر علی گڑھ پہنچا۔ اندازہ ہوا کہ طلبا میں بابری مسجد کے سلسلے میں بے چینی بلکہ اشتعال اور سراسیمگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان چند ماہ میں جب سے بابری مسجد کے دروازے رام للاّ کے درشن کے لیے کھول دیئے گئے تھے، یوپی اور دہلی میں مختلف قسم کی ایکشن کمیٹیاں وجود میں آ گئی تھیں، ان میں سے بیشتر علی گڑھ کے سابق طالب علموں نے بنائی تھیں اور وہ بجا طور پر یونیورسٹی کیمپس سے اپنے انصار و اعوان کی فراہمی کے خواہاں تھے۔ ان ایکشن کمیٹیوں کے قائدین اپنے گرما گرم بیانات اور شعلہ فشاں عزائم کے اظہار میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ مقابلہ سخت تھا اس لیے کہ پریس ان ہی بیانات کی سرخیاں بناتا جن میں جذبات کو مشتعل کرنے کے زیادہ امکان پائے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں مظفر حسین کچھوچھوی کی قیادت میں جو ایکشن کمیٹی تشکیل پائی تھی اس میں اعظم خان اور ظفریاب جیلانی کے نام نمایاں تھے۔ اوّل الذکر نے آگے چل کر سماج وادی پارٹی کے اساطین کے طور پر شہرت حاصل کی اور آخر الذکر پرسنل لا بورڈ کے شرعی اور اسلامی وکیل کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان ہی مظفر حسین کچھوچھوی نے اپنے ایک دھمکی آمیز بیان میں کہا تھا کہ اگر بابری مسجد مسلمانوں کو فی الفور واپس نہ کی گئی تو ایکشن کمیٹی لاکھوں مسلمانوں کا جلوس لے کر مسجد کی بازیابی کے لیے ایودھیا جائے گی۔ اور اگر ہمیں اس عمل پر مجبور کیا گیا تو لوگ جان رکھیں کہ اس جلوس کے راستے میں آنے والا کوئی بھی مندر محفوظ نہیں رہے گا۔ اس طرح کے بیانات سے مسلم اکثریتی آبادی کے علاقوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ذرائع ابلاغ میں یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ مسلمان شاہ بانو قضیے میں حکومت کی منہ بھرائی سے حوصلہ پا کر اب اکثریتی طبقے کو کھلی دعوتِ مبارزت دے رہے ہیں۔ دہلی میں جاوید حبیب نے ایکشن کمیٹی کا

علم تھام رکھا تھا۔ ادھر جامع مسجد کے منبر سے عبداللہ بخاری کی خطیبانہ گھن گرج مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ سید شہاب الدین، جو جنتا پارٹی کے عہد میں سیاست میں داخل ہوئے تھے اور اب مسلم انڈیا کے مدیر کی حیثیت سے خود کو مسلمانوں کا لائق ترین ترجمان سمجھتے تھے، وہ بھلا قیادت کی اس دوڑ میں پیچھے کیوں رہتے۔ انھوں نے بھی بھانت بھانت کی ایکشن کمیٹیوں کو ایک رابطہ کمیٹی میں پرونے اور اس کی قیادت پر خود کو متمکن کرنے کا پروگرام بنالیا۔

ایکشن کمیٹی بنیادی طور پر علی گڑھ کے نوآموز اور جواں سال قائدین کا پروجیکٹ تھا۔ لیکن اپنے اشتعال انگیز بیانات کے سبب قومی میڈیا انھیں مسلمانوں کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کررہا تھا، حتیٰ کہ بورڈ کے سکہ بند قائدین بھی جو تحفظ شریعت کی ہیجان انگیز تحریک کے سبب وزیراعظم سے بار بار بلا تکلف ملاقاتیں کرتے اور قومی میڈیا انھیں خاطرخواہ اہمیت دیتا، وہ بھی ایکشن کمیٹی کے اشتعال انگیز بیانات کے سبب حاشیے پر چلے گئے تھے۔ مولانا علی میاں مسجد کے مسئلے پر کوئی عوامی تحریک چلانے کے حق میں نہ تھے، مگر ان کی اب سنتا کون تھا؟ تحفظ شریعت کے حوالے سے انھوں نے جس طرح ایک عوامی تحریک کی قیادت کی تھی اس کی بنیاد بھی جوش وخروش اور معاملہ فہمی سے خالی اتباع قیادت پر رکھی گئی تھی۔ کل شریعت کے نام پر اگر لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل سکتے تھے تو آج خانۂ خدا کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے انھیں کون روک سکتا تھا۔ رہی بات تحلیل وتجزیے کی تو اس کا نہ کل رواج تھا اور نہ آج کوئی موقع۔ ایک ہیجانی عوامی تحریک کے غبارے میں شریعت کے نام پر جو ہوا بھری گئی تھی، مسجد کے قائدین نے اس جوش وخروش کو اپنے حق میں استعمال کرلیا۔ یونیورسٹی کیمپس پر اس صورت حال کا اثر فطری تھا۔ نوجوانوں کے جذبات کا ایک آتش فشاں تھا جو کسی لمحے بھی پھٹ سکتا تھا۔ اس صورت حال کے ازالے کے لیے میں نے اپنی سی سعی شروع کردی۔ اس سلسلے میں سینئر طلبا سے تبادلۂ خیال کیا گیا پھر خیال آیا کیوں نہ اس مہم میں نئے شیخ الجامعہ کو بھی شامل کرلیا جائے۔ اب تک نئے وائس چانسلر سید ہاشم علی سے میری کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ملاقات کا وقت طے پایا اور ہم پندرہ بیس سینئر طلبا نے ان کی چائے کی دعوت قبول کرلی۔

وی سی لاج میں اب فرنیچر کی ترتیب بدل چکی تھی۔ بائیں طرف لمبی راہداری میں جہاں سید حامد صاحب ایک چھوٹی سی میز پر اپنا دفتر جماتے تھے وہاں اب ایک بڑی کانفرنس میز آویزاں تھی، جس کے اردگرد پندرہ بیس کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم لوگ وقت مقررہ پر وی سی لاج جا پہنچے۔ ابھی ہم لوگ اپنی نشستوں پر پوری طرح براجمان بھی نہ ہوئے تھے کہ عقبی دروازے سے ہاشم علی صاحب کی بھاری بھرکم اور وجیہہ

شخصیت طلوع ہوئی۔ مرکزی کرسی پر انھوں نے اپنی نشست سنبھالی اور چھوٹتے ہی کہنے لگے: ہاں تو آپ لوگ مجھے بتائیے، which rules you want me to break? وہ غالباً یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سینئر طلبا کا یہ وفد مطالبات کا کوئی محضر نامہ لے کر آیا ہوگا۔ امتحانات، داخلے یا ہاسٹل کے کچھ مسائل، اس سے بڑھ کر اسٹوڈنٹ لیڈرز آخر سوچ بھی کیا سکتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ہم لوگ بابری مسجد کے مسئلہ پر طلبا اور نوجوانوں میں پیدا ہونے والی بے چینی اور مستقبل کے حوالے سے پیدا ہونے والی بے یقینی کے مداوا کے لیے ان کے پاس آئے ہیں اور یہ کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس فکر میں انھیں بھی شریک کریں۔ ہماری یہ باتیں سن کر ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بولے: آپ لوگوں کی آمد سے پہلے اساتذہ کا ایک وفد آیا تھا، جس نے آپ لوگوں کو مطعون کرنے اور محورِ شر باور کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہاں کے بیشتر اساتذہ کام چور ہیں، نکمّے اور حرام خور ہیں۔ سیاست کرتے ہیں یہ سب۔ کاش کہ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا۔ یہ کہتے ہوئے سید ہاشم علی کرسی سے اٹھے، اندرونی کمرے سے ٹائپ شدہ اوراق کی ایک فائل لے کر آئے۔ بولے: میں تو خود اس نظام کا زخم خوردہ ہوں۔ آزادی کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، میں اس وقت بیوروکریسی کا حصہ تھا۔ حکومت ہند نے ایک خفیہ سرکلر جاری کیا تھا کہ کسی مسلمان کو اہم اور حساس عہدے پر نہ رکھا جائے۔ میں نے پوچھا: اس سلسلے میں کسی حوالے یا شواہد کی آپ نشان دہی کر سکیں تو عنایت ہوگی۔ بولے: میں نے اس بات کا تذکرہ اپنے اس مضمون میں کیا ہے اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے تازہ مقالے کی ایک کاپی مجھے عنایت کر دی۔ مضمون قومی یکجہتی کے موضوع پر تھا۔ ابتدائی سطروں میں مصنف نے اپنی بیالیس سالہ سرکاری خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ قومی یکجہتی کی حیثیت ایک خیالِ عبث کی ہوگی اگر ہندوستان کے ہر شہری کو احساسِ تحفظ حاصل نہ ہو، وہ اگر اپنے آپ کو ملک کا باوقار شہری محسوس نہ کرے، امورِ ملکی میں شراکت داری کا اسے موقع نہ ملے اور قومی زندگی میں اس کی چلت پھرت دکھائی نہ دیتی ہو۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بی ایچ یو کے وائس چانسلر کو لکھے گئے اس مکتوب کا بھی تذکرہ کیا تھا جس میں انھوں نے ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو علی گڑھ کے ساتھ مل کر علما و اساطینِ فن کا ایک مشترکہ محاذ بنانے کی دعوت دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ دھماکہ خیز صورت حال میں جواب سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کے کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی ہے، یونیورسٹی کے اساتذہ کو اہم رول ادا کرنا چاہیے۔ مقالے میں پی اے سی کے مسلم دشمن رویے کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور قومی یکجہتی کونسل سے اس بات کی شکایت کی گئی تھی کہ ہر فساد کے موقع پر مسلمان پولیس کی زیادتیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ فساد کے بعد مقدمات میں بھی وہی

پھنسائے جاتے ہیں اور اس صورت حال کو حکومتی مشنری نے جان بوجھ کر روا رکھا ہوا ہے۔ قومی یکجہتی کونسل بھی مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے سے قاصر رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کل اگر ایک خفیہ سرکلر مسلمان افسروں کو حساس عہدوں پر تعیناتی سے روک سکتا تھا تو آج جب اس سرکلر کی شناعت ہر خاص و عام پر واضح ہوگئی ہے، ایک ایسا سرکلر کیوں جاری نہیں ہوتا جو اس نظام میں مسلمانوں کے اعتماد کو بحال کر سکے۔ ہاشم صاحب سے اس کے بعد بھی میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ صاف دل کے سیدھے سچے اور کھرے آدمی تھے۔ اپنی بات بے لاگ لپیٹ کہتے جو علی گڑھ کی نیازمندانہ فضا میں بسا اوقات اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہوتی۔

۴۱

آتشِ نمرود

لندن کا مجوزہ سفر اب بھی دل و دماغ پر حاوی تھا۔ ایک طرف ملک کی ہیجان انگیز صورت حال اور دوسری طرف علمی زندگی کی ہفت خوانیاں، لیکن سفر کب کیا جائے اس بارے میں حیص بیص کا شکار تھا۔ ایک شب عشا کی نماز کے بعد مصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے غور وفکر کر رہا تھا کہ اونگھ کی کیفیت طاری ہوئی۔ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کے اس عالم میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں اور دورانِ نماز میرے قدم کعبہ مشرفہ کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ مجھ پر ایک عالم وارفتگی طاری ہے، یہاں تک کہ میرے قدم حطیم سے آگے بڑھ کر مقام ابراہیم تک جا پہنچے ہیں۔ اب کعبہ پیچھے ہے اور میری نماز آگے۔ کوئی شخص مجھے اس صورت حال پر مطلع کرتا ہے اور میں اپنا قبلہ درست کر لیتا ہوں۔ آنکھ کھلی تو بہت دیر تک یہ خواب میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ پتہ نہیں اس کی تعبیر کیا ہوگی، مگر یہ سب کچھ اتنا واضح اور مبرہن تھا کہ اس کا بھولنا مشکل تھا۔ خیال ہوا کہ کہیں یہ اس بات کا اشارہ تو نہیں کہ خدا مجھے اپنے گھر بلانا چاہتا ہے۔ ان دنوں حج کے ایام تھے اور وقوف عرفہ میں دس پندرہ دنوں کی مہلت رہ گئی تھی۔ اگلے دن برادرِ مکرم حسین ذوالقرنین صاحب کی دہلی آمد کی اطلاع ملی۔ خیال ہوا کیوں نہ ان سے ملاقات کے لیے دہلی کا سفر کیا جائے۔ وہ ان دنوں اپنے ایک عزیز عبدالرزاق کشمیری کی قیام گاہ پر ٹھہرے تھے جو حسن اتفاق سے سعودی سفارت خانے میں سیکنڈ سکریٹری کے منصب پر فائز تھے۔ باتوں باتوں میں حج اور اس موقع پر سعودی سفارت خانے کی بڑھتی مصروفیت کا تذکرہ چل نکلا۔ وہیں ایک خیال میرے ذہن میں کوندا، کیوں نہ لندن کا سفر براہِ جدہ کیا جائے اور اس طرح لگے ہاتھوں حج کی سعادت بھی اپنے حصے میں آجائے۔ خیال آیا کہ سرسید جب لندن کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے تو اکبرالہ آبادی نے ان کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اگر لندن کے سفر میں حج کی سعادت بھی نصیب ہوجائے تو ایک ہی سفر میں خدا کا گھر اور خدا کی

شان دونوں ہی نظارے جمع ہوجائیں گے۔ میں نے عبدالرزاق سے پوچھا کہ ایام عرفہ کو اب دس بارہ ہی دن رہ گئے ہیں، کیا اس آخری لمحے میں بھی حج کا ویزہ مل سکتا ہے؟ بولے: کیوں نہیں، کل صبح پاسپورٹ لے کر سفارت خانے آجاؤ اور سفر کی تیاری شروع کردو۔

سفرِ حج کا پروگرام چونکہ اچانک اور غیرمتوقع طور پر بن گیا تھا، اس لیے نہ تو اس سلسلے میں کسی روایتی انداز کی تیاری کا موقع تھا اور نہ ہی مناسکِ حج کے سلسلے میں کتابوں کی چھان بین کا کوئی موقع ملا۔ تھا بھی تو یہ ایک طالب علم کا سفرِ حج۔ میں ایک مختصر سی پوٹلی اٹھا کر سفر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ایک تنہا مسافر جس کے آگے نہ کوئی کارواں اور نہ پیچھے کوئی لاؤلشکر۔ ایک عالم وارفتگی تھی جس نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اسی عالم میں، میں جبل الرحمہ کی چوٹیوں تک جا پہنچا جہاں افغان مجاہدین کا ایک گروہ انتہائی الحاح وزاری کے ساتھ خدا کی نصرت اور اسلام کے غلبے کی دعا مانگ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا رُواں رُواں اس دعا میں شامل ہوگیا ہو، جیسے خدا کی رحمت اب اس امت پر پھر سے سایہ فگن ہونے کو ہو۔ 'غلبۂ اسلام' کی تصنیف کا خیال بھی اسی چوٹی پر آیا۔ نہ جانے مستقبل کے کتنے منصوبے قلب ونظر میں جگمگا اٹھے۔ اسی عالم وارفتگی میں، میں بسوں کی طویل قطاروں کو چھوڑ کر پاپیادہ منیٰ سے مکہ کی طرف چل پڑا۔ حج سے فراغت کے بعد جب میں لندن کی طرف محوِ پرواز تھا مجھے اپنا وہ خواب یاد آیا جس میں میں دورانِ نماز چلتا ہوا کعبہ مشرفہ کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

کوئی چھ ماہ بعد جب میں لندن کے سفر سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ملک میں بابری مسجد کی بازیابی کے حوالے سے مسلمانوں کے جذبات میں ابال آیا ہوا ہے۔ دوسری طرف احیا پرست تحریکیں ایک آخری اور فیصلہ کن معرکے کی طرف بڑی سرعت اور تنظیم کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھا رہی ہیں۔ احیا پسندوں کو حکومت اور نظم ونسق قائم کرنے والی مشنری کی پشت پناہی حاصل ہے، جبکہ اس معرکہ آرائی میں مسلم قائدین کے پاس اشتعال انگیز بیانات کے علاوہ کوئی عملی منصوبہ سرے سے مفقود ہے۔ پریس اگر مسلمانوں کے بیانات کو شہ سرخیوں میں چھاپتا بھی ہے تو وہ اس لیے تاکہ احیا پرست ہندوؤں کی نقل وحرکت اور ان کے جارحانہ منصوبوں کو جواز فراہم کیا جا سکے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء کی آخری تاریخیں تھیں جب میں واپس دہلی پہنچا تھا۔ دہلی کے ملّی حلقوں میں اس کانفرنس کی بازگشت باقی تھی جو ابھی چند دن پہلے آل انڈیا بابری مسجد کانفرنس کے بینر تلے دہلی میں منعقد ہوئی تھی جس میں بھانت بھانت کی ایکشن کمیٹیوں اور علی گڑھ اولڈ بوائز پر مشتمل جواں سال مہم جو قائدین کو ایک بینر تلے لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کانفرنس سے دس رکنی بابری مسجد رابطہ کمیٹی کا ظہور ہوا جس کے کنوینر کی حیثیت سے سید شہاب الدین صاحب کا نام سامنے آیا۔ ابراہیم سلیمان سیٹھ

اور عبداللہ بخاری اس کے اساطین میں تھے۔ یوپی اور دہلی کی بابری مسجد ایکشن کمیٹیوں کے علاوہ مسلم مجلس مشاورت کی بابری مسجد بازیابی کمیٹی کی تائید بھی اسے حاصل تھی۔ اس طرح پرسنل لاء بورڈ کے بعد سید شہاب الدین کی قائم کردہ رابطہ کمیٹی کو ایک بین المِلّی متحدہ محاذ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پرسنل لاء بورڈ نے گزشتہ چند برسوں میں تحفظ شریعت کے حوالے سے جس عوامی ہیجان کو جنم دیا تھا، اس مشتعل مزاجی کا خمار ابھی باقی تھا۔ بابری مسجد کے قائدین نے اسی مذہبی جوش وخروش کو اب اپنی مہم جوئی کے لیے استعمال کرلیا۔ یہ کوئی وہی صورت حال تھی جب تحریک خلافت سے پیدا ہونے والی عوامی تحریک کو گاندھی نے کمالِ حکمت کے ساتھ تحریک عدم موالات میں تبدیل کردیا تھا۔ ملک میں قیادت کا سفینہ اب بورڈ کے علما کی عدم شرکت کے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔ دسمبر میں دہلی میں آل انڈیا بابری مسجد کانفرنس کا جو جلسہ ہوا تھا اس میں بورڈ کے کبار قائدین نے شرکت نہ کی تھی۔ مولانا علی میاں مسجد کی بازیابی کے لیے کسی عوامی تحریک کے حق میں نہ تھے، لیکن قیادت کا سفینہ اب آگے چل پڑا تھا، سواکثر ملّی تنظیموں اور قائدین نے اس سفینے پر سوار ہونے میں ہی عافیت جانی۔

دہلی کی کانفرنس میں تین اہم فیصلے لیے گئے۔ اولاً ۲۶ر جنوری کے جشن جمہوریہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ثانیاً ۳۰ر مارچ کو بوٹ کلب پر عوامی ریلی کا انعقاد ہو۔ ثالثاً اگر یہ دونوں اقدامات بھی مسجد کی بازیابی میں کارگر نہ ہوں تو اکتوبر کے مہینے میں مسلمان اقدامی عمل کے طور پر ایودھیا کی طرف مارچ کریں۔

یومِ جمہوریہ کے بائیکاٹ کا اعلان ہوتے ہی قومی پریس میں ایک بھونچال کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ سید شہاب الدین اب رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے ہر طرف موضوعِ بحث تھے۔ جشن جمہوریہ کے بائیکاٹ کی اس کال کو بہت سے لوگوں نے ملک دشمنی پر محمول کیا۔ اڈوانی نے جنتا پارٹی سے شہاب الدین کے اخراج کی مانگ کی۔ خود مسجد تحریک کے دوسرے قائدین حیص بیص کا شکار ہو گئے۔ گو کہ آخری لمحہ میں سید شہاب الدین نے یہ کال واپس لے لی، لیکن قومی پریس میں اس نزاع سے ان کی مرکزیت اور اسٹریٹجک پوزیشن مستحکم ہوگئی۔ ویسے تو پرسنل لا بورڈ کی تحفظِ شریعت مہم بھی ایک پُرشور اور غیر منظم تحریک کی حیثیت سے سامنے آئی تھی۔ لیکن بورڈ کے علما پر چونکہ روحانیت اور تقدس کا پردہ پڑا تھا، اس لیے ان کی اس مہم جوئی اور ہیجانی تحریک کے مضمرات وعواقب کا فوری طور پر اندازہ نہ ہوسکا۔ لیکن بابری مسجد کے قائدین جس طرح اشتعال انگیز بیانات اور غیر ذمہ دارانہ اعلانات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کررہے تھے اور اس کے نتیجے میں ہندوؤں کے خلاف مسلم قومی افتخار کی لڑائی جس طرح آگے بڑھ رہی تھی اس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ آنے والے دنوں میں نفرت اور تصادم کے اس طوفان پر قابو پانا مشکل

ہوجائے گا۔ میں نے ان اندیشوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے سید شہاب الدین صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔مگر میری بات ان کی سمجھ میں کہاں آتی۔اس خط کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا:

مکرمی شاذ صاحب! السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، دعاؤں اور نیک خواہشات کے لیے شکرگزار ہوں۔ ہم لوگ ایک تاریخی موڑ پر ہیں۔ جوش کے ساتھ ہوش کی بھی ضرورت ہے، لیکن مصلحت اور احتیاط سے کام نہیں چلے گا۔اب تو بے دھڑک آتشِ نمرود میں کود جانے والے عشق کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہماری رہنمائی کرے اور ہدایت عطا فرمائے۔

سید شہاب الدین

آتشِ نمرود میں کود پڑنے کی دعوت صرف سید شہاب الدین ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ مختلف ایکشن کمیٹیوں کے نوآموز قائدین اور جامع مسجد کے منبر ومحراب سے بھی مسلسل ہندو احیا پرستوں کو دعوت مبارزت دی جارہی تھی۔ ان ہی دنوں ایک نائب امام اس عزم کے ساتھ ایودھیا کے سفر پر نکلے تھے کہ وہ بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہوکر نماز پڑھیں گے یا پھر ان کی لاش ہی وہاں سے واپس آئے گی۔ روانگی سے پہلے جب کسی صحافی نے ان سے پوچھا کہ آپ کب تک لوٹیں گے تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا، پرسوں۔ حالات اب جس رخ پر بڑھ رہے تھے اس پر نہ اب حکومت کا اختیار تھا اور نہ ہی کسی مؤقر مسلم گروہ، ملّی تنظیم یا دینی شخصیت کے بس میں تھا کہ وہ مسلمانوں کو قومی افتخار کی اس لڑائی میں شرکت سے روک سکے، جس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے ایک غیر منصوبہ بند جنگ میں پھنس کر رہ جانے کا امکان پیدا ہوگیا تھا، بلکہ ان کی پیمبرانہ اور داعیانہ شان کے بھی خلاف تھا کہ وہ محض ایک قوم کی حیثیت سے اپنے دستوری حقوق پر اصرار جاری رکھیں۔

مارچ کی وسطی تاریخوں میں ایک دن سید شہاب الدین صاحب کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ سرسید ہال کے لان میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ فضا دیر تک نعرۂ تکبیر سے گونجتی رہی۔ ۳۰/مارچ ۱۹۸۷ء کو بوٹ کلب کے وسیع میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم الشان ریلی منعقد ہوئی جسے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع بلکہ انبوہ عظیم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ حالات انتہائی نازک تھے، دہلی کا سفر محفوظ و مامون نہ تھا۔ دہلی کی طرف جانے والی ٹرینوں اور بسوں پر اغیار کی نظریں تھیں۔ خوف و اندیشے کی اسی فضا میں، میں اپنے ایک مشفق دوست محمد نوراللہ صاحب کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ بڑی مشکل سے ایک ٹرین ہاتھ لگی۔ اس دن اکثر ٹرینیں یا تو التوا کا شکار تھیں یا دیر سے چل رہی تھیں۔ بوٹ کلب کے وسیع سبزہ

زار پر مسلمانوں کا ایک عظیم سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسٹیج کے دائیں طرف ایک بہت بڑے بینر پر جلی حرفوں میں لکھا تھا:

نہ گھبراؤ مسلمانو خدا کی شان باقی ہے ابھی اسلام زندہ ہے ابھی قرآن باقی ہے
یہ کافر کیا سمجھتے ہیں جو اپنے دل میں ہنستے ہیں ابھی تو کربلا کا آخری میدان باقی ہے

ایسا لگتا تھا کہ مسلمان ایک آخری اور فیصلہ کن معرکہ آرائی کے لیے دہلی کی سرزمین پر ایک بار پھر جمع ہو گئے ہیں۔ ایک طرف عوامی جوش وخروش کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف اسٹیج سے ہونے والی تقریریں امت کے افتراق و انتشار پر دال تھیں۔ قائدین کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ اس تاریخ ساز ریلی کا حقیقی قائد کون ہے؟ جاوید حبیب کا کہنا تھا کہ بابری مسجد خود اس تحریک کی قائد ہے اسے کسی قائد کی ضرورت نہیں۔ عبداللہ بخاری مسلمانوں کے اس جمِ غفیر کو دیکھ کر جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ انھوں نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں اس مجمع کو اشارہ کروں کہ وہ مسلم وزرا کی کوٹھیوں میں آگ لگا دے اور ان کی ٹانگیں توڑ دے تو کیا ہو۔ اسی دوران سید شہاب الدین نے امام صاحب کو لگام دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے اشارتاً امام کا کرتا کھینچا، لیکن امام کہاں قابو میں آنے والے تھے۔ انھوں نے برسرِ اسٹیج سید شہاب الدین کو جھٹک دیا کہ وہ قومی اور ملّی معاملے میں کسی لاگ لپیٹ کو روا رکھنے کے قائل نہ تھے۔ اس تاریخ ساز ریلی سے واپسی پر میں نے 'بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان' کے نام سے ایک کتابچہ لکھا جس میں قائدین کی غیر ذمہ دارانہ مہم جوئی اور بے بصیرتی پر سخت تنقید تھی۔ میں نے لکھا تھا:

'اے میرے عزیز ترین بھائیو! بابری مسجد کا سانحہ یقیناً ہندوستان میں تمھارے لیے ایک بھیانک مستقبل کی پیش گوئی کر رہا ہے، لیکن میرے نزدیک اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تمھارا یہ رویہ ہے جس کے ذریعہ تم اس مسجد کی بازیابی چاہتے ہو۔ خدا کی قسم تم ایک بڑی خیانت کا ارتکاب کر رہے ہو، تم اللہ کے گھر کے نام پر اپنی قومی لڑائی کی جڑیں مضبوط کر رہے ہو، افسوس کہ اسلام کی آبرو داؤ پر لگاتے ہوئے بھی تمھیں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ تم ہر قیمت پر اپنی قومی ترقی کا سامان کرنا چاہتے ہو، کاش کہ تم نے ماضی کے تجربات سے کچھ سبق لیا ہوتا۔ تمھارے اسی اندازِ فکر نے محض قومی مفاد کی خاطر ملک کو تقسیم کروالیا، تمھیں اس بات سے تو خوف آتا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں تم معاشی بدحالی کے شکار ہو جاؤ گے، ہندو تم پر حاوی ہو جائیں گے اور اس لیے ایک الگ خطے کا حصول ناگزیر ہو گیا۔ لیکن تمھیں اس بات کی کوئی فکر نہ رہی کہ منقسم ہندوستان کو اگر مسلمانوں نے خالی کر دیا تو عرصۂ دراز تک یہ سرزمین اللہ اکبر کی صداؤں سے خالی ہو جائے گی

اور انسانوں کی ایک قابل لحاظ آبادی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے سارے راستے یک لخت بند ہوجائیں گے۔ پھر اس لولی لنگڑی قومی فکر کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا اور خدا کے نام پر مفاد پرستوں کے حاصل کردہ ملک پاکستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ خدا کا عذاب ہے، ایک بڑی خیانت کی سزا ہے۔ کاش کہ تم اس سے کچھ سبق لو۔ ان قومی مفاد پرستوں نے دشمنانِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ دیکھو پاکستان میں اسلام فیل ہوگیا، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کو داخل ہونے کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا گیا۔ روزِ اوّل سے جس خطرناک غلطی کو روا رکھا گیا وہ یہ تھی کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی تنظیم نظریاتی بنیادوں پر کرنے کے بجائے نام نہاد قومی بنیادوں پر کی گئی اور جب قوم سے وابستگی اللہ سے وابستگی پر سبقت لے جائے، جب قومی مفاد سب کچھ قرار پائے تو ایسی صورت میں قوم کے اندر مختلف فرقوں کا وجود میں آنا اور ان کے درمیان باہمی کشمکش اور پھر خون ریزی کا ہونا عین فطری ہے۔ میں نے تقسیم کے سانحہ کا قدرے تفصیل سے اس لیے ذکر کیا کہ آج پھر مجھے اسی قسم کے خودغرضانہ اور نفس پرستانہ قومی نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ آج پھر قوم سے وفاداری جسے ہم نے 'ملّی ذمہ داریوں' کا نام دے رکھا ہے، اللہ سے وفاداری پر سبقت لے جارہی ہے۔

میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ مسحورکن قومی نعرے اور قومی مفاد کے لیے کی جانے والی کوششیں تمھارے درد کا درماں نہیں ہوسکتیں۔ ایک خاص قومی لڑائی میں تمھاری شکست یقینی ہے، افسوس کہ تمھاری اخلاقی پستی نے شکست و فتح کی تمیز بھی تم سے چھین لی ہے۔ ذرا غور کرو، اس غلط رویے کے ذریعہ ایک طویل قومی لڑائی کے نتیجے میں اگر تم نے بابری مسجد حاصل کر بھی لی تو اس سے اسلام کا کیا بھلا ہوجائے گا؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم مقابل قوم کے سامنے سینہ پھلا کر کہہ سکو گے کہ تم ایک زندہ قوم ہو۔ تم اپنے قومی غرور کے نشے میں سرشار دوسروں پر حقارت بھری نظروں کے تیر پھینک سکو گے، لیکن یہ عمل جسے تم اپنی فتح سمجھ بیٹھے ہو دراصل تمھاری سب سے بڑی شکست ہوگی کہ اس پورے عمل میں تم نفرت کی جو فضا تیار کرو گے اور دوسری قوموں کے تعصب کی جس حد تک آبیاری کر چکے ہوگے، جس کا سلسلہ تمھارے سیکولر قوم پرست رہنماؤں کے ذریعہ شروع ہوچکا ہے، تو یقین جانو، نفرت اور تنگ نظری اور قومی تعصب کا یہ بھیانک سیلاب تمھارا داعیانہ تشخص بھی بہالے جائے گا۔ نتیجتاً ہندوؤں کی ایک بڑی اکثریت جس میں ابھی دعوتِ دین کے خاصے مواقع موجود ہیں اور جو وسیع النظری کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہے انھیں بھی تم

ہندوتعصب کی دیواروں میں محصور کردو گے۔ اس طرح قومی خطوط پر بابری مسجد کی بازیابی ملک میں ایک طویل عرصے کے لیے دعوت وتبلیغ اور افہام وتفہیم کا دروازہ بند کردے گی۔ اور پھر یہ سلسلہ یہیں نہ رکے گا، مقابل قوم کا احساس شکست اس کے اندر انتقام اور نفرت کا شدید جارحانہ داعیہ پیدا کردے گا اور پھر تمھیں اپنے تعمیر یافتہ قومی تعصب کے خول میں بھی پناہ نہ ملے گی۔'
(ص ص ۱۱-۱۲)

گو کہ یہ کتابچہ مقبولِ عام رجحان کے خلاف تھا، لیکن اس کی غیر معمولی طور پر پذیرائی ہوئی۔ آناً فاناً اس کے کئی ایڈیشن نکل گئے۔ بہت سے لوگوں نے اسے اپنے حلقۂ اثر میں مفت تقسیم کے لیے بڑے پیمانے پر خریدا۔ ملک بھر سے میرے پاس اس قسم کے خطوط آنے لگے کہ آپ نے ہمارے ملّی انحراف کی بروقت نشاندہی کی ہے۔ کتابچہ کی پرشکوہ نثر اور ابوالکلامی لب و لہجے کے سبب بہت سے لوگوں نے مجھے معمر بزرگ سمجھا۔ انھوں نے میرے اوپر یہ فردِ جرم بھی عائد کردی کہ جب میں صورت حال کو اتنی باریک بینی سے دیکھ رہا تھا تو اب تک خاموش کیوں رہا۔ کتابچے کے آخر میں نئی آنے والی تصنیف 'غلبۂ اسلام' کا بھی تعارف کرایا گیا تھا تا کہ جو لوگ اس ملک میں قومی افتخار کی لڑائی کے بجائے پیمبرانہ مشن کی تنظیم نو میں دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لیے ایک واضح لائحۂ عمل سامنے آجائے۔ بہت سے خطوط میں 'غلبۂ اسلام' کی اشاعت کا بے صبری سے انتظار پایا جاتا تھا۔ میں نے سوچا ایک ایسے وقت میں جب ایک عمومی بے سمتی ہمارا مقدر بن چکی ہے، کیوں نہ 'غلبۂ اسلام' کے نام سے ہندوستان میں احیائے اسلام کے منشور کی فی الفور اشاعت کا سامان کیا جائے۔ ملک میں ہندو مسلم منافرت کا درجۂ حرارت مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ مختلف شہروں سے چھوٹے بڑے فسادات اور ہندو مسلم کشیدگی کی خبریں آرہی تھیں۔ ایسے میں تصنیف و تالیف پر توجہ مرکوز رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ابھی کتاب اپنے آخری مرحلے میں تھی کہ ایک دن غیر متوقع طور پر ایک خط نے میرے ذہنی ارتکاز کے سلسلے کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میرٹھ جہاں سے ان دنوں مسلم کشی کی وحشت ناک خبریں آرہی تھیں اس کے تار حلیم بھائی سے جڑ جائیں گے۔ میں جوں جوں خط پڑھتا جاتا خوف و سراسیمگی کی کوئی لہر، ایسا لگتا تھا، جیسے میرے وجود میں سرایت کرتی جارہی ہو۔ لکھا تھا:

'برادرم! سلام مسنون

یہ خط میں میرٹھ کے ایک نرسنگ ہوم سے لکھ رہا ہوں جہاں چند دن پہلے میرا اپنڈکس کا آپریشن ہوا ہے۔ ابھی آپریشن تھیٹر سے باہر ہی آیا تھا کہ نرسنگ ہوم پر بلوائیوں نے ہلّہ بول دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمان مریضوں کو یہاں سے نکال دیا جائے، لیکن ڈاکٹر بھٹناگر، جن کا یہ

نرسنگ ہوم ہے، انھوں نے بلوائیوں کا یہ مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشتعل بھیڑ نے نرسنگ ہوم کو نقصان پہنچایا۔ بہت سا مال و اسباب لوٹ کر لے گئے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ میری غیر مطبوعہ ڈائری کا مسودہ بھی اس ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ گزشتہ چار پانچ سالوں سے میں اپنے درد و کرب کو کاغذ پر انڈیلتا رہا تھا۔ کسے پتہ تھا کہ یہ حادثہ بھی میری قسمت میں لکھا جائے گا۔

چند دن پہلے تمھارا ایک کتابچہ 'بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان' کے عنوان سے مختلف ہاتھوں میں ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا تھا جس سے یہ پتہ چلا کہ تم ابھی تک علی گڑھ میں ٹکے ہوئے ہو۔ مرادآباد میں پولیس کی دھڑ پکڑ سے بچنے کے لیے ہم لوگ میرٹھ چلے آئے تھے۔ عزیز و اقارب نے سہارا دیا اور زندگی پھر سے چل نکلی۔ لیکن اب ایک بار پھر فسادات نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ رام جنم بھومی کی تحریک نے انسانوں پر بہیمیت طاری کر دی ہے۔ چند دن پہلے حکیم سیف الدین کے پاس طبی مشورے کے لیے گیا تھا، کہنے لگے کہ مسجد مندر قضیے کے سبب نفرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر کہیں دو بھینسیں بھی لڑ جائیں تو ہم ایک کو مسلم بھینس اور دوسری کو ہندو بھینس کہہ کر ان کے طرفدار بن جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں تو برسرِ تذکرہ لکھ دی ہیں۔ اصل بات جو میں تمھیں بتا کر دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ بتانے پر اپنا اختیار بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ آج تقریباً پچیس دن ہو چکے ہیں میرا سب سے چھوٹا بھائی کلیم لا پتہ ہے۔ ذرا ہسپتال سے چھٹی ملے تو اس کی تلاش میں نکلوں۔ کوئی کہتا ہے کہ فساد میں مارا گیا۔ جس وقت پولیس والے اسلحوں کی تلاش میں مسلم محلوں کی تلاشی لے رہے تھے، وہ عقبی دیوار کود کر بھاگ نکلا تھا۔ خدا جانے کہاں گیا۔ ملیانہ اور ہاشم پورہ میں جو حادثات پیش آئے ہیں تو نہیں لگتا کہ وہ زندہ بچا ہوگا۔ ایک موہوم امید باقی ہے۔ اب تو غم سہنے کی جیسے عادت سی پڑ گئی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کیا خدا اس دن بھی ہم جیسوں سے حساب لے گا۔ ہم آخر کتنی قیامتیں جھیلیں گے۔ ہر طرف لوگوں کی آنکھوں میں نفرت ہے۔ یہ جگہ اب انسانوں کے رہنے کی نہیں۔ ہم لوگ ایک بار پھر نقل مکانی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ امروہہ، مرادآباد یا شاہجہاں پور، پتہ نہیں اگلی منزل کون سی ہو۔

دعاؤں کی درخواست کے ساتھ

تمھارا بھائی

عبدالحلیم صدیقیؔ

خط پڑھ کر خیال آیا کیوں نہ حلیم بھائی کی فی الفور مدد کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ابھی چند دنوں پہلے میرٹھ اور ہاپوڑ کے کچھ طلبا نے متاثرین کی مدد کے لیے ایک ریلیف کمیٹی بنائی تھی جس میں میرے توسط سے بھی بعض لوگوں نے خطیر رقمیں دی تھیں۔ کمیٹی کا روح رواں ارشد میرے ہاسٹل میں ہی رہتا تھا۔ چند دنوں بعد جب ارشد اپنے احباب کے ساتھ ریلیف کی رقمیں لے کر میرٹھ کے سفر پر گیا تو وہ حلیم بھائی کی تلاش میں بھٹنا گر نرسنگ ہوم بھی پہنچا۔ تلاش بسیار کے بعد پتہ چلا کہ وہ ملیانہ کے محلہ شیخان میں رہتے تھے جہاں یا تو اب جلے ہوئے مکانات ہیں یا پھر یتیموں، بیواؤں کی آہ و بکا۔ اکثر لوگ نقلِ مکانی کر چکے تھے۔

ملیانہ کی بھی عجیب کہانی بتائی جاتی تھی۔ واقف کار کہتے ہیں کہ میرٹھ میں فسادات پر قابو پایا جا چکا تھا۔ زندگی معمول پر لوٹنے لگی تھی کہ ایک دن اچانک راجیو گاندھی نے چیف منسٹر ویر بہادر سنگھ کو دہلی طلب کیا اور ان سے اس بات کی شکایت کی کہ ہاشم پورہ اور املیان کے مسلمان اتنے سرکش ہو گئے ہیں کہ انھوں نے کرفیو کے دوران پولیس کو اپنے علاقے میں تلاشی کے لیے داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ یہ بات برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ویر بہادر نے اطمینان دلایا کہ میرٹھ میں اب حالات قابو میں ہیں۔ لیکن فرمان وزیر اعظم کا تھا۔ وہ دوسرے دن میرٹھ پہنچے اور انھوں نے پی اے سی کے اہلکاروں کے ساتھ ہاشم پورہ اور املیان کے باشندوں کی سرکشی کی شکایت کی۔ ویر بہادر عموماً بھوجپوری بولتے تھے اور ان کی زبان میں لکنت تھی۔ ان کی لکنت کے سبب پولیس افسران کو ایسا لگا جیسے وہ ملیانہ کہہ رہے ہوں اور اس طرح املیان کے مسلمانوں کا انتقام ملیانہ کے مسلمانوں سے لے لیا گیا۔ ان دنوں یہ تاثر بھی عام تھا کہ راجیو گاندھی نے اپنے خاص مقاصد کی تکمیل کے لیے ویر بہادر سنگھ کو یوپی کا چیف منسٹر بنایا تھا۔ ان کے ہاتھوں بابری مسجد کا تالا کھلوایا، اتر پردیش کے مسلمانوں کو سبق سکھایا گیا اور جب ان کی بدانتظامی کا چرچا عام ہوا تو انھیں وزارتِ علیا کے عہدے سے ہٹا کر اپنی کابینہ میں وزیر اطلاعات کے منصب پر لے آئے۔ اور جب یہ اندازہ ہوا کہ ویر بہادر رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھانے میں بیباک ہوتے جا رہے ہیں اور وزیر اعظم سے اپنے خصوصی تعلقات کا تذکرہ کرنے میں احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے تو چند ہی ماہ بعد فرانس کے ایک دورے کے موقع پر پراسرار حالت میں ان کی موت بھی واقع ہو گئی۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے، لیکن ایک خاص مدت کے لیے این ڈی تیواری کے ہاتھوں سے وزارتِ علیا کا عہدہ لے کر اسے ویر بہادر کو سونپنا اور پھر مشن کی تکمیل کے بعد دوبارہ این ڈی تیواری کو وزارت علیا کا عہدہ سونپ دینا تو اسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ راجیو گاندھی کو ویر بہادر سے جو کام لینا تھا وہ انھوں نے لے لیا۔

۴۲

مولانا سبحانی

بابری مسجد ریلی کے بعد ملک بھر میں اور خاص طور پر اتر پردیش کے مختلف شہروں میں مسلم کش فسادات نے شدت اختیار کر لی تھی۔ رمضان کا آخری عشرہ تھا، مئی کا مہینہ، گرمی کی شدت اور ہر روز نت نئی تشویشناک خبروں کا سلسلہ۔ ایک دن جب میں لائبریری سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بجلی غائب ہے، معین اور مجاہد برآمدے میں بیٹھے اخبارات کی ورق گردانی کر رہے ہیں اور آج خلافِ معمول ان دونوں پر سنجیدگی طاری ہے۔ معین اور مجاہد میرے پڑوسی تھے، نیچرل سائنس میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور ان دونوں حضرات کا زیادہ تر وقت اپنی لیب میں گذرتا تھا۔ یہ دونوں جب اکٹھے ہو جاتے تو مجلس کو قہقہہ زار بنائے رکھتے۔ بذلہ سنجی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن آج ان پر سراسیمگی طاری تھی۔ پتہ چلا کہ میرٹھ سے فسادات کی جو خبریں آ رہی تھیں ان میں ایک نئے انداز کی بربریت کا واقعہ سامنے آیا ہے۔ پہلے تو پولیس اور فوجی دستوں نے مسلم محلوں کی پوری طرح ناکہ بندی کر دی۔ لوگوں کو گھروں سے نکال کر سڑکوں پر لائے، قطاروں میں کھڑا کیا۔ بوڑھے، بچے، نوجوان اور عورتیں الگ کی گئیں۔ صرف محلہ ہاشم پورہ میں ۷۰۰ لوگ گرفتار ہوئے جن میں ۴۲ نوجوانوں کو قتل عام کے ارادے سے الگ کر لیا گیا۔ مجموعی طور پر شہر کے مختلف مسلم محلوں سے ڈھائی ہزار سے زائد نوجوان اٹھائے گئے جن کے بارے میں پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گئے۔ باقاعدہ گرفتار ہونے والے اور پولیس کے تشدد کے نتیجے میں حوالات اور جیلوں میں مرنے والوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ ۴۲ نوجوانوں کے بہیمانہ قتل عام کی خبر چونکہ اچانک غیر متوقع طور پر سامنے آ گئی تھی اس لیے ذرائع ابلاغ میں واویلا مچ گیا تھا۔ مجاہد کا کہنا تھا کہ آزاد ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا انوکھا تجربہ ہے جہاں مسلم نوجوانوں کو پولیس اور فوج کے مشترکہ آپریشن میں حراست میں لیا گیا اور پھر رات کی تاریکی میں انھیں ہنڈن ندی کے کنارے ایک ایک کر کے گولی ماردی گئی اور ان کی لاشیں ندی میں پھینک دی گئیں۔ وہ تو کہیے کہ ندی کے کنارے دور دور تک مسلمانوں کی بستیاں آباد ہیں جب گاؤں والوں کو ندی میں تیرتی لاشوں کا علم ہوا تو انھوں نے بروقت زندہ بچ جانے والوں کی تلاش شروع کر دی۔ چار لوگوں میں

زندگی کے آثار ابھی باقی تھے جنھیں داخل ہسپتال کیا گیا۔ ادھر دربھنگہ کا بابو دین انصاری جو پولیس کی گولی سے زخمی ہوکر نیم مردہ حالت میں جھاڑی میں پھنس کر رہ گیا تھا اور جسے مردہ سمجھ کر پولیس والے چھوڑ کر چلے گئے تھے آخری وقت میں اپنے رب سے مناجات میں مشغول تھا۔ خدا نے اس کی دادرسی کے لیے وبھوتی نرائن رائے کو بھیجا جو غازی آباد کے ایک فرض شناس پولیس آفیسر تھے۔ انھوں نے بابو دین کو جھاڑی سے نکالا، تھانے لائے اس کا بیان قلم بند کروایا اور اس کی بنیاد پر پی اے سی کی ۴۱ویں بٹالین کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی۔ وزیر اعلی ویر بہادر سنگھ اس وقت دہلی کے یوپی بھون میں سو رہے تھے انھیں جب اس ایف آئی آر کا پتہ چلا تو بہت گھبرائے۔ واقف کار کہتے ہیں کہ وہ ننگے پیر اپنی کار کی طرف یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ 'ای تو گجب ہوئی گوا، ای تو گجب ہوئی گوا'۔ انھوں نے فی الفور غازی آباد کا رخ کیا، وبھوتی نرائن کی معطلی کے احکام جاری کیے اور جس ہسپتال میں زندہ بچ جانے والوں کا علاج چل رہا تھا اس پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا تاکہ ذرائع ابلاغ والے وہاں داخل نہ ہوسکیں۔

ملیانہ اور ہاشم پورہ سے آنے والی خبروں نے معین اور مجاہد جیسے نہ جانے کتنے نوجوانوں کے چہروں سے مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔ کل تک جن آنکھوں میں مستقبل کا خواب دکھائی دیتا تھا آج وہاں وحشت نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کل تک جن نوجوانوں کی مجلسیں مہ جبینوں کے تذکروں سے مملو ہوتی تھیں آج وہاں اس سوال نے اہمیت اختیار کرلی تھی، آیا اس ملک میں ہمارا نام ونشان باقی بھی رہ پائے گا یا نہیں۔ مجاہد ابھی چند دن پہلے جرمنی میں کسی کانفرنس میں اپنا مقالہ پیش کرکے لوٹے تھے، تب وہ مستقبل کے سلسلے میں بڑے پراعتماد دکھائی دیتے تھے۔ آج بہت فکرمند دکھائی دیئے۔ کہنے لگے کہ قتل و غارت گری کے واقعات مسلسل بڑھتے جارہے ہیں۔ اس آگ کے پھیلنے میں ہمارے ملّی قائدین بھی نادانستہ طور پر دشمنوں کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم گرما گرم جوابی نعروں سے رام جنم بھومی کی تحریک کو تقویت پہنچا رہے ہوں۔

وہ کس طرح؟ میں نے پوچھا۔

بولے: اب دیکھیے ۳۰ر مارچ کو بابری مسجد ریلی ہوئی جسے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع کا نام دیا گیا۔ اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں۔ ہندوؤں کو ایسا لگا کہ مسلمان ایک بار پھر منظم ہورہے ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد رام نومی کا تہوار تھا جسے ہندوؤں نے جوابی حملے کے طور پر استعمال کیا۔ ملک بھر میں رام بھگتوں کا یہ جلوس جن علاقوں سے گزرا وہاں بے گناہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہوگیا۔

میرے خیال میں رام نومی کے جلوسوں کا شاید اتنا رول نہیں۔ اصل آگ تو ۱۶ر مئی کی تقریر نے

لگائی ہے، معین نے کہا۔

کون سی تقریر؟ میں نے پوچھا۔

بولے: بوٹ کلب کی تقریر۔

مگر وہاں تو ۳۰ / مارچ کو ریلی ہوئی تھی، میں نے وضاحت کی۔

بولے: ۳۰ / مارچ کی ریلی کا تو سب کو پتہ ہے۔ اسی بوٹ کلب میں ۱۶ / مئی کو وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بھی کانگریس کے کارکنوں کو خطاب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ ملک کو غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے پیچھے بیرونی ہاتھ ہے۔ امریکہ پاکستان کو مسلح کر رہا ہے۔ راجیو گاندھی نے کہا تھا: 'ان کو ہم کڑا کے کا جواب دیں گے، ایسا جواب دیں گے کہ انھیں نانی یاد آجائے گی'

تو گویا راجیو گاندھی ہندو کارڈ کھیل رہے تھے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: یہ تو بہت واضح ہے۔ بوٹ کلب میں عبداللہ بخاری کی تقریر نے اگر مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کیا تھا تو راجیو گاندھی کی تقریر ہندوؤں کو واضح الفاظ میں یہ پیغام دے رہی تھی کہ حکومت مسلمانوں اور ان کے سرپرستوں کو نانی یاد کرا دینے میں سنجیدہ ہے۔

مگر اس بیان پر تو ہمارے ملّی قائدین نے کوئی واویلا نہیں مچایا، معین نے سوال کیا۔

بولے: کیسے مچاتے، ملّی قائدین تو انھیں اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں۔ نفقہ مطلقہ کے مسئلہ پر آپ نہیں دیکھتے تھے کہ مسلمان علما اور کانگریس کے مسلم لیڈران کس طرح راجیو گاندھی کی مسلم دوستی میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ اکثر مسلم قائدین انھیں صاف ذہن، روشن خیال اور مسٹر کلین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بابری مسجد ان ہی کی ایما پر کھلی۔ سرکاری ٹیلی ویژن پر مسجد میں پوجا پاٹ کے مناظر ان ہی کی خاموش حمایت کے سبب دکھائے جاتے رہے۔

'تمھارا خیال درست ہے۔ وزیر اعظم کو ایسا بیان نہیں دینا چاہیے تھا' مجاہد نے معین کی تائید کی۔

بولے: ارے بھئی راجیو کا تو یہ خاص انداز ہے۔ وہ کمزوروں کو سبق سکھانے سے کب چوکتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں جب ملک بھر میں سکھوں کے خلاف فسادات ہو رہے تھے اور جب صرف دہلی میں تین ہزار سے زائد بے گناہ سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اس وقت بھی راجیو گاندھی نے اس قتل عام کو جواز بخشتے ہوئے کہا تھا کہ جب کوئی بڑا درخت گرتا ہے تو دھرتی ہلتی ہے۔ یہ تو ہمارے روشن خیال اور سیکولر وزیر اعظم کا خاص طریقۂ واردات ہے۔

عجیب! میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

میرا خیال ہے معین صحیح کہتے ہیں، مجاہد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بولے: 'ہندو احیا پرست اور حکمراں کانگریس دونوں ہی مسلمانوں کو نانی یاد دلانے کی مہم میں ایک دوسرے کے شریک و سہیم بن گئے ہیں۔ پرسوں میں دہلی میں تھا، دریا گنج کے علاقے سے گذر رہا تھا وہاں ایک اسکوٹر رکشا پر نظر پڑی جس پر بڑے بڑے بینروں پر اشتعال انگیز نعرے لکھے تھے: 'اس بار عید کیسی ہوگی؟ مرادآباد جیسی ہوگی'۔ دوسری طرف لکھا تھا: 'جو مانگے گا بابری، اس کا سمے ہے آخری'۔ لاؤڈ اسپیکر پر اشتعال انگیز نغمے بجاتے اور نعرے بازی کرتے ہوئے اس کے پیچھے بھگوا دھاری نوجوانوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی چل رہی تھی۔ ہر پل ایسا لگ رہا تھا کہ ایک نیا فساد بس اب شروع ہوا چاہتا ہے۔ کیا بتاؤں بہت وحشت ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں کب خون خرابہ شروع ہو جائے۔ کیمپس سے باہر نکلو تو پتہ چلتا ہے کہ دُنیا کس قدر ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے...'

مجاہد کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ زینے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ 'ارے سبحانی چچا آپ! آیئے آیئے تشریف لائیں' آپ ابھی تک محوِ استراحت نہیں ہوئے؟ معین نے انھیں دیکھتے ہی آواز ہ بلند کیا۔

مولانا حسن سبحانی کی بھی عجب کہانی تھی۔ وہ ۲۷ سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کی غرض سے یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ایک بڑے مردِ قلندر کے بیٹے تھے۔ کانپور کی مسجد مچھلی بازار کی شہادت کے خلاف علمِ احتجاج بلند کرنے اور اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے مولانا آزاد سبحانی سے ایک دُنیا واقف ہے۔ وہ پاکستان تحریک میں بھی پیش پیش رہے لیکن جب تقسیم کے بعد انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار دیکھی تو یہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ حسن سبحانی صاحب کا کمرہ ہمارے کمرے سے قریب ہی تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی اُردوئے معلّٰی میں خیریت پوچھتے۔ کیا مجال کہ انگریزی کا کوئی لفظ ان کی زبان کو آلودہ کر سکے۔ مثلاً فرماتے: کیا آپ مذاکرۂ تقرری میں نہیں بیٹھے تھے؟ سنا ہے عزیزی فاروق کا تقرر درس جمع دو میں ہو گیا ہے، وہیں دارالاقامہ میں انھیں خورش اور رہائش کی سہولت بھی مل گئی ہے۔'

موسم ابر آلود دیکھ کر لڑکے ان سے تقاطر امطار کی بابت سوال کرتے۔ ایک صاحب زادے جو غالباً کسی انگریزی اسکول کے پروردہ تھے انھوں نے تو جوشِ زبان دانی میں اپنے ایک کلاس فیلو کو سبحانی صاحب سے یوں متعارف کروایا تھا: 'مولانا صاحب ان سے ملیے یہ ہمارے ہم زلف ہیں، ہم لوگ اسکول کے زمانے سے ہی ہم زلف چلے آتے ہیں۔' یہ سن کر ایک لمحے تو ان پر حیرت طاری رہی، پھر جب بات کی تہہ تک پہنچے تو بہت محظوظ ہوئے۔

آج سبحانی صاحب کچھ پریشان بلکہ مضطرب سے دکھائی دیئے۔ کہنے لگے پتہ نہیں حکومت کیا چاہتی ہے۔ حالات بے قابو ہو رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ عید کے اجتماع میں کوئی بڑا حادثہ نہ پیش آ جائے۔

’مگر اس بار تو ہلکی پھیکی عید منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے‘، مجاہد نے وضاحت کی۔

بولے: ’آزادی کے بعد اس ملک میں ہماری ہر عید ہلکی پھیکی بلکہ محزون و مغموم ہی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی لوگوں کا اجتماع تو ہوگا نا؟ سنا ہے کہ مرادآباد کے نعرے لگائے جا رہے ہیں‘

’جی ہاں! اور یہ سب حکومت کی عین سرپرستی میں ہو رہا ہے، آپ نے نانی یاد کرانے والی تقریر نہیں سنی؟ معین نے مداخلت کی۔

بولے: ارے بھئی اب تو پھر سے تقسیمِ ہند والے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ٹرینوں میں جدولِ مسافران کے ذریعے مسلمانوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

’مگر اس مسئلے کا تو ہم لوگوں نے حل ڈھونڈھ نکالا ہے، مجاہد نے وضاحت کی۔ بولے: عبداللہ کو تو آپ جانتے ہیں نا؟ وہ گورکھپور والے جو ہندی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ انھوں نے ٹرین کے ٹکٹ میں اپنے نام کا ہندی ترجمہ لکھا ہے‘، یہ کہتے ہوئے مجاہد کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

اچھا! وہ کیا؟ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

بولے: انتہائی شستہ اور برمحل ترجمہ ہے۔ لکھا ہے: بھگوان داس

اچھا تو میاں صاحب زادے اب بھگوان داس بن گئے ہیں، ذرا ملیں تو میں ان کی خبر لوں۔ سبحانی صاحب نے ترجمے کا لطف لیتے ہوئے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

اس میں حرج بھی کیا ہے؟ اگر دفع فتنے کی خاطر ہم نوراللہ کے بجائے اوم پرا کاش کہلائیں یا سلمی بیگم کو شانتی دیوی کہا جائے۔ اس طرح زبان کا حجاب بھی جاتا رہے گا۔ مجاہد نے اپنی گفتگو میں مزید وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بولے: یہ ایک انتہائی نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ زبان اپنے ہمراہ ثقافت بھی لیے آتی ہے۔ اگر ہم فاتح ہوں تو کچھ حرج نہیں زبان کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں لیکن مفتوح اگر تلوار کے زور پر نام تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ عمل ہمیں نفسیاتی طور پر اندر سے مجروح کر دے گا۔ یہ کہتے ہوئے سبحانی صاحب ایک لمحے کو رکے، جیسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ پھر فرمایا: یہ کام دراصل بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ جس طرح مسلمانوں نے آتش پرستوں کے نماز روزے کا ’اسلامی کرن‘ کیا اسی طرح اگر دھیان گیان، پوجا پاٹ، برت اور یاترا جیسی اصطلاحوں کو بھی بر وقت اسلامیا لیا گیا ہوتا تو آج صورتِ حال مختلف ہوتی۔ ہم نے اصل میں اسلام کو عرب قالب میں محصور کر لیا۔ خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے اس پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے سبحانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔

۴۳

سرزمیں دلّی کی

دو ڈھائی ماہ سخت عالمِ اضطراب میں گزرے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب مختلف شہروں سے کشت و خون کی خبریں نہ آتی ہوں۔ اس دوران 'غلبۂ اسلام' کی کتابت مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی اشاعت کے خیال سے دہلی کے سفر کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ابھی کمرے سے نکلا ہی تھا کہ پتہ چلا کہ میرٹھ- بجنور بس سے گیارہ مسلمان مسافروں کو اتار کر تہہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ دوستوں نے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب بابری مسجد کی ریلی میں شرکت کے لیے میں بمشکل ٹرین کے ایک ڈبّے میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن ٹرین جیسے جیسے لیٹ ہوتی جاتی اور غیر متوقع طور پر چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی تو خطرات بڑھتے جاتے، جان کا دھڑکا لگا رہتا مگر پھر اس خیال سے کہ اب تو یہی اس ملک کے شب و روز ہیں، میں نے دہلی کی راہ لی۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جامع مسجد کے صدر دروازے پر بڑے بڑے سیاہ بینر آویزاں ہیں جن میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم پر سخت الفاظ میں احتجاج درج کیا گیا ہے۔ مسجد کے مِنارے سیاہ غلافوں سے ڈھک دیئے گئے تھے، جس سے ناظرین پر یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ مسلمانوں پر اس ملک میں کوئی سخت وقت آ پڑا ہے۔ ان کے جذبات مجروح اور دل فگار ہیں اور اس نازک صورت حال پر جامع مسجد ماتم کناں ہے۔ پتہ چلا کہ رمضان کے چند دنوں بعد امام جامع مسجد عبداللہ بخاری نے میرٹھ کے فسادات سے دل برداشتہ ہو کر احتجاجاً نمازیوں اور زائرین پر جامع مسجد کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ کوئی دو ہفتوں تک مسجد نمازیوں اور سیاحوں کے لیے بند رہی۔ پھر حکومت کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ خاطی آفیسروں کو سزا دلائے گی اور مظلوم مسلمانوں کو رہا کیا جائے گا، جامع مسجد تو کھول دی گئی تھی لیکن میناروں سے لپٹے سیاہ غلاف اب بھی اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ —

سرزمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے۔

صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو ایک ڈونیشن باکس پر نظر پڑی جو آدم سینا کی مالی معاونت کے لیے رکھا گیا تھا۔ آدم سینا کا تذکرہ تو گزشتہ سال ہی سننے میں آیا تھا لیکن ان فسادات میں مزاحمت یا مدافعت

کے لیے اس نوزائیدہ تنظیم کا کوئی عملی وجود دیکھنے کو نہ ملا تھا۔ اب جامع مسجد میں آویزاں چندے کے ڈبوں سے یہ پتہ چلا کہ یہ تنظیم نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ قومی اخبارات میں شیوسینا، بجرنگ دل اور وشوا ہندو پریشد کے جنگجویانہ عزائم کے مقابلے میں مسلمانوں کی طرف سے اسی واحد تنظیم کا سہارا ہے۔ آدم سینا کی کاغذی تنظیم اگر نہ ہوتی تو اخبار والوں کے لیے شاید توازن پیدا کرنا مشکل ہوجاتا۔ پھر وہ اس پورے قضیے کو جو دراصل ریاستی مشینری بنام بے بس مسلمان تھی، ہندو۔مسلم تنازع کے روپ میں کیسے پیش کر پاتے۔

مسلمانوں کو نانی یاد کرادینے کی سرکاری مہم کتنی چابک دستی اور مؤثر طریقے سے چلائی گئی اس کا کسی قدر اندازہ مظلومین کے ان بیانات سے ہوتا تھا جو انھوں نے میرٹھ اور دہلی میں ٹریبونل کے ممبران کے سامنے مارچ ۱۹۸۸ء میں دیئے تھے۔ ہاشم پورہ کے محمد عثمان نے اپنی روداد غم کچھ اس طرح سنائی تھی:

'۲۲ر مئی ۱۹۸۷ء شام ۶ر بجے کا وقت تھا جب پی اے سی، فوج اور پولیس والوں نے مجھے اور میرے تمام پڑوسیوں کو گرفتار کرلیا۔ ہم لوگ سڑک پر بٹھا دیئے گئے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے وہ تین ٹرکوں میں ہمارے محلے کے لوگوں کو لے گئے۔ بچے اور بوڑھے گھر واپس بھیج دیئے گئے۔ اب میں اور محلے کے پچاس دیگر لوگ باقی رہ گئے تھے، تب پی اے سی کمانڈر نے، جس کے ہاتھ میں مائک تھا، ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم لوگ ٹرک میں سوار ہوجائیں۔ میرے ساتھ اس ٹرک میں قادر چائے والا، حاجی مستقیم، حاجی شمیم، نعیم، رضوان، عبدالحق اور دوسرے لوگ تھے، جن میں سے بعض لوگوں کو میں چہرے سے تو جانتا تھا مگر نام سے واقف نہ تھا۔ ہم لوگ اس ٹرک میں کسی طرح ٹھونس دیئے گئے۔ مجھے بیچ میں بیٹھنے کی جگہ ملی اس لیے مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ ٹرک کہاں جارہا ہے۔ ٹرک ایک جگہ رکا اور وہاں دو یا تین پی اے سی والے اتر گئے۔ ٹرک پھر چل پڑا، پھر چلتا ہی رہا۔ ہم لوگ حیران تھے کہ ہم اب تک سول لائن پولیس اسٹیشن کیوں نہیں پہنچے۔

آگے چل کر ٹرک دائیں طرف کو مڑا۔ میں نے اپنے ایک محلے دار کو یہ کہتے سنا کہ یہ تو مرادنگر کنال ہے۔ یہاں پی اے سی والوں نے ایک شخص کو اتارا، اسے گولی مارکر نہر میں پھینک دیا۔ پھر انھوں نے دوسرے شخص کو اتارا اور اسے گولی مارکر نہر میں پھینک دیا۔ اسی طرح تیسرا آدمی بھی مارا گیا۔ اب ہم لوگوں کو ایسا لگا کہ ہم سب کی موت یقینی ہے۔ آخری لمحے میں اب ہمیں خدا کو یاد کرنا چاہیے۔ ہم لوگ اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں چوکنّا دیکھ کر پی اے سی والوں نے ٹرک پر بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ جو بچ رہا اسے بھی گولی مارکر نہر میں پھینک دیا گیا۔ میرے اوپر ایک شخص گرا ہوا تھا، اس لیے میں بندوق کی گولی سے بچ گیا۔ پھر دو پی اے سی

والوں نے مجھے پکڑا، میں نے چیخ و پکار شروع کی، رحم کی بھیک مانگی، اپنے چھوٹے بچوں اور بوڑھے والدین کا حوالہ دیا تبھی ایک پی اے سی جوان میری طرف نشانہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا۔ میں نے بندوق کا بیرل پکڑ کر اسے اپنی طرف سے دور کرنے کی کوشش کی۔ دو چار سیکنڈ اسی کنفیوژن میں گزرے۔ جوان نے گولی چلا دی تھی جو میرے پیٹ میں لگی تھی۔ میں چیخا او میں مارا گیا۔ انھوں نے مجھے مردہ سمجھ کر کنال میں پھینک دیا۔ کنال میں پہنچنے کے بعد میں نے تیرنے کی بہت کوشش کی لیکن میری ٹانگیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کنارے پہنچا۔ پی اے سی کے ٹرک چلے جانے کے بعد نہر سے باہر نکلا۔ سڑک پر آیا تو دیکھا کہ وہاں دو بہاری مزدور جنھیں میری ہی طرح گولی لگی تھی، زخمی حالت میں موجود تھے۔ اس راستے پر دو ٹرک گزرے۔ میں نے روکنے کی کوشش کی لیکن کوئی نہ رکا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل پر کچھ پولیس والے متحرک دکھائی دیئے۔ میں نے انھیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ رک گئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ پی اے سی والوں نے ہمیں گولی مار کر نہر میں پھینک دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم جیپ لے کر آ رہے ہیں۔ اس دوران ایک پولیس والا ہمارے ساتھ ہی رکا رہا۔ پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اس طرح بیان دوں گا تو میری زندگی خطرے میں آ جائے گی، اس لیے مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اسی دوران فساد شروع ہو گیا۔ کسی نے میری پیٹھ پر گولی ماری۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا۔ آل انڈیا انسٹیٹیوٹ میں جب تک میرا علاج چلتا رہا، ایک سی آئی ڈی کا آدمی ہر وقت میرے قریب رہتا تھا جو کسی صحافی کو مجھ سے بات نہیں کرنے دیتا تھا۔ اس دوران جس نے بھی مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی میں اسے پولیس کی بتائی کہانی دہراتا رہا، اس لیے کہ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری زندگی اب بھی خطرے میں ہے۔'

ہاشم پورہ سے گرفتار کیے گئے بعض نوجوان یا تو پولیس کی پٹائی کے نتیجے میں شہید ہو گئے یا ان زخموں کی تاب نہ لا کر فتح گڑھ جیل میں چل بسے۔ پولیس کے بہیمانہ تشدد سے ایک عینی شاہد پرویز احمد جنھوں نے میرٹھ یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کی ڈگری لے رکھی تھی، نے کچھ ان الفاظ میں پردہ اٹھایا تھا:

'میں، قمر الدین اور شیراز احمد، نصیر الدین کے گھر مکان نمبر ۹، باغیچہ محمد حسین میں تھا۔ ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا جب فوجی ہمارے گھر میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مجھے، قمر الدین، شیراز احمد، محمد نصر اور سالم کو گرفتار کر لیا اور ہمیں مین روڈ پر لے آئے۔ وہاں محلے کے دوسرے بہت سے لوگ پہلے سے موجود تھے۔ میجر پٹھانیا اور ایک سکھ کیپٹن اس کارروائی کی

سربراہی کررہے تھے۔ مجھے ایک ٹرک میں بٹھایا گیا جس میں معین الدین بھی تھا۔ہم لوگ پولیس لائن لائے گئے۔ جب ٹرک پولیس لائن پہنچا تو اسے پی اے سی کے جوانوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ہماری پٹائی شروع کردی۔ ہم لوگ ٹرک میں تھے اور یہ ایک کھلا ٹرک تھا۔ پٹائی سے بچنے کے لیے لوگ ایک طرف سے دوسری طرف بھاگتے۔ ٹرک کے اندر بھگدڑ کی ایک کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اسی بھگدڑ میں معین گر گیا اور اسے بری طرح چوٹ آئی۔ ہم لوگ دو تین گھنٹے پولیس لائن میں رہنے کے بعد سول لائن پولیس اسٹیشن لائے گئے۔ انھوں نے ہمیں ایک ایک کرکے کھینچ کر ٹرک سے نکالا اور انتہائی بے دردی سے ہماری پٹائی شروع کردی۔ اس پٹائی کے نتیجے میں معین الدین، ظہیر احمد اور مینو بے ہوش ہوگئے۔ ان کے جسموں کو کھینچتے ہوئے درخت کے نیچے لائے۔ رات گیارہ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میرا خیال ہے یہ لوگ یا تو مر چکے تھے یا کچھ دیر بعد انھوں نے دم توڑ دیا ہوگا۔ صبح چار بجے پولیس ان تینوں کی لاشوں کو کہیں لے گئی۔ سخت پٹائی کے نتیجے میں میری دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔'

غم کے مارے ان بے گناہ مسلم نوجوانوں کو جیل میں بھی تعذیب سے رہائی نہ مل سکی۔ فتح گڑھ جیل میں گرفتار ہوکر پہنچنے والے تاج الدین ولد شمس الدین نے جیل کے اندر بیتے واقعات کا کچھ ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

'۲۴ر مئی ۱۹۸۷ء کی شام میں اور میرے ایک ساتھی کو سول لائن پولیس اسٹیشن لایا گیا۔ وہاں سے ہم لوگ ۲۵ر مئی کی صبح فتح گڑھ جیل پہنچے۔ صبح سات بجے کا وقت رہا ہوگا، جیسے ہی ہم جیل میں داخل ہوئے سزا یافتہ مجرموں اور پولیس والوں نے لاٹھی ڈنڈوں سے ہماری پٹائی شروع کردی، جس کے نتیجے میں دین محمد اسی وقت مرگیا۔ حنیف خان اور جمیل احمد جو دوسرے ٹرک میں آئے تھے اور محمد سلیم نے دوسرے دن جیل کے ہاسپٹل میں دم توڑ دیا۔ مجھے ان کے جسموں کی شناخت کے لیے کہا گیا، لہٰذا میں نے دین محمد، حنیف خان اور جمیل احمد کے لاشوں کی شناخت کردی۔ میں نے دیکھا محمد عثمان جو ایک دوسرے ٹرک سے فتح گڑھ جیل میں لائے گئے تھے، ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ دو دنوں بعد جیل کے ہاسپٹل میں ان کی بھی وفات ہوگئی۔'

یہ تو مرنے والوں کا قصہ تھا۔ جو لواحقین بچ گئے ان پر کیا گزری، اس کا کسی قدر اندازہ شکیلہ بیگم کے اس بیان سے ہوتا ہے، جنھیں اپنے شوہر حنیف کی موت کی خبر پولیس والوں نے کچھ اس طرح سنائی تھی:

’۲۲رمئی سہ پہر تین چار بجے کے قریب پی اے سی اور خاتون پولیس میرے گھر میں گھسی۔ میرے شوہر جو گزشتہ تین سال سے بیمار چلے آتے تھے، گھر کے اندر تھے۔ میں نے پولیس سے بہت کہا کہ وہ میرے بیمار شوہر کو نہ لے جائے لیکن وہ نہیں مانی۔ اس نے بندوق کے دستے سے ان کے پیٹ پر ٹھوکر ماری اور انھیں زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ میں نے انھیں اپنے شوہر کی ایکسرے رپورٹ اور علاج کے کاغذات دکھائے، منت سماجت کی اور جب ہمارے چھ سالہ پوتے نے مزاحمت کی کوشش کی تو اسے بھی کھینچ کر لے جانے لگے۔ میں باہر نکلی اور بڑی مشکل سے اپنے پوتے کو ان سے چھیننے میں کامیاب ہوئی۔ ۲۷رتاریخ کو پی اے سی والے ہمارے پاس آئے، بولے: حنیف کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کوئی ہمارے ساتھ چل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم لوگ تو سب کو لے گئے اب یہاں ساتھ جانے کو بچا ہی کون ہے؟ میں ان کے ساتھ سول لائن پولیس اسٹیشن گئی جہاں انھوں نے مجھے بتایا کہ ہم تمھیں عید کے موقع پر ایک تحفہ دینے والے ہیں اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرے شوہر کی لاش میرے حوالے کر دی۔ انھوں نے مجھے گالی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے لیے یہ تحفہ دور فتح پور جیل سے لے کر آئے ہیں۔‘

شکیلہ بیگم کی طرح عید کی یہ رات نہ جانے کتنے مسلمانوں پر شب عاشور بن کر آئی۔ کوئی ڈھائی ہزار نوجوان میرٹھ کے مختلف علاقوں سے اٹھائے گئے تھے جن میں بیالیس کا تذکرہ ہاشم پورہ قتل عام کے حوالے سے اخبارات کی زینت بنا۔ بقیہ لوگ کہاں گئے کسی کو نہیں معلوم۔ ایم جے اکبر جو اُن دنوں کانگریس کے ترجمان ہوا کرتے تھے اور جنھوں نے وزیر اعظم راجیو کے ساتھ میرٹھ کا دورہ بھی کیا تھا، انھوں نے ہاشم پورہ کی گھر گھر تلاشی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد پولیس عبدالماجد کے گھر میں داخل ہوئی۔ گھر کے صحن میں ایک نیم کا درخت تھا۔ پولیس نے میاں بیوی سے کہا کہ وہ گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں، اس دوران وہ پیڑ کے نیچے بیٹھے رہیں۔ تلاشی میں پولیس کو کچھ اور تو نہ ملا وہ عبدالماجد کے بیس سالہ جوان بیٹے دین محمد کو اپنے ساتھ لے گئی۔ ۲۸رمئی کو چاند رات تھی۔ عشا کے بعد کچھ پولیس والے عبدالماجد کے گھر یہ خبر لے کر آئے کہ اس کا بیٹا جیل میں اس سے ملنے کے لیے بے چین ہے، لہٰذا وہ اس کے ساتھ چلے۔ عبدالماجد کو اندیشہ ہوا کہ شاید پولیس کے تشدد کے سبب جیل میں اس کے بیٹے کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں اسے بہت دیر بٹھائے رکھا گیا۔ ڈھائی بجے رات میں جب پولیس نے اس کے بیٹے کی لاش اس کے حوالے کی تو وہ حواس باختہ ہوگیا۔ پولیس کی سخت ہدایت تھی کہ اسے صبح ہونے سے پہلے ہی دفنا دیا جائے۔ پولیس والوں نے پہلے سے ہی قبر کھدوا رکھی تھی۔ جب عبدالماجد

اپنے دوستوں کے ساتھ جواں سال بیٹے کا جنازہ لے کر قبرستان پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ اکیلا نہیں ہے، تین اور باپ اپنے جوان بیٹوں کا جنازہ لے کر قبرستان آئے ہیں۔ یہ سب وہ مسلم نوجوان تھے جو جیل میں پولیس کی حراست کے دوران بہیمانہ تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ ہاشم پورہ کے واقعات بھی اس ملک میں ذرائع ابلاغ کی سرخیوں میں نہ آتے اگر نہر میں پھینک دیئے جانے والے نوجوانوں میں کوئی زندہ نہ بچتا اور اگر ایک فرض شناس پولیس آفیسر وبھوتی نارائن کی بروقت مداخلت سے پی اے سی کی بٹالین ۴۱ کے خلاف ایف آئی آر درج نہ ہوتی۔ وبھوتی نارائن بنیادی طور پر ایک حساس قلمکار تھے۔ آگے چل کر انھوں نے *Hashimpura 22May* کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ کیس درج ہوا۔ برسہا برس کی کوششوں کے بعد ۱۹۹۶ء میں سی بی آئی اور سی آئی ڈی نے چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ، غازی آباد کی عدالت میں ۱۹ پی اے سی والوں کے خلاف چارج شیٹ داخل کی۔ متاثرین کی درخواست پر ۲۰۰۲ء میں یہ مقدمہ دہلی کی عدالت میں منتقل کردیا گیا۔ ۱۵/مارچ ۲۰۱۵ء کو جب فیصلہ سامنے آیا اس وقت تک تین پولیس والے اپنی فطری موت مر چکے تھے، باقی جو سولہ رہ گئے انھیں کورٹ نے شہادتوں کی کمی کے سبب بری کردیا۔ ستائیس سال کی یہ قانونی جنگ جس طرح اپنے انجام کو پہنچی اس نے بابو دین اور ان کے ان تین ساتھیوں کو، جو معجزاتی طور پر بچ گئے تھے، ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ طرفہ یہ کہ اس دوران اتر پردیش میں ملائم سنگھ کی 'اسلامی' حکومت قائم ہوئی، مایاوتی کی مسلم دوستی کا چرچا رہا، لیکن متاثرین کی دادرسی کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ وبھوتی نارائن کہتے ہیں کہ ہاشم پورہ اس ملک میں کوئی نادر اور انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ہاشم پورہ دراصل کوئی وقوعہ نہیں بلکہ ایک طرز فکر کا نام ہے۔ اس لیے اس بات پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات بالعموم مسلمانوں اور پولیس کے مابین ہوتے ہیں، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نہیں۔ رائے کا کہنا تھا کہ میرٹھ میں جو کچھ ہوا اس کے تار اوپر تک ملتے ہیں۔ ایک معمولی سب انسپکٹر کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس طرح قتل عام کا حکم صادر کر سکے۔ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ ہاشم پورہ سانحہ کے بعد جب راجیو گاندھی میرٹھ کے دورے پر گئے تھے تو وہاں پی اے سی زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ محسنہ قدوائی اس وقت میرٹھ سے ممبر پارلیمنٹ ہوا کرتی تھیں، وہ راجیو کی کابینہ میں وزارت کے عہدے پر بھی فائز تھیں، انھوں نے سانحے کے بعد میرٹھ کا دورہ بھی کیا تھا، لیکن افسوس کہ ان کی زبان سے ایک کلمۂ اف بھی نہ نکل سکا۔

۴۴

بریف کیس داعی

ملک میں ایک عمومی بے چینی تھی۔ مسلمان خود کو ایک اذیت ناک گھٹن میں محسوس کر رہے تھے۔ مسلم علما کی تحفظ شریعت مہم کے بطن سے ہندو احیا پرستی کے عفریت نے جنم لیا تھا۔ نفقہ مطلقہ کے مسئلے پر ایک لغو اور بے ضرر قانون کے عوض ہندوؤں کو بابری مسجد کا تحفہ عطا کر کے راجیو گاندھی نے ہندوؤں کی خوشنودی کا سامان کر لیا تھا۔ انھوں نے علما کے ترکش سے شریعت کا تیر کچھ اس طرح اڑا لیا کہ ہمارے مولوی صاحبان اور ان کے معاون دانشوروں کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگی۔ دوسری طرف بابری مسجد کی سیکولر قیادت نے مسلمانوں کو ان کے نظری مقام سے ہٹا کر انھیں ایک خالص قومی جنگ میں جھونک دیا تھا۔ طرفہ یہ کہ مسلمانوں کی ملّی تنظیمیں، جن میں مسلم مجلس مشاورت اور جماعت اسلامی جیسی تنظیمیں بھی شامل تھیں، وہ بھی قومی افتخار کی اس لڑائی میں پوری قوت سے شامل ہو گئی تھیں۔ ایک عام تاثر تھا کہ جو لوگ بابری مسجد کے مسئلے پر مجاہدانہ جوش و جذبے کا مظاہرہ نہیں کریں گے وہ سواد اعظم سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ رہے مسجد کے قائدین تو ان کے پاس جذباتی نعروں اور گرما گرم بیانات کے علاوہ قوم کو دینے کے لیے اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ پوری قوم ایک بند گلی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ ان حالات میں غلبۂ اسلام کی اشاعت نے امید کی ایک نئی کرن روشن کی۔

'غلبۂ اسلام' جسے ہندوستان میں احیائے اسلام کے منشور کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا، محض کوئی علمی تصنیف نہ تھی بلکہ ایک انقلابی منصوبے کا اعلان تھا۔ کتاب کے ساتھ ایک جوابی کارڈ بھی شامل تھا جس میں قارئین سے ان کے ذاتی کوائف طلب کیے گئے تھے اور ان سے یہ پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ غلبۂ اسلام کے اس نئے مشن کو تعاون دینے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ گویا ہم رشتہ کارڈ کی حیثیت ایک تحریری بیعت نامہ کی تھی۔ کتاب جہاں جہاں پہنچی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سیکڑوں کی تعداد میں بیعت نامے کی کاپیاں ملک کے مختلف علاقوں سے موصول ہونے لگیں۔ بہار اور اتر پردیش کے بعض شہروں سے بعض گرم جوش مسلمان بنفسِ نفیس مجھ سے ملنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے آئے۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ لوگ

صاحبِ کتاب کوعقیدت ومحبّت کے اس مقام علیا پر فائز کردیں گے جو کسی عہد کے کبار مصلحین کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے امت کو مدت سے کسی آنے والے کا انتظار رہا ہو۔ ایک دن جامع مسجد دہلی کے علاقے میں اُردو بازار کے ایک مکتبہ میں تھا کہ وہیں مجھے یہ اطلاع ملی کہ تبلیغی جماعت کے حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب غلبۂ اسلام کے نوجوان مصنف سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ان دنوں چتلی قبر میں جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر ہوا کرتا تھا۔ افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی، جنھیں ہم لوگ افضل چچا کہتے تھے، اکثر فائلوں میں مشغول رہتے۔خوش اخلاقی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا مگر گفتگو مختصر کرتے ، جیسے ابھی بہت سے کام نپٹانے ہوں۔البتہ اس دن جب میں نے سلام کرکے آگے بڑھ جانا چاہا تو انھوں نے اپنی فائلیں لپیٹ کر رکھ دیں، سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے: امیر جماعت کہہ رہے تھے کہ تم نے جماعت پر سخت تنقید کردی ہے۔ ویسے تمھاری تنقید درست ہے محاکمہ تو ہونا چاہیے۔ ہم لوگ بھی کیا کریں۔ بڑے سخت حالات میں گاڑی یہاں تک کھینچ لائے ہیں۔ان ہی دنوں مولانا وحیدالدین خان صاحب سے میری دو ایک ملاقات رہی۔ان کی گفتگو مولانا مودودی پر تنقید سے مملو ہوتی۔کتاب کی غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر خیال ہوا کیوں نہ اس کا عربی اور انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہوجائے۔ شعبۂ انگریزی کے ایک سینئر استاذ مجیب صاحب نے شستہ انگریزی میں ترجمہ کردیا۔مولانا اکرم ندوی ان دنوں ایک جواں سال قلمکار کی حیثیت سے ابھر رہے تھے، انھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ کتاب کا عربی قالب تیار کرڈالا۔محب مکرم کمال حلباوی صاحب نے عربی ترجمے کی تزئین وتصحیح کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ گویا دیکھتے دیکھتے ایک چھوٹی سی کتاب نے وہ شہرت حاصل کرلی کہ میں جہاں جاتا اس کتاب کی شہرت میرے تعاقب میں لگی رہتی۔ یہ صحوہ کا وہی زمانہ تھا جب سعودی اور ایرانی خیمے کے داعیان فتحِ اسلامی کے بڑے بڑے منصوبے بناتے اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے جہاد افغانستان میں امریکی شمولیت اور حمایت کے سبب اسلامی منصوبوں کو بظاہر تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اس ماحول میں دین کا کام کرنا خطرات کو دعوت دینے کے بجائے بہت سے لوگوں کے لیے دُنیا طلبی کا ذریعہ بن گیا تھا۔اس تکلیف دہ صورت حال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

> 'بے شمار اسلامی اداروں، انجمنوں اور تنظیموں کی موجودگی کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام کی تحریک کسی قابل ذکر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہورہی ہے؟ اس اہم سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ عہد جدید کے بریف کیس داعیوں میں اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے بے چینی، غلبۂ اسلام کے لیے انتہائی درجے کی تڑپ اور اللہ کی راہ میں مرمٹنے کی تمنا کا بڑی حد تک فقدان ہے اور جب تک انسانوں کے ایک قابل ذکر گروہ میں فکر وعمل کی اس درجہ تبدیلی نہیں ہوتی اور جب تک

اسلام کے انقلابی رویے کے حاملین کا ایک گروہ پیدا نہیں ہوتا ذلت کی زندگی سے مسلمانوں کی نجات ناممکن ہے، اسلام کے غلبہ کا خیال عبث ہے۔اس کتاب کا مقصد اسی تڑپ کو عام کرنا ہے۔'

بریف کیس داعیوں پر یہ جملے بہت شاق گزرے۔ کسی نے کہا کہ 'غلبۂ اسلام' میں جن دس نکاتی منصوبے کا تذکرہ کیا گیا ہے، مصنف اسے احکامِ عشر (Ten Commandments) سے کم نہیں سمجھتے اور خود اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کے مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ الفاظ کا شکوہ اور لہجہ کی بلند آہنگی سے تو یہی تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے گویا اب تک اس ملک میں اشاعت اسلام کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان کی بنا ہی غلط رکھی گئی تھی اور اب ان حضرت کو نئے دور کے مجدد کا کام سونپا گیا ہے۔ ایک صاحب جو کئی کتابوں کے مصنف تھے انھوں نے یہ پھبتی کسی کہ خیر سے شاذ صاحب بھی صاحبِ کتاب ہو گئے ہیں۔ دوسرے نے کہا: صاحبِ کتاب نہ کہو بلکہ اہل کتاب کہنا کہیں بہتر ہے۔ یونیورسٹی کے سیکولر حلقوں میں اس کتاب کی اشاعت کو کچھ اس طرح دیکھا گیا جیسے ایک نئی radical قیادت ظہور میں آنے کو بیتاب ہو۔

ایک دن شعبہ انگریزی میں بیٹھا پی ایچ ڈی کے مقالے کی ترتیب وتصویب میں مصروف تھا کہ غیر متوقع طور پر شمسی کی آمد ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں 'غلبۂ اسلام' کا ایک نسخہ تھا جس کے حاشیے پر جا بجا انھوں نے اپنے ملاحظات لکھ رکھے تھے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے: ارے بھئی یہ کیا بات ہوئی ہمارے خیال میں تو غلبہ کا پیراڈائم (paradigm) ہی غلط ہے۔ کیوں چاہیے ہمیں غلبہ؟ کیا غلبہ کے بغیر ہم مسلمان نہیں رہ سکتے؟ اور حدیبیہ کو ہم مشعلِ راہ کیوں نہیں بناتے؟ ہمارے خیال میں تو فتح مبین کا راستہ حدیبیہ سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ میں نے کہا، یہ سب کچھ حدیبیہ تک لے جانے کی ہی سعی ہے۔ حدیبیہ دراصل برپا کرنا پڑتا ہے، اسے انقلابی تحریک کا منتہا سمجھو۔ جو لوگ اسے صرف pacifism کا علامیہ سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ کہنے لگے، ریاست اور خلافت کی بات میرے خیال میں دراصل ایک اضافی شے ہے۔ شمسی ان دنوں مولانا وحید الدین خاں کی تحریروں کے زیر اثر تھے۔ لوگوں کو ان کی تعبیر کی غلطیوں پر کچھ اسی اعتماد کے ساتھ مطلع کرتے کہ کس طرح خدا اس دن بعض لوگوں کی دینی خدمات کو یہ کہہ کر ان کے منہ پر دے مارے گا کہ یہ باتیں جن کو تم دین سمجھ کر عامل رہے ان باتوں کا تو ہم نے سرے سے حکم ہی نہیں دیا تھا۔ کہنے لگے کہ دُنیا میں امن قائم کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں کہ مروجہ نظام (status quo) کو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا جائے۔ میں نے کہا کہ انبیا status quo کو توڑنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ خود رسول ﷺ کا مقصدِ بعثت **ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم** بتایا گیا ہے۔ انبیا ہوں یا ان کے پیروکار اگر انھوں نے نظامِ ظلم کے آگے سرخم کر دیئے تو کونوا **قوامین بالقسط** کا علم کون اٹھائے گا مگر یہ جو ریاست کو دین کے مرکز ومحور میں

رکھ دیا جاتا ہے یہ تو مناسب نہیں۔

میں نے کہا: محور میں نہ رکھو مگر حاشیے سے غائب بھی نہ کرو۔ جس چیز کا جو مقام ہے اسے وہیں رہنے دو۔ تم کہتے ہو خلافت بعد کی ایجاد ہے تو میرے بھائی خلافت تو نام ہی اس نظام کا ہے جو وصالِ نبوی ﷺ کے بعد پہلی نسل کے مسلمانوں نے امت کے شیرازہ کو متحد رکھنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ ابوبکرؓ نے اپنی امارت کو خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت سے جواز بخشا۔ عمرؓ نے خود کو خلیفہ خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کہا۔ گویا امت کی شیرازہ بندی رسول ﷺ کو محور میں رکھ کر کی گئی اور امیر المومنین کی اتباع خلیفۂ رسول ﷺ ہونے کے سبب لازم ٹھہری۔ کبھی ثقیفہ کے مجمع میں خلیفہ کی تقرری ہوئی تو کبھی مشاورت سے نامزد کیا گیا اور کبھی کبار صحابہؓ کی کمیٹی نے باہمی مشاورت سے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی۔ بس یہ سمجھو کہ ایک نبوی محور کے گرد امت کی شیرازہ بندی کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اسے خلافت کہو یا امامت یا أمرھم شوریٰ بینھم کے تحت کوئی اور نام دے لو۔ اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں اور آپ کے بعد مسلمانوں کی پہلی نسل نے اس بات کا بھرپور التزام کیا کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ ایک اجتماعی نظم کا حصہ بنیں بلکہ ان کی اجتماعی اور ملی قوت سے چہار دانگ عالم میں عدل وقسط کے قیام کا کام لیا جائے۔

شمسی سے ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ اسی دوران احمد سورتی صاحب تشریف لے آئے۔ سورتی صاحب ان دنوں یونیورسٹی سے سبکدوش ہو چکے تھے البتہ جب کبھی لائبریری آتے تو ہمیں بھی اپنی آمد سے مشرف فرماتے۔ کہنے لگے: ارے بھئی میں تو سمجھا یہاں کوئی کلاس ہو رہی ہے، پھر شاز میاں کی آواز سنی تو خیال آیا کہ جس کلاس میں شاز موجود ہوں تو وہ کلاس آف کلاس ہوگی، میتھ میٹکس میں وہ سٹ تھیوری ہے نا....

'مگر شمسی کو تو یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ آگے کیا ہوگا، اس ملک میں ہم اپنی شناخت کے ساتھ باقی بھی رہ پائیں گے یا نہیں'، میں نے سورتی صاحب کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوال کا رخ ان کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔

بولے: بہت ہی اہم اور حساس سوال ہے، تم لوگوں کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ ہمارا واسطہ انتہائی مکار اور مجنٹ لوگوں سے ہے۔ مکر کا مقابلہ مکرِ محض سے نہیں ہوسکتا اس کے لیے پیمبرانہ بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مکروا ومکر اللہ عام طور پر لوگ ترجمہ کرتے ہیں کہ وہ مکر کرتے ہیں اور خدا مکر کرتا یعنی چالیں چلتا ہے۔ حالانکہ خدا کی چالوں کی نوعیت ہی الگ ہے۔ اہلِ کفر کی دسیسہ کاریوں کے مقابلے میں خدائی ترکیبوں کی مثال یوں سمجھو جیسے سامری کے مقابلے میں عصائے موسیٰ۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم وقت کے سامری کا مقابلہ پیمبرانہ سطح پر کریں، عام ساحروں کے روایتی ہتھیاروں سے نہیں۔

'گویا ہندو احیا پرستی کا مقابلہ مسلم احیا پرستی سے نہ کیا جائے' شمسی نے گفتگو کے اطلاقی پہلو کو کھولنے کی کوشش کی۔

بولے: 'تم نے بالکل صحیح سمجھا۔ پہلے بھی ہم نے ہندو قوم پرستی بنام مسلم قوم پرستی سے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ملک دولخت ہوا بلکہ اس حادثے میں ہماری عددی قوت تحلیل ہو کر رہ گئی۔ اب ان ہی خطوط پر ایک قومی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے، یہ کسی طور بھی ایک صحت مند ترکیب نہیں ہے، اس راستے میں شکست ہمارا مقدر ہے'۔

'اور ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تمھارا موقف درست ہے، البتہ اس میں مزید تراش خراش کی ضرورت ہے'، انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

'مگر اس وقت تو پوری امت اس بات پر متفق ہوگئی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہے۔ حتیٰ کہ جماعتِ اسلامی والے جو ایک اسلامی آئیڈیل ازم کے داعی رہے ہیں وہ بھی مسلمانوں کی اس قومی جنگ کا حصہ بن گئے ہیں' شمسی نے تشویش ظاہر کی۔

بولے: ایک دور تھا، گو کہ وہ بہت مختصر رہا، جب جماعتِ اسلامی کی دعوت میں پیمبرانہ لب و لہجے کی شان پائی جاتی تھی۔ مولانا مودودی کی ابتدائی تحریروں میں دیکھیے، ان کا ذہن اس بارے میں خاصا صاف ہے کہ روزِ حشر خدا اس بنیاد پر فیصلہ نہیں کرے گا کہ کسی کا نام عبداللہ ہے یا رام پرشاد۔ وہاں فیصلے کی بنیاد نیک اعمال ہوں گے، محض زبانی اقرار نہیں۔ انھوں نے خطبات میں اس نکتے کو بہت آسان اسلوب میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خدا کی رحمت صرف ان ہی کے لیے ہے جو اس کو پہچانتے اور اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ صفت نہیں ہے ان کے نام خواہ عبدالرحمٰن ہوں یا دین دیال، خدا کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں اور ان کو اس کی رحمت سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مگر بعد کے دنوں میں یہ پیمبرانہ شان باقی نہیں رہ سکی اور اب تو مسلمانوں کے دوسرے دھڑوں کی طرح ان کے ہاں بھی قومی، ملی اور تہذیبی شناخت پر بڑا اصرار ہے۔

پھر تو ہمیں چاہیے کہ ہم موجودہ صورتِ حال میں اپنے پیمبرانہ رنگ و آہنگ کو صیقل کرتے رہیں تا کہ اہلِ وطن کو یہ پتہ چلے کہ ہم کوئی اور نہیں اس آخری پیغام کے امین ہیں جس کے بغیر تاریخ کے آگے کا سفر بے معنی ہو جاتا ہے۔ شمسی نے امتِ مختار کی نظری حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

'جی ہاں! اس ملک کے باسیوں کو اگر پتہ چل جائے کہ ہم واقعی کون ہیں، ہمارا مستقبل کی خدائی اسکیم میں کیا مقام ہے تو جو لوگ حجر و شجر کی پرستش کو لازم جانتے ہیں تو کیا عجب کہ وہ ہم سے لڑنے کے بجائے

ہماری تقدیس وتعظیم پرآمادہ ہوجائیں۔انھیں اگرمعلوم ہوجائے کہ ہم امتِ مختار ہیں، اس ملک میں رحمتیں ہماری وجہ سے نازل ہوتی ہیں، ہم نہ ہوں تو بارش رک جائے ، زمین نعمتیں اگلنا بند کر دے، سورج اپنی ضیاپاشی سے پہلوتہی کرے۔' میں نے ایک ممکنہ اسٹریٹجی کی طرف اشارہ کیا۔

بولے: یہ امتِ مختار والی ترکیب بھی ایک جال (trap) ہے، ایک گورکھ دھندا ہے جس میں بسا اوقات شکاری خود ہی پھنس جاتا ہے۔اس ملک میں صوفیا اور سادات کے حلقوں نے اپنی تقدیس وتکریم کا غلغلہ بلند کیا۔ وہ برکتیں بانٹتے رہے، لوگ ان کا آشیرواد لیتے رہے، درشن کرتے رہے۔مگر ان باتوں سے کیا ہوا۔ یہ کام تو اپنے انداز میں برہمن بھی کرتے ہیں۔ ہمارا کام تو ہانکے پکارے کونوا ربانین کی دعوت دینا ہے۔ نبی کہتا ہے ربّانی بنو، اس کے برعکس جولوگ منصبِ نبوت کا صحیح شعور نہیں رکھتے وہ اس دعوت کو کونوا عباداً لی میں بدل دیتے ہیں، اپنی تقدیس وتکریم کی دعوت ان کے درس وارشاد کا محور بن جاتا ہے۔خود کو امتِ مختار سمجھنا ایک بات ہے اور اس منصبِ عظیم پر فائز ہونا ایک بالکل ہی دوسری بات۔'

'میں سمجھا نہیں! باتیں ایسا لگتا ہے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئی ہوں'، شمسی نے وضاحت طلب کی۔

بولے: 'ہمارا امتِ مختار ہونا اس کارِ نبوت کے سبب ہے جو نبی کے نائب اور وارث کی حیثیت سے ہمیں تفویض ہوا ہے۔ اگر ہم نے اس کارِ نبوت سے پہلوتہی کی تو ہم اس اعزاز کے مستحق نہیں رہتے۔ اہلِ یہود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندوں میں ہیں، انھیں خدا نے تمام اقوامِ عالم پر فضیلت دے رکھی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ فضیلت تورات کے حاملین ہونے کے سبب تھی، جب انھوں نے تورات کی تعلیمات اور اپنے قائدانہ مقام کا پاس نہ رکھا تو وہ از خود اس منصب سے معزول ہو گئے۔ پھر ان کی خوش فہمیاں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکیں۔ نازی جرمنی کی عقوبت گاہوں میں جب ان پر ظلم وستم کی رات طویل ہوتی گئی تو ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ خدا نے اپنی فضیلت یافتہ قوم کو اس طرح بے یار ومددگار کیوں چھوڑ دیا۔'

'گویا یہ احساس ایک طرح کے خبطِ عظمت کو بھی جنم دے سکتا ہے۔'

بولے: ہاں! اگر کوئی قوم ایک false sense of chosenness میں مبتلا ہوجائے تو وہ خود بھی تباہ ہوتی ہے اور دوسروں کی تباہی کا سبب بھی بن جاتی ہے۔اب اسی نازی جرمنی کے واقعے کو لو۔ اہلِ یہود کا روایتی خبطِ عظمت انھیں لے ڈوبا، وہ نوشتۂ دیوار کو نہ پڑھ سکے۔ دوسری طرف جولوگ انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے وہ بھی اپنے آپ کو ایک خدائی مشن پر مامور سمجھتے تھے۔

کیا مطلب؟ ہٹلر بھی کیا کوئی مذہبی آدمی تھا؟ شمسی نے حیرت سے پوچھا۔

'مذہبی تو اہل یہود بھی نہیں رہ گئے تھے۔ خبطِ عظمت کا اسیر ہونے کے لیے آدمی کا مذہبی ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ ہٹلر کا یہ خیال کہ جرمن قوم کو خدا نے نسلی اعتبار سے برتر بنایا ہے، سیادت ان کے لیے مقدر کی گئی ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اس خیال کے تانے بانے بھی دراصل لوتھر کی تحریکِ اصلاح سے جا ملتے ہیں۔'

'واقعی؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ہاں! اس طرف لوگوں کی توجہ کم ہی گئی ہے بلکہ اس سیاق میں نازی جرمنی کے ظہور کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔ وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ ۱۸۷۱ء میں پروشین (جرمن) فوجیں جب فرانسیسیوں کو شکست دینے کے بعد برلن کو واپس آ رہی تھیں انھوں نے ایک بڑا بینر آویزاں کر رکھا تھا جس پر لکھا تھا: "Welch eine Wendung durch Gottes Fugung" (یعنی خدائی مداخلت سے اچانک حالات نے کیسے پلٹا کھایا)۔ اس عہد میں پروٹسٹنٹ علما اپنی تقریروں میں اس بات کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے کہ خدا نے بے دین فرانسیسیوں کی تذلیل کے لیے جرمن قوم کو منتخب کیا ہے۔ لوتھر کی معنوی اولاد کے ہاتھوں ان لوگوں کی تذلیل جنھوں نے انسانی عقل کو اپنا خدا بنایا، حکمرانی کے حقوق بادشاہوں سے لے کر اپنے جیسے عام انسانوں کو دے دیئے، سیکولرازم کی کوکھ سے جنم لینے والی تحریکِ تنویر (Enlightenment) کی حمایت کی جس کے بطن سے انقلابِ فرانس کا ظہور ہوا اور جس کے سبب چرچ کی حکمرانی کا تصور پاش پاش ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو سزا دینے کے لیے اگر خدا نے جرمن قوم کو منتخب کیا ہو تو ان کے لیے اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی۔

گویا اس عہد میں نظری اعتبار سے جرمنی اور فرانس دو مختلف کیمپوں میں بٹے ہوئے تھے؟

ہاں! اس عہد کے سماجی منظر نامے پر نظر ڈالو تو بڑی دلچسپ تصویر نظر آتی ہے۔ ۱۸۱۳ء میں نپولین پر جرمن قوم کی فتح کا معاملہ ہو، یا ۱۸۷۰ء کی جنگ ہو یا پہلی جنگِ عظیم کے ایام، ہر موقع پر پروٹسٹنٹ علما کی تقریروں سے ایسا لگتا ہے کہ جرمن قوم ایک خدائی مشن پر مامور ہو۔ ان کے نزدیک نپولین کی حیثیت ایک مسیح دجال کی تھی جس کی بیخ کنی کے لیے خدا نے جرمن قوم کو منتخب کیا تھا۔ اس عہد میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے خیمے میں غیر معمولی سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔ جا بجا خانقاہیں قائم ہوتی ہیں، معذوروں اور یتیموں کی مدد کے لیے مراکز وجود میں آتے ہیں، مشنری سرگرمیاں تیز ہو جاتی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے مسیح کے ظہورِ ثانی کا وقت اب قریب آ گیا ہو، جیسے خدائی بادشاہت کے قیام میں اب محض چند ثانیے رہ گئے ہوں۔

'مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک خالص مذہبی تحریک کے بطن سے نسل پرستی اور وہ بھی جارح نسل پرستی کا ظہور کیوں کر ہوا؟' شمسی نے تخصیص کے ساتھ جاننا چاہا۔

بولے: بات بہت واضح ہے۔ مذہب کا تو یہاں صرف نام استعمال ہو رہا تھا ورنہ اصل دعوت تو نسلی

تفوق کی ہی دی جارہی تھی۔لوتھر کوایک مذہبی مصلح سے کہیں زیادہ ایک قومی ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔لوتھر نے خود کو جرمن قوم کے نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا، ان کی دعوت میں نہ صرف یہ کہ پیمبرانہ لب و لہجے کا فقدان تھا بلکہ ان کے دل میں اہلِ یہود کے لیے نفرت وعداوت کا طوفان برپا تھا۔

'عجیب! مگر لوتھر کی شخصیت کے اس تاریک پہلو پر گفتگو کم ہی کی جاتی ہے۔عام طور پر تو انھیں ایک روشن خیال مصلح تصور کیا جاتا ہے، بلکہ بہت سے سیکولر مسلمانوں کی زبان سے گاہے بگاہے یہ جملہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ کاش اسلام کو بھی کوئی لوتھر ملا ہوتا،' میں نے خیال ظاہر کیا۔

بولے: یہ سب نادانی کی باتیں ہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر لوتھر نہ ہوتے تو شاید ہٹلر کا ظہور بھی نہ ہوتا۔

وہ کیسے؟ لوتھر تو ایک مذہبی مصلح ہیں، پروٹسٹنٹ چرچ میں ان بڑی اہمیت ہے جبکہ ہٹلر کو عام طور پر بدی کی ایک علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

بولے: گو کہ ان دو شخصیات کے بیچ کوئی چار سو سال کا فاصلہ حائل ہے، نظری طور پر یہ دونوں ہی جارح قوم پرستی کے نقیب ہیں، دونوں ہی اہل یہود کو زندہ رہنے کا حق دینا نہیں چاہتے۔فرق ہے تو صرف اتنا کہ لوتھر کے ہاں یہ سب کچھ مذہبی لب و لہجے میں ہے تو ہٹلر کے ہاں سیکولر عہد کے دلائل، مثلاً سوشل ڈارونزم کو بھی جرمن نسل پرستی کے حق میں استعمال کیا گیا ہے۔مگر حل دونوں کے ہاں ایک ہے۔ وہ یہ کہ اہل یہود سے مذہبی تشخص کے ساتھ جینے کا حق چھین لیا جائے۔

'مگر عجیب بات ہے کہ ہٹلر جہاں مجمع خلائق میں راندۂ درگاہ ہے وہاں لوتھر کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔'

بولے: مذہبی تقدس کا یہی تو فائدہ ہے۔ عام لوگوں کے جرائم بآسانی طشت از بام ہو جاتے ہیں جبکہ مذہبی دسیسہ کاریوں اور قیل وقال پر تقدس کا پردہ پڑا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کھلی آنکھوں سے لوتھر کا رسالہ 'On the Jews and their Lies' پڑھے گا تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ لوتھر نے اہل یہود کے مسئلے سے نپٹنے کی جو ترکیبیں بتائی تھیں، ہٹلر نے ان ہی ترکیبوں کو مزید نئے اضافوں کے ساتھ عملی جامہ پہنایا ہے۔

اچھا! دونوں کے نقطۂ نظر میں اس قدر مماثلت ہے، شمسی نے حیرت سے پوچھا۔

بولے: ہاں لوتھر نے اہل یہود کی عبادت گاہوں کو جلانے، ان کے گھروں کو تباہ کرنے، ان کی مذہبی کتابوں کو ان سے چھین لینے، ان کے ربائیوں کو درس و اشاعت سے روکنے، ان پر سفری پابندی عائد کرنے، ان کی سودی مالیات کو ختم کرنے اور ان کے نوجوان لڑکے لڑکیوں سے جبراً کام لینے کی تلقین کی تھی۔ ہٹلر نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور اضافے کر دیئے، مثلاً اہل یہود کی آریائی نسل سے

شادی پر روک، یہودیوں کی علیحدہ بستیاں یعنی ghettos کا قیام، کمتر نسل جس میں یہودیوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا ان کی نس بندی وغیرہ۔ گو کہ جرمن یہودی اپنے آپ کو جرمن شہری سمجھتے تھے، لیکن لوتھر اور ہٹلر دونوں انھیں محض یہودی تسلیم کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہودی ہونے کا مطلب تھا کہ وہ جرمن مخالف ہیں۔ ہٹلر کی نگاہوں میں لوتھر کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ اپنی کتاب مین کیمف *(Mein Kampf)* میں اس نے لوتھر کو دُنیا کے عظیم ترین سورما کا لقب دیا ہے۔ ہٹلر کے زوال کے بعد جب ان کے پیروکاروں پر مقدمہ چلایا گیا تو ان میں سے بعض سرکردہ لیڈروں نے یہ بات کہی تھی کہ آج اگر مارٹن لوتھر ہوتے تو وہ بھی ہمارے ساتھ اس کٹہرے میں کھڑے ہوتے کہ ان کا خیال تھا کہ یہودی سانپ کی قبیل سے ہیں، ان کی عبادت گاہوں کو آگ لگا دینا چاہیے اور انھیں تہہ تیغ کر دینا چاہیے۔ ہٹلر کے بہت سے پیروکار انھیں مارٹن لوتھر کا اوتار سمجھتے تھے۔ جرمن نیشنلزم کا خمیر یہود مخالف جذبات سے تیار ہوا تھا۔ اس اعتبار سے ہٹلر اور لوتھر ایک ہی سکہ کے دو رُخ معلوم ہوتے ہیں۔

'گویا جرمن نیشنلزم خیر امت کی ہی ایک سیکولر تعبیر تھی؟'

سیکولر نہ کہو، گمراہ کن کہو۔ آمریت اپنے ساتھ بہت سے مفاسد لاتی ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں ایک لفظ ہے: ہیوبرس (hubris)۔ یہ نرگسیت سے ایک درجہ آگے کا مرحلہ ہے۔ جب لیڈر کا تعلق حقائق کی دُنیا سے بڑی حد تک منقطع ہو جاتا ہے اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، ایسا کرنے میں خواہ اسے خلق کی تائید حاصل نہ ہو، مگر کائنات کی تمام قوت اس کے ساتھ ہے۔ اس کے ہاتھوں میں قوت کا ارتکاز اسے باور کراتا ہے کہ وہ ایک الٰہی مشن پر مامور ہے، حالانکہ یہ سب کچھ بنیادی طور پر پرسنیلٹی ڈس آرڈر (personality disorder) کے سبب ہوتا ہے۔ ہم جنھیں کرشماتی شخصیات سمجھتے ہیں، ان کے دل و دماغ میں کس قسم کے توہمات و مسلمات کا ڈیرہ ہوتا ہے تو اس پر سے بھی سریت کا نقاب اٹھنا باقی ہے، یہ کہتے ہوئے سورتی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے سوچا سورتی صاحب شاید صحیح کہتے ہیں۔ خیر امت ہونا ایک نازک اور حساس امر ہے۔ بسا اوقات پتہ نہیں چلتا کہ آپ پیمبرانہ مقام سے کب پھسلے اور کب قومی افتخار کی لڑائی میں شامل ہو گئے۔ بابری مسجد کے قائدین ہی پر کیا موقوف دُنیا میں بڑی بڑی فتنہ سامانیاں قیام امن اور حصول انصاف کے بہانے ہی روا رکھی جاتی ہیں۔ امریکی استعمار اپنی توسیع پسندی کو انسانی حقوق اور فرد کی آزادی کا نام دیتا ہے۔ امریکی ڈالر کی سطوت بھی اسی تقدیسی حوالے سے قائم ہے جس پر لکھا ہوتا ہے: In God We Trust۔

۴۵

گولامی کا بوجھا

ملک میں حالات اب بھی تشویشناک بلکہ ہنگامی اور اضطراری نوعیت کے تھے۔ ان حالات میں تحقیقی اور علمی کاموں کی گنجائش کہاں تھی۔ مگر استاذ مکرم پروفیسر جعفر ذکی صاحب رضوی کا مشفقانہ اصرار تھا کہ اب میں پوری تندہی کے ساتھ اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کی تیاری میں لگ جاؤں۔ انھوں نے خاص اس مقصد کے لیے یونیورسٹی سے ایک سال کی چھٹی بھی لے لی تھی۔ لیکن ابھی پہلے باب کے ابتدائی صفحات پر ہی نگاہ ڈالی تھی کہ ان پر انجائنا کا شدید حملہ ہوا۔ چند دنوں بعد جب طبیعت نے سنبھالا لیا تو مجھے اس امر میں تکلف محسوس ہوا کہ استاذ محترم پر علمی کاموں کا بوجھ ڈالا جائے۔ میرے شدید اصرار پر وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ سردست مقالے کی تصحیح و تبویب کا کام ان کی جگہ نقوی صاحب انجام دے ڈالیں۔ اب کام کی ترتیب یہ بنی کہ میں ہر روز ایک منصوبے کے تحت دس بارہ صفحات لکھتا اور اگلی صبح نقوی صاحب کو دکھاتا۔ میری عادت ایک انگلی سے ٹائپ کرنے کی تھی۔ ابھی اس عمل پر دس بارہ دن ہی گذرے ہوں گے کہ انگلیاں فگار ہونے لگیں۔ خدا کا کرنا ان ہی دنوں مغربی بنگال سے ایک نوجوان اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ علی گڑھ میں وارد ہوئے تھے۔ ان کی شادی نے سماجی تنازع کی شکل اختیار کر لی تھی اور دفع فتنہ کے خیال سے انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ کسی مناسب دفتری کام کی تلاش میں تھے۔ میرے عم زاد محترم جاوید ذوالقرنین صاحب کے توسط سے وہ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا نام شریف تھا، آدمی اسم بامسمیٰ تھے، انگریزی ٹائپنگ کا اچھا تجربہ تھا۔ ایسا لگا جیسے خدا نے انھیں میری معاونت کے لیے خاص طور پر بھیجا ہو۔ شریف بھائی روز سہ پہر میں تشریف لاتے، میں انھیں مسودہ املا کراتا اور وہ بڑے سلیقے سے ٹائپ شدہ اوراق میرے حوالے کر جاتے۔ اس طرح چار پانچ ماہ کے مختصر عرصے میں مقالے کا پہلا ڈرافٹ تیار ہو گیا۔

ایک دن شریف بھائی کے ساتھ مسودے کی تصحیح و تزئین میں مصروف تھا کہ اسی دوران عبدالقادر ادھر آ نکلے۔ عبدالقادر سے میری پرانی شناسائی تھی، وہ صومالیہ کے رہنے والے تھے اور اب دارالحکومت مقدیشو میں ہونے والی خانہ جنگی کے سبب وطن واپسی کا ارادہ ترک کر چکے تھے۔ ان پریشان کن حالات میں بھی

ہمیشہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی لیکن اس دن غیر معمولی طور پر متوحش نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے: برودر! یونو شیطان از ویری کلیور، اگر فوراً کچھ نہ کیا گیا تو وہ اپنا کام کر جائے گا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شیطان کو اپنا کام کرنے دو۔ رحمان کے بندے اپنا کام کریں۔ بولے: بات بہت سنگین ہے، مذاق کا موقع نہیں۔ عثمان سے تم واقف ہو، اچھا خاصا نمازی اور پرہیزگار آدمی ہے، اس کے اور امینہ کے بیچ الفت ومحبّت کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر فوری طور پر کوئی مناسب حل نہ نکالا گیا تو خطرہ ہے کہ شیطان بیچ میں آجائے۔ میں نے کہا شیطان کو چھوڑو بس تم بیچ میں نہ آنا۔ بولے: میں تو قاضی کی تلاش میں نکلا ہوں اور تم سے مدد کا خواہاں ہوں۔ میں نے کہا یہ لوگ چند دن رک کیوں نہیں جاتے تا کہ ان کے والدین بھی اس تقریب میں شامل ہو جائیں؟ بولے: ان کے گھر تک یہ بات پہنچی تو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی ابغال قبیلے کی ہے اور عثمان کا تعلق ہبر جدیر قبیلے سے ہے۔ صومالیہ کی خانہ جنگی میں یہ دونوں قبائل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ سردست نکاح کے علاوہ اس مسئلہ کا کوئی اور حل ہے نہیں۔ عبدالقادر کی باتیں سن کر اچانک مجھے اپنا پرانا کلاس فیلو علی باقر یاد آیا۔ باقر ایک عراقی طالب علم تھا، کچھ دنوں سے کلاس سے غائب رہا، نظر آیا تو میں نے خیریت پوچھی۔ بولا: کچھ مسائل درپیش تھے، اچھی بات یہ ہے کہ ہم نے بالآخر شیطان کو دور بھگا دیا ہے۔ میں حیران ہوا، پوچھا وہ کیسے؟ مسکراتے ہوئے بولا: متعہ کر لیا ہے اور اب بے خوف جیتا ہوں۔

عبدالقادر مصر تھے کہ فوری طور پر کسی قاضی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ مولانا تقی امینی صاحب سے اس بارے میں مشورہ کیا جائے۔ مولانا بڑے آدمی تھے، مگر ہم طلبا سے ایک طرح کی بے تکلفی روا رکھتے۔ اگلے دن مولانا کی رہائش گاہ پر نکاح کی تقریب انجام پا گئی اور اس طرح شیطان کو ایک بار پھر منہ کی کھانا پڑی۔

چند دن بعد جب میں ولیمہ کی سادہ سی تقریب میں شرکت کے لیے عثمان کے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ شریف بھائی بھی اسی مکان کے ایک گوشے میں رہتے ہیں۔ بڑے اصرار سے وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اپنی اہلیہ عائشہ سے متعارف کرایا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ عائشہ ایک دلت نومسلم کے گھر پیدا ہوئیں۔ عمرانیات میں ایم اے کی طالبہ رہی ہیں اور انھیں اپنی تعلیم کے انقطاع کا افسوس ہے۔ کہنے لگیں: شاید دو چار ماہ میں لوگوں کی فتنہ سامانیاں ٹھنڈی ہو جائیں اور ہمارے لیے وطن واپسی کی راہ آسان ہو۔

میں نے کہا اسلام آپ کا خاندانی نہیں بلکہ اختیاری دین ہے، ایک اعتبار سے آپ کا تعلق مسلمانوں کی دوسری نسل سے ہے، جنھیں ہم تاریخ میں تابعین کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔ ایمان

کے اس سفر میں آپ جہاں تک پہنچی ہیں وہاں سے آگے کی منزل کیسی دکھائی دیتی ہے؟ یہ سن کر عائشہ کے چہرے پر ایک لہر آئی گئی، پھر ایسا لگا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہوں۔ بولیں: شریف اکثر ایک شعر پڑھا کرتے ہیں:

یہ شہادت گہہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایمان کی زندگی جینا کچھ آسان نہیں۔ ابھی ایک چیلنج سے نکلے نہیں کہ دوسرا چیلنج سامنے آجاتا ہے۔ اور ہم لوگ تو کئی جنریشن سے اپنی اصل آتما کی تلاش میں ہیں۔ آتما کیا عزتِ نفس کہو۔ ایک زمانے تک ہم لوگ بدھ مت کے اسیر رہے۔ پھر اللہ نے اسلام کی طرف رہنمائی کی اور اب ایسا لگتا ہے کہ یہاں سے آگے کی بھی کوئی منزل ہے، پتہ نہیں خدا کو کیا منظور ہے۔

اسلام سے آگے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

بولیں: جس اسلام کی تلاش میں ہمارے پرکھوں نے اسلام قبول کیا تھا، وہ تو ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس بھی نہیں۔

کیا مطلب؟ میں نے وضاحت چاہی۔

بولیں: ایک ہے نظری اسلام اور ایک ہے عوامی اور عملی اسلام یعنی وہ اسلام جس کا سکہ مسلمانوں میں چلتا ہے۔ میں آج کل اشرف اور اجلف کی بحثیں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں بھی اونچی ذات کے لوگ، نیچی ذات کے لیے کفو نہیں ہو سکتے۔ فتاویٰ رضویہ میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ جلاہا، دھنیا، تیلی جیسی قوموں کے لوگ اگر عالم بھی بن جائیں جب بھی وہ سید اور شیخ کے کفو نہیں ہو سکتے۔ میں حیران ہوں کہ یہ وہی اسلام ہے جس کے خدا کا فرمان ہے: **إنّ أکرمکم عند اللہ اتقاکم**۔ اسلام کیا تھا اور کیا سے کیا بنا دیا گیا۔

علما کے دواوین تو ان کے انفرادی رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں۔

بولیں: تمھاری بات درست ہے مگر چلتی تو ان ہی کی ہے۔ دین کے نمائندے یہی سمجھے جاتے ہیں۔ فتاوے ان ہی کے قلم سے صادر ہوتے ہیں۔ عام لوگ تو انھیں دین مبین کا سچا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ان کا حکم چل جاتا ہے اور قرآن کی بات پیچھے رہ جاتی ہے۔ جب بھی کوئی شخص دھرم کے حوالے سے انسان کا اپمان کرتا ہے تو میں اپنا توازن کھو دیتی ہوں۔ شاید میں اس معاملہ میں بہت حساس ہوں، مگر میں بھی کیا کروں۔ میں تو اس سماج سے آئی ہوں، جہاں لوگ صدیوں سے اپنی آتما پوتر کرنے کے لیے ترکیبیں تلاش کرتے

رہے ہیں، لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ اپنی آتما کو پالینا، اپنے وقار کو حاصل کر لینا، تو ابھی تک سچ پوچھو تو ہم یہ حاصل نہیں کر پائے ہیں۔

یہ صدیوں والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے عائشہ کو کریدنے کی کوشش کی۔

بولیں: شاید شریف نے تمھیں بتایا نہیں۔ ہم لوگ پہلے بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب نے اسلام قبول کیا۔ اس اعتبار سے میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی۔ جب مجھے اپنی پرانی تاریخ کا علم ہوا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے آپ کو آدمی ثابت کرنے کے لیے کتنا لمبا سفر طے کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اب بھی پورا آدمی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کو لگتا ہے کہ ہم لوگ کوئی کمتر درجے کی مخلوق ہیں۔ نچلی ذات یعنی انسان سے ایک درجہ کم۔

یہ احساس آپ کو پہلی بار کب ہوا؟

بولیں: میں ممبرا میں پیدا ہوئی جہاں میرے والد قبولِ اسلام کے بعد بمبئی سے نقلِ مکانی کر کے آ گئے تھے۔ میری عمر یہی کوئی چار پانچ سال رہی ہوگی۔ نیا شہر تھا، نئے لوگ تھے۔ والد صاحب نے ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک چھوٹی سی دکان ڈال لی تھی۔ میرا داخلہ ایک اُردو میڈیم اسکول میں ہو گیا تھا۔ اسکول کیا چھوٹا سا غیر رسمی مدرسہ کہہ لیجیے جہاں محلے کی اور بھی بہت سی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ کئی سال تک تو مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ چلا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں۔ ایک دن والد صاحب کے پاس خبر آئی کہ ہمارے خاندان میں کسی بزرگ کا انتقال ہو گیا ہے۔ پونہ کے مضافات میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں سے ہم لوگوں کا آبائی تعلق ہے۔ شروع کے دو چار دن تو بڑی افراتفری رہی۔ سوگ کا ماحول جب کم ہوا اور جب میں خاندان کے بچوں میں گھلی ملی تو پتا چلا کہ ہم لوگ دراصل مہار ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے پرکھوں نے بابا صاحب امبیڈکر کی تحریک پر تبدیلیٔ مذہب کے بعد بدھ مت قبول کر لیا تھا۔ گاؤں میں ہمارے خاندان کے بقیہ لوگ اپنے پرانے بدھ مذہب پر اب بھی قائم تھے۔ قائم کیا تھے دراصل وہ ہندو مذہب سے اپنے قطع تعلقی کو ثابت کرنے پر مصر تھے، مگر ثقافتی اور سماجی سطح پر ان کی علیحدہ شناخت اب بھی قائم نہ ہو پائی تھی کہ بدھ مت بھی ثقافتی طور پر ہندو مذہب کا ہی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ہولی اور دیوالی کے ہندو تہواروں سے بھی ہمارا پیچھا نہ چھوٹا تھا۔

بدھ مت اپنانے کے بعد بھی ہولی اور دیوالی؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولیں: ہاں! پرانی عادتیں بڑی مشکل سے جاتی ہیں۔ حالانکہ بابا صاحب نے ۱۹۵۶ء میں جب ناگپور میں ۲ ملین دلتوں کے ساتھ تبدیلی مذہب کا اعلان کیا تھا اس وقت اپنے ہم مذہبوں سے انھوں نے

خاص طور پر اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ ہندوازم کو پوری طرح خیر باد کہیں گے، برہما وشنو اور مہیش کی عبادت کبھی نہیں کریں گے، رام اور کرشن کو ہرگز خدا کا اوتار تسلیم نہیں کریں گے، گوری گنپتی اور دوسرے ہندو معبودوں کی پرستش نہیں کریں گے۔ اس طرح کے ۲۲ نکات تھے جس کا انھوں نے اپنے ماننے والوں سے عہد لیا تھا۔

'پھر یہ ہندو تہوار کہاں سے آ گئے؟'

'اسے حیلِ فقہی کہو یا تعبیرِ نفسانی۔ اکثر دلت اس خیال سے ان تہواروں میں شریک ہو جاتے ہیں کہ ان کے بچے ان اوسروں پر مانتے نہیں، بعضے کہتے ہیں کہ ہم مذہبی طور پر اس تہوار کو نہیں مناتے بچوں کی خوشی کے لیے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہوئی کہ بابا صاحب کو تبدیلیٔ مذہب کے بعد زیادہ دنوں زندہ رہنے کا موقع نہیں ملا ورنہ آج دلتوں کی صورتِ حال مختلف ہوتی'۔

کیا وہ کوئی اور مذہب اختیار کر لیتے؟

یہ کہنا تو مشکل ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوتا کہ برہمنیت کا خیمہ زمیں بوس ہو جاتا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

بولیں: تمھیں معلوم ہے تبدیلیٔ مذہب کے بعد بابا صاحب دو ماہ سے بھی کم زندہ رہے۔ ۱۴ اکتوبر کو انھوں نے ناگپور کا جلسہ کیا، ۱۶/دسمبر کو اسی قسم کا ایک بڑا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا اور پھر اس کے بعد دوسرے شہروں کی باری تھی، ان اقدامات سے برہمنیت کا خیمہ زمیں بوس ہونے کو تھا کہ ۶/دسمبر کو اچانک ان کی موت واقع ہو گئی۔

اچانک؟ پھر تو اس کے پیچھے کوئی گہری سازش لگتی ہے، میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بولیں: حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اچھا بھلا آدمی جس کے انقلابی اقدامات سے اونچی ذات کے ہندوؤں پر ہیجان طاری تھا اتنی خاموشی سے سوتے ہوئے موت سے کیسے ہمکنار ہو گیا۔ واللہ اعلم! خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ تحقیق کا موضوع ہے۔ میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ میں نسبی طور اسی مہار ذات سے تعلق رکھتی ہوں جس نے بابا صاحب جیسا سپوت پیدا کیا۔ جب میں پہلی بار گاؤں گئی تو مجھے اپنی اس شناخت کا علم ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ گاؤں میں جہاں اونچی ذات کے ہندو رہتے ہیں وہاں اب بھی ہمارا داخلہ ممنوع تھا۔ ہماری قوم کے لوگ اب بھی گاؤں کی سرحد کے باہر رہتے تھے جسے یہ لوگ مہارواڑہ کا نام دیتے ہیں، یعنی وہ علاقہ جہاں نیچی ذات کے مہار رہتے ہیں۔

گاؤں سے واپسی پر میرے اندر اپنی جڑوں کی تلاش کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے مہار قوم کی

تاریخ کا مطالعہ کیا۔ امبیڈکر کی سیاسی جدوجہد اور ان کی انقلابی تحریروں نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ ابتداً یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ انھوں نے اسلام کے ہوتے ہوئے بدھ مت کو کیوں ترجیح دی؟ اب برسوں کے مطالعہ کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری طرح امبیڈکر کے سامنے بھی یہ سوال رہا ہوگا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے کس ورن میں انھیں جگہ ملے گی۔ سید، شیخ، مغل اور پٹھان تو وہ بن نہیں سکتے تھے کہ اس کے لیے نسلی سلسلے سے تعلق ضروری تھا۔ اب رہی انصاری، منصوری برادریوں میں شمولیت کی بات تو اگر اسلام قبول کرنے کے بعد بھی سماج کے نچلے پائیدان پر ہی جگہ ملنی تھی تو ایسا اسلام کس کام کا؟

مگر بدھ مت میں بھی انھیں کیا ملا۔ میں نے اعتراض کیا۔

بولیں: بدھ مت تو ان کے لیے ایک اسٹیشن تھا، منزل نہیں۔ یہ بات تو بابا صاحب نے پہلے دن طے کر لی تھی کہ اگر انھیں منووادی نظام سے نکلنا ہے اور اپنی آدمیت کو دوبارہ حاصل کرنا ہے تو انھیں ہندو دھرم کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اسلام ایک متبادل ہوسکتا تھا۔ مسلمانوں سے ان کے اچھے مراسم بھی تھے، لیکن وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ ایک نامحسوس برہمنیت ہندوستانی مسلمانوں کے ہاں بھی موجود ہے۔ جس طرح برہمنوں کے ستر گناہ معاف ہیں اسی طرح یہاں بھی سادات کی تکریم میں حد درجہ غلو سے کام لیا جاتا ہے۔ مسلمان اشرف اور اجلف کے خانوں میں بٹے ہیں۔ صدیوں سے دبی کچلی قوم کو ایک سماجی نظام کی غلامی سے نکال کر دوسرے سماجی نظام کی غلامی میں دے دینا کوئی دانش مندی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ امبیڈکر کا اصل مشن ذات پات کے نظام کا خاتمہ تھا خواہ وہ ہندوؤں میں ہو یا مسلمانوں میں، بدھ مت تو ایک ہالٹ تھا جہاں وہ تھوڑی دیر کے لیے رکنا چاہتے تھے۔

پھر پونہ معاہدہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گی جس کے سبب عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ امبیڈکر کے لیے ہندوازم کا ترک کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

بولیں: پونہ معاہدہ میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی، شاید تم ۱۹۳۶ء کے امبیڈکر۔موجھی معاہدہ کی بات کر رہے ہو۔ پونہ معاہدہ (۱۹۲۳ء) میں تو صرف اتنی بات تھی کہ بابا صاحب دلتوں کے لیے ایک علیحدہ قومی شناخت اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ترک کر دیں گے اور اس کے عوض انھیں صوبائی اسمبلی میں محفوظ نشستیں دی جائیں گی اور مرکزی اسمبلی کی ۱۸ فیصد نشستیں بھی ان کے لیے مخصوص ہوں گی۔ البتہ اگست ۱۹۳۶ء کے معاہدہ میں اس بات کی خاص طور پر صراحت کر دی گئی کہ جو دلت اسلام یا عیسائیت قبول کر لیں گے وہ ریزرویشن کی سہولت کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس اعتبار سے تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ان کے قبولِ اسلام کی راہ میں ریزرویشن ایک سدِ سکندری بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ

امبیڈکر کو ایک عبوری فیصلہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ کرتے بھی کیا، ایک طرف ہندوؤں نے ان کے سامنے ریزرویشن اور سرکاری مراعات کی فصیل کھڑی کر دی تھی تو دوسری طرف برہمن زدہ اسلام انھیں پورے اکرامِ آدمیت کے ساتھ، اونچی ذات کے مسلمان کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

'مگر اسلام میں تو نظری طور پر ذات پات کی کوئی گنجائش نہیں، یہ تو سماجی برائی ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں کے تعامل سے ملی ہے'۔

بولیں: تم کس اسلام کی بات کرتے ہو۔ جب مسلمانوں کی پوری سوسائٹی ذات پات میں بٹی ہو۔ سادات کو اپنے مزعومہ نسبی سلسلے پر فخر ہو اور جب ہندوستانی علما کا اس بات پر اتفاق ہو، خواہ وہ دیوبندی اسکول کے اشرف علی تھانوی ہوں یا بریلوی جماعت کے احمد رضا خاں، کہ نیچی ذات کے مسلمان سادات کے کفو نہیں ہو سکتے۔ یہ کہتے ہوئے عائشہ کے ٹھہرے اور متین لہجے میں ایک اشتعال سا پیدا ہوا۔ بولیں: بہشتی زیور پڑھی ہے آپ نے؟ وہاں تو یہ بھی لکھا ہے کہ اشراف کو کن لوگوں سے میل جول رکھنا چاہیے۔ نیچی ذات کے مسلمان سوشلائزنگ کے لیے ممنوع قرار دیئے گئے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جو لوگ انسانی وقار کی تلاش میں نکلے ہوں، جو اس بات کے خواہاں ہوں کہ انھیں اکرامِ آدمیت کا سزاوار سمجھا جائے، بھلا ان کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے اس منووادی سماجی نظام میں کیا کشش ہو سکتی تھی۔

عائشہ کی گفتگو جاری تھی۔ اسی دوران شریف بھائی چائے کی پیالیاں لیے داخل ہوئے۔ بولے: لگتا ہے بات بہشتی زیور تک آ پہنچی ہے۔ جی ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ عائشہ ہمارے مولویوں سے بہت خفا ہیں۔ بولے: کیا بتائیں بہت دکھ دیا ہے ان مولویوں نے۔ کلکتہ میں ہم لوگ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ کوئی پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ عائشہ کے والد ایک مقامی اسکول میں پرنسپل ہو کر آئے تھے۔ والد صاحب سے ان کی دوستی ہو گئی۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ والد صاحب عائشہ کو بہت مانتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے، میں عائشہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔ دیندار ہے، باشعور ہے اور پڑھائی لکھائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ آج کے دور میں ایسی بچیاں کہاں ملتی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم لوگ سادات خاندان سے تھے اور عائشہ کے بارے میں پتہ تھا کہ وہ دلت خاندان سے مسلمان ہوئی ہیں۔ والدہ تو کسی طرح تیار ہو گئیں لیکن خاندان کے دوسرے بزرگوں نے سنا تو انھوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیں۔ بھلا کوئی دلت لڑکی کو بھی سید کے گھر میں بیاہ کر لاتا ہے۔ صورت حال نے نزاع کی شکل اختیار کر لی۔ والد صاحب کا تعلق چونکہ ایک دینی جماعت سے تھا، وہ اس رشتے کو ایک کارِ خیر سمجھ کر اس پر جم گئے، لیکن ہمیں اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ عین نکاح کے دن رشتے داروں نے گھر پر ہلہ بول دیا۔ پولیس آئی،

حالات سنگین ہو گئے۔ ہم لوگوں کو فی الفور شہر چھوڑ کر نکل جانا پڑا۔ سنا ہے کہ اب سمجھانے بجھانے سے معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، لیکن مہاجرت تو کرنا پڑی نا۔ آج بھی اسلام کے ایک اصول پر عمل کرنے میں دیکھو مسلم معاشرے میں کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ جب مجھ سے اپنا چھوٹا سا یہ غم سنبھالا نہیں جاتا تو آپ اندازہ کریں کہ عائشہ پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس کے پرکھے تو جنم جنم جہنم جیتے رہے ہیں۔

'چلیے اتنا تو ہوا کہ اس طرح آپ سماجی مراتب کی بلندی پر پہنچ گئیں'۔

کیسی بلندی؟ یہی تو میری لڑائی ہے کہ میں اسے بلندی مانتی ہی نہیں۔ جب سارے انسان برابر ہیں۔ تکریم آدمیت کا واحد معیار تقویٰ ہے۔ پھر سادات کی بہو بن جانے کو باعثِ افتخار کیوں سمجھا جائے؟ ہاں تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ سماجی طور پر میں اب ایک ایسی پوزیشن میں ہوں جہاں سے اکرامِ آدمیت کی جنگ کہیں بہتر طور پر لڑ سکتی ہوں۔ مسلم معاشرے میں نسل پرستی کے جو بت ہیں ان پر ضرب لگا سکتی ہوں۔ کالج میں میری ایک برہمن سہیلی تھی۔ ایم اے کے پہلے سال میں وہ مجھ سے بڑی گھلی ملی رہی۔ ہم لوگ اکثر ساتھ رہتے۔ میرا مسلمان ہونا اس کی دوستی کی راہ میں حائل نہیں تھا، لیکن جب اسے ایک دن یہ پتہ چلا کہ میں ذات کی مہار ہوں تو ایسا لگا جیسے اس پر اوس پڑ گئی ہو۔ ہماری دوستی میں پہلی سی وہ گرم جوشی نہ رہی۔ ایک دن اس نے مجھ سے دبے لفظوں میں یہ شکایت بھی کی کہ میں اس کے ساتھ کھاتی پیتی رہی اور اس طرح اس کا دھرم بھرشٹ ہو گیا۔ دوستی عداوت میں بدلی، پھر تو صورت حال یہ ہوگئی کہ وہ مجھ پر میری ذات کے حوالے سے جملے کستی۔ دوستوں کی مجلس میں بیٹھتی تو میری موجودگی میں ذومعنی جملے کہتی۔ ارے بھئی آج کل کالج کا ٹوائلٹ بڑا گندہ رہتا ہے۔ میں یہ سب سنتی اور مسکرا کر رہ جاتی۔

'گویا پبلک اسپیس میں ابھی اونچی ذات کے ہندوؤں نے دلتوں کو قبول نہیں کیا ہے'؟

بولیں: بالکل نہیں، بس سمجھو برداشت کیا ہوا ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اگر نہ کریں تو نیچی ذات کے ہندو دوسرا دھرم قبول کر لیں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی مصنوعی اکثریت ختم ہو جائے۔

اب جو لوگ پیچھے رہ گئے ان کے بارے میں آپ کیا سوچتی ہیں؟

کون لوگ؟

وہی جو اب بھی دلت ہیں، اپنے پرانے دین پر قائم۔ ان کے لیے نجات کی کیا سبیل ہو سکتی ہے؟

بولیں: نجات تو بڑا لفظ ہے۔ بھلا جن لوگوں کی آدمیت ہی مشتبہ ہو، جو لوگ آدمی سے کمتر درجے کی مخلوق سمجھے جاتے ہوں وہ نجات اور جنت وجہنم کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں۔ وہ تو صدیوں سے اپنے آپ کو ایک جہنم میں پاتے ہیں، جہاں نسلوں سے ان کے ذمہ انسانی غلاظت اٹھانے کا کام سونپا گیا ہے۔

صفائی کرنے والے کس معاشرے میں نہیں ہوتے۔ بول و براز تو تمام ہی قومیں کرتی ہیں، لیکن دُنیا کی کسی قوم میں اس کام کے لیے اتنا واویلا نہیں مچایا جاتا کہ جنم جنم سے انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے بول و براز اٹھانے کے لیے مختص کر دیا گیا ہو اور طرفہ یہ کہ اسے مذہبی فریضہ بتایا جاتا ہو۔ بابا صاحب نے سماجی تبدیلی کے لیے جو اقدامات کیے تھے اس نے دلت سماج میں ایک انقلابی کیفیت تو پیدا کر دی ہے، اب باشعور اور تعلیم یافتہ دلت نوجوانوں کی ایک نسل میدان میں ہے، لیکن سماجی دباؤ اتنا شدید ہے کہ اس کے لیے راستہ بنانا آسان نہیں۔ دلتوں نے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے ہیں، لیکن انھیں کہیں بھی پورے آدمی کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

یہ جو آپ بار بار پورے آدمی کی بات کرتی ہیں یا انسانی وقار کے حصول کو سب باتوں پر ترجیح دیتی ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب کچھ شدتِ احساس کے سبب ہے کہ ظلم و زیادتی تو مسلمانوں پر بھی کم نہیں ہو رہی ہے۔

بولیں: ہم دلت مسلمانوں کا غم دوہرا ہے۔ مسلمان بہت گئی گزری حالت میں ہیں، لیکن ہم تبدیلیٔ مذہب کے بعد بھی اس گئی گزری حالت کو حاصل نہیں کر پاتے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ہماری سماجی حالت نہیں بدلتی۔ ہمیں دلت مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم لاکھ پڑھ لکھ لیں، پاسی، دُھنیا اور بھنگی ہی رہتے ہیں۔ حالانکہ پیشے کے اعتبار سے ہمارا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کلکتہ میں ہمارے ایک استاد ہیں ڈاکٹر نور عالم، بڑے قابل ٹیچر ہیں۔ پتہ چلا کہ ذات کے پمریا ہیں اور ان کی شیوخ وسادات سے ہمیشہ اَن بن رہتی ہے۔

پمریا؟

بہار میں یہ لفظ شاید پاسی کے لیے مستعمل ہے، میں نے کہا۔

برسوں بعد جب کے۔ آر۔ نارائن صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہوئے، میں ایک دن پریس کلب آف انڈیا میں چند غیر مسلم صحافیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حاضرین میں زیادہ تر اونچی ذات کے ہندو تھے۔ ایک صاحب نے جن کے ہاتھ میں کوئی اخبار تھا، اس میں چھپی کے۔ آر۔ نارائن کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا: جانتے ہو نارائن کو کل جب راشٹرپتی بھون میں پہلی بار جھنڈا لہرانے کا موقع ملا تو اس کی کیفیت کیا ہوئی۔ تصویر میں دیکھو ایسا لگتا ہے من ہی من میں کہہ رہا ہو جی تو چاہتا کہ کھمبے پر چڑھ جاؤں۔ یہ سن کر حاضرین نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کا نسبی تعلق پڑوا یعنی پاسی ذات سے تھا۔

پھر آپ کے خیال میں مسئلہ کا حل کیا ہے؟ میں نے عائشہ کے احتجاج کو سمجھنے کی کوشش کی۔

بولیں: جب تک برہمنیت کومکمل شکست نہیں دی جاتی اس ملک میں اکرامِ آدمیت اور انسانی حقوق کی لڑائی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

'مگر آپ تو کہتی ہیں کہ مسلمان ہوکر بھی ہم وہیں رہے'۔

بولیں: برہمنیت نے ہر جگہ پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی مذہب اس کی زد سے بچا نہیں ہے۔ جولوگ اپنی آتما کی تلاش میں عیسائی ہوئے تھے وہ وہاں دلت عیسائی بن کر رہنے پر مجبور ہیں۔ بعض علاقوں میں تو دلتوں کے چرچ بھی الگ ہیں۔ اسی طرح جو لوگ سکھ مت میں داخل ہوئے تھے انھیں مذہبی سکھ کہا جاتا ہے، انھیں بھی کمتر سمجھا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلتوں کو اگر اپنے وقار کی بحالی کا راستہ مل جائے تو وہ جوق در جوق اس راستے پر چل نکلیں گے۔

بھلا اسلام سے بہتر کیا آپشن ہوسکتا ہے، اس بارے میں ایک مؤثر حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔ شریف بھائی نے رائے دی۔ بولے: پروفیسر نور عالم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں مساوات کا تصور صرف پانچ منٹ کے لیے ہے۔ جب تک نماز میں ہیں، اونچی اور نیچی ذات والے ایک ہی صف میں کھڑے رہتے ہیں، لیکن جیسے ہی مسجد سے باہر قدم نکالیے، نسبی اور سماجی تفریق اپنا کام کرنے لگتی ہے۔

'دیکھیے مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ اس ملک میں دلتوں، آدی باسیوں اور دوسرے دبے کچلے لوگوں کا مستقبل اسلام کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اس اسلام کے ساتھ جو پہلی صدی ہجری میں مالابار کے ساحلوں پر آیا۔ مسلمان تاجروں اور مبلغین کی اس نسل نے مقامی لوگوں کو انسان سمجھ کر انھیں اسلام کی دعوت دی اور پھر ان اقوام کے ساتھ رنگ و نسل کے امتیاز سے بے پروا ہوکر خاندانی رشتے قائم کیے۔ رہی مسلمانوں کی موجودہ نسل اور اس کے کبار شارحین تو ان میں سے بیشتر ایک طرح کی برہمنیت کے شکار ہیں۔ جب تک اسلام کو ان مفاسد سے پاک نہیں کیا جاتا مظلوم انسانیت کے لیے اس کے دروازے وَا نہیں ہوسکتے۔

عائشہ کی باتوں میں بلا کا درد تھا۔ ان کی گفتگو گہرے مطالعے، مشاہدے اور ذاتی تجربات سے مملو تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان کے دلت مکاشفات کو اسی طرح سنتا رہوں۔ مگر رات زیادہ ہوچکی تھی، میں نے شریف بھائی سے اجازت لی۔ لوٹتے ہوئے اقبال کا یہ شعر میرے دل و دماغ پر چھایا رہا:

شب ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتاب را گزر نیست

عائشہ گو کہ پیدائشی طور پر مسلمان تھیں، ایک دلت نومسلم گھرانے میں ان کی پرورش ہونے کے سبب بابا صاحب کی عظمت کا نقش ان کے دل پر قائم تھا۔ میں نے سوچا غلاموں کی قوم سے اگر ایک آدمی بھی اپنی زنجیروں کو توڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو وہ ایک عالم کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ مجھے آج امبیڈکر جینتی پر گائے جانے والے وہ لوک گیت بھی یاد آئے جس میں ڈھول کی تھاپ پر گانے والا کچھ اس طرح گاتا ہے:

'ہمرے بابا کا للکھل ادھیکار چاہیے
گولامی کے بوجھا ڈھوئے جب چاہے مرجی
اب جھوٹ نہ کوئی اکرار چاہیے، ہمرا یار چاہیے۔'

مجھے ایسا لگا کہ یہ لوک گیت ہم ہندوستانی مسلمانوں پر ایک لطیف طنز ہوں۔ آخر کچھ تو ہے کہ امبیڈکر کروڑوں دبے کچلے پریشاں حال لوگوں کے لیے نجات دہندہ بن کر سامنے آئے اور جن لوگوں کو مستضعفین کی مسیحائی کا فریضہ انجام دینا تھا انھوں نے کفو اور غیر کفو کی فقہی تاویلات کے ذریعہ اپنے ہی جیسے انسانوں پر اکرامِ آدمیت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔

۴۶

گر بھیم نہیں ہوتے

آج مجھے اپنے بچپن کے ایک برہمن پڑوسی کی گفتگو بھی یاد آئی۔تب میری عمر یہی کوئی دس بارہ سال کی رہی ہوگی۔ جاڑے کے ایام تھے، امیری لال دھوپ میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر ذکر اونچی اور نیچی ذات کا چل نکلا۔ بولے: خدا نے کسی کو اونچا اور کسی کو نیچا پیدا کیا ہے، یہی اس کا نظام ہے۔تم نہیں دیکھتے کہ اصیل گائے بیس بائیس سیر دودھ دیتی ہے جبکہ عام گائے تین چار سیر سے زیادہ نہیں دیتی۔نسل کا تو فرق ہوتا ہے نا! خدا نے بعض انسانوں کو اپنے سر سے پیدا کیا اور بعض کو پیر سے۔اب اگر پیر سے پیدا ہونے والے شودر دماغ والوں کا کام کرنا چاہیں تو سب چیز اُلٹ پلٹ ہو جائے۔ میں حیرت سے ان کی باتوں کو سنتا رہا۔ بولے: اب تم ہی بتاؤ اگر میں اپنا پیر سر کی جگہ لگا لوں، یا ناک کاٹ کر آنکھ کی جگہ پر چپکا دوں تو کیا کسی کام کا رہوں گا۔بس یہی مثال ان ورنوں کی ہے جس میں انسان پیدا ہوا ہے۔ جو جس کام کے لیے بنایا گیا ہے اسے وہی کام کرنا چاہیے۔شاستروں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ جو لوگ تمام انسانوں کو ایک سمان بتاتے ہیں، یا جو چھوا چھوت کو نہیں مانتے وہ شاستروں کا اپمان کرتے ہیں۔ میرے اس اعتراض پر کہ اللہ نے ہر انسان کو ایک ہی فطرت پر پیدا کیا ہے پھر کسی کو اچھوت یا قابل نفریں کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ کہنے لگے: اچھوت تو جسم ہوتا ہے، روح نہیں ہوتی۔ جو لوگ اُلٹی سیدھی غذائیں کھاتے ہیں، گوشت مچھلی سے اپنے جسم کو آلودہ کرتے ہیں۔ ان کے جسم پوتر نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر یہ لوگ اپنے ورن میں رہ کر خوش خوش اپنے کام کرتے رہیں تو اگلے جنم میں انھیں اونچے ورن میں شامل ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

'اور اس جنم میں ان کے لیے نجات کا کوئی امکان نہیں؟ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

بولے: انھیں نجات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ سوچ ہی غلط ہے۔ یہ چاروں ورن مل کر ایک جسم بناتے ہیں۔ جب تمھارے پیر میں ٹھوکر لگتی ہے تو سب سے پہلے اس کی تکلیف پر کون آواز بلند کرتا ہے۔ منہ سے ہی تو چیخ نکلتی ہے نا؟ اب دیکھو! ٹھوکر شودر (پیر) کو لگی اور چیخ کہاں سے نکلی؟ منہ (برہمن) سے۔ اور دوڑ کر اس کی مدد کو کون آیا؟ انھی ہاتھوں (چھتری) نے اسے سہلایا۔ تو یہ ایک سسٹم ہے جس سے سماج چلتا ہے۔

اب شودر کہے کہ ہم کرسی پر بیٹھیں گے، پیشوائی کا فریضہ انجام دیں گے تو ایسا کرنا خدائی نظام میں خلل ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ منو کے شاستروں میں صاف طور پر لکھا ہے کہ برہمن کے سامنے شودر زمین پر بیٹھے اور جو ایسا نہ کرے اس کی ڈنڈے سے تنبیہ کی جائے اور شاستروں میں جو لکھا ہے وہی سچ ہے اس میں اپنی عقل نہیں لگانی چاہیے۔ انسان شاستروں پر چلتے ہیں اور جانور اپنی عقل کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔'

اس دن مجھے امیری لال کی باتوں پر بڑی حیرت ہوئی۔ تب مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ذات پات کے اس منو وادی نظام نے اس ملک میں صدیوں سے (مفروضہ) نچلی ذات کے کروڑں انسانوں کو شرفِ آدمیت سے محروم کر رکھا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا وہ گاؤں بھی یاد آیا جس کے مضافات میں نیچی ذات کے ہندوؤں کی بستیاں ہوا کرتی تھیں۔ گوالا، ملّاح، ڈوم، چمار اور اس قبیل کے دیگر طائفے جو دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتے، مالک مالکن کے القاب سے ہمیں مخاطب کرتے اور اپنا پیارا منگلا جو پھولوں کی کیاریوں میں پانی ڈالتا، ہمارے لیے بڑے چاؤ سے سرخ اور پیلے گلاب توڑ لاتا، یہ لوگ خوشی اور غم کے ہر موقع پر ہمارے کام آتے، ان کے دم سے آم کے موسم اور فصل کے موقع پر گھروں میں رونق رہتی، لیکن میرے دل میں کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آیا کہ میں ان کے گھر جاتا کہ جاگیردارانہ اور طبقاتی معاشرے نے اسلام کا جو قالب تیار کیا تھا اس میں شریف اور کمین لوگوں کے درمیان حد فاصل کھینچ دی گئی تھی اور یہ سب کچھ ان دیندار گھرانوں میں تھا جہاں ولی اللہی اسلام اور ان کے دیوبندی اور بریلوی شارحین آرتھوڈوکسی کا میعار سمجھے جاتے تھے۔

ان ہی دنوں کی بات ہے، ایک دن لائبریری کینٹین کے قریب سے گزر رہا تھا کہ شریف بھائی نے آواز دی۔ کینٹین کے بیرونی حصے میں جہاں درختوں کے نیچے آہنی کرسیاں ایستادہ تھیں، شریف بھائی کسی شیخ الاسلام قسم کی شخصیت کے ساتھ ڈوسے کا لطف لے رہے تھے۔ تعارف ہوا تو حیرت ہوئی کہ جناب کا نام سچ مچ شیخ الاسلام ہے۔ لحیم شحیم قد کاٹھ، سفیدی مائل طویل داڑھی، محدب چشمے سے جھانکتی ہوئی بارعب آنکھیں۔ پتہ چلا کہ آپ شریف بھائی کے خسر ہیں اور دہلی جاتے ہوئے اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے رک گئے ہیں۔ انھیں جب ہمارے باہمی مراسم کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے۔ اب تک ان کی شخصیت پر شیخ الاسلام کے جاہ و حشم اور تکلّفات کا جو پردہ پڑا تھا اسے انھوں نے فی الفور ترک کر دیا۔ شاید وہ اپنے نام کے حوالے سے میری حیرانگی کو بھانپ چکے تھے۔ بڑی ہی اپنائیت سے بولے: میرے شیخ الاسلام بننے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے جب میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کیا تو سوچا کہ اپنا نام اسلام رکھوں گا۔ اور بمبئی کے علاقے میں جہاں میں اس وقت رہتا تھا بہت سے مسلمانوں کے

ناموں کا آخری حصہ شیخ ہوا کرتا تھا۔ اس طرح میں نے اپنا نام اسلام شیخ رکھا، لیکن بڑی مسجد میں جب میں کلمہ پڑھنے گیا تو امام صاحب سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ میرے مطالعہ سے بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: اسلام شیخ نہیں، خدا تمھیں شیخ الاسلام بنائے اور اپنے دین کی خدمت کا کام لے۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے ناموں کی تبدیلی کے فارم میں میرا نام شیخ الاسلام لکھ دیا۔ تب سے اب تک پل تلے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ آج بھی مجھ سے میرا یہ نام، ایسا لگتا ہے جیسے کچھ مطالبہ کرر ہا ہو۔ یہ کہتے ہوئے شیخ الاسلام کسی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ میری نگاہوں میں چند دن پہلے عائشہ سے ہونے والی گفتگو کا منظر تازہ ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ شیخ الاسلام تو کسی طرح بھی (مفروضہ) نیچی ذات سے آئے ہوئے مسلمان نہیں لگتے۔ کتنا رعب ہے ان کی شخصیت میں، چہرے پر وہی مردانہ وجاہت، جلال و جمال کا وہی امتزاج جو رجال اللہ کے چہروں پر ہوا کرتا ہے۔

انھیں جب یہ پتہ چلا کہ عائشہ سے مختلف امور پر ہماری گفتگو ہوتی رہی ہے تو کہنے لگے کہ عائشہ نئے زمانے کی بچی ہے، حساس ہے۔ وہ عمرانیات (Anthropology) کی طالبہ ہے۔ اسے ان باتوں کی فنی باریکیوں کا شاید زیادہ اندازہ ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عز ووقار کی لڑائی میں جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ ہے آپ کا سیلف ڈیفینیشن (Self defination)۔ اب دیکھیے ہم مہاروں نے اس نکتہ کو پالیا تو ہماری قوم میں ایک انقلاب آگیں کیفیت پیدا ہوگئی۔ اب مہار ہونا ہمارے لیے حقارت کی بات نہیں، فخر کا علامیہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ سب امبیڈکر کے سبب ہے؟ بولے امبیڈکر کا ایک کلیدی رول ضرور ہے، لیکن امبیڈکر اس تقلیبِ فکری کی بنیاد نہیں ہیں۔ امبیڈکر کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کو دریافت کیا اور اس نئے بیانیے کو کام پر لگایا۔ بھیما کورے گاؤں کا نام سنا ہے تم نے؟

نہیں، میں نے لاعلمی ظاہر کی۔

بولے: امبیڈکر کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کا ایک استوانہ دریافت کیا۔ موقع ملے تو کبھی کورے گاؤں کا تفصیلی مطالعہ کرنا۔ تمھیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ کسی قوم کی تاریخ اگر کھو جائے تو وہ کس طرح بے دست و پا ہو جاتی ہے۔

کورے گاؤں کیا کوئی مذہبی مقام ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: مذہبی تو نہیں مگر اس کی اہمیت اس سے کم بھی نہیں۔ یہ واقعہ ۱۸۱۸ء کا ہے جب کورے گاؤں کے مقام پر کوئی آٹھ سو مہار اٹھائیس ہزار برہمنی پیشوا فوج سے ٹکرائے تھے۔ جس میں مہاروں کو فتح عظیم حاصل ہوئی تھی اور جہاں انگریزوں نے مہار فاتحین کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے کورے گاؤں میں

ایک یادگاری ستون قائم کر دیا تھا۔ امبیڈکر جن دنوں انگلینڈ میں اپنی تاریخ کا مطالعہ کر رہے تھے انھیں اپنی قوم کی اس تابناک تاریخی فتح کا پتہ چلا۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے اس مقام کی نشان دہی کی۔ اس یادگاری ستون کو ڈھونڈ نکالا اور پھر اسے مہاروں کے لیے ایک زیارت گاہ کی حیثیت دے دی۔ وہ ہر سال بنفس نفیس یکم جنوری کو اس فتح عظیم کی یاد منانے کے لیے وہاں جاتے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کا اژدہام ہونے لگا۔ بہت جلد مہاروں کو ایسا لگا کہ وہ ان بہادروں کی قوم سے ہیں جو قلت تعداد کے باوجود اونچی ذات کے برہمنوں کی اینٹ سے اینٹ بجا چکے ہیں۔

آٹھ سو بنام اٹھائیس ہزار یہ تو کسی معجزے سے کم نہیں، میں نے کہا۔

بولے: اس فتح عظیم کے پیچھے جو نفسیاتی اور سماجی محرکات کارفرما رہے ہیں، انھیں سمجھے بغیر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہم مہاروں کی بھی عجیب تاریخ ہے۔ ہم لوگ بنیادی طور پر ناگ ونشی ہیں۔ تم نے مہاتما بدھ کے مجسّموں کے اوپر ناگ کو سایہ کیے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ایک وقت تھا جب بدھ مت کے ماننے والے ہندوستان سے افغانستان اور چین سے جاپان تک غالب تھے۔ بدھ نے اخوت اور مساوات کی بنیاد پر ایک معاشرہ تشکیل دیا تھا۔ یہاں مورتی پوجا کی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن جیسا کہ مذاہب کی تاریخ میں ہوتا ہے، بدھ کے ماننے والوں نے ان کے مجسّمے بنا ڈالے۔ پھر جب ان پر برہمنیت کا حملہ ہوا تو وہ اس حملے کا دفاع نہ کر سکے۔ بدھ کی مورتیاں نئے اضافوں اور تراش خراش کے بعد برہما، وشنو اور مہیش کی شکل میں نظر آنے لگیں۔ بدھ مندروں پر برہمنوں کا قبضہ ہو گیا اور جو لوگ بدھ مت کے اعوان و انصار تھے انھیں غلام بنالیا گیا۔ مذہب کی نئی تعبیر عمل میں آئی اور یہ کہا جانے لگا کہ کچھ لوگ دائمی غلامی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہماری گندگیاں اٹھائیں، مردہ جانوروں کو ٹھکانے لگائیں، بستیوں کے باہر اچھوتوں کی طرح رہیں، مبادا ان کا سایہ عبادت گزاروں کا دھرم بھرشٹ نہ کر دے۔

گویا یہ اونچی اور نیچی ذات کی لڑائی بدھ مت اور ہندوازم کے تصادم کی پیداوار ہے؟

بولے: ہندوازم نہ کہو۔ ہندوازم تو ویسے بھی کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ تو عربوں کی دی ہوئی ایک جغرافیائی نسبت ہے، ورنہ وید، پران، گیتا، اپنشد یا ہندوؤں کی کسی مذہبی کتاب میں لفظ ہندو کا ذکر نہیں ملتا۔ برہمنیت نے مذہب کے نام پر ہم مہاروں پر بدترین قسم کا تشدد روا رکھا۔ تمھیں حیرت ہوگی کہ صدیوں سے ہماری گردنوں میں ہانڈیاں بندھی رہیں۔ کمر سے جھاڑو لٹکتی رہی تاکہ دیکھنے والے دور ہی سے پہچان لیں کہ ہم اچھوت لوگ ہیں جنھیں بنیادی طور پر لوگوں کی گندگیاں اٹھانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

جھاڑو تو بات سمجھ میں آتی ہے، یہ گردنوں سے ہانڈیاں لٹکنے کی کیا منطق تھی؟ میں نے پوچھا۔

بولے: اچھوت جوٹھہرے تو ان کا لعاب زمین پر نہ گرے سو اس خیال سے ان کی گردنوں سے ہانڈیاں لٹکا دی گئیں۔

یہ تو بڑی ناانصافی کی بات تھی۔ اس صورت حال کو مہاروں نے کیسے قبول کرلیا؟

بولے: مہاروں پر ہی موقوف نہیں، ملک کے مختلف حصوں میں نیچی ذات کی مختلف قوموں پر ذلت کا یہ عذاب مسلط کیا گیا۔ بعضوں نے آبادیوں کو خیرباد کہا اور جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ تم جنھیں آدیباسی کہتے ہو، یہ وہی تو ہیں مصیبت کے مارے لوگ۔

مگر انھوں نے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ذلت کی اس زندگی کو ٹھنڈے پیٹوں کیسے قبول کرلیا؟

بولے: گاہے بگاہے بغاوتیں ہوتی رہیں لیکن چونکہ شودروں پر زندگی کا یہ عذاب مذہب کے حوالے سے مسلط کیا گیا تھا، یہ بتایا گیا تھا کہ اگر وہ اپنی موجودہ زندگی میں اس خدائی اسکیم کو خوش دلی سے قبول کرلیں گے تو ہوسکتا ہے کہ اگلے جنم میں ان کی پیدائش اونچے ورن میں ہوجائے اور وہ بھی برہمنوں، چھتریوں اور بنیوں کی طرح اگلے جنم میں زندگی کا لطف لے سکیں۔ بس یہ سمجھو کہ ایک طرح کی برین واشنگ تھی جس کے نتیجے میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی خود کو شودر سمجھنے لگی اور اسے اپنی ابدی ناپاکی پر یقین آ گیا۔

مگر ملیچھ تو مسلمانوں کو بھی کہا گیا۔

بولے: یہ ہتھکنڈہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف استعمال تو کیا مگر یہ داؤ چلا نہیں۔ مسلمان چونکہ سیاسی طور پر غالب آ گئے تھے اس لیے ان کا سماجی مقاطعہ ممکن نہ تھا، البتہ انھوں نے اب ایک نئی اصطلاح کو کام پر لگایا ہے اور یہ نسخہ بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔

وہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: ملیچھ والی بات تو نہ چلی مگر آزادی سے پہلے ہی جب ان برہمنوں کو مردم شماری کے بعد اس بات کا اندازہ ہوا کہ محض اونچی ذات کے ہندو اس ملک میں عددی طور پر فیصلہ کن رول ادا نہیں کر سکتے تو انھوں نے اولاً مختلف نچلی ذاتوں کو ہندوؤں کے خیمے میں بجبر شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۲ء میں جیسا کہ تم جانتے ہوگے گاندھی کو مرن ورت رکھنا پڑا۔ دوسری چال انھوں نے یہ چلی کہ مسلمانوں کو مختلف حیلے بہانوں سے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اس ملک میں اقلیت میں ہیں اور اس لیے اب انھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے حاشیے پر رہنا ہے۔

پھر اس ذہنی آزردگی (mental-conditioning) کا آپ کے پاس توڑ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: دلت تو اب برہمنیت کے اس سحر سے رفتہ رفتہ آزاد ہو رہے ہیں۔ امبیڈکر نے انھیں ایک راہ دکھائی ہے البتہ مسلمانوں کے ہاں صورت حال کہیں نازک ہے۔ جب میں ان کے کبار علما اور دانشوروں کی زبان سے اپنے لیے اقلیت کا لفظ سنتا ہوں تو مجھے ان کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر آپ صبح شام اپنی کمزوری کا ورد کرتے رہیں تو آپ کو اپنے کمزور ہونے پر خود بھی یقین آجاتا ہے، اور جب آپ کے اندر سے ہوا نکل گئی ہو تو بیرونی سہارے کام نہیں آتے۔

اور یہ جو دلت ۔ مسلم اتحاد کے ذریعہ اس ملک میں ایک نئے انقلاب کی باتیں ہو رہی ہیں اسے آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

بولے: میں اسے ایک نیک فال ضرور سمجھتا ہوں مگر مسلمانوں میں اس کے لیے ابھی دلی آمادگی کا فقدان ہے۔ وہ ابھی تک سماجی طور پر چماروں اور بھنگیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بھی دراصل ایک طرح کی برہمنیت کے اسیر ہیں۔ ایسی صورت میں ایک مشترکہ محاذ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ وہ مدت سے کانگریسی برہمن اور بنیوں کی جماعت کو افرادی قوت فراہم کرتے رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے شاکی ہیں، لیکن انھیں ان شاطروں کے خیمے میں رہنے میں شرم نہیں آتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے علما و دانشوروں نے اس تکلیف دہ صورت حال کو قبول کر رکھا ہے۔ ان سے کہیں باشعور تو ہمارے دلت ہندو ہیں۔ میں جب اپنے غیر مسلم رشتہ داروں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں تو کیا بتاؤں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے دلوں میں ہر لمحہ اونچی ذات کے خلاف آگ جل رہی ہو۔ انھیں یہ شدید احساس ہے کہ ہم بہت ستائے گئے۔ ابھی پچھلے سال میں پونہ کے ایک جلسہ میں تھا۔ ایک نوجوان کی تقریر سنی کہ دلت اور دوسری نچلی ذات کے ہندو رام مندر کی تحریک سے دور رہیں۔ یہ ہمیں ایک نئے جال میں پھنسانے کی تیاری ہے۔ ویسے بھی ہم ہندو نہیں۔ جو مذہب ہمیں اچھوت سمجھتا ہو اور جس مندر میں ہمارا داخلہ ممنوع ہو اس کے استھاپنا میں ہمارا یوگدان بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ گو کہ یہ آوازیں ابھی کمزور ہیں لیکن دلتوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل زیر زمین اپنا کام کر رہی ہے۔

تو کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں دلتوں کا سیاسی شعور انھیں مسلمانوں سے قریب لے آئے گا؟ بولے: سر دست تو ایسا نہیں لگتا۔ ایک تو قانونی پیچیدگی ہے۔ دستور کی دفعہ ۱۴۱ ۳ دلتوں کے قبولِ اسلام کی راہ میں حائل ہے۔ دوسری نفسیاتی وجہ بابا صاحب کا اسلام کے مقابلے میں بدھ ازم کو ترجیح دینا ہے۔

آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جس کے مسلمانوں سے مراسم بھی اچھے تھے اس نے

اسلام کے مقابلے میں بدھ مت کا انتخاب کیا۔

بولے: ایک تو مسلمانوں کی سرد مہری جو چماروں اور بھنگیوں کے لیے اب بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہے اور دوسرے امبیڈکر کا اس نتیجہ پر پہنچنا کہ بدھ مت سے ان کے پرکھوں کی عظیم الشان تاریخ کا سرا جاملتا ہے۔ انھوں نے اپنے قومی عزووقار کی لڑائی میں تاریخ کے اس شیر کو جگایا جو مہار قوم کی عظمت رفتہ کی داستان سنا سکے۔ اس عمل میں انھوں نے اپنی قوم کو تو یقیناً غیر معمولی اعتماد سے سرشار کیا، نہ صرف یہ کہ مہاتما بدھ کے حواریوں سے اپنا رشتہ جوڑا بلکہ جغرافیائی اعتبار سے کورے گاؤں میں ایک قومی نشانِ افتخار بھی ڈھونڈ نکالا جو ہر سال یکم جنوری کو برہمن پیشواؤں پر بہادر مہاروں کے غلبے کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن تاریخ کا شیر جب ایک بار بیدار ہو جائے اور قومی افتخار کا بت آپ کو اپنے سحر میں لے لے تو کسی دانش مندانہ اور آزادانہ فیصلے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

برسوں بعد جب بھیما کورے گاؤں کا موضوع ذرائع ابلاغ کی شہ سرخیوں میں آیا تو میرے ذہن میں شیخ الاسلام کی گفتگو پھر سے تازہ ہوگئی۔ تب مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ امبیڈکر نے بھیما کورے گاؤں کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ دلتوں کو ہمیشہ ہمیش کے لیے قومی افتخار کا ایک استوانہ فراہم کر دیا تھا، بلکہ سچ پوچھیے تو انھوں نے اپنے اس اقدام سے ذات پات پر مبنی برہمنی سماج کی اُلٹی گنتی کا بٹن بھی دبا دیا تھا۔ کورے گاؤں میں دوسو سالہ جشن کے موقع پر جو کچھ ہوا اس سے پہلی بار دُنیا کو یہ اندازہ ہوا کہ امبیڈکر نے ریزرویشن اور دوسرے دستوری تحفظات کے ذریعہ دبی کچلی اقوام کو اوپر اٹھانے کی جس تحریک کی بنیاد رکھی تھی اس نے اب ایک توانا آواز کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایک دن پرکاش ناتھ پاٹنکر کی قوالی سنتے ہوئے جب میں ان لائنوں تک پہنچا تو مجھے ایسا لگا کہ بچپن کی بہت سی گتھیاں اچانک حل ہو گئی ہوں۔

وہ بات کرو پیدا تم اپنی زبانوں میں
دُنیا بھی کہے کچھ ہے ان بھیم دِوانوں میں
گر بھیم نہیں ہوتے (تو) ہم آج کہاں جاتے
قسم بھگوان گوتم کی ہم کبھی کے مرگئے ہوتے
دبا کر جیتے جی رکھا تھا ہم دلتوں کو ان پنڈوں نے
چوٹی والوں نے یہ بھگوے کپڑے والوں نے
چھوا چھوتی کا بوجھ لاد رکھا تھا ان غنڈوں نے

بہت ظلم و ستم کے تیر بے ایمانوں نے برسائے
ہمیں کھانا تو کیا ایک لوٹا بھر پانی کو ترسائے
قلم کی نوک پر بھیم راؤ نے جب ان کو نچوائے
تبھی یہ بھیڑیے سیدھی طرح سے راہ پر آئے

مجھے اوائل عمری میں مکتبہ کی ایک مجلس میں ہونے والی والد صاحب کی وہ گفتگو بھی یاد آئی کہ ہندوستان کے سیکولرازم کے پیچھے اربابِ اقتدار کی وسیع النظری نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ ایک عملی اور سیاسی مجبوری کے سبب تھا کہ ہندوراشٹر کا ایک ایسا تصور جو ذات پات کے مروّجہ نظام پر مبنی ہو، امبیڈکر اور ان کے کروڑوں متبعین کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے ہریجنوں کے تئیں گاندھی کی وسیع القلبی، ان کی ہمدردی اور ان کے پیار کی حقیقت بھی آج ہی سمجھ میں آئی۔ وہ بہت پہلے اس نکتہ سے آگاہ ہو گئے تھے کہ اگر نچلی ذات کی اقوام اپنے حقوق کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں تو ہندو اکثریت کا مصنوعی طلسم ہوا ہوجائے گا۔ انھوں نے دراصل ایک سیاسی حکمت عملی کے طور پر اچھوتوں کو ہریجن یعنی 'خدا کے بندے' کے پیارے لقب سے نوازا۔ ان کے لیے مندروں کے دروازے کھولنے کی وکالت کی، لیکن ان کی علیحدہ سیاسی قوت کے قیام کے راستے میں اپنے مرن ورت کا پتھر رکھ کر بیٹھ گئے۔ بالآخر ۱۹۳۲ء میں امبیڈکر کو گاندھی کے آگے جھکنا پڑا۔ انھوں نے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو تو واپس لے لیا لیکن سیاسی نمائندگی میں دلتوں کے لیے ریزرویشن اور آگے چل کر ملازمتوں میں ملنے والی مراعات نے اور خاص طور پر کورے گاؤں کے نظری استوانہ نے دلتوں کو ایک علیحدہ شناخت فراہم کر دی۔ ۱۹۵۶ء میں اپنے لاکھوں متبعین کے ساتھ ناگپور کے عوامی جلسہ میں ہندوازم کے خیمے سے باہر آنے کے اعلان نے تو گویا برہمنی سماج کی بنیاد ہی ہلا ڈالی۔

یکم جنوری ۲۰۱۸ء کو کورے گاؤں میں منعقد ہونے والے دوسوسالہ جشن کو جس طرح سرکاری سطح پر سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی اس سے بھی اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ آج بھی امبیڈکر کی تحریک زیرزمین اپنا کام کر رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ایک سرکاری حکم نامہ کے ذریعے دفعہ ۳۴۱ کا اضافہ اس خیال سے کیا گیا تھا کہ دلتوں کو ہندوازم کے خیمے میں کسی طرح باندھ کر رکھا جائے، لہٰذا یہ کہا گیا کہ جو لوگ ہندو ازم کو خیرباد کہہ دیں گے وہ شیڈول کاسٹ کو ملنے والی مراعات کے مستحق نہیں ہوں گے۔ بعد میں لوگوں کے بہت کچھ احتجاج کے بعد سکھ مت اور بدھ مت قبول کرنے والوں کو تو ان مراعات میں شامل کر لیا گیا البتہ آج بھی عیسائی یا مسلمان ہونے والے دلت اس سہولت سے محروم ہیں۔

۴۷

خدا کو معافی

رام مندر کی تحریک نے رفتہ رفتہ ایک عوامی غیظ وغضب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ عام ہندوؤں کو احیا پرستوں کے اس پروپیگنڈے پر یقین آنے لگا تھا کہ اس ملک میں ہندو اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود محفوظ و مامون نہیں۔ انھیں پرشوتم رام کے شایانِ شان ان کی جنم بھومی پر ایک عظیم الشان مندر کی استھاپنا کی اجازت نہیں اور یہ سب اس لیے ہے کہ حکومت مدت سے مسلمانوں کی منہ بھرائی اور خوشامد کی پالیسی پر کاربند ہے۔ مسلم قائدین کو یہ غلط فہمی تھی کہ پریس ان کے بیانات کو اہمیت دیتا ہے۔ مجاہدانہ رنگ و آہنگ والے پریس اعلامیوں کو شہ سرخیوں میں جگہ ملتی ہے، لیکن امر واقعہ یہ تھا کہ پریس بڑی چابک دستی کے ساتھ ایک جارح ہندو بیانیے میں رنگ بھرنے کے لیے ان قائدین کے گرما گرم بیانات کو استعمال کر رہا تھا۔ دوسری طرف مسلم تنظیموں کا حال یہ تھا کہ مسلم مجلس مشاورت اپنا قومی کنونشن صرف اس لیے منعقد نہ کر پائی تھی کہ اس کے پاس بقول سید شہاب الدین (نائب صدر) ایک قومی کنونشن کے انعقاد کے لیے نہ تو مالی وسائل تھے اور نہ ہی انتظامی ڈھانچہ۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلم خواتین ایکٹ ۱۹۸۶ء کے نقائص کو دور کرنے میں بھی کوئی عملی پیش رفت نہ کر سکا تھا۔ پرسنل لاء کی تقنین (codification) سے متعلق طول طویل بحثیں بھی کسی فیصلہ کن گفتگو تک پہنچنے میں اب تک ناکام رہی تھیں۔ codification کا کام ہوتا بھی تو کیسے۔ فقہی تاویلات و تعبیرات اور احکامِ قرآنی کے مابین جو تعارض پایا جاتا تھا اسے دور کرنے کی بورڈ کے علما کے پاس کوئی ترکیب نہ تھی۔ تین طلاق، نفقہ مطلقہ اور یتیم پوتے کی وراثت جیسے مسائل کے سلسلے میں قرآن کا موقف فقہا کے دواوین سے مغائر نظر آتا تھا۔ ہمارے علما کے لیے فقہا کو مسترد کرنا ممکن نہ تھا لیکن ان کا دل اس بات پر بھی مطمئن نہ ہوتا تھا کہ وہ قرآن مجید کے علی الرغم ان منحرفہ دواوین کو ابدی صداقت کے طور پر قبول کر لیں، لہٰذا codification کا کام مسلسل التوا کا شکار رہا۔

ایک طرف ہندو احیا پرست تحریکیں جہاں نئے نعروں اور نئی سج دھج کے ساتھ سامنے آرہی تھیں وہیں دوسری طرف مسلم تنظیموں پر نزاع کا عالم طاری تھا۔ جمعیۃ العلماء ہند تقسیم کا شکار تھی جس کے ایک دھڑے کی

قیادت اب مولانا سید احمد ہاشمی کر رہے تھے۔ اُدھر مولانا اسعد مدنی نے ایک خودساختہ تنظیم امارتِ ہندیہ کی قیادت کا علم بلند کر رکھا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی طرح مدرسہ مظاہر العلوم بھی اختلاف امتی رحمة کی راہ پر گامزن تھا۔ اس دوران اگر کوئی چیز آگے بڑھی تھی تو وہ مشاورت کا مرکزی ریلیف فنڈ تھا جو بقول سید شہاب الدین آپریشنل (operational) ہو گیا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ ۸۷ء کے میرٹھ فساد اور خاص طور پر ملیانہ اور ہاشم پورہ کے واقعات نے عالم عرب کے اخبارات میں بڑی شہرت پائی تھی۔ عربی اخبارات میرٹھ کو (بروزن بیروت) میروت لکھ رہے تھے اور وہاں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم سے متاثر ہو کر بعض اصحابِ خیر نے متاثرین کی بازآبادکاری کے لیے اپنے طور پر چھوٹی موٹی رقمیں بھی بھجوائی تھیں۔ میرٹھ کے لرزہ خیز حادثات نے صرف مشاورت کے مرکزی ریلیف فنڈ کو ہی متحرک نہیں کیا تھا بلکہ بہت سی مسلم تنظیموں کے لیے ریلیف کے نام پر سماجی خدمت کا ایک نیا میدان نکل آیا تھا۔

ایک طرف مسلم تنظیموں کا مسلسل رو بہ زوال گراف، مسجد کے قائدین کے غیر ذمہ دارانہ اشتعال انگیز بیانات، آدم سینا اور امارت ہندیہ جیسی کاغذی تنظیموں کے خالی خولی دعوے اور دوسری طرف ملک بھر میں ہندو احیا پرستی کی ایک ایسی عوامی لہر کہ وقت کا وزیراعظم بھی شیلا پوجن میں شرکت اور مندروں کی زیارت کو اپنی سیاسی بقا اور استحکام کے لیے ضروری سمجھتا۔ راستہ آگے کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کے لیے صرف ایک تاریک اور طویل رات رہ گئی ہے، ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رات۔

اس غیر یقینی صورتِ حال کے سبب میں ان دنوں ایک عالمِ اضطراب میں رہتا۔ کبھی دیر رات گئے تک سبزہ زاروں پر ٹہلتا اور کبھی بے تابانہ ویران سڑکوں اور وسیع میدانوں میں جا نکلتا۔ غلبۂ اسلام کی اشاعت کے بعد سے ہی والد صاحب نے قیام اللیل کو میرے لیے بمنزلۂ فرض قرار دیا تھا۔ ان راتوں میں لطف وانبساط کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی اوراد و وظائف میں دل لگاتا تو کبھی منظوم مناجاتوں اور مثنوی مولانائے روم کی جھوم جھوم کر تلاوت کرتا۔ ان دنوں عالمِ عرب کے ایک سفر میں ادعیہ ماثورہ نامی ایک کتاب بھی میرے ہاتھ لگ گئی تھی جس کے بارے میں اول اول تو یہ تاثر تھا کہ شاید یہ اہلِ دل کے مجرباتی نسخوں سے ماورا خالص کتاب وسنت پر مشتمل خدا سے لو لگائے رکھنے کا کوئی مستند نسخہ ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ اس بات کا اندازہ ہونے لگا کہ وظائف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی دراصل سالکین کو مشغول رکھنے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے۔ پھر بھی ان شبینہ مجلسوں میں انبساط کی ایک کیفیت طاری رہتی۔ البتہ یہ سوال بھی سر اٹھاتا کہ اگر ان ریاضتوں اور روحانی نصابوں میں حالات کو بدل ڈالنے اور دشمن کو زیر کر لینے کا کوئی واقعی امکان پایا جاتا تو یہ کام تو اب تک اہلِ صفا کی ان مجلسوں سے انجام پا چکا ہوتا جہاں میں اٹھتا بیٹھتا آیا

تھااور جہاں ان اوراد کی ادائیگی کے سلسلے میں احتیاط والتزام کا یہ عالم تھا کہ وہ شیخ کی خاص اجازت کے بعد ہی مستحق سالکین کے ذریعہ پڑھے جاتے تھے۔سو جب اتنے بڑے بڑے شیوخ جن کے دستارِطریقت کا سلسلہ قطب الاقطاب سے ہوتا ہوا راست حضرت علیؓ سے جا ملتا ہو یا جو لوگ خیمۂ صدیقیؓ سے اپنا تعلق بتاتے ہوں،سو جب ان کی مشترکہ ہائے ہو حالات میں کوئی مثبت تبدیلی لانے سے قاصر ہو تو بھلا مجھ جیسے نو آموز وظیفہ کار سے کیا ہو سکے گا جس پر ابھی مثنوی معنوی کے معانی بھی پوری طرح کھلنے باقی ہوں۔

ایک دن نقوی صاحب سے ملک کی صورتِ حال پر گفتگو چھڑ گئی۔ کہنے لگے اسپینوزا کو پڑھا ہے تم نے؟ اتنی بڑی کائنات اوراس کائنات میں ہماری زمین کی حقیقت ایک ذرّے سے زیادہ نہیں۔ اور اس ذرّے میں موجود حضرتِ انسان کو دیکھیے کہ وہ اپنی کہانی کو محورِ کائنات سمجھے بیٹھے ہیں۔بعضوں کو یہ زعم ہے کہ خدا اس کی سزا اور جزا کا گوشوارہ مرتب کر رہا ہے۔ وہ کسی کی سنتا اور کسی کی فریاد مسترد کر دیتا ہے۔ یہ سب حضرت انسان کی خوش فہمیاں ہیں۔ بھلا خدا کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہمارے لیے ابدی جہنم تیار کرے۔ ارے بھئی خدا تو یہ چاہتا ہے کہ اس نے تمھیں زندگی کی جو نعمت عطا کی ہے اس سے لطف اندوز ہو،فطرت کی وادیوں میں چلو پھرو، درختوں کے نیچے جھولے ڈالو، دریا کے کنارے سکون کی بانسری بجاؤ۔خود بھی خوش رہو اور دوسروں کو بھی اس خوشی میں شامل کرو۔ یہ جو نفرت کی آندھی اس ملک میں اٹھ رہی ہے یہ بھی تو ایک مذہبی بیانیے کی پیداوار ہے۔ورنہ کون رام اور کس کی جائے پیدائش؟ مگر اہلِ مذاہب کو ان سوالوں سے کیا دلچسپی؟

نقوی صاحب کی نامذہبیت بڑی حد تک شخصی اور غیر جارح تھی جسے ان کے مسکراتے چہرے کے خدوخال نے ایک خاص کشش عطا کر دی تھی۔ وہ مذہبی امور پر بحث سے گریز کرتے۔ وہ مذہب کو یکسر مسترد نہیں کرتے، سوالات قائم کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بی بی منزل جہاں وہ رہتے تھے اس کے ٹھیک سامنے محلہ کی مسجد تھی جو اب نئے اضافوں کے ساتھ ایک بڑے مدرسے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ان کی اہلیہ پابندی سے اس میں چندہ دیتیں۔ وہ اس بات پر تعرض تو کیا کرتے، بس مسکراتے ہوئے ایک دن کہنے لگے کہ انھوں نے مذہبی امور کی وزارت بیگم کے حوالے کر رکھی ہے۔ان کے برعکس رضا امام صاحب کا رویہ نسبتاً تبلیغی ہوتا۔ضیا ان کا خاص شاگرد تھا۔کمیونسٹ پارٹی کی میٹنگوں میں ان کے ساتھ شریک ہوتا۔ایک دن ان ہی مجلسوں میں پڑھائے جانے والے تازہ سبق کچھ اس طرح سنانے لگا۔ بولا: خدا کوئی علیحدہ ہستی نہیں یہ دراصل ہمارے لاشعور کا پیدا کردہ نفسیاتی وجود ہے۔ خدا کو تو دراصل ہم انسانوں نے بنایا ہے۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی وہ آرزو جو نا تمام رہ گئی یا جس کو پورا کرنے کی وہ قدرت نہیں رکھتا، اسے کسی ایسی ہستی سے طلب کرے جو عقل کل بھی ہو اور جسے قدرتِ کاملہ بھی حاصل ہو۔

میں نے کہا: لگتا ہے آج کل تم فائر باخ کو پڑھ رہے ہو۔ کچھ ہرج نہیں۔ لطف تو جب ہے کہ اصل ماخذ سے پڑھو ورنہ مجلسی گپ شپ میں پتہ نہیں چلتا کہ پانی مرتا کہاں ہے۔ وہاں تو مارکس علیہ رحمہ کا یہ خالص روحانی جملہ بھی ایک مذہب مخالف بیانیے کے طور پر دیکھا جاتا ہے:

> Religion is the sigh of the oppressed creature, the heart of a heartless world, and the soul of soulless conditions. It is the opium of the people.

اچھا تو تم نے مارکس میں بھی روحانیت ڈھونڈھ نکالی ہے! ضیا نے حیرت کا اظہار کیا۔

ہاں! کیوں نہیں، اگر ان سطروں کو اس کے اصل سیاق میں دیکھو۔ بقول مارکس:

> ...the criticism of religion is, therefore, in embryo, the criticism of that vale of tears of which religion is the halo.

مارکس کا ہدفِ ملامت فی نفسہ مذہب نہیں بلکہ وہ اجتماعی نظام تھا جس کی بنیادیں ناانصافی پر مبنی تھیں۔ مذہب تو ایک طرح کی سروائیول اسٹریٹجی تھا، سر جھکا کر جیے جانے کی اسکیم۔ مذہب کی آڑ میں دراصل وہ اس سیاسی نظام کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے جو اس غیر صحت مند افیون کی مسلسل افزائش کر رہا تھا۔ ہم یہ کیوں بھولے جاتے ہیں کہ یہ اس معاشرے کا تذکرہ ہے جس کے بارے میں اینگلس نے ۱۸۶۰ء میں کہا تھا، ہم لوگ ہر اعتبار سے ایک سیکولر ملک بن چکے ہیں حتیٰ کہ ہمارے مذہبی تصورات بھی سیکولر قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ مارکس کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ مروجہ نظام کو اس کی جڑوں سے جب تک نہیں اکھاڑ پھینکتے، نئے نظامِ انصاف کا سورج طلوع نہیں ہوسکتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مارکس نے اپنے عہد میں اسی پرانے کارِ پیمبری کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا جس کی کوشش ہر عہد میں مخلص مصلحین کرتے رہے ہیں۔

ضیا کو تو میں نے خیر کسی طرح رخصت کر دیا مگر میرے پاس اس سوال کا اب بھی کوئی جواب نہ تھا کہ ہمارا خدا جس کے رحمٰن و رحیم ہونے کا اس قدر شہرہ ہے اس نے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو مدت سے ایک تعذیبِ مسلسل میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہم ابھی ایک حادثے سے پوری طرح ابھرتے بھی نہیں کہ دوسرا اس سے کہیں بھیانک حادثہ ہمیں آ لیتا ہے۔ ہماری ملی زندگی ایک کربِ مسلسل سے عبارت ہے۔ آخر خدا کو ہمارے حال پر رحم کیوں نہیں آتا؟ سیانے کہتے کہ یہ سب ہمارے پرکھوں کی غلط کاریوں کا ثمرہ ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ آخر خدا ہمارے پرکھوں کی غلطیوں کا حساب کتاب ہم سے کیوں چکا رہا ہے۔ خدا کے بارے میں میرا اپنا ذاتی تجربہ انتہائی خوش کن تھا۔ میں اسے جب بھی پکارتا اپنی مدد پر مستعد پاتا۔ ایسا لگتا جیسے میں اس کی انگلی پکڑ کر چلتا ہوں اور گاہے کسی شریر بچے کی طرح انگلی چھوڑ کر اِدھر ادھر بھاگ نکلتا ہوں مگر میرا خدا اس بات کا برا بھی نہیں مناتا۔ مجھے اپنے خدا سے ڈر بالکل نہیں لگتا۔ کبھی نماز

پڑھتا اور کبھی ٹال جاتا۔ مجھے تو یہ اطمینان تھا کہ وہ میرے شب و روز سے واقف ہے، میری تنہائی کا رفیق ہے، بھلا وہ مجھ سے تعرض کیوں کرے گا۔ البتہ ادھر کچھ دنوں سے مجھے اپنے پیارے خدا سے گلہ اور شکوہ پیدا ہونے لگا تھا۔ دعاؤں میں الحاح و زاری کے بجائے مناقشے اور محاربے کی زبان در آئی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آتا کہ آخر مجھ جیسے ناتواں کی زبان سے اس طرح کے جسارت آمیز الفاظ کیونکر نکل رہے ہیں۔ ان فی البدیہ مناقشوں کو جو ان مضطرب ایام میں میرے اور خدا کے بیچ ہوتے رہے تھے میں نے مختلف کیسٹوں میں محفوظ کرلیا:

بارالٰہا!

کیا واقعی تو نے طے کرلیا ہے کہ بابری مسجد ہم ہندوستانی مسلمانوں کا گولگاتھا بن جائے؟

تیرے مذبح خانے میں میرے یقین کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔

تو کنزاً مخفیا تھا، مگر جب سے تیرا ظہور ہوا ہمارے حالات دگر گوں ہیں۔

کمزور دبا لیے گئے، نقص من الاموال والجوع کی باتیں اب ہمیں تسلی نہیں دیتیں۔

کسی نے نازی تعذیب گاہ کی دیوار پر یہ کیا لکھ دیا:

'اگر کوئی خدا ہے تو اسے ایک دن مجھ سے اس بات کے لیے معافی مانگنی پڑے گی جو مجھ پر گذر رہی ہے۔ آخر کس جرم کی پاداش میں؟'

تنگ آمد بجنگ آمد! یعقوب نے تجھ سے دو دو ہاتھ کیے

مگر ہم تو تیرے آخری علمبردار ٹھہرے، ہمارے حق میں بھی تو بروٹس بنا پھرتا ہے؟

ہم نہ رہے تو تیری ربوبیت کا علم کون اٹھائے گا؟

تو کہتا ہے ہم امتِ مختار ہیں، واقعی! لطیف طنز میں تیرا کوئی ثانی نہیں۔

بہت ہو چکا اب ہمیں بخش دے، کارِ پیمبری کسی اور کو تفویض کر

یا رقیب بالعباد! اب بس کر۔

۴۸

قدسیوں کا جلوس

خدا سے مجھے بہت شکایت تھی مگر میں جاتا کہاں۔ میں اس کھونٹے سے جتنا بھی اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا مجھے ایسا لگتا جیسے میری ڈور مزید اس کھونٹے میں الجھتی جارہی ہو۔ مجھے ایسا لگتا کہ جو خدا میرے ذاتی معاملات میں میری انگلی پکڑے لیے چلتا ہے، وہی خدا قومی اور ملی معاملات میں میری باتوں کو سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ مگر کرتا بھی کیا میرے پاس کوئی اور دوسرا کھونٹا بھی تو نہ تھا جہاں اپنا سر ٹکاتا۔ سو کبھی رات کی تنہائی میں ٹمٹماتی شمع کی پراسرار روشنی میں الحاح وزاری کرتا اور کبھی اورادو وظائف کی زنبیل سے کسی نئے فارمولے کی تلاش میں رہتا۔ ایک عرصہ اسی اضطراب میں گزرا۔ کبھی درختوں کے نیچے قیامِ نیم شبی کو آزمایا اور کبھی روحانی ارتکاز میں مخل ہونے والی بجلی کی روشنی کے تمام تار کاٹ ڈالے مبادا اس زاہدِ شب بیدار کے مصلے سے روشنی کا کوئی روزن ملائے اعلیٰ میں کھلتا دکھائی دے۔ ان کوششوں سے ملائے اعلی میں کوئی ہلچل تو کیا پیدا ہوتی البتہ ہم غم کے مارے ہندوستانی مسلمانوں پر ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑی۔

اس دفعہ اذیت ناک خبروں کا سلسلہ بھاگلپور سے تھا جہاں ہندوستانی مسلمانوں کو قتل عام کے ایک نئے ماڈل اور تعذیب کی ایک نئی صورت کا سامنا تھا۔ نیلی (آسام) میں جہاں ایک غیر سرکاری اندازے کے مطابق کوئی دس ہزار بے بس مسلمان تہہ تیغ کر دیئے گئے تھے، قتلِ عام کا یہ واقعہ صبح سے شروع ہو کر دیر رات گئے تک اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ مرادآباد میں عیدگاہ کے مجمع عام میں پولیس کی یک طرفہ اور بے جا فائرنگ کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی عید خون میں نہلائی گئی تھی۔ ملیانہ اور ہاشم پورہ میں مسلمانوں کو سبق سکھانے کے لیے ان نوجوانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا تھا جن میں صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوئی ادنیٰ سی رمق بھی پائی جاتی تھی۔ بھاگلپور کا یہ فساد اس اعتبار سے پچھلے تمام فسادات سے بڑھ کر اور اپنی نوعیت میں کہیں دوررس اثرات کا حامل تھا کہ یہاں ریاستی پولیس کی سرپرستی میں ہندو احیا پرست تنظیمیں ایک منظم منصوبے کے تحت اس ملک سے مسلمانوں کے انخلا اور ان کے کلی صفایا کے پروگرام پر عامل تھیں اور اس پورے منصوبے کو وقت کے وزیراعظم کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ مسلمانوں کے انخلا کا یہ منصوبہ اس اعتبار

سے بھی مختلف تھا کہ ۲۴/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو رام شیلا کے جلوس سے مسلمانوں کا جو قتلِ عام شروع ہوا وہ اسی شدت کے ساتھ دو ماہ سے زائد کے عرصے تک جاری رہا۔ ریاستی پولیس نے نہ صرف یہ کہ بلوائیوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی بلکہ اکثر مقامات پر وہ بلوائیوں کی قیادت کر رہی تھی۔ کوئی ڈھائی سو گاؤں انخلا کے اس منصوبے کا حصہ بنائے گئے۔ 'جیسے ماں کالی - تاتار پور کرو خالی' اور 'ہندی، ہندو، ہندوستان - ملّا بھاگو پاکستان' جیسے نعرے اپنی شدت اور خون آشامی میں ۱۹۴۶ء کے بھاگلپور فساد سے بھی کہیں بڑھ کر تھے جس کا تذکرہ آج بھی شہاب نامہ میں پڑھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ منت اللہ رحمانی جنھوں نے ۱۹۴۶ء کے فساد کی رپورٹیں مرتب کی تھیں، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ ۱۹۸۹ء کا فساد اپنی شدت اور کیفیت میں ۱۹۴۶ء سے کہیں بڑھ کر تھا۔ ۱۹۴۶ء میں فساد زدہ علاقوں کا جب ہم لوگ دورہ کرتے تو علاقہ کے لوگ اس بربریت پر اظہارِ شرمندگی کرتے، لیکن آزاد ہندوستان میں شرمندگی تو کجا، متاثرہ علاقوں میں نفرت کے عمومی ماحول کے سبب مسلمانوں کا خود اپنے ہی گاؤں میں لوٹنا ممکن نہ تھا۔

یہ تاثر عام تھا کہ یہ فسادات ہو نہیں رہے ہیں بلکہ کروائے جا رہے ہیں۔ صوبے اور مرکز دونوں جگہ کانگریس کی حکومت تھی۔ ستندر نارائن سنہا جو اس وقت بہار کے وزیر اعلیٰ تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان کے سیاسی رقیب دراصل ان فسادات کے ذریعہ ان کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ مقامی ایس پی، ایس کے دویدی جن پر یکطرفہ طور پر مسلم مخالف کارروائی انجام دینے کا الزام تھا، ان کے فی الفور تبادلے کا حکم ریاستی حکومت نے جاری کر دیا تھا۔ لیکن جب راجیو گاندھی صورت حال کا جائزہ لینے وہاں پہنچے تو اس کرفیو زدہ شہر میں ہندو احیا پرستوں نے دویدی کے تبادلے کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ راجیو گاندھی نے مظاہرین کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے انھیں فی الفور یہ یقین دہانی کرائی کہ Mr. Divedi will remain here۔ دویدی کے تبادلے کا یوں اس طرح وزیر اعظم کی مداخلت سے رک جانا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے انخلا اور ان کے مکمل صفایا کے اس منصوبے کو ریاستی سرپرستی حاصل رہے گی۔ بعد میں اس واقعہ کی جتنی بھی سرکاری یا غیر سرکاری تحقیقات سامنے آئیں اس میں واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ اگر دویدی کا بروقت تبادلہ ہو گیا ہوتا تو سیکڑوں بے بس مسلمانوں کے قتلِ عام اور ان کی املاک پر غاصبانہ قبضے کو فی الفور روکا جا سکتا تھا۔

بھاگلپور کے واقعہ نے بہار سے کانگریس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ لالو پرساد مسلمانوں کے تحفظ کے نعروں کے ساتھ اقتدار میں آئے، لیکن انھوں نے اپنے وزیر شکیل احمد خان کے ذریعہ اس خیال کی تبلیغ شروع کر دی کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے مسلمان اپنے درد کو بھول جائیں تا کہ ایک نئ

شروعات کی جاسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی مسلمانوں کی عبادت گاہوں اوران کی زمینوں اوران کے گھروں پر فسادیوں کا قبضہ ہے۔ مسلمان اپنے ہی ملک میں بے وطن، خانہ بدوش اورمحرومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ نتیش کمار جو لالو یادو کی مسلم منافقت اور بھاگلپور میں کملیشور یادو جیسے مجرمین کو سیاسی پناہ دینے کے الزام پر مسلمانوں کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے تھے، خود ان کی حکومت میں دویدی جیسے پولیس افسر کو بہار پولیس کا سربراہ مقرر کیا جانا ایک ایسا مخمصہ ہے جس کے سیاسی اور نظری اطلاقات کو سمجھنا کچھ آسان نہیں۔

Mr. Divedi will remain here کا یہ جملہ میرے حافظے پر کچھ ایسا چپکا کہ ایک مدت تک اس جملے کی یاد آتے ہی دل و دماغ پر ایک جھرجھری کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اب یہ بات شک وشبہ سے بالاتر تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو زندگی کے ہر موڑ پر مختلف قسم کے دویدیوں کا سامنا ہے۔ عین حکومت کی سرپرستی میں اس بات کا کھلم کھلا اعلان کہ دویدی اب یہیں رہیں گے خواہ ان کی شناعت اور ان کا جرم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو۔ اب ان کے وقتی تبادلے کے ذریعہ مسلمانوں کے زخم پر کسی قسم کا نفسیاتی مرہم بھی نہیں رکھا جائے گا۔ میں جتنا اس صورت حال پر غور کرتا، اپنے آپ کو ایک ہلا مارنے والی بے بسی کے گرداب میں پاتا۔ دِویدی کی مسلم دشمنی کا ہر خاص و عام کی زبان پر چرچا تھا۔ یہ بات معروف تھی وہ پچھلے کئی ماہ سے احیا پرست ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ۲۴/اکتوبر کو جب رام شیلا کے جلوس کو انھوں نے مسلم علاقے سے گزرنے کی اجازت دی جس کے نتیجے میں حالات بے قابو ہو گئے اور ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ اس کے بعد دِویدی کا تبادلہ تو ایک منطقی اور معمول کی کارروائی سمجھی جاتی تھی۔ یہ کم سے کم عمل تھا جس کی مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے امن پسند ہندو بھی توقع کر رہے تھے۔ برسوں بعد ستندر نارائن نے اپنی یادداشت ''میری یادیں میری بھولیں'' میں اس راز سے پردہ اٹھایا کہ راجیو گاندھی جو وزیر اعظم کی حیثیت سے بھاگلپور کی صورت حال کا جائزہ لینے آئے تھے، وہ جب ہیلی پیڈ سے سرکٹ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے تو انھیں راستے میں مختلف مقامات پر احیا پرست ہندوؤں کے مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا، مطالبہ تھا کہ دِویدی کے تبادلے کو فی الفور روک دیا جائے کہ ان کے بغیر ہندو خود کو محفوظ محسوس نہیں کریں گے۔ راجیو گاندھی نے بلوائیوں کے زیر اثر جن میں سادہ لباس میں بعض پولیس کے جوان بھی شامل تھے، اس مطالبہ کو فی الفور مان لیا اور انھوں نے مظاہرین کے جارحانہ تیور کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا کہ Mr. Divedi will remain here۔

دسمبر کا آخری عشرہ تھا، سردی اپنے شباب پر تھی۔ ایک دن میں مولانا آزاد لائبریری کے مرکزی ہال میں، جہاں ان دنوں اخبارات و رسائل کا ایک گوشہ نیا نیا قائم ہوا تھا، India Today کا تازہ شمارہ دیکھ رہا تھا

جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح فسادات کے دو ماہ بعد بھی شہر میں مستقل قتل وخون کے واقعات پیش آرہے ہیں۔ ہر طرف خوف و دہشت کا سایہ ہے۔ کوئی ۳۰ ہزار لوگ ریلیف کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ کرفیو میں ڈھیل ملتے ہی خونریزی کے واقعات دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حالات معمول پر کب لوٹیں گے۔ چاندیری گاؤں کی ملکہ بیگم جو گاؤں کی مسلم آبادی میں تنہا زندہ بچ گئی تھی، اس کا کہنا تھا کہ میرا تو وشواس اُٹھ گیا اور دوسری طرف آٹھ سالہ اگنی کماری کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں دہشت سے سمٹی ہوئی تھی۔ بم کے حملے میں اس کا چہرہ زخمی ہو چکا تھا۔ محمد جہانگیر اپنا رکشہ لے کر ہندو علاقے میں جانے کی نہیں سوچ سکتا اور نہ ہی للّن شاہ مسلم علاقے میں سواری کی تلاش میں جا سکتا ہے۔ وجہ دونوں طرف ایک ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے ڈر لگتا ہے۔ محمد بہرام جو شہر میں ریشم کے ایک بڑے تاجر ہیں اور جن کے ایکسپورٹ کا کاروبار نیویارک تک پھیلا ہوا ہے، وہ اب اپنے کاروبار کو مغربی بنگال میں منتقل کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

ابھی میں اس رپورٹ کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر کسی بے تکلف ہاتھ کی تھپکی محسوس ہوئی۔ اچھا تو تم پھر سے اخبارات و رسائل کی دُنیا میں لوٹ آئے ہو۔ اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ شمسی کی آواز میں پہلے ہی پہچان چکا تھا، کہنے لگا: یہ کیا پڑھ رہے ہو؟ یہ سب ٹریش (trash) ہے۔ یہ رپورٹیں امر واقعہ پر ہمیں مطلع نہیں کرتیں۔ یہ سب صحافت کی دُنیا کا ایک بیلینسنگ ایکٹ (balancing act) ہے جو جان بوجھ کر صداقت پر پردہ ڈالتی ہے۔ پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے جیسے معاملہ برابر کا ہو، جیسے واقعتاً کوئی ہندو مسلم فساد برپا ہوا ہو، جہاں دونوں طرف کے مجروحین ایک دوسرے سے خوف زدہ ہیں۔ اگر ایک طرف ملکہ بیگم کی آنکھوں میں خوف ہے تو دوسری طرف اگنی کماری بھی کم دہشت زدہ نہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ بھاگلپور میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نوعیت فرقہ وارانہ فساد کی نہیں بلکہ مسلمانوں کے منظم انخلا اور عین ریاستی سرپرستی میں ان کے نسلی صفایا کی مہم ہے۔ مہلوکین میں نوے فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں اور مختلف جگہوں پر رفیوجی کیمپ بھی ان ہی کے دم سے آباد ہیں۔ میڈیا میں ایک جھوٹی خبر یہ چلائی گئی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام نگر میں پناہ لے رکھی ہے اور ہندو رام نگر کے کیمپوں میں پناہ گزیں ہیں، لیکن کسی کو نہیں پتہ کہ یہ دونوں جگہیں کہاں پائی جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں اصل صورت حال کا عشر عشیر بھی نہیں آرہا ہے جس سے بھاگلپور کے مسلمان دوچار ہیں۔ شاید تم نے اس سلسلے میں اِندو بھارتی کی رپورٹ نہیں پڑھی۔ یہ کہتے ہوئے شمسی سامنے کی الماری سے ای پی ڈبلیو (EPW) کا ایک شمارہ نکال لائے۔ غالباً یہ ۳۰ دسمبر کی اشاعت تھی جس میں بہار حکومت کے جانبدارانہ رول پر سوال

اٹھائے گئے تھے۔ مصنف نے واضح الفاظ میں لکھا تھا:

'بہار ملٹری پولیس کی نفری نے نہ صرف یہ کہ بلوائیوں کی کھلے عام حمایت کی بلکہ خود بھی مسلمانوں کے قتلِ عام میں شامل رہی۔ چاند یری گاؤں سے جن ایک سو پچاس مسلمانوں کو فوجی دستوں نے خطرے سے نکال کر بہار پولیس کے حوالے کیا تھا وہ سب کے سب پناہ گزیں کیمپ میں ہی قتل کر دیئے گئے تھے۔ محمد حسین آزاد، جو صوبائی حکومت میں وزیر تھے، ان کے مسلسل مطالبے کے باوجود متاثرہ علاقوں سے بہار پولیس کے دستے نہیں ہٹائے گئے تھے۔ تین دنوں تک حساس مقامات میں جہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا کمان مکمل طور پر بہار پولیس کے ہاتھوں میں تھی جو اقلیتوں کے سلسلے میں اپنے تعصب کے لیے بدنام تھی اور جس کے ہاتھ مئی میں ہونے والے ہزاری باغ فساد میں مسلمانوں کے خون سے رنگیں تھے۔ حتیٰ کہ راجیو گاندھی کے دورۂ بھاگلپور سے چند گھنٹے پہلے نیا بازار کے علاقے میں تیس اموات ہو چکی تھیں اور ان علاقوں میں بھی بہار ملٹری پولیس کا پہرہ برقرار تھا۔'

آگے چل کر مصنف نے لکھا تھا:

'بعض جگہوں پر تو اقلیتی فرقوں کے پورے خاندان کو ان کے گھروں میں بند کر کے نذرِ آتش کر دیا گیا اور وہ سب کے سب رات کے اندھیروں میں زندہ جل کر مر گئے۔ ناتھ نگر، چمپانگر، نیا بازار، صاحب گنج، پربتی، اسحاق چک، جوکسار، کریہ، رحمٰن پور اور منصور گنج کے علاقوں میں ایسی تباہی مچائی گئی کہ اب یہ علاقے پہچان میں نہیں آ رہے ہیں۔ چاند یری اور سندھیری جیسے گاؤں کا مکمل صفایا ہو چکا ہے۔ چمپانگر اور ناتھ نگر کے علاقے جو ریشمی کپڑوں کی صنعت کے لیے جانے جاتے تھے، وہاں اب بنکروں کا کوئی بھی خاندان زندہ نہیں بچا ہے۔ بنکروں کی مشینیں کچھ اس انداز سے تباہ کی گئی ہیں کہ ان علاقوں سے مسلم بنکروں کو ہر حال میں نقل مکانی پر مجبور کر دیا جائے۔ بھاگل پور اور اس کے اطراف میں مہلوکین کی تعداد سرکاری طور پر ڈھائی سو بتائی جاتی ہے، لیکن غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اصل تعداد ہزار سے بھی کہیں زیادہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ لاشوں سے بھرے دو ٹرک انتظامیہ نے گنگا ندی میں بھی پھنکوائے ہیں۔'

رپورٹ نگار کا کہنا تھا کہ:

'بھاگلپور، سیتامڑھی، مونگیر اور موتیہاری میں ہونے والے قتلِ عام نے بہار کے مسلمانوں کا حکومت میں اعتماد بری طرح متزلزل کر دیا ہے۔ مسلمان اس قدر خوف زدہ ہیں کہ ۹ رنومبر کو جبکہ

ایودھیا میں شیلا پوجن کی بنیاد رکھی جانی تھی اس سے تین چار دن پہلے ہی سے پٹنہ شہر کے چھوٹے چھوٹے دکان داروں نے اپنی دکانیں اور کاروبار بند کر کے شہر سے فرار ہونے میں عافیت جانی۔ کوئی ہفتہ عشرہ تک مسلمانوں کے کاروبار پر تالے پڑے رہے۔ اب یہ چھوٹے موٹے مسلمان کاروباری شہر میں واپس آنا شروع ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک حکومتی نظم و نسق میں ان کا اعتماد واپس نہیں آسکا ہے۔'

حالات انتہائی نازک تھے۔ ایک طرف انتہا پسند ہندو تنظیموں کو حکومتی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور دوسری طرف بے بس مسلمانوں کا اس آسمان کے نیچے خدا کے علاوہ اور کوئی سہارا نہ تھا۔ وہ جس بے بسی کے ساتھ اپنے اپنے گھروں سے مقتل کی طرف لے جائے گئے اور جس طرح گاؤں کے گاؤں مسلم آبادیوں سے خالی ہو گئے اس سے اس بات کا صاف عندیہ ملتا تھا کہ ان کے اندر اپنی مدافعت میں کچھ کر گزرنے کا کس بل بھی باقی نہیں بچا ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان کریں تو کیا کریں۔ جان و مال کی مدافعت کس طرح کی جائے، اس بارے میں اسلام کی مبینہ تعلیمات کیا ہیں اور یہ کہ موجودہ صورت حال میں ایک مؤثر اور نبوی اقدامی عمل کا ڈول کس طرح ڈالا جانا چاہیے۔ میں نے 'مسلم ملیشیا کی ضرورت' نامی کتابچہ میں ان ہی سوالات کو محور گفتگو بنایا تھا۔ یہ کتابچہ احباب کے حلقے میں کچھ اسی احتیاط و التزام کے ساتھ تقسیم کیا گیا جس طرح ایمرجنسی کے زمانے میں مولوی منت اللہ رحمانی کا کتابچہ زیر زمین شائع ہو کر ان کے مؤیدین کے حلقے میں پہنچا تھا۔ ابھی اس کی اشاعت پر چند ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ خفیہ پولیس حرکت میں آ گئی۔ اُدھر مکتبہ میں پولیس کا چھاپہ پڑا۔ اس دوران پولیس والے مکتبہ کی تلاشی لیتے رہے۔ کتابیں اُلٹی پلٹی جاتی رہیں۔ الماریوں کے اندرونی حصے کاغذات کی درازیں اور فائلیں نہ جانے کیا کیا اُلٹ پلٹ ڈالا، لیکن کتابچے نہ ملنے تھے نہ ملے اور ملتے بھی کیسے، خدا نے ان کی بصارت پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ 'مسلم ملیشیا' کے کتابچوں پر اُردو کا قاعدہ کچھ اس شان سے براجمان رہا کہ خفیہ پولیس کی گھنٹوں کی کارروائی بے اثر ہو کر رہ گئی۔

اسی دوران بہار میں وزیر اعلیٰ کی تبدیلی عمل میں آ گئی۔ نئے کانگریسی وزیر اعلیٰ جگن ناتھ مشرا اُردو کے حوالے سے مسلمانوں میں اچھی شبیہ رکھتے تھے۔ اس تبدیلی سے فوری طور پر ایک نفسیاتی راحت کا احساس ہوا۔ ان کی وزارت پر ابھی تین ماہ کا عرصہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ نئے ریاستی انتخابات میں کانگریس کا صفایا ہو گیا اور لالو یادو وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ گو کہ نئی حکومت مسلمانوں کے تحفظ کے نام پر وجود میں آئی تھی، لیکن عملی طور پر اپنی پندرہ سالہ حکومت میں اس نے بھاگلپور کے لٹے پٹے مسلمانوں کی بازآبادکاری کی کوئی مؤثر کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کی زمینیں انھیں باج گزار کرائی جا سکیں۔

برسوں بعد ۱۹۹۵ء میں جب بھاگلپور قتلِ عام کی تحقیقاتی رپورٹیں سامنے آئیں تو پتہ چلا کہ بیشتر معاملات میں پولیس نے ایف آئی آر درج کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ کل پانچ سو پچانوے (۵۹۵) ایف آئی آر درج کی گئیں، جس میں لوٹ، آتش زنی اور قتل کے مختلف واقعات شامل تھے۔ پولیس کے اپنے ریکارڈ کے مطابق نوسو بیاسی (۹۸۲) افراد قتل ہوئے تھے، لیکن ایف آئی آر میں صرف تین سو چون (۳۵۴) مقتولین کا تذکرہ تھا۔ پانچ سو اموات تو خود پولیس کی اپنی رپورٹ کے مطابق اس کے تفتیشی دائرے سے باہر رہ گئی تھیں۔ مجرمین کھلے عام دندناتے پھر رہے تھے اور جن آنکھوں نے انھیں قتل کرتے دیکھا تھا ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ان مجرمین کا نام لے سکتے۔ پھر یہ ایف آئی آر بھی اتنی تاخیر سے درج ہوئی تھیں کہ ان کے لیے شواہد کا جٹا پانا کچھ آسان نہ تھا۔ مثال کے طور پر لوگائیں گاؤں میں جہاں پولیس کی ملی بھگت سے ایک سو آٹھ لاشوں کی اجتماعی قبر پر گوبھی کے پھول اُگا دیئے گئے تھے، اس جرم کی ایف آئی آر اکتالیس دنوں بعد درج کی گئی تھی۔ جب قتل کے اتنے بڑے واقعہ کو اتنے دنوں تک ٹالا جا سکتا ہو تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رپورٹ درج کرنے والوں کی نیت کیا رہی ہوگی۔ مجرمین چونکہ کھلے عام حکومت کی مشینری میں دخیل تھے یا خود اس کا حصہ تھے اس لیے جو کل پانچ سو پچانوے ایف آئی آر درج کی گئیں ان میں چار سو سولہ ایف آئی آر میں کسی معین شخص کا نام نہیں لیا گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ صرف ایک سو چالیس ایف آئی آر کے سلسلے میں پولیس نے باقاعدہ چارج شیٹ داخل کی، بقیہ معاملات کی فائلیں شواہد نہ ملنے کی وجہ سے بند کر دی گئیں۔ کورٹ نے بھی پولیس کی اس دلیل کو کافی مان کر ان مقدمات کی فائلیں بند کر دیں۔ اسے اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ چار سو ایف آئی آر کو مسترد کرنے کے بجائے وہ ان مقدمات کو کسی دوسری تفتیشی ایجنسی کو سپرد کرنے کا حکم دیتی۔

زندہ بچ جانے والوں میں لوگائیں کے اشرف علی، پربتی کے محمد جاوید اور چاندیری کی ملکہ بیگم کے نام ذرائع ابلاغ میں آجانے اور ان کی عینی شہادتوں کے سبب بعض واقعات عوامی معلومات کا حصہ بنے ورنہ ۲۵۰ گاؤں میں کون کہاں اور کیسے مارا گیا اس کی تفصیلات سنانے کے لیے کوئی نہیں بچ سکا۔ لوگائیں جہاں مقتولین کی اجتماعی قبروں پر گوبھی کے پھول بو دیئے گئے تھے اس کے بارے میں کلکٹر آفس کی ایک رپورٹ میں یہ معلومات درج تھی کہ ۱۰۵ مقتولین میں بچوں کی تعداد ۵۲ تھی۔ بقول مانی خاں جنھوں نے ریلیف کے کام میں اہم رول ادا کیا، ان کا کہنا تھا کہ لوگائیں میں جب لاشوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہوا تو معصوم بچیوں کے ربن اور ان کی چھوٹی چھوٹی چٹیا دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اشرف علی آج بھی جب اپنی بیوی اور ماں کے کپڑے دیکھ لیتے ہیں تو ان پر پاگل پن کا دورہ پڑنے لگتا ہے۔ بقول ملکہ بیگم: '

لوگ ائیں میں مسلمان ایک گھر میں جمع ہو گئے تھے، اسی دوران فوج آ گئی مگر فوج کے چلے جانے کے بعد انھیں گھروں سے نکالا گیا، پھر قتلِ عام کچھ اس طرح شروع ہوا کہ بلوائیوں کا گروہ آگے سے بڑھا، آگے سے کاٹنا شروع کیا، پیچھے سے بڑھا، پیچھے سے کاٹنا شروع کیا۔ ایک آدمی کے تین چار ٹکڑے کیے، گلا اتارا، پیٹ کاٹا گلا کاٹا پیٹ کاٹا'۔ جاوید جن کے خاندان کے ۱۲ افراد مارے گئے اور صرف وہی زندہ بچ گئے، وہ تو قاتلوں کو پہچانتے بھی ہیں۔ گوسوامی اور منڈل کے حملوں سے وہ کسی طرح نکل بھاگے تھے، لیکن وہ ان کا نام نہیں لے سکتے۔ پولیس اور بلوائی، مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے تھے۔ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق:

> "The manner in which search was conducted was reminiscent of the searches in occupied Europe by the Nazis."

بھاگلپور کا قتلِ عام اپنی نوعیت کے اعتبار سے منقسم ہندوستان میں مسلمانوں پر اب تک کا سب سے کاری وار تھا جس کا مقصد مسلمانوں کا مکمل انخلا، انھیں ملیامیٹ کرنا اور ان کی زمینوں اور املاک پر قبضہ کرنا تھا۔ بعض رپورٹوں کے مطابق آج بھی کوئی تین ہزار ایکڑ زمینوں پر غیر مسلمین قابض ہیں۔ مظلومین کی دادرسائی کے لیے جو مختلف کمیشن بٹھائے گئے اس نے بھی اس پہلو کو بالکل ہی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ گو کہ اس دوران ایسی حکومتیں بنتی رہیں جو مسلمانوں کی بہی خواہی کا دم بھرتی تھیں۔ لالو اور نتیش دونوں پر ہی ہماری مسلم قیادت فریفتہ رہی۔ مولوی مجاہد الاسلام جو اس وقت قاضیٔ شریعت اور بعد میں پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے منصب پر بھی پہنچے وہ اپنے دستِ مبارک سے لالو یادو کو لڈو کھلاتے دیکھے گئے۔ اخبارات میں باہمی الفت و محبّت پر مبنی اس قسم کی تصویریں شائع ہوئیں۔ نتیش عہد میں تو مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع پٹنہ کے گاندھی میدان میں منعقد ہوا جس پر نتیش کمار کا دستِ شفقت اتنا واضح تھا کہ ناظمِ اجتماع کو اسی شام ایم ایل سی کے منصب پر نامزد کرنا انھوں نے ضروری سمجھا۔ لیکن مسلم قیادت کے سرکار دربار سے ان خوشگوار تعلقات کے باوجود بھاگلپور کے محرومین کو انصاف نہ مل سکا۔ برسوں بعد ۲۰۱۶ء میں *Splintered Justice* کے مصنفین نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ انصاف کو ایک منصوبہ بند طریقے سے تاراج کرنے اور زخموں کو دانستاً کھلا اور رِستا چھوڑ دینے کے معاملے میں ۱۹۸۹ء کے بھاگلپور کے فساد اور ۲۰۰۲ء کے گجرات فساد میں بڑی واضح مماثلت ہے۔ بھاگلپور کا فساد کانگریس کے عہد میں پیش آیا اور بعد کے دنوں میں سرکاری مولویوں کی خوش الحانی اور سیاسی مسلمانوں کی تگ و تاز نے اس کی سنگینی پر بڑی حد تک پردہ ڈال دیا جبکہ گجرات کے قاتلوں کو سرکاری مسلمانوں اور درباری مولویوں کی فوری کمک نہ ملنے کے سبب اس واقعہ کی شناعت گذرتے

وقتوں کے ساتھ واضح ہوتی چلی گئی۔

بھاگلپور قتل عام کے چند ماہ بعد جب میں وطن مالوف پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابّا کی شخصیت کے گرد مختلف غیر مرئی سرگرمیوں کا ظہور ہے۔ ایسے لوگ جو کبھی نہ دیکھے گئے اور دہقانیوں کے غول کے غول نہ جانے کہاں سے آتے، ان سے چند لمحے گفتگو کرتے، حوصلہ پاتے اور پھر اپنی راہ لیتے۔ ایمرجنسی میں ابّا کی گرفتاری کے بعد ان کے متاثرین اور محبین کے جس زیر زمین اور خاموش نیٹ ورک کا ہمیں تھوڑا بہت اندازہ ہوا تھا، وہ ایسا لگتا تھا اب پوری طرح متحرک ہو۔ دور دراز علاقوں سے لوگ آتے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آتے ہیں۔ ایک دن ایک سفید ریش بزرگ تشریف لائے۔ چہرے بشرے سے خضر کی صورت معلوم ہوتے تھے۔ ابّا نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ اچھا تو آپ ہی راشد میاں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے فرطِ محبّت سے مجھے گلے لگالیا۔ چند لمحے میرا ہاتھ تھامے رہے، فرمایا: بیٹا! تم نے بروقت کتابچہ تحریر کیا۔ لوگوں کو اقدامی عمل کی ترغیب دی۔ بڑے بڑے مشکل معرکے ہمت اور حوصلے سے سر کر لیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیتامڑھی کے علاقے میں بعض مسلم بستیوں کو بھاگلپور والی صورت حال درپیش تھی۔ مسلح بلوائیوں کے غول کے غول نہتے مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ہم لوگ جہاں رہتے ہیں اس کے چاروں طرف غیر مسلموں کی آبادیاں ہیں، جن کے دلوں میں ہمارے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ہمارے بچوں نے بے بسی کی موت مرنے کے بجائے اقدامی عمل کا پروگرام بنایا۔ گاؤں کی کل آبادی کوئی ڈیڑھ سو مرد و زن پر مشتمل تھی، جن میں بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ ہم نے اپنے پاس موجود دیسی اسلحوں کو صیقل کیا اور مرد و عورت اور بوڑھے بچے سبھوں نے مردانہ لباس اختیار کیا۔ اپنے سروں پر سفید پگڑیاں جمائیں اور ہاتھوں میں بلّم اور لاٹھیاں لیے چاندنی رات کے منظر نامے میں گاؤں سے باہر شاہراہ عام پر نکل آئے۔ قدسیوں کا یہ خاموش جلوس تو گاؤں اور اس کے اطراف کی زیارت کے بعد واپس آ گیا، لیکن جن لوگوں نے بھی یہ منظر دیکھا ان کے اوپر ہیبت طاری ہوگئی۔ انھیں ایسا لگا جیسے آسمان سے کوئی مخلوق اہل ایمان کی حفاظت کے لیے اُتر آئی ہو۔ ہمارا عزم تھا اور ہمارے بچے اس بات کے لیے تیار بھی تھے کہ ہم بے بسی کی موت مرنے کے بجائے شہادت کو ترجیح دیں گے۔ جب آپ مرنے کے لیے تیار ہوجائیں تو زندگی آپ کے قدم چومنے لگتی ہے۔

ابّا نے ان دنوں ایک خطیر رقم بھاگلپور کے متاثرین کے لیے بھی بھجوائی تھی، حالانکہ ان دنوں خود ان کی اپنی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن حوصلوں کی اس جنگ میں جو بھاگلپور قتلِ عام کے بعد بہار کے مختلف حصوں میں لڑی جا رہی تھی، ابّا کسی قیمت پر بھی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے

میرے کتابچے کی اشاعت سے پیدا ہونے والی مشکلات پر نہ صرف یہ کہ مجھ سے کوئی اعراض نہ کیا بلکہ میرے پشت پناہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ کتابچے پر خفیہ پولیس کی کارروائی کا سلسلہ شاید مزید طول کھینچتا مگر خدا کا کرنا کہ اتر پردیش اور بہار کے سیاسی منظرنامے میں ڈرامائی تبدیلی آ گئی۔ دونوں ریاستوں سے کانگریس کی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مرکز میں وی پی سنگھ نے وزیر اعظم کی حیثیت سے زمام اقتدار سنبھال لی اور اسی دوران قدرت نے عربی تعلیم کے لیے میرے سوڈان جانے کا فیصلہ صادر کر دیا۔

چند ماہ بعد جب میں سوڈان سے واپس آیا تو علی گڑھ کے اسلامی حلقوں میں کتابچے کی دھمک ابھی باقی تھی۔ اس دوران خفیہ ایجنسیوں کے بعض وفود تفتیش کی غرض سے دہلی سے علی گڑھ کا رخ کرتے رہے تھے۔ خفیہ پولیس کی ان سرگرمیوں کے پیش نظر بعض احباب نے تو یہ پیشین گوئی بھی کر رکھی تھی کہ میں ہندوستان واپسی پر شاید ایئر پورٹ سے ہی گرفتار کر لیا جاؤں۔ لیکن خدا کی شان کہ ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ البتہ ان رسمی تفتیشی کارروائیوں کو جو بالعموم مسلمانوں کی ملی سرگرمیوں کے سلسلے میں روا رکھی جاتی ہیں اور جن کا مقصد مسلم نوجوانوں کو خوف زدہ کرنا ہوتا ہے، اسے بعض کج کلاہ مخالفین نے میرے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مجھے ایک ایسے سخت گیر اور شدت پسند نوجوان کی حیثیت سے پیش کیا گیا جس کی موجودگی کیمپس کے پرسکون تعلیمی ماحول کو درہم برہم کر سکتی تھی۔

استاذی جعفر ذکی صاحب اب شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ میری ملی سرگرمیوں کے سبب ان کا رویہ بڑی حد تک معتقدانہ تھا۔ وہ میری عمر کے دوسرے ایرانی اور عراقی طلبا کو بھی جو دین کی سربلندی کے لیے سرگرم رہتے، اپنی نازبرداریوں کا محور بنائے رکھتے۔ ان کا حکم تھا کہ میں نئے تعلیمی سال کی ابتدا سے شعبہ میں درس و تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لوں۔ گو کہ باقاعدہ تقرری میں ابھی چند دن باقی تھے لیکن انھوں نے میرے حصے کا کام مجھے تفویض کر دیا اور میں انٹرویو کی تیاری میں منہمک ہو گیا۔ لیکن چند دنوں بعد جب انٹرویو کا نتیجہ آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ غیر متوقع طور پر میرا نام اس فہرست سے غائب تھا۔ استاذی جعفر ذکی کی سربراہی میں منعقد ہونے والی سلیکشن کمیٹی مجھے مسترد کر دے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے لیے اس خبر پر یقین کرنا مشکل تھا۔ انھوں نے پیشکش بھی تو خود ہی کی تھی۔ پھر اچانک ان کے فیصلے میں اس تبدیلی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ میرے لیے تقرر سے کہیں زیادہ استاد محترم کا یہ رویہ تھا جن کی شفقتوں اور محبتوں کے سہارے میں نے اب تک علمی زندگی کی مختلف منزلیں طے کی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اتھلے پانی میں ڈوب جانے کے سبب میری موت واقع ہو گئی ہو۔

ایک دن آزاد لائبریری سے نکلتے ہوئے استاد محترم پر نظر پڑی، انھوں نے اشارے سے قریب

بلایا، خیریت پوچھی۔ ان کی نگاہوں میں پشیمانی نمایاں تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن ایسا لگا جیسے زبان نے ساتھ نہ دیا ہو۔ اپنے ساتھ ڈپارٹمنٹ لے کر آئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں اور کہنے کا یارا نہ ہو۔ اس واقعہ کے بعد علی گڑھ سے میرا دل اُچاٹ ہوگیا۔ میں مختلف بلاد و امصار کی سیر کرتا ہوا دہلی پہنچا، جہاں سے کئی برسوں تک ملّی ٹائمز انٹرنیشنل نکالتا رہا۔ اس دوران جب بھی علی گڑھ آتا اپنے شفیق استاد کی زیارت کو اپنی سعادت جانتا۔ ایک دن ان سے رہا نہ گیا، بولے: راشد میاں! دل پر ایک بوجھ تھا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ مجھے لوگوں نے متوحش کر دیا تھا۔ یہ بات گو کہ گفتگو کے سیاق و سباق سے بالکل الگ اور بے جوڑ تھی۔ انھوں نے کسی کا نام نہ لیا تھا لیکن اشارہ واضح تھا۔ ہم دونوں نے خفت مٹاتے ہوئے بات آگے بڑھا دی کہ ملی کام کرنے والوں کو تفتیشی ایجنسیاں اتنا نقصان نہیں پہنچاتیں جتنا ہمارے بزدل کج کلاہوں کی ریشہ دوانیاں اور معاندانہ پروپیگنڈے انھیں حاشیے پر لگا دیتے ہیں۔

۴۹

کریسٹال ناخت

علی گڑھ میں میرے لیے اب کچھ زیادہ دلچسپی کا سامان نہ رہا تھا۔ مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی تھی۔ سوڈان میں عربی زبان کی تعلیم سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب عالمِ غرب کے ساتھ ساتھ عالمِ شرق بھی میرے راست رابطے میں تھا۔ اس دوران مغرب کی تحریک امن کی تنظیموں سے بھی میرے گہرے روابط ہو گئے تھے۔ یہ ایک الگ دُنیا تھی جس میں ابتدأ میرے لیے چونک کا بڑا سامان تھا۔ طرح طرح کے صوفی منش لوگ ایک نئی دُنیا کا خواب سجائے اپنی کاوشوں میں مست رہتے۔ البتہ اب تک میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ میں اپنے کاموں کی ابتدا کہاں سے کروں؟ کبھی پرآسائش زندگی کا خواب اپنی طرف کھینچتا تو کبھی انقلابی خیالات انگڑائی لینے لگتے۔ ان دنوں کثرت سے ایسے خواب آتے جن میں اپنے آپ کو کسی دوراہے پر پاتا اور کبھی بلند و بالا عمارتوں سے اترتے ہوئے زینے اتنے تنگ ہونے لگتے کہ سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی اور آنکھ کھل جاتی۔ ایک بار صرف اسی خیال سے حجازِ مقدس گیا کہ وہاں حرم کی تنہائی میں اپنے مستقبل کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ لوں مگر صحوۃ اسلامی کے حلقوں میں میرے وسیع تر تعارف کے بعد حرم میں بھی تنہائی میسر نہ رہی۔ ایک دن کچھ ان ہی سوالات میں غلطاں حطیم سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ہاشم مہدی نے آلیا، بڑے اصرار سے اپنے گھر لے گئے۔ جس ستون سے ٹیک لگائے ایسا لگتا تھا کہ خدا نے وہیں کسی شناسا کو بٹھا رکھا ہے، جیسے کوئی مجھ پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔ ایک دن مسجدِ نبوی کو اپنے ارتکاز کا مرکز بنایا، دُنیا و مافیہا سے بے خبر سبز گنبد کے نظارے میں کھویا تھا کہ شیخ الحسیّن نے کندھا تھپتھپایا: ماشاالله! ماشاالله! کی صدا بلند ہوئی۔ پچھلی ملاقاتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ شیخ ان دنوں مسجد نبوی سے متصل ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ مالوخئے کی ڈش ان کے ہاں بہت لذیذ ہوا کرتی تھی۔ مشرق میں صحوۃ کے احباب جن میں بعض میری ہی طرح انگریزی زبان وادب میں پی ایچ ڈی تھے اور اعلیٰ مناصب پر متمکن تھے اور مغرب میں تحریک امن کے علمبردار جن میں کوئیکر بھی تھے جو اپنے اندر روشنی کی تلاش میں رہتے اور آزاد منش مدنیت بیزار نفوس بھی جو فطری اور سادہ زندگی کی جستجو میں ایک خواب آسا دُنیا کا منصوبہ بناتے۔ ان دنوں میرے

پاس ایک پوٹلی نما بیگ ہوا کرتا تھا جو میری کل کائنات تھی۔ زندگی سادہ اور تکلفات سے ماوراء تھی۔ اپنی اس پوٹلی کو اٹھائے ہوئے کبھی مشرق کے چکر لگاتا اور کبھی مغرب کے اصفیا کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ فیصلہ ابھی معلق تھا۔ زندگی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ اسے معمول کے انداز سے نہ جیا جائے، کچھ آسان نہ تھا۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مجھے ہالینڈ میں منعقد ہونے والی ایک ہفت روزہ بین الاقوامی ورکشاپ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جس کا مرکزی موضوع عدم تشدد تھا۔ ایک 'ریڈیکل'، 'شدت پسند' اور انقلابی نوجوان کے لیے، ذائقہ کی تبدیلی کے لیے، کسی ایسے ورکشاپ کی بڑی اہمیت تھی۔ میں نے فی الفور اس میں شرکت کا ارادہ کرلیا۔

اس بین الاقوامی ورکشاپ میں گو کہ شرکا مختلف اطراف واکناف سے آئے تھے، ان کی اغلب تعداد یورپی ممالک کے طلبا و طالبات پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو حال ہی میں اپنے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد اب مختلف رفاہی تنظیموں کے ساتھ اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے۔ جِل جو امریکہ سے آئی تھی اس نے نوٹرڈیم سے مطالعاتِ امن میں ایم اے کر رکھا تھا اور اب اگلے ماہ ہالینڈ کی ایک رفاہی تنظیم میں اہم ذمہ داری سنبھالنے والی تھی۔ نتاشا اور یوری نے روسی ٹیلیویژن میں اپنی باقاعدہ ملازمت کا حال ہی میں آغاز کیا تھا۔ نتاشا نے غضب کی آواز پائی تھی جب وہ بربط پر کوئی نغمہ چھیڑتی تو سامعین پر وجد کی ایک کیفیت طاری ہوجاتی، جی چاہتا کہ وقت یوں ہی ٹھہرا رہے اور نغمہ کبھی تمام نہ ہو۔ ٹیری جو ہم سب لوگوں سے نسبتاً عمر میں بڑا تھا نارتھ آئرلینڈ کی انقلابی تحریکوں میں خاصا وقت گزار چکا تھا، اب عدم تشدد کے راستے کو اپنانے کا خواہاں تھا۔ صوفیہ جو کبھی مشرقی جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی کی اہم کارکن ہوا کرتی تھی اب دیوارِ برلن کے انہدام کے سبب سخت ذہنی تشنج سے دوچار رہتی، وقتاً فوقتاً اس کی محزون آنکھوں سے آنسو کے دو چار قطرے ڈھلکتے دکھائی دیتے۔ للیانہ یوکرین میں رقص کی طالبہ تھی اور اسی فن کو دُنیا میں قیامِ امن کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی رقص سکھانے کی پیشکش کی مگر بات غل غپاڑوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔

ورکشاپ میں صبح سے شام تک مختلف قسم کے پروگرام ہوتے؛ کبھی کوئی معروف دانشور اور مبلغِ امن ہمارے درمیان ہوتا اور کبھی طلبا و طالبات کے چھوٹے چھوٹے گروپ باہمی حل کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ شرکا کا ذہنی اور فکری پسِ منظر گو کہ ایک دوسرے سے خاصا مختلف تھا لیکن مسلسل کئی دنوں کی مشترکہ بودوباش اور گفت وشنید نے ہمارے اندر ایک commune (خاندان) کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ کانفرنس ہال سے متصل ایک مختصر سی لائبریری تھی جہاں اس ورکشاپ کے روحِ رواں اور ہمارے میزبان ایبل

(ہابیل) انتظامی امور کی نگرانی میں منہمک رہتے۔ اب جو تکلفات کا پردہ اٹھا تو ہم نے ان کی لائبریری میں تاک جھانک شروع کی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ان کی لائبریری میں اہلِ یہود سے متعلق ویڈیو کیسٹس کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اب خالی اوقات میں میرے لیے ایک نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ پروفیسر لیبوچ، ربائی ٹیٹل باؤم، مارٹن بوبر، حنا آرنٹ، بن اہر یبزیخ، اسرائیل شحاک اور ان جیسے دسیوں یہودی اہلِ علم سے میرا پہلا باضابطہ تعارف یہیں ہوا۔ یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ سارے یہودی ریاستِ اسرائیل کے حامی نہیں ہیں بلکہ ناٹورے کارٹا فرقے کے یہودی ربائی موشے لیب ہرش تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انھیں ایک صیہونی ریاست قبول نہیں خواہ اس خیال کو عربوں کی حمایت ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ انیسویں صدی کے ایک قدآور ربائی سامسون ہرش نے تو فلسطین واپسی کی کسی بھی باضابطہ مہم کو بمنزلۂ گناہ قرار دیا ہے۔

ایک دن ایبل فرصت سے تھے، ورکشاپ کے زیادہ تر شرکا شام کی سیر کے لیے نکل چکے تھے، کچھ لوگ باہر سبزہ زار سے متصل آہنی بنچوں پر گپ شپ میں مصروف تھے، اسی دوران مخدا اپنی بیٹی شاشا کے ساتھ چائے کے لوازمات لیے لائبریری میں داخل ہوئیں اور بات ہالینڈ کے نازی ایام پر چل نکلی۔

'ایمسٹرڈم میں نہروں کے سہارے دور تک بلند و بالا مکانات کا جو سلسلہ ہے، میں ان ہی میں سے ایک گھر میں پیدا ہوا تھا، پھر نازی آ گئے اور سب کچھ بدل گیا'، ایبل نے اپنی روداد زندگی اچانک ایک سانس میں کچھ اس طرح بیان کر دی کہ پہلے تو مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس بیان کا یہ محل کیا ہے۔ پھر جو غور کیا تو ایک لمحے کے لیے اجنبیت، نامانوسیت اور خوف کی کوئی لہر ایسا لگا جیسے میرے وجود کو مس کرتی ہوئی گذر گئی ہو۔ تو کیا ایبل کا تعلق بھی اہلِ یہود کے کسی طائفے سے ہے؟ اور مخدا؟ مخدا تو اپنے آپ کو ایک قدامت پسند روایتی بشپ کی بیٹی بتاتی ہیں۔ اور یہ دونوں میاں بیوی اپنی راست بازی اور خدمتِ خلق کے کاموں کے سبب تحریکِ امن کے حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اہلِ یہود اب تک میرے لیے ایک علمی دلچسپی کا موضوع رہے تھے، اب جو اچانک ایبل کی شکل میں ایک گوشت پوست کے یہودی سے سابقہ پڑا تو، چند لمحے کے لیے ہی سہی، میں دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ بچپن سے ہی یہودیوں کی ایک منفی اور پراسرار تصویر میرے نہاں خانۂ دل میں آویزاں چلی آتی تھی۔ اب قدرت نے میرے لیے ایک ایسے یہودی سے ملاقات کا سامان کر دیا تھا جو نہ صرف یہ کہ نازیوں کی ستم گری کا چشم دید گواہ تھا بلکہ ریاست اسرائیل کا زبردست ناقد بھی۔

ایک دن لائبریری میں چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا کہ میری نظر ایک ویڈیو کیسٹ پر پڑی جس پر

لکھا تھا: Kristallnacht 50۔ پہلے تو کچھ اندازہ نہ ہوا کہ یہ کریسٹال ناخت کیا بلا ہے۔ پھر شوقِ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب اسے دیکھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ اس شبِ غم کی داستان ہے جب نازی جرمنی میں اہلِ یہود پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک پولش یہودی نوجوان نے حالات سے تنگ آ کر پیرس میں ایک جرمن سفارت کار کو گولی ماردی۔ نازی حکومت کے لیے یہودیوں کو مطعون کرنے کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ جرمن پروپیگنڈہ منسٹر نے اس واقعہ پر سخت غیض وغضب کا اظہار کیا۔ پوری جرمن قوم حکومت کی پشت پناہی میں یہودیوں سے انتقام لینے کے لیے سڑکوں پر نکل آئی۔ ۹ نومبر ۱۹۳۸ء کی شب پورے جرمنی اور جرمن قبضہ والے آسٹریا میں ایک قیامت سے کم نہ تھی۔ رات بھر جرمن قوم پرستوں کے منظم غول یہودی گھروں، عبادت گاہوں اور تجارتی املاک کو نشانہ بناتے رہے۔ دو دنوں تک لوٹ مار اور قتل وغارت گری کی کھلی چھوٹ رہی۔ آگ بجھانے والا عملہ اگر موقع واردات پر آیا بھی تو صرف اس لیے کہ آگ کو غیر یہودی علاقوں میں پھیلنے سے روکا جا سکے۔ کہتے ہیں کہ صرف ان دو دنوں میں ۹۱ یہودی قتل ہوئے، ڈھائی سو سے زیادہ سینا گوگ جلا کر خاکستر کر دیئے گئے، کوئی تیس ہزار لوگوں کو پولیس ان کے گھروں سے اٹھا کر تعذیب گاہوں میں پہنچا آئی۔ صبح اس طرح ہوئی کہ پورے ملک میں ہر طرف تباہی تھی۔ ٹوٹے شیشے، شکستہ دروازے، جلتے مکانات اور لٹے ہوئے مال واسباب کے اس منظر نامے کو دیکھ کر یہودیوں کو اس بات کا یقین آ گیا کہ اب جرمنی میں ان کا کوئی مستقبل نہیں رہا۔

کریسٹال ناخت کی پچاسویں برسی پر جو پروگرام منعقد ہوا تھا اس میں ایک یہودی ربائی مسئلہ سکوت پر وعظ فرما رہے تھے۔ بولے: عزیزانِ گرامی! کریسٹال ناخت سے تو ہمارا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ جب ہم معبد کی تباہی کے بعد بابل میں جلا وطنی کے دن گذار رہے تھے، غالباً کسی شادی کی تقریب تھی، لوگ خوشی اور مسرت سے سرشار تھے، جیسا کہ عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے، تبھی ایک مردِ دانا ان کے درمیان سے اٹھا، بولا: 'معبد تباہ ہو گیا، داؤد وسلیمان کی قائم کردہ سلطنت چھن گئی، ہم ارضِ کنعان سے نکالے گئے، جلا وطنی ہمارا مقدر بنی، پھر بھی چہروں پر اتنی مسکراہٹ، خوشی کا اس قدر احساس، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو'، یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے رکھے ہوئے شیشے کے انتہائی قیمتی اور خوبصورت گل دان کو پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ ایک زبردست چھناکے دار آواز کے ساتھ مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ 'تو عزیزو! یہ ہے وہ کریسٹال ناخت جس کا تذکرہ تلمود میں موجود ہے'۔ اور یہ جو خاموشی ہے، یہ جو سکوت ہے تو اس میں بھی بڑے معانی پوشیدہ ہیں۔ ایک خاموشی تو وہ ہے جس کا مطلب ہے رضامندی۔ آج سے پچاس سال پہلے ۹ اور ۱۰ نومبر کی تاریخوں میں قومِ یہود پر جو مظالم ڈھائے گئے اس پر پوری جرمن قوم خاموش رہی۔ یہ گویا اس بات کا اعلان

تھا کہ ہمارے قتلِ عام کو ان کی خاموش تائید حاصل تھی۔ خاموشی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے سربرآوردہ لوگ جو اپنی سماجی حیثیت اور اثر ورسوخ کے سبب پہلے مرحلے میں بچ جاتے ہیں۔ وہ اس لیے خاموش رہ جاتے ہیں کہ اگر بولے تو مصائب میں گرفتار ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ میرے بھائیو! ایسے لوگوں کی بڑی مسئولیت ہے۔ ایسے لوگ جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ رویہ کہ ہم تو بچ گئے، ہم کیوں بولیں دراصل آپ کو مجرموں میں شامل کر دیتا ہے۔ خاموشی کی ایک قسم وہ ہے جب آدمی اس لیے خاموش رہتا ہے کہ وہ غور وفکر کرے، سوچے کہ کس بحران میں پھنسا ہے اور اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہوسکتا ہے؟'۔ ابھی میں نے تلمود کا حوالہ دیا، آج کریسٹال ناخت کی پچاسویں برسی پر شکستہ شیشوں کی مہیب آوازیں ہم سے سوالی ہیں کہ ہم نے اس واقعہ سے کیا سیکھا؟ اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد اس وقت کے امریکی صدر نے ایک پریس کانفرنس کی تھی جس میں انھوں نے اس حادثے کی مذمت کی۔ کسی نے پوچھا: کیا اس نازک صورتِ حال کے پیش نظر جو یہودیوں کو جرمنی میں درپیش ہے، امریکہ اپنی ایمیگریشن پالیسی میں تبدیلی لائے گا؟ انھوں نے اس بات کی ضرورت سے صاف انکار کر دیا۔ تو بھائیو! خالی خولی ہمدردی جس کے پیچھے کچھ کرنے کا داعیہ نہ ہو وہ بھی دراصل جرم میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ اور ہاں کوئی بتائے کہ یہودی تنظیمیں اس وقت کہاں تھیں، کیا کر رہی تھیں؟ ایلی ویزل جو خود بھی تعذیبی کیمپوں میں رہے، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'جب ہولوکاسٹ ختم ہوا تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ دُنیا نے اس واقعہ سے سبق لے لیا ہے، شاید اب دوبارہ انسانوں کو اس صورتِ حال سے سابقہ پیش نہ آئے گا۔ لیکن ابھی ہولوکاسٹ کو صرف چند سال گزرے ہیں اور بہت سے لوگ یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ہولوکاسٹ واقعتاً پیش بھی آیا تھا'۔ لوگو! آؤ اس بات کا پختہ عہد کریں کہ اب دوبارہ کبھی کریسٹال ناخت نہ ہونے دیں گے۔ داؤد کی لازوال سلطنت تمھاری راہ تک رہی ہے۔ اگلے سال یروشلم میں! اے بابل کی ندیو! اگر ہم یروشلم کو فراموش کریں تو ہمارا دایاں ہاتھ تباہ ہو جائے'۔

ربائی کی تقریر میں وہی گھن گرج اور بلند آہنگی تھی جو عام طور پر ہمارے ہاں مذہبی علما کی گفتگو کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ میں نے ایبل سے پوچھا: کریسٹال ناخت کے واقعہ کو پچاس سال ہو گئے مگر ان تقریروں کو سن کر تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کا واقعہ ہو۔ اس ڈاکومنٹری میں تصویروں اور اخباری تراشوں کو بھی بڑی فنکاری سے استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۳۸ء کے نازی ایام مختلف ابعاد کے ساتھ مرصع ہو کر نگاہوں کے سامنے آ گئے ہوں۔ آخر اہلِ یہود نازی ایام کو اپنی نگاہوں کے سامنے اس قدر مستحضر کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟

بولے: ایک سبب تو یہی ہے تا کہ مستقبل میں یہ حادثہ دوبارہ پیش نہ آئے۔ لوگ چوکنّا رہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب سے ہولوکاسٹ ایک علمی اور تحقیقی موضوع کے طور پر سامنے آیا ہے اس کی جزئیات اور ذیلی محرکات کی تفصیلات میں لوگوں کی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ تعذیبی کیمپوں سے زندہ بچ جانے والوں نے جب اپنی آپ بیتیاں لکھنا شروع کی تھیں اس وقت کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ آگے چل کر ہولوکاسٹ ایک باضابطہ ڈسپلن کے طور پر سامنے آئے گا اور دُنیا بھر میں ہولوکاسٹ میوزیم کو عوامی زیارت گاہوں کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔

'سنا ہے کہ اب جرمنی میں ایک عام احساسِ تأسف پایا جاتا ہے۔ مظلومین کی یاد میں جابجا تعظیمی نشانات آویزاں کیے جارہے ہیں'۔

بولے: ہاں! ایک اعتبار سے تو یہ Never Again! بیانیے کا ایک خوشگوار پہلو ہے۔ لوگوں میں اپنی غلطیوں پر احساسِ پشیمانی عام ہے۔ اوشوٹز جیسی بدنام زمانہ تعذیب گاہوں کی باقیات اور ان کی عوامی زیارتوں سے بھی مسلسل یہ پیغام عام ہورہا ہے کہ ظلم قوموں کے ضمیر پر گہرا داغ چھوڑ جاتا ہے۔ البتہ ظلم و ناانصافی کے خلاف اس یہودی بیانیہ نے رفتہ رفتہ ایک کلٹ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہم صرف اپنے ظلم پر نوحہ کناں ہیں، اس کی یاد میں میوزیم قائم کرتے ہیں اس میں فی نفسہٖ کوئی برائی بھی نہیں، لیکن ہم دوسروں پر ہونے والے ظلم کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔

یہ تو آپ نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ کیا اہلِ یہود میں اور بھی ایسے اہلِ فکر ہیں جو Never Again! والے بیانیے کو گروہی تنگ نظری پر محمول کرتے ہیں؟

بولے: ہاں! یہ بات تو بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ہم اہلِ یہود جو اپنے معبد کے قیامِ نو کے نعرے کے ساتھ اٹھے تھے، ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر تو نہ کر پائے البتہ ہم نے ہولوکاسٹ میوزیم کی شکل میں نئے دور کا معبد ضرور تعمیر کرلیا جہاں چیف ربائی کی مسند پر بڑی شان کے ساتھ Elie Weizel متمکن چلے آتے ہیں۔

'ایلی ویزل؟ دی نائٹ والے؟ انھیں تو ادب کا نوبل انعام بھی ملا ہے'، میں نے ایلی ویزل سے اپنی واقفیت جتانے کی کوشش کی۔

بولے: ایلی ایک اچھے ادیب ہیں، میں ان کے فن کا قائل ہوں مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اپنے قومی اور ملی حوادث کا درد تو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن دوسری قوموں کے آلام و مصائب پر کیوں نہیں تڑپتے؟ میں نے نہیں دیکھا کہ کبھی انھوں نے فلسطینیوں پر روا رکھے جانے والے مظالم پر کلمۂ

اف بھی کہا ہو۔ حالانکہ یہودیوں میں اور بھی ادیب وشاعر ہیں جو ریاست اسرائیل کی سخت تنقید کرتے رہے ہیں۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہا کہ ریاست اسرائیل میں فلسطینی 'نئے یہودی' بن گئے ہیں اور ہم اہلِ یہود نے نازیوں والا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ کلمۂ حق کہنے والے لوگ ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مگر ایلی ویزل جو ایک بڑے ادیب ہیں، نوبل انعام یافتہ ہیں، انھیں ریاستِ اسرائیل کی غلط کاریاں نظر نہیں آتیں۔ یہ بڑا افسوسناک پہلو ہے۔

'آخر ایسا کیوں ہے؟'، میں نے پوچھا۔

بولے: 'کلمۂ حق کہنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اپنی قوم کے خلاف زبان کھولنا جو آپ کو کاندھوں پر اٹھائے پھرتی ہو۔ کلمۂ حق کہنے والے لوگ حاشیہ پر چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ چلتے ہیں وہی اعزاز واکرام سے نوازے جاتے ہیں۔ ایسا ہر قوم اور ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔ یہ بڑے بڑے نام جو تم دیکھتے ہو جن کی توقیر میں لوگ پلکیں بچھاتے ہیں، حکومتیں ان کی پشت پناہی کرتی ہیں تو اس کا سبب بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ حضرات دانستاً پورا سچ نہیں بولتے۔ اور سچ جب تک کامل نہ ہو، اسے بلا خوف لومتہ لائم نہ بولا جائے، اس پر جھوٹ کا شائبہ ہوتا رہتا ہے'۔

ایبل کی باتوں میں میرے لیے چونک کا بڑا سامان تھا۔ ایلی ویزل میرے ممدوح تھے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری نظر میں ان کا بڑا مقام تھا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ نازیوں کے جرائم کو دُنیا کے سامنے بے نقاب کرنے والے ایلی ویزل مسئلہ فلسطین پر نہ صرف یہ کہ خاموش رہے ہیں بلکہ وہ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ ریاست اسرائیل کے ساتھ کھڑے ہیں۔

سچ بولنا کیا واقعی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے؟ اب جو میں نے اپنے اردگرد اہلِ تقویٰ پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ پورا سچ تو شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ خاص طور پر وہ لوگ جنھیں مسلم عوام اپنے سروں پر اٹھائے پھرتے ہیں، جن کے ہٹو بچو کے گرد تقدس کا ایک ہالہ قائم ہے اور جن کے بیرونی اسفار سے ان کی شخصیت کا قد وکاٹھ متعین ہوتا ہے، ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنی غیر مشروط وفاداری مختلف مسلکی گروہوں اور ان کے سرپرست حکمرانوں کے ہاتھوں رہن رکھی ہوئی ہے۔ کوئی سعودی بلاک کا حمایتی ہے تو کسی نے ایرانی انقلاب کی حمایت کا علم اٹھا رکھا ہے۔ ان کے پاس اپنے دلائل ہیں لیکن کوئی بھی اپنی ممدوح حکومتوں کے خلاف کلمۂ حق کہنے کا یارا نہیں رکھتا۔ بلکہ ان میں سے بیشتر حضرات تو اتنی ہمت بھی نہیں جٹا پاتے کہ اپنے بیرونی سفر کے دوران ذرائع ابلاغ میں اپنے مظلوم ہندوستانی بھائیوں کا مقدمہ رکھ سکیں۔ خود ہندوستان میں ان کی زبانیں مشکل ہی سے کھلتی ہیں۔ مجھے مرادآباد کے قتلِ عام کے بعد دہلی میں منعقد ہونے والا مسلم مجلسِ مشاورت کا وہ جلسہ

یاد آیا جس کی روداد حلیم بھائی نے سنائی تھی۔ مسلم لیڈران مرادآباد کے فوری دورے کے لیے تیار نہ تھے تا آنکہ انھیں وزیراعظم اندرا گاندھی کی ایما حاصل ہوگئی۔ اور گئے بھی تو اس طرح جیسے کوئی رسم پوری کرنے آئے ہوں۔ نہ متاثرہ علاقوں کا دورہ، نہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کی کوئی اسکیم اور نہ ہی ظالموں کے خلاف مقدمے قائم کرنے کی کوئی کوشش۔ ہاں لکھنؤ میں ایک بڑا جلسہ ضرور ہوا جس میں سیاسی لیڈروں کی گل افشانی گفتار سے ایسا لگا جیسے اس ملک میں مسلمان غیر محفوظ نہیں ہیں۔ مجھے نیلی کا قتلِ عام بھی یاد آیا؛ وہ جانوروں کی طرح غریب اور بے بس مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ہانک کر لایا جانا اور انھیں ہزاروں کی تعداد میں تہہ تیغ کیا جانا۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کے سیاسی لیڈران کی زبان گنگ رہی، علمائے حق کے خیموں میں بھی کوئی ہلچل دکھائی نہ دی۔ ہاشم پورہ کا قتل عام بھی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا اگر اس موقع پر وبھوتی نرائن جیسے فرض شناس پولیس آفیسر نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی۔ ہمارے علما و قائدین تو ہمیں یہی بتاتے رہے کہ ہندوستان میں اسلام آزاد اور مسلمان محفوظ ہیں۔ ملک میں سیکولر جمہوریت قائم ہے اور ہم مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ہم اس ملک میں سیکولرازم کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے کام کرتے رہیں۔

میں نے سوچا آدھا سچ تو واقعی بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ آدھا سچ مظلوم فلسطینیوں کی آہ و کراہ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا، آدھا سچ سیکولرازم کی تعذیب گاہ میں موت موت زندگی جینے کو قابلِ تحسین قرار دیتا ہے، آدھا سچ مصلحت اور حکمت کے نام پر ہمیں مداہنت کا خوگر بناتا ہے۔ جھوٹ کی شناعت تو ہر خاص و عام پر عیاں ہوتی ہے مگر مقدس ہستیوں کے آدھے سچ کو شکست دینا کچھ آسان نہیں ہوتا۔

کریسٹال ناخت کی ویڈیو دیکھتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ جو قومیں اپنی صورتِ حال کا صحیح تحلیل و تجزیہ کر لیتی ہیں اور جو بروقت کسی وقوعہ کا کوئی مناسب نام بھی دے لیتی ہیں ان کے لیے صورتِ حال کی نزاکت پر مطلع ہونا اور پھر اس وقوعہ کو دوبارہ نہ ہونے دینا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنی مصیبتوں کا نہ تو صحیح تجزیہ کر سکیں اور نہ ہی اسے کوئی مناسب نام دے سکیں وہ بھلا اس صورتِ حال سے کیسے باہر آ سکتے ہیں۔ کریسٹال ناخت گو کہ نازیوں کا عطا کردہ نام ہے۔ اہلِ یہود نے شکستہ شیشے کی اس رات کو اپنی آہ و بکا اور نالہ و شیون سے کچھ اس طرح بھر دیا کہ اب ہر سال اس واقعہ کی یاد منانے والوں کو وہ شبِ وحشت اپنی تمام ابعاد کے ساتھ نگاہوں میں مرصع ہونے لگتی ہے۔ مجرمین کٹہرے میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں، ہر طرف سے Never Again! Never Again! کی صدائیں بلند ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ہم ہندوستانی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہم اپنے قومی اور ملی حوادث کا نہ تو صحیح تجزیہ کر پاتے ہیں اور نہ ہی اسے کوئی مناسب نام دے پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ قتلِ عام اور نسلی انخلا کے بڑے بڑے واقعات پر

'فساد' جیسے بے ضرر لفظ کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ جرمنی کا کریسٹال ناخت تو صرف دو دنوں پر مشتمل تھا، بھاگلپور میں تو پورے دو ماہ تک شب و روز کریسٹال ناخت جیسی صورتِ حال رہی۔ گاؤں کے گاؤں مسلمانوں سے خالی ہو گئے۔ ہزاروں خانماں برباد مسلمان در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے جنھیں آج تک کوئی ٹھکانہ نہ مل سکا۔ حکومتیں بدلیں مگر مسلمانوں کی اشک شوئی کی کسی کو توفیق نہ ہوئی خود مسلم قیادت نے امن عامہ اور باہمی خیر سگالی کے نام پر صورت حال سے سمجھوتہ کرلیا۔

میں نے بہت سوچا کہ ہم اپنے مصائب و حوادث کو، جن سے منقسم ہندوستان میں ہم مسلسل دوچار ہوتے آ رہے ہیں، کوئی ڈھنگ کا نام کیوں نہیں دیتے؟ خیال آیا کہ 'قتلِ عام' ہو یا 'نسلی تطہیر'، جبری انخلا کا معاملہ ہو یا ریاستی دہشت گردی کا عذاب، یہ سارے الفاظ مشترکہ طور پر بھی اس صورتِ حال کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں ایسا لگا کہ ہم ہندوستانی مسلمان گذشتہ برسہا برس سے ایک bottomless pit میں گرتے جا رہے ہوں اور ہر لمحہ ہمارے گرنے کی رفتار اور زندگی کے عذاب میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہو۔ ذرا یہ سلسلہ رکے تو اسے کوئی مناسب نام دیا جائے۔

مرادآباد، نیلی اور 'میروت' کی طرح بھاگلپور کریسٹال ناخت کی یادیں ہمارے اجتماعی حافظے سے محو ہوتی گئیں۔ ریاست کا جبری انتظامی چکّہ بے بس مسلمانوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس دوران عین دن کی روشنی میں، ذرائع ابلاغ کے کیمروں کے سامنے، بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ بھی پیش آیا۔ آگے چل کر ۲۰۰۲ء میں گجرات میں ایک بار پھر ہم کریسٹال ناخت جیسی صورتِ حال سے دوچار ہوئے جس میں دو ہزار سے زیادہ مسلمان تاراج ہوئے، سیکڑوں زندہ جلا دیئے گئے مگر کریسٹال ناخت کے لفظ تک کسی کا ذہن نہ گیا۔ پہلی بار ۲۰۲۰ء کے دہلی 'دنگوں' کے موقع پر کریسٹال ناخت کا لفظ اس وقت سننے میں آیا جب کیمبرج یونیورسٹی کی ایک جواں سال لیکچرر پریا گوپال نے اپنے ایک ویڈیو پیغام میں دُنیا کو متنبہ کیا کہ دہلی میں مسلمانوں کو جس صورتِ حال کا سامنا ہے وہ کوئی ہندو مسلم فساد نہیں بلکہ یہ کریسٹال ناخت کی وہی صورتِ حال ہے جو نازی جرمنی میں یہودیوں کو پیش آئی تھی۔ بھاگلپور کے سانحہ سے دہلی کے قتلِ عام تک تیس سال کا عرصہ گذرا تب کہیں جا کر ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات کا اندازہ ہو سکا کہ انھیں اس ملک میں جس صورتِ حال کا سامنا ہے اس کے لیے مناسب لفظ فساد نہیں بلکہ کریسٹال ناخت ہے، ایک ازلی اور ابدی کریسٹال ناخت۔

۵۰

حبِ کلام

ہالینڈ کے بعد اب ہماری اگلی منزل انگلستان تھی۔ ادھر جب سے یورپ میں آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا تھا لندن کو میرے بین الاقوامی اسفار میں کچھ وہی مرکزیت حاصل ہوگئی تھی جو عالمِ اسلام کے سفر میں جدہ اور ریاض کو حاصل تھی۔ ان دنوں یہ خیال عام تھا کہ عالمِ اسلام کے حبس زدہ ماحول کے برعکس لندن میں ہر قسم کی کھلی اور بے لاگ گفتگو کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ معتدل اور جمہوریت پسند اخوانی قائدین سے لے کر حزب التحریر کے جوشیلے نوجوان، برطانوی یونیورسٹی کیمپسوں کو اپنی تگ و تاز کا خاص میدان سمجھتے۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا جب کسی نہ کسی بہانے میں لندنستان میں اپنے اسلامی دوستوں کی مجلسوں کا حصہ نہ ہوتا۔ سوچا کیوں نہ اس بار بس کے ذریعہ لندن کے سفر کا لطف لیا جائے۔ اس طرح دورانِ سفر رود بارِ انگلستان کی سیر کا موقع بھی مل جائے گا۔

ڈن ہاخ سے بلجیم اور فرانس کی سرحدوں سے گذرتی ہوئی ہماری بس شام ڈھلے ساحلِ سمندر تک پہنچی جہاں ایک بحری جہاز ہمارا منتظر تھا۔ ابھی ایمگریشن کی قطار سے نکلا ہی تھا کہ میری نظر ڈاکٹر ہیری پر پڑی جو میری طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ انھیں اچانک اس طرح دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پتہ چلا کہ وہ بوداپاسٹ میں کسی کانفرنس میں شرکت کے بعد اپنے رفقا کے ساتھ لندن کو لوٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہیری سے میری پہلی ملاقات چند برس پہلے لندن کی ایک جنگ مخالف کانفرنس میں ہوئی تھی جہاں یہ ورلڈ پاسپورٹ کا اسٹال لگائے بیٹھے تھے۔ محض دس پاؤنڈ ادا کیجیے اور مستقبل میں وجود میں آنے والی عالمی حکومت کے شہری بن جائیے۔ شنید ہے کہ اس خیال کے ابتدائی موسس گیری ڈیوس نے جب ایک عالمی شہریت کا تصور وضع کیا تھا تو ان کی اس خیالی دُنیا اور اس کے پاسپورٹ کے اجرا کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا تھا لیکن ڈیوس ان مخالفتوں سے بددل نہ ہوئے، انھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس بارے میں آرتھر کینینگس، جنھوں نے آگے چل کر ڈیوس کی زندگی پر ایک مرقع فلم بنائی، نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ بقول کینگس: اس میں شبہ نہیں کہ ورلڈ پاسپورٹ کا اجرا بادی النظر میں ایک مذاق معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بات تو دُنیا کے تمام

پاسپورٹ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔(بھلا خدا کی زمین پر انسانوں کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی نقل و حرکت پر روک لگائے)۔بقول کینگس: ان کا جاری کردہ پاسپورٹ ہمارے اوپر ایک تمسخر ہے اور ہمارا پاسپورٹ ان کے نظام پر ایک طمانچہ۔

ہمارے ایک دوست ہیں پروفیسر گلین مارٹن، انھوں نے بھی ایک عبوری عالمی پارلیمنٹ بنا رکھی ہے جس کے اجلاس وقتاً فوقتاً دُنیا کے مختلف شہروں میں ہوتے رہتے ہیں۔ایک بار نینی تال میں منعقدہ ایک اجلاس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔دُنیا بھر سے مستقبل کے شہری یہاں جمع تھے۔اس موقع پر نئی عالمی کرنسی ارتھ ڈالر کا اجرا ہونا تھا۔شرکا میں غیر معمولی جوش وخروش پایا جاتا تھا۔تبھی سخت حفاظتی حصار اور التزام کے جلو میں چند آہنی صندوقچے کچھ اس شان سے لائے گئے کہ مجلس میں ہلچل کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ باری باری جب شرکا کے ہاتھوں میں مستقبل کی کرنسی تھمائی گئی اور مستقبل کی عالمی حکومت کے رجسٹروں میں باقاعدہ اس کے اندراج کے بعد ہمارے دستخط لیے گئے تو اس موقع پر پارلیمنٹ کی خزانچی یوجین المن کی مسرت دیدنی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے مستقبل کی عالمی حکومت کے قیام کو بس اب چند لمحے رہ گئے ہوں۔ڈاکٹر ہیری سے میں جب بھی ملا اس بات کا شدید احساس ہوا کہ سرمایہ دارانہ شکنجے سے بچ نکلنے کا امکان ابھی باقی ہے اور یہ کہ ابھی بہت سے نیک نفسوں نے نظامِ جبر کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم نہیں کی ہے۔

جہاز کی پہلی منزل پر مختلف قسم کے ریستوراں اور خورد و نوش کی دکانیں تھیں، بچوں کی دلچسپی کے لیے مختلف قسم کے کھیل کود کے آلات اور ہاؤ ہو کی موسیقی کا بے ہنگم شور، گویا ایک محشر بپا تھا۔ بالائی منزل نسبتاً پرسکون تھی جہاں ہم لوگوں نے مجلس جمائی۔جب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر جم گئے تو خیال آیا کیوں نہ ایک چکر عرشے کا لگایا جائے کہ سمندر کا اصل لطف تو عرشے پر ہی محسوس ہوتا ہے۔عرشے پر شائقین کی تعداد خاصی کم تھی۔نسبتاً نیم تاریک گوشے میں ایک بنچ پر قبضہ جمایا اور عشا کی نماز میں مشغول ہو گیا۔اوپر کھلا آسمان، نیچے لہروں کا طلاطم خیز شور اور یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے۔سمندر کی مہیب اور پراسرار وسعت کے مقابلے میں آج پھر اپنی کشتی بہت چھوٹی اور بے وقعت سی لگی۔کچھ دیر ان ہی مناظر میں کھویا رہا۔پھر نہ جانے کب ایک اونگھ سی طاری ہو گئی۔کیا دیکھتا ہوں کہ ابّا اسی بنچ کے دوسری جانب کچھ اس طرح ٹیک لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کی پیٹھ میری جانب ہے، دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی ٹھوڑی کو اس طرح سہارا دے رکھا ہے جیسے کسی گہری فکر میں ہوں۔دفعتاً ان کی زبان پر یا مسبب الاسباب کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔'بارِ الٰہا! اس ڈوبتے جہاز کو بچا لے، یلغار چوطرفہ ہے اور تیرے علاوہ کوئی اور سہارا نہیں، کوئی اور ہمارا نہیں۔' پھر ان گریہ و زاری میں من ذریتی من ذریتی کی تکرار سنائی دیتی ہے، اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

ابا کو اس قدر مضطرب اور پریشان دیکھ کر میں بے چین ہو اٹھا۔ میں نے سوچا نہ جانے اب کون سی مصیبت آنے کو ہے۔ پتہ نہیں یہ کس بات کا اشارہ ہے۔خواب ہو یا بیداری، عالمِ رویا ہو یا عالمِ عمل، مشکل کی ہر گھڑی میں ابّا میری پشت پناہی میں کھڑے ہو جاتے۔ان کی موت کے بعد بھی یہ سلسلہ رکا نہیں۔ ایک بار مکان کی تزئینِ نو کے بعد بہت سے پرانے اسباب اور کاغذات کی فائلیں تلف کرنے کے خیال سے باہر ڈال دی گئی تھیں۔ اسی دوران ابّا ایک دن غیر متوقع طور پر وارد ہوئے۔ فرمایا: ان فائلوں کو نہ پھینکو۔ دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان میں بعض دستاویزی نوعیت کی چیزیں اور اہم شخصیات سے مراسلت کی فائلیں شامل تھیں جو ان کی بروقت مداخلت سے تلف ہونے سے بچ گئیں۔ ابّا خواب میں بیداری کی باتیں کرتے اور عالمِ بیداری میں ہمیں خواب دیکھنے پر لگائے رکھتے۔ان کے ہاں خواب اور بیداری کے مابین فاصلہ خاصا کم تھا۔ ایک بار حج سے فراغت کے بعد سیر و تفریح کی غرض سے انھیں جدہ میں بحرِ احمر کے ساحلوں پر لے گیا۔ دیر تک سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پوچھنے پر پتہ لگا کہ اس سے پہلے یہ مناظر انھوں نے صرف خواب میں دیکھے تھے، عالمِ مشاہدہ میں پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔خواب کا ان کی زندگی میں بڑا دخل تھا بلکہ انھوں نے خواب ہی کے ذریعہ ہماری زندگیوں میں بھی ایک روزن کھول رکھا تھا۔

کچھ دیر میں ہمارا جہاز آبنائے ڈوور کے ساحل سے آلگا۔ ابھی ڈوور سے لندن کا سفر باقی تھا۔ میں نے قریب کی دکان سے گرما گرم کافی خریدی، برطانوی روزنامہ گارڈین کا تازہ شمارہ لیا اور بس میں اپنی نشست پر آبیٹھا تاکہ کافی کے ساتھ اخبار بینی کا لطف لیا جا سکے۔ اب جو خبروں پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ ابّا کی بے چینی بلا سبب نہیں تھی۔ وطنِ عزیز میں ہندوستانی مسلمانوں کو جس ہلا مارنے والی صورتِ حال کا سامنا تھا، وہی کیا کم تھا کہ اب عراقی فوج نے کویت پر حملہ کر دیا جس کے سبب پورے شرقِ اوسط میں ایک غیر یقینی کی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ادھر کچھ دنوں سے میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر ایک ملک گیر کنونشن کے انعقاد کی سوچ رہا تھا، اب خلیج کی الجھتی صورتِ حال اس بات کی طالب تھی کہ بین الاقوامی مسائل کو بھی قومی تناظر سے الگ نہ سمجھا جائے۔

لندن میں ان دنوں میرا قیام شیخ عبد الخالق کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ شیخ غیر معمولی خوبیوں کے مالک تھے، ورع اور تقویٰ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کے اندر ایک مضطرب روح تھی جو غلبۂ حق کے لیے نت نئے راستے کی تلاش میں رہتی۔ انھوں نے عرب و عجم کے کبار علما کی صحبتیں اٹھائی تھیں مگر معتقد وہ کسی کے نہ بن پائے تھے۔ اور ان کی شاید یہی خوبی ہماری دوستی کی بنیاد بن گئی تھی۔ ایک دن کہنے لگے ہندوستانی علما کی جامد حنفیت بلکہ ان کا سڑا تقلیدی طرز فکر انھیں ایک نئی ابتدا سے روکتا ہے۔ اس معاملے میں سعودی اور

اخوانی علما ہم سے کہیں آگے ہیں۔ ہم نے نفقہ مطلقہ کی حنفی تعبیر کو جس طرح مدارِ دین قرار دے رکھا ہے اور اس بارے میں متبادل تعبیرات کو صرف اس لیے سننا نہیں چاہتے مبادا ہمارا اتحاد جاتا رہے تو یہ سب کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ اب سنا ہے کہ عرش سے فرش تک مسجد کی بات ہو رہی ہے۔ دیکھیے اس تحریک کا کیا حشر ہوتا ہے۔

'جی ہاں! جن دنوں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے اس قسم کے بیانات آرہے تھے کہ مسجد جہاں ایک بار بن گئی وہ جگہ قیامت تک کے لیے مسجد ہی رہتی ہے، فرش سے عرش تک مسجد۔ ان دنوں میں نے بورڈ کے صدر کو متعدد خطوط لکھے تھے کہ خود فقہ حنفی میں عرش سے فرش تک اور مسجد کی جگہ کو قیامت تک کے لیے مسجد قرار دینے کا کوئی دائمی کلیہ موجود نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے ایک دوسرے شاگرد امام محمدؒ اس بات کے قائل ہیں کہ مسجد اور اس کے متعلقات کسی وجہ سے ویران ہو گئے ہوں تو ایسی صورت میں اسے اور اس کے تعمیری لوازمات کو دوسری جگہ منتقل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ پھر یہ عرش سے فرش تک مسجد کی بات کن بنیادوں پر کہی جا رہی ہے؟ مگر اس وقت بھی کسی نے میری ان معروضات پر توجہ نہ دی۔

بولے: اس وقت آپ کی بات کون سنے گا خاص طور پر جب دونوں طرف سے طبلِ جنگ بج چکا ہو۔ ہر ہر مہادیو کے مقابلے میں تو عرش سے فرش تک کا نعرہ ہی کارگر معلوم پڑتا ہے۔ ویسے سننے میں آرہا ہے کہ مولانا علی میاں صاحب اور کانچی پورم کے شنکر آچاریہ کے بیچ، حکومت کی سرپرستی میں کوئی بات چل رہی ہے، کیا عجب کہ باہمی افہام و تفہیم کی کوئی راہ نکل آئے۔

مولانا علی میاں اس وقت ایسی پوزیشن میں تو ہیں کہ ایک فیصلہ کن رول انجام دے سکیں۔ حکومت ان کا وزن محسوس کرتی ہے۔ پچھلے کئی وزرائے اعظم خاص طور پر مسز اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی سے ان کے ذاتی مراسم رہے ہیں۔ اندرا تو ایمرجنسی میں اپنی انتخابی شکست کے بعد ان کے ہاں آشیرواد لینے بھی جا چکی ہیں اور کانچی کے شنکر آچاریہ سے اس ملاقات کے پیچھے بھی وزیر اعظم وی پی سنگھ کا ذہن کام کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ منظر نامے میں مولانا کی اہمیت مسلّم ہے۔ مگر مولانا کی مرنجاں مرنج شخصیت اس بات کی متحمل نہیں ہوگی کہ وہ اس قسم کے حساس مسئلہ پر اپنی صوابدید سے کوئی فیصلہ لے سکیں۔

آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟ انھوں نے پوچھا۔

دیکھیے! مولانا کا جو مزاج ہے، جہاں تک میں نے انھیں سمجھا ہے، وہ کسی بھی فریق سے ٹکراؤ مول نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے بابری مسجد کے قائدین کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑا ہونا اور اپنے موقف کو منوا لینا آسان نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں کی شخصیت میں کونے نہیں ہوتے، صرف گولائی ہوتی ہے۔ وہ دشمن نہیں

بناتے کہ یہی ان کی خوبی ہوتی ہے اور یہی ان کی کمزوری بھی۔ ایسے لوگ تاریخ کا رخ نہیں موڑتے بلکہ ان کی ساری قوت جاری صورتِ حال کو برقرار رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی مولانا تحریر وتقریر کے آدمی ہیں۔ حبِّ کلام سے قوموں کی قسمتیں نہیں سنورتیں۔

'حبِّ کلام؟' شیخ عبدالخالق نے وضاحت چاہی۔

مکہ میں ہمارے ایک دوست ہیں محمد ناصر۔ بڑے ہی لائق و فائق اسکالر ہیں، رابطہ کے انگریزی جرنل کے مدیر ہیں، انھوں نے ایک بار مولانا سے پوچھا: آپ پابندی سے رابطہ کے پروگراموں میں آتے ہیں، بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں حالانکہ ان جلسوں سے امت کی صورتِ حال میں کسی تبدیلی کی توقع نہیں ہوتی؟ بقول محمد ناصر: مولانا نے فرمایا: ارے بھئی! حبِّ کلام بھی ایک چیز ہوتی ہے۔

'اس وقت امت کو حبِّ کلام کی نہیں بلکہ جرائتِ اظہار کی ضرورت ہے، شیخ عبدالخالق نے کہا۔

مولانا ہم دونوں کے ہی ممدوح تھے۔ ان کی راست بازی اور تقویٰ شعاری کا ہمارے دل ودماغ پر گہرا اثر تھا۔ البتہ اس وقت یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں اپنی چلت پھرت کے باوجود وہ مسلم مسائل پر کوئی ٹھوس اور جاندار موقف کیوں نہیں اپناتے؟ حالانکہ ان کے پیچھے عوامی حمایت بھی ہے اور مسز گاندھی سے لے کر راجیو گاندھی اور وزیر اعظم وی پی سنگھ سبھی ان کا احترام کرتے رہے ہیں۔ میرے لیے یہ بات بھی سمجھنا مشکل تھی کہ مرادآباد میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد انھوں نے مرادآباد کا جو دورہ کیا تھا اس موقع پر بے بس مسلمانوں کی طرف سے قانونی چارہ جوئی اور ان کی اشک شوئی کی کوئی ٹھوس کوشش کیوں نہیں کی اور ساری توجہ اگلے مہینے لکھنؤ میں پیامِ انسانیت کے اجلاس پر کیوں مرکوز کر دی؟ مرادآباد کے بعد نیلی میں مسلمانوں کو تاراج کیا گیا، پھر ہاشم پورہ اور ملیانہ کے لرزہ خیز واقعات پیش آئے، بھاگلپور سے مسلمانوں کے انخلا کی کوشش ہوئی۔ یہ سب کچھ عین حکومت کی سرپرستی میں ہوا اور طرفہ یہ کہ ان تمام حوادث کے بعد بے بس مسلمانوں کو ہی جھوٹے مقدمات میں پھنسایا گیا۔ مجرم آزاد دندناتے رہے۔ اگر ہماری قیادت نے ان سانحات کے معاً بعد سخت موقف اپنایا ہوتا یا منظم اور منصوبہ بند طریقے سے مجرمین کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی ہوتی تو ان کے لیے ایک کے بعد دوسرا 'فساد' برپا کرنا شاید اتنا آسان نہ ہوتا۔ پھر ہماری ملی قیادت نے محض جلسے جلوس، تقاریر و بیانات اور وزیر اعظم سے ملاقات کو ہی کافی کیوں سمجھا؟ میں اس بارے میں جتنا بھی سوچتا مجھے یہ عقدہ لاینحل معلوم ہوتا۔

ان واقعات کو چند برس گذرے۔ اس دوران مولانا علی میاں کی خودنوشت کاروانِ زندگی کی مختلف جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ ان مجلدات میں مولانا نے مرادآباد کے اپنے دورے کا ذکر کیا اور اس صورتِ

حال کے ازالے کے طور پر لکھنؤ میں پیامِ انسانیت کنونشن کے انعقاد کی بات کہی اور اعترافاً یہ بھی لکھ گئے کہ اس کنونشن کے ذریعہ انھیں اپنی نحیف آواز کو ذرا بلند آہنگی کے ساتھ پہنچانے کا موقع ملا اور بڑی صفائی سے یہ بات بھی کہہ دی کہ 'اس سے زیادہ اپنے اختیار میں کچھ نہیں'۔ انھوں نے مسز اندرا گاندھی سے اپنی ملاقاتوں اور مراسلت کی تفصیلات اور ان کے اس دورے کی رودادِ شوق لکھی جب وہ ازخود عید کے دوسرے دن ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر رائے بریلی پہنچیں اور خواتین سے ملنے کے لیے گھر کے اندر بھی گئیں تا کہ مستورات کو سلام پیش کریں۔ (ج ۲، ص ۲۲۸) انھوں نے راجیو گاندھی سے اپنی 'بے تکلف' اور 'بار بار' کی ملاقاتوں اور ان کے 'شریفانہ طرزِ عمل'، ان کی 'حقیقت پسندی' اور ان کی 'اخلاقی جرأت' کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھا۔ (ج ۵، ص ۳۳) البتہ ریکارڈ کی درستگی کے لیے یہ وضاحت بھی کر دی کہ 'بھاگلپور فساد کے بعد مسلمانوں کے جذبات اتنے برانگیختہ تھے کہ خصوصی مجلسوں میں بھی کانگریس کی حمایت میں بولنا دشوار ہو گیا تھا اور خود بھی حکومت کی تائید کے سلسلے میں وہ یکسوئی اور شرح صدر باقی نہیں رہا تھا جو بالعموم کانگریسی حکومت کے لیے رہا ہے'۔ (ج ۴، ص ۱۴۹)۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس فساد کے بعد راجیو گاندھی نے بہار کا دورہ کیا تھا اور انھوں نے خاطی پولیس افسروں کو سزا دینے کے بجائے متہم اور برطرف شدہ افسران کو دوبارہ بحال کر دیا تھا اور بقول مولانا علی میاں اس بات کی شہرت 'ریاست میں اور ریاست سے باہر پھیل گئی جس سے مرکزی حکومت کے اس تغافل اور تساہل کا مسلمانوں کو اور بھی احساس ہوا'۔ (ج ۴، ص ۱۴۸)۔ ان مجلدات کی ورق گردانی کرتے ہوئے بھی میرے لیے یہ عقدہ لاینحل ہی رہا کہ جن وزرا اعظم کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین رہے ہوں اور جن کی سفا کی اور سنگ دلی کے شواہد خود مولانا نے اپنی کتاب میں فراہم کیے ہوں ان کی 'اخلاقی جرأت' اور 'شریفانہ طرزِ عمل' کے آخر وہ اس قدر کیوں قائل ہیں اور ان ظالموں سے اپنی راہ ورسم کو اتنی اہمیت کے ساتھ کیوں بیان کرتے ہیں؟

۵۱

گول کونے

ایک دن SOAS لائبریری کی زیریں منزل میں، جہاں اہلِ یہود کی فقہی، سماجی اور سیاسی تحریکوں پر کتابوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، ایک نوجوان یہودی اسکالر سے ملاقات ہوگئی۔ گفتگو کا سلسلہ جب آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ ان کا نام زَکَری ہے اور یہ صاحب نازی ایام کے حوالے سے اہلِ یہود کی قیادت پر کوئی تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے میں نے پوچھا: کیا کوئی خاص لیڈر یا مصنف آپ کے محورِ تحقیق میں ہے یا آپ کے پیشِ نظر محض اس عہد کی اجمالی صورتِ حال کا جائزہ لینا ہے؟ بولے: ہاں! ایک صاحب ہیں اسٹیفن وائز، شاید آپ ان سے واقف نہ ہوں۔

وائز (عقلمند) سے بھلا کون واقف نہ ہوگا، ویسے بھی ہم لوگ عقل وحکمت کی تلاش میں رہتے ہیں، ہمارے رسول کا کہنا ہے: **الحکمة ضالة المومن فحیث وجدها فهو احق بها** یعنی حکمت مومن کی متاعِ گمشدہ ہے سو جہاں بھی اسے پائے وہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ اسٹیفن وائز کے تذکرے کے بغیر شوا یعنی ہولوکاسٹ کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ بڑا دبدبہ رہا ہے ان کا اپنے زمانے میں، اور صدر روزویلٹ تو ان کا خاص احترام کرتے تھے۔

میری زبان سے شوا (ہولوکاسٹ کا عبرانی متبادل) کا لفظ سن کر اور اسٹیفن وائز سے میری واقفیت جان کر زَکَری کے چہرے پر مسرت اور حیرت کے آثار طلوع ہوئے اور بات مسکراہٹوں کے تبادلے پر ختم ہوگئی۔

اگلے دن وہ مجھے لنچ پر کیفے ٹیریا کی قطار میں نظر آ گئے۔ خیال آیا زَکَری اہلِ یہود کی قیادت پر لکھ رہے ہیں، کیوں نہ ان سے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ان کے ہاں قیادت کا حال ہم سے کس قدر مختلف ہے۔ مجھے کرسٹل ناخت کا وہ ویڈیو بھی یاد آیا جس میں، میں نے ایک ربائی کو بڑی شدت کے ساتھ یہ سوال اُٹھاتے ہوئے سنا تھا کہ جب جرمنی اور اس کے قبضے والے علاقوں میں یہودیوں کو ہولوکاسٹ کی صورت حال درپیش تھی اس وقت یہودی قیادت کہاں تھی؟ ان کی تنظیمیں کیا کر رہی تھیں؟ اس سے پہلے کہ میں کوئی

پیش بندی کرتا زَکَری نے خود ہی اس بات کا تذکرہ چھیڑ دیا کہ وہ اگلے ہفتہ اسٹیفن وائز کے متعلق دستاویز کے مطالعے کے لیے نیو یارک کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا: امریکہ میں یہودی قیادت تو اس وقت بھی بڑی بااثر تھی، پھر وہ نازیوں کے مقابلے میں اپنے ہم قوموں کی مدد کیوں نہ کر پائی؟ میرے اس سوال پر وہ اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ بولے: مجھے اس سلسلے میں اسٹیفن وائز کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط دیکھنے ہیں جو انھوں نے اپنے عہد کے دوسرے یہودی لیڈروں اور بعض حکومتی عہدے داروں کو لکھے تھے، اور جن کے حوالے جابجا نظر آتے ہیں۔ میری تو یہی رائے ہے کہ ہمیں دراصل ہماری قیادت نے ڈبویا ہے۔ اگر ہمارے لیڈروں نے خواہ وہ جرمنی میں رہے ہوں یا امریکہ میں، اگر ان لوگوں نے بزدلی اور سرد مہری کا رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو اتنی آسانی سے چھ ملین یہودیوں کا قتل عام نہ ہو گیا ہوتا۔

تو آپ بھی اپنے قائدین کو ہی موردِ الزام گردانتے ہیں؟

بولے: دیکھیے بعض چیزیں بڑی واضح ہیں۔ جرمنی میں جو کچھ ہوا وہ ایک دن میں نہیں ہوا۔ ۱۹۳۳ء سے جب ہٹلر برسر اقتدار آیا، ۱۹۴۴ء تک جب اتحادیوں کی بمباری سے تعذیب گاہوں میں پھنسے یہودی آزاد ہونے لگے، دس گیارہ سال کے اس عرصے میں ایک منصوبہ بند طریقے سے یہودیوں کو فنا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سوال تو بہر حال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم پر یہ قیامت برپا تھی اس وقت یورپ اور امریکہ میں جو بااثر یہودی قیادت تھی وہ کر کیا رہی تھی؟

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہودی لیڈر بھی در پردہ نازیوں کی سازش میں شریک ہو گئے تھے؟

میرے اس سوال پر وہ قدرے جھنجھلائے، بولے: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ پیچیدہ سوالوں کو اس طرح غیر معمولی سادہ لوحی سے نہیں پوچھنا چاہیے۔ بعض صورت حال ایسی ہوتی ہے جب آپ کی مصلحت اور بزدلی دشمنوں کے لیے ہتھیار بن جاتی ہے۔ آپ جسے مصلحت کہتے ہیں وہ دراصل مداہنت پر مبنی ایک رویہ ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں نازی ایام کی یہودی قیادت اسی مرض کہن میں مبتلا تھی۔ اب ان ہی اسٹیفن وائز کو لیجیے، یہ اس عہد کے سب سے بڑے مذہبی قائد تھے۔ امریکہ میں جتنی بھی بڑی یہودی انجمنیں تھیں ان کی کرسئ صدارت کی شان ان ہی کے دم سے قائم تھی۔ ایوان اقتدار میں ان کے عمل دخل کا عالم یہ تھا کہ صدر رُوزویلٹ بے تکلفی سے انھیں صرف اسٹیفن کہہ کر بلاتے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے تیرہ مرتبہ صدر رُوزویلٹ سے ملاقات کی تھی۔ روزویلٹ سے ان کے ذاتی مراسم کے سبب اس زمانے میں یہ لطیفہ بھی زبانِ زد عام تھا کہ عام انسانوں کے لیے صرف دو دُنیائیں ہیں، ایک die velt یعنی موجودہ دُنیا اور دوسری yene velt یعنی آخرت، البتہ یہودیوں کے لیے ایک اور اضافی متبادل موجود ہے اور وہ ہیں Roosevelt۔

بہت خوب! میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

بولے: مگر رُوز ویلٹ پر اس غیر معمولی انحصار کا نتیجہ کیا نکلا، یہودیوں کو نہ تو دُنیا ہی ملی اور نہ ہی آخرت۔ وہ اس تیسرے متبادل کی نذر ہوگئے۔ اس اعتبار سے اسٹیفن وائز اور اس عہد کے دوسرے لیڈروں کی مسئولیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

ربائی اسٹیفن وائز کے جب صدر امریکہ سے ذاتی مراسم تھے، بے تکلفی تھی، بار بار کا ملنا جلنا تھا تو وہ ہولوکاسٹ کے نازک ایام میں صدر رُوز ویلٹ کو کوئی مؤثر اقدام اٹھانے پر کیوں نہ آمادہ کر سکے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: بعض لوگوں کی طبیعت میں صلح کُل کا مادہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہہ لیجیے کہ ان کی ریڑھ میں ہڈی نہیں ہوتی۔ وہ کسی مسئلہ پر سخت اور فیصلہ کن موقف اختیار نہیں کر سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی قیادت کا دبدبہ سرکار دربار میں ان کی ذاتی توقیر سے وابستہ ہے۔ ان کی نظر میں یہ بات اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ صدر یا وزیر اعظم نے مجھے خاص طور پر مدعو کیا یا کسی مسئلہ پر میری رائے لی یا خود مجھ سے ملنے آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک فیصلہ کن موقف اختیار کرنے کے نتیجے میں وہ حکمرانوں کی نگاہِ ناز کے سزاوار نہ رہیں اور اس طرح خیر کی جو تھوڑی بہت موہوم سی امید باقی ہے وہ بھی جاتی رہے۔ حکمراں بھی اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں کہ جب تک ان قائدین کا وجود باقی ہے انھیں زبانی جمع خرچ اور خوش اخلاقی کے مظاہرے سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک کر کے ہماری مزاحمت کا حصار گرتا جاتا ہے اور ہر بار ہمارے یہ بے دم قائدین ایوانِ اقتدار میں اپنی مظلومی کی نئی داستان لے کر حاضر ہوتے رہتے ہیں۔

'آخر کیا وجہ ہے کہ انھیں ان مزاحمتی حصاروں کے گرنے کا ادراک نہیں ہوتا؟'

بولے: جب خدا سے ناامیدی اور انسانوں سے امیدیں کسی کے دل میں گھر کر جائیں تو وہ عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اب ان ہی ربائی اسٹیفن کو لیجیے، وہ اس بات پر پھولے نہیں سماتے تھے کہ صدر رُوز ویلٹ نے ان کی بیٹی اور داماد کو کھانے پر مدعو کیا ہے۔ صدر خود اس دعوت میں موجود ہیں اور یہ کہ انھوں نے مجھے خاص طور پر اپنا محبّت بھرا اسلام بھیجا ہے۔ انھیں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش کہ یہ شخص ہماری قوم کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھاتا: (If only he would do something for my people) ادھر جرمنی سے مسلسل یہودیوں کے انخلا اور ان کے قتلِ عام کی خبریں آتی رہتیں۔ صدر رُوز ویلٹ کوئی مؤثر اقدام اٹھانے کے بجائے یہ کہنے پر اکتفا کرتے کہ یہودیوں کو بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہٹلر کو جنگ کے میدان میں شکست دی جائے۔ پوری یہودی دُنیا مضطرب رہی۔ جرمن قبضے کے مختلف علاقوں سے یہودیوں

کوٹھریوں میں بھر کر تعذیب گاہوں میں پہنچایا جاتا رہا۔امریکی یہودی حلقوں میں مسلسل بے چینی بڑھتی رہی۔نوجوان یہودیوں، جن میں برگساں بوائز کا ان دنوں بڑا چرچا تھا، نیویارک، واشنگٹن اور دوسرے شہروں میں مظاہرے کرتے رہےلیکن اسٹیفن وائز کےصدر سے ذاتی مراسم پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ انھوں نے صدر روزویلٹ کو جوشیلے مظاہرین سے ملنے سے بھی منع کر دیا تھا،مبادا امریکہ میں ایک متبادل یہودی قیادت کو اعتبار مل جائے۔

'مگر اسٹیفن وائز تو ایک خدا ترس ربائی تھے، ان کی تحریریں اور تقریریں اہل یہود کے قومی اور مذہبی مفادات سے مملو ہوتیں اور اہل یہود کو تفوق عطا کرنے کے لیے صیہونی تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے تھے، پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر محض اپنی شخصی وجاہت اور بلند قامتی کے تحفظ کے لیے ایک نازک وقت میں اپنے مذہبی اور ملّی مفاد سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے۔'

جان بوجھ کر نہیں۔ دراصل اس قسم کے لوگ منافق تو ہوتے نہیں کہ ان پر جانے بوجھے اپنے ملّی مفاد کے خلاف کام کرنے کا الزام عائد کیا جائے۔ مقدس لوگوں پر شیطان کے وار بھی نرالے ہوتے ہیں۔ مزاحمت سے مسلسل دور رہنے کے سبب ان کی شخصیت کا کس بل نکل چکا ہوتا ہے۔ وہ فیصلہ کن لحات میں بھی دشمنوں کے حق میں بےضرر ثابت ہوتے ہیں۔

'یعنی گول کونے والی شخصیت؟' میں نے لقمہ دیا۔

پہلے تو وہ میری اس اصطلاح پر متحیر ہوئے، پھر بولے: ہاں تم نے صحیح سمجھا کہ یہ چاہتے تو ہیں کہ اربابِ اقتدار کے سامنے اپنی قوم کا مقدمہ پوری شان کے ساتھ رکھیں۔ پھر انھیں خیال آتا ہے کہ کہیں ان کی کھری کھری باتیں مخاطب کو ناراض نہ کردیں اور اس طرح باہم مل بیٹھنے اور اپنی قوم کا مقدمہ رکھنے کا موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ وہ چاہتے تو ہیں کہ کلمۂ حق کہہ دیں لیکن سچ ان کے حلق میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ وہ اچانک اس اندیشے کا شکار ہوجاتے ہیں، مبادا ان کی تلخ نوائی اربابِ اقتدار پر اُلٹا اثر نہ کر جائے۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ ہماری مذہبی اور ملّی قیادت اربابِ اقتدار سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی ہے، لیکن عملاً مسائل جوں کے توں رہتے ہیں، بلکہ ہر گزرتے دن ان کی سنگینی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

'پھر آپ کی نظر میں قیادت کو کیا کرنا چاہیے تھا؟'

بولے: قیادت تو دراصل فرشی جھولے (seesaw) کا کھیل ہے۔ آپ اگر اپنا وزن محسوس نہیں کرا سکتے تو فریقِ مخالف آپ کو ہلکے میں ہی لے گا۔ برسہا برس کی ملاقاتوں، بار بار کی عرض ومعروضات اور فدویانہ گزارش کے بعد جب اسے اس بات کا یقین ہو چلے کہ آپ کی ذات سے اسے کوئی بڑا خطرہ نہیں، اربابِ

اقتدار کے لیے کوئی بڑی مشکل پیدا کرنا آپ کے مزاج سے ہی مغائر ہے تو بھلا اہلِ اقتدار آپ کی بات پر کان کیوں دھریں گے۔ ربائی اسٹیفن وائز جیسے سادہ لوح اور رُوز ویلٹ جیسے چرب زبان کے باہمی مراسم جو کوئی دس پندرہ سال کے عرصے پر محیط ہیں، اس خیال کی توثیق کرتے ہیں کہ بے ضرر ملّی قیادتوں نے ہمیشہ اپنی قوم کو ہزیمت سے ہی دوچار کیا ہے۔

'مگر ربائی وائز جس دور میں جی رہے تھے وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ان کے پاس متبادل کیا تھا؟' میں نے زَکَری کو گھیرنے کی کوشش کی۔

بولے: انھوں نے موہوم امیدوں میں بہت وقت ضائع کیا۔ وہ اپنے ذاتی خطوط میں صدر روز ویلٹ کے رویے کے شاکی نظر آتے ہیں، لیکن اتنی ہمت نہیں جٹا پاتے کہ صدر کو صاف لفظوں میں متنبہ کرسکیں۔ نازی جرمنی میں جب یہودیوں کا قتل عام شروع ہوا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ ہٹلر کے نزدیک یہودی مسئلہ کا آخری حل جرمنی سے ان کا انخلا اور مکمل صفایا ہے اس وقت امریکہ میں یہ اطلاع سب سے پہلے ربائی وائز کے پاس پہنچی۔ انھوں نے امریکی محکمۂ خارجہ کے ذمہ داروں سے گفتگو کی، جہاں سے انھیں یہ ہدایت ملی کہ وہ اس خبر کو اس وقت تک عام نہ کریں، جب تک حکومت اپنے طور پر اس خبر کی توثیق نہ کرلے۔ ربائی وائز اس خبر پر دو ماہ تک خاموش رہے تا آنکہ امریکی ذرائع ابلاغ میں ایک دن اچانک شور مچ گیا اور پھر متعلقہ حکومتی محکمے نے بھی اس خبر کی تصدیق کردی۔ کہتے ہیں کہ اگر انھوں نے دو ماہ پہلے ہی ذرائع ابلاغ میں شور مچا دیا ہوتا تو دُنیا اس خطرے کا پہلے ہی ادراک کرلیتی اور شاید بہت سے یہودیوں کی جان بچ جاتی۔

'مگر وائز تو کسی امید پر ایسا کررہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے امریکی حکمرانوں کے مصالح کا پاس ولحاظ رکھا تو ان کا تعاون حاصل کرنا آسان ہوگا۔'

بولے: اسی کو تو میں seesaw کا کھیل کہتا ہوں۔ اگر آپ ملّی اور مذہبی اہمیت کی خبروں کو صرف اس لیے دفن کردیتے ہیں کہ آپ نظامِ وقت کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تو پھر آپ نہ صرف یہ کہ اس کھیل کے لائق نہیں ہیں بلکہ آپ اپنی مانندِ حباب شخصیت کے سبب قومی مجرم بھی ہیں، قومی مجرم۔ یہ کہتے ہوئے زَکَری کسی قدر مشتعل ہوگئے۔ بولے: ربائی وائز کو میں برا آدمی نہیں سمجھتا، لیکن اتنے بڑے قتل عام کی جواب دہی تو طے کرنی پڑے گی نا!

'آپ کی بات درست ہے مگر اہل تقویٰ کے لیے اس طرح کے سخت الفاظ کا استعمال مناسب نہیں، آخر ان کے تقدس کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیے۔' میں نے زَکَری کو سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ بولے: یہ تقدس کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ تو ہمارا اپنا پیدا کردہ سراب ہے۔ ہم بعض لوگوں کو روحانیت کے ہالے میں گھرا دیکھتے ہیں، لیکن اس بات کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں کر پاتے کہ آخر کس چیز نے انھیں مقدس بنا رکھا ہے؟ کیا خاص قسم کا لباس یا وضع قطع آدمی کو روحانی بناتا ہے یا تقویٰ شعاری کا معیار کچھ اور ہے؟ ہمارے ہاں تلمودی کہانیوں میں حکمت کے بڑے بیش قیمت نکتے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک شخص ارض مقدس کی زیارت کے بعد ایک ربائی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بولا: حضرت! میں ارض کنعان میں بہت چلا پھرا۔ میں دیوار گریہ کے قریب بھی گیا اور تمام مقدس مقامات کی زیارت کی لیکن مجھے وہاں تقدس کا کوئی پرتو یا روحانیت نظر نہیں آئی۔ یہ سن کر ربائی نے اس سے پوچھا: کیا تم بفو فسٹک تو نہیں؟

یہ کیا ہوتا ہے؟

دیکھو سوال کا سیدھا جواب دو۔ تم بفو فسٹک تو نہیں؟ ربائی نے زور دے کر پوچھا۔

بولا: میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

تو تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تقدس کیا چیز ہوتی ہے اور روحانیت کسے کہتے ہیں۔ جب تک تمھارے پاس تقدس اور روحانیت کی کوئی متعین تعریف نہ ہو بھلا تم انھیں کیسے پہچان پاؤ گے۔

اس حکایت کو سناتے ہوئے زکری کے چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ بولے: اکثر لوگ مریدانہ اور معتقدانہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ ایک خاص قسم کی وضع قطع کو روحانیت سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان کے لیے اپنے ہی جیسے انسانوں کا محاکمہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بولے: میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہولوکاسٹ کے سانحہ کے لیے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے قائدین اور ہماری اپنی انجمنیں ذمہ دار ہیں۔ اگر یورپ اور امریکہ میں بیٹھے ہوئے یہودی قائدین اور خود جرمن کنٹرول کے علاقوں میں کام کرنے والی مختلف یہودی انجمنیں خود کو نوالۂ تر بنا کر پیش نہ کرتیں تو اتنے بڑے پیمانے پر ہمارا قتلِ عام نہ ہوتا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے بزرگوں کو کیا ہوگیا تھا کہ انھوں نے بغیر کسی قابلِ ذکر مزاحمت کے اپنے گھر بار اور کاروبار کو تج کر گیٹو کی رہائش اختیار کر لی۔ پھر ان گیٹو سے اٹھ کر ان ٹرینوں میں سوار ہو گئے جو مختلف تعذیب گاہوں کی طرف انھیں لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اس انخلا میں جو ترتیب و تنظیم اور حسنِ انتظام نظر آتا ہے یہ بھی مختلف سطح کی یہودی قیادت نے فراہم کیا۔ جو قوم از خود مرنے کو کشاں کشاں تعذیب گاہوں کی طرف چلی آتی ہو، حالانکہ اسے معلوم ہو کہ اگلی منزل موت ہے۔ بھلا کسی ایسی قوم کو موت کے منہ سے کون بچا سکتا تھا۔ لوگ مجھے انٹرنلسٹ (internalist) کہتے ہیں، لیکن میں جس

قدر بھی ہولوکاسٹ کے سانحہ پر غور کرتا ہوں مجھے اپنے قائدین کے دامن خون آلودہ نظر آتے ہیں۔

یہ تو آپ نے عجیب بات کہہ دی۔ اس طرح آپ کہیں نازیوں کا جرم تو ہلکا نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے ذَکری کے شدت احساس کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔

بولے: ہرگز نہیں، نازیوں کا جرم اپنی جگہ، اس کی شناعت کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کو ہمارے قتلِ عام کے لیے اعوان و انصار ہماری قوم سے ملے۔ نازیوں نے ہر شہر کے یہودی علاقوں میں ایک مجلسِ بزرگاں بنا رکھی تھی جو بڑی مستعدی کے ساتھ ان کے احکام وفرامین پر عمل کرتی تھی۔ بعض لوگوں نے تو عجیب عجیب قسم کی خیانتیں کیں اس قوم کے ساتھ۔ آپ نے شاید ایخمان مقدمہ (Eichmann trail) کے بارے میں کچھ سنا ہو۔

نہیں! مجھے نہیں معلوم۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔

بولے: ایخمان ایک نازی آفیسر تھا جس کے ذمہ ملک کے مختلف علاقوں سے یہودیوں کو اکٹھا کرنا اور انھیں ٹرینوں میں بھر کر تعذیب گاہوں میں پہنچانے کا کام سونپا گیا تھا۔ بعد میں یہ صاحب اسرائیل میں پکڑ کر لائے گئے اور ان پر مقدمہ چلا۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ میں اس کا بڑا چرچا تھا، لیکن مجھے یہاں ایخمان سے کچھ شکایت نہیں۔ وہ تو ایک معمولی ہرکارہ تھا، اپنے کام پر مامور۔ ہنگری کے ایک بڑے یہودی لیڈر تھے کاسنر (Kastner)۔ انھوں نے بوداپاسٹ میں یہودیوں کی مدد کے لیے ایک ریلیف کمیٹی قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد جرمن علاقوں سے یہودیوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانا تھا۔ کاسنر نے اہل ثروت یہودیوں کی جان بچانے کے لیے، جس میں بعض معروف یہودی فنکار، شاعر اور مصنف بھی شامل تھے، ایخمان سے ایک خفیہ سودا طے کیا تھا جس کے مطابق ہنگری سے سولہ سو یہودیوں کا ایک قافلہ بذریعہ ٹرین سوئٹزرلینڈ پہنچایا جانا تھا۔ کاسنر چونکہ ایخمان کے مستقل رابطے میں تھے، ان پر یہ بات پوری طرح عیاں تھی کہ جرمن قبضہ کے مختلف علاقوں سے جو ٹرینیں یہودیوں کی منتقلی پر مامور ہیں اس کے پیچھے دراصل اجتماعی قتل کا منصوبہ ہے، لیکن سولہ سو یہودیوں کی جان بچانے اور انھیں بحفاظت سوئٹزرلینڈ تک پہنچانے کے لیے انھوں نے ان معلومات کو اپنی قوم سے پوشیدہ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سولہ سو لوگوں کی جان تو بچ گئی، لیکن اس اطلاع کے افشانہ ہونے کے سبب لاکھوں دوسرے یہودی لقمۂ اجل بن گئے۔ جس طرح ربائی وائز ہمارے قتلِ عام کی خبروں کو دو ماہ تک دبا کر بیٹھ گئے تھے، اسی طرح کاسنر نے مٹھی بھر یہودیوں کی جان بچانے کے لیے اپنے ہم قوموں کو حقیقی صورت حال سے ناآگاہ رکھا۔ اپنے اس عمل کے لیے توجیہات دونوں کے پاس ہوں گی۔ مگر اتنی بات تو طے ہے کہ قیادت کی کرسیوں پر براجمان ان جیسوں کے ہاتھ ہمارے خون سے ناآلودہ نہیں'۔

عجیب! کاسنر اور وائز کو آپ نے ایک صف میں کھڑا کر دیا؟

میرے اس احتجاج پر وہ مسکرائے، بولے: کاسنر تو پھر بھی چھوٹے مجرم ہیں، ان کے جرم کی شناعت ہر خاص و عام پر عیاں ہے۔ اسرائیلی ریاست میں کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلا، جج نے انھیں شیطان کے زیر اثر کام کرنے کا خطا کار پایا۔ یہ بھی کہا گیا کہ انھوں نے وہ کام کیا جو صرف خدا کو زیب دیتا ہے، یعنی اس بات کا فیصلہ کہ کسے زندہ رہنا چاہیے اور کسے نہیں۔ ان کی ٹرین میں صرف وہی لوگ سوار ہو سکتے تھے جنھیں ان کی ایما حاصل ہو۔ کاسنر تو اپنے اس جرم کے لیے سزائے موت کے مستحق قرار پائے۔ اس کے برعکس ربائی وائز کے جرم پر آج بھی تقدس کا پردہ پڑا ہے۔

لنچ کا وقفہ ختم ہونے کو تھا۔ کیفے ٹیریا میں برتنوں کے سمیٹے جانے اور کرسیوں کی ترتیبِ نو کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے زَکَرِی سے اجازت چاہی۔ واپس لائبریری میں اپنی نشست پر آ بیٹھا مگر ذہن کہیں اور بھٹکتا رہا۔ آج مجھے ہاشم علی اختر کی وہ گفتگو یاد آئی جب انھوں نے ہم طلبا کو ایک مسلمان بیوروکریٹ پر ہونے والی ستم کاریوں کے حوالے سے کہا تھا کہ پاکستان بننا شاید ناگزیر ہو گیا تھا۔ 'چلیے اس قصّے کو چھوڑیے، جناح نے برصغیر کے آدھے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل کر دیا، اب بقیہ آدھے مسلمانوں کا مسئلہ ہمیں حل کرنا ہے'۔ اس وقت بھی میرے دل و دماغ پر یہ جملہ ایک ایٹم بم کی طرح گرا تھا۔ آج روڈولف کاسنر کی امدادی ٹرین کا قصہ سن کر ایسا لگا جیسے ہمارے قائدین نے بھی چند مراعات یافتہ مسلمانوں کی زندگی بچانے اور انھیں ایک محفوظ جولانگاہ فراہم کرنے کے لیے برصغیر کی آدھی مسلم آبادی کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیا ہو۔

میں جس قدر غور کرتا مجھے ربائی وائز کی بارعب اور تقدس مآب شخصیت کچھ مانوس مانوس سی لگتی۔ ایسا لگتا جیسے یکے بعد دیگرے مختلف تصویریں اس فریم میں فٹ ہوتی جاتی ہوں۔ ان میں بعض تصویریں وہ تھیں جنھیں میں نے بہت قریب سے برتا تھا اور بعض کے بارے میں میرا تجربہ بس دور کے جلوہ پر مبنی تھا۔ پھر خیال آیا بھلا ایک راندۂ درگاہ یہودی عالم کی جولانیوں سے ہمارے علما و قائدین کو کیا علاقہ۔ سو یہ سوچ کر اس وسوسے پر لاحول پڑھنے میں عافیت جانی۔

۵۲

جرأتِ کفر

لندن میں مجھے مطالعہ ومشاہدہ کی جو سہولت حاصل تھی تو جی تو یہی چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ کچھ اور دراز ہو مگر ہندوستان سے آنے والی خبریں پریشان کیے رکھتیں۔ ایک دن شیخ عبدالخالق سے اس مسئلہ پر گفتگو چل نکلی۔ کہنے لگے: ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت حالات سے بالکل بے خبر ہے، کاش کہ انھیں اس بات کا اندازہ ہوتا کہ اس وقت انھیں ایک عالمی یلغار کا سامنا ہے۔ ابھی گذشتہ برس لندن کے نواح میں واقع Milton Keynes میں جو وراٹ ہندو سمّیلن منعقد ہوا تھا اس کے پیچھے بھی رام مندر کی تحریک ہی کارفرما تھی۔ کوئی ایک لاکھ لوگ مختلف اطراف واکناف سے آئے تھے۔ 'ہندو جاگے وشو جاگے، مانو کا وشواس جاگے' جیسے نغموں سے فضا گونج رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ رام مندر کی تحریک نے عالمی سطح پر ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ کا سامان کر دیا ہو۔ دوسری طرف بابری مسجد کے قائدین اور مسلم تنظیموں کے ذمہ داروں کو دیکھیے تو ایسا لگتا ہے کہ

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف   ہائے وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہیں کوئی ہدف

کہنے لگے: محض اخباری بیانات سے معرکے سر نہیں ہوتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو موگیانہ قیادت کی نہیں بلکہ پیمبرانہ عزائم کی ضرورت ہے۔

شیخ کے منہ سے 'موگیانہ قیادت' جیسی خالص دیہاتی اصطلاح سن کر پہلے تو مجھے ہنسی آئی، پھر خیال آیا، شاید 'مولویانہ' کہتے ہوں۔ میں نے صراحت چاہی تو بولے: 'ارے بھئی صرف مولویوں کو ہی موردِ الزام کیوں ٹھہرایا جائے۔ ایک طرح کے وہم کا تو ہم سب ہی شکار ہیں۔ اور جب تک اس مرض مزمن کا شافی علاج نہ ہو، اقدامی عمل کی ہر منصوبہ بندی پر ایک بیمار ذہن کی نفسیات غالب رہے گی'۔

میں نے سوچا شیخ شاید صحیح کہتے ہیں۔ کسی قوم کی نفسیاتی اور روحانی صحت اگر درست نہ ہو تو اسے بیس کروڑ اہلِ ایمان کی عددی قوت پر بھی محض 'اقلیت' ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے علما لوگوں کو رسالۂ محمدی کی طرف بلانے کے بجائے 'حلف الفضول' جیسے ما قبل نبوۃ اسوہ میں پناہ لینا مناسب جانتے ہیں، ان کے

دانشور خود کو مسلمان سمجھتے تو ہیں پر کہنا نہیں چاہتے، انھیں اپنی نظری شناخت کے افشا ہوجانے سے ڈر لگتا ہے مبادا ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگ جائے۔ اسلام کی یہ تصویر کہ یہ مسلمانوں کا قومی دین ہے اتنا مقبول اور شائع ہے کہ پیمبرانہ اسلام کی آواز کہیں دب کر رہ گئی ہے۔ جب طبقۂ علما نے ہی رسالہ محمدی کے علی الرغم حلف الفضول تک اپنی تگ و تاز کو محدود رکھا ہو تو عام لوگوں سے بھلا کیا شکوہ۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

آج مجھے ہندوستانی مسلمانوں کا وہ قومی کنونشن بھی یاد آیا جو پچھلے سال سید شہاب الدین کی دعوت پر ماؤلنکر ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر قرآن مجید کا ایک نسخہ میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے تقریر کی ابتدا میں قرآن مجید کو ہاتھ میں لہراتے ہوئے سامعین سے کہا: لوگو! میں تمھیں اس کتاب کی سیاست کی طرف بلانے آیا ہوں۔ مسلمانوں کی قومی تحریک سے ہم پہلے ہی بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔ ہندو بنام مسلم کی جنگ میں ہم نے سابق دارالاسلام ہندوستان سے اپنا استحقاق کھو دیا۔ اب یہ قومی کشمکش جو بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعہ کی شکل میں دوبارہ ہمارے سامنے آئی ہے، ہمیں پھر سے ایک خالص قومی جنگ میں گھسیٹنا چاہتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس وقت اپنے دستوری اور جمہوری حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرنے کے بجائے اسلام کے اس آفاقی پیغام کو عام کریں جس میں تمام ہی قوموں کے لیے ان کے حقوق کی ضمانت ہے۔ اسلام کے عدل و قسط کا ایجنڈا آج بھی ملک کی ایک بڑی غیر مسلم آبادی کے لیے نغمۂ نشاط انگیز ثابت ہوگا۔ منڈل اور کمنڈل کی جنگ نے آج پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ہمیں ایک مصنوعی اکثریت کے مقابلے میں اقلیت باور کرایا گیا ہے۔ اکرامِ آدمیت کا اسلامی ایجنڈا آج بھی اس ملک میں ایک نئی صبح کا نقیب بن سکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے پھر سے قرآن مجید کو ہاتھ میں بلند کیا اور کہا کہ وقت آ گیا ہے کہ اس کتاب کی سیاست کا اس ملک میں آغاز کر دیا جائے۔ قرآن مجید کے اس طرح لہرانے سے سامعین نے گفتگو شوق اور توجہ سے سنی چند لمحوں کے لیے مجلس میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جلسے کے اختتام پر سید شہاب الدین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں میرا نام لیے بغیر ان صاحب کی خوب نکیر کی جو بقول ان کے، یہاں یہ سمجھ کر آ دھمکے تھے گویا یہ کنونشن کسی اسلامی حکومت کے قیام کے لیے بلایا گیا ہو۔ انھوں نے باسالیب مختلف اس بات کی صراحت کر دی کہ ان کے پیش نظر کوئی نئی سیاسی حکمتِ عملی نہیں بلکہ موجودہ سیکولر آرڈر کا دفاع ہے۔ اور بس۔

سید شہاب الدین میرے کرم فرماؤں میں تھے۔ ان سے میری مراسلت تھی۔ اور شاید اسی لیے انھوں نے مجھے اپنے کنونشن میں شرکت کی دعوت بھی دی تھی لیکن میں نے موقع کی نزاکت کا بالکل ہی خیال

نہیں کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہمارے باہمی مراسم میں وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ کوئی دو سال بعد قدرت نے ہمیں پھر ایک اسٹیج پر جمع کر دیا۔ نیویارک میں امریکن فیڈریشن آف مسلمس فرام انڈیا (AFMI) کا پہلا کنونشن تھا جس میں شہاب الدین صاحب ہندوستان سے تشریف لائے تھے۔ میں ان دنوں واشنگٹن میں موجود تھا۔ میری موجودگی کا فائدہ اٹھا کر منتظمین نے مجھے بھی مدعو کر لیا تھا۔ وہاں بھی سید صاحب نے سیکولر آرڈر کے دفاع میں تقریر کی اور میں نے اس نظام کے 'چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر' ہونے کا تذکرہ جاری رکھا۔ برسوں بعد جب میں نے مولوی محمود مدنی سکریٹری جمیعت العلماء ہند کو بانگِ دہل بلکہ کسی قدر افتخار کے ساتھ یہ کہتے سنا کہ انھوں نے (یعنی ان کے وطن پرست پرکھوں نے) موجوہ سیکولر نظام کے حق میں نظامِ مصطفی کو مسترد کر دیا تھا تو مجھے اس بات پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ ہاں مجھے ان کی اس صاف گوئی پر پیار آیا۔ ان کی جرأتِ کفر سے میرے اس خیال کی مزید توثیق ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو منقسم ہندوستان میں شروع سے ہی ایک نظری اور سیاسی ارتداد کا سامنا تھا۔

۵۳

تیسری ہجرت

علی گڑھ میں ایک طرح کی خانہ بدوشی مجھ پر سایہ فگن ہونے کو تھی۔ گذشتہ چند برسوں سے میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ابھی ایک سفر کی تکان دور نہیں ہوتی کہ دوسرے سفر پر اچانک روانہ ہو جاتا۔ اس سفرِ مسلسل کے سبب بعض احباب یہ کہنے لگے تھے کہ یہ صاحب رہتے تو جہاز پر ہیں ہاں کبھی کبھی ادھر بھی آجاتے ہیں۔ اس دفعہ طویل غیر حاضری کے بعد جب علی گڑھ پہنچا تو پتہ چلا کہ میری کتابوں اور کاغذات کے بنڈل مختلف احباب کے کمروں میں بطور امانت رکھوا دیئے گئے ہیں۔ غلبۂ اسلام کا ڈھیر جن صاحب کے حصّے میں آیا تھا انھیں مسلسل آنے والوں سے اس استفسار کا سامنا رہتا کہ یہ کون سی کتاب ہے، اس کے ڈھیر سارے نسخے یہاں کیوں رکھے ہیں اور یہ کہ اس کتاب کی خاص بات کیا ہے؟ ان صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کتاب پڑھے بغیر ہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان سوالوں کے شافی جواب دیتے رہتے۔

دو چار دن ایک طرح کی بے گھری کا احساس رہا پھر جلد ہی دوستوں کے لطف و کرم سے ایسا لگنے لگا کہ رہنے کو بہت سارے کمرے ہوں اور اب تک محض ایک کمرے میں رہنے کا تکلف خواہ مخواہ ہی پال رکھا تھا۔ ایک دن باہر برآمدے میں بیٹھا صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ پڑوس کے کمرے سے ایک بزرگ صورت مولوی صاحب باہر نکلے، چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ ارے یہ تو مولانا حمایت اللہ ہیں۔ ان سے مدینہ منورہ میں میرا ملنا جلنا رہا تھا۔ مولانا چند دنوں پہلے ہی ریاض سے تشریف لائے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ کویت پر صدام کے حملے کے بعد سعودی عرب میں خوف و دہشت کا ماحول ہے۔ شاہراہیں ویران اور ایئرپورٹ سنسان ہیں۔ پتہ نہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک ایسے وقت میں جب لوگ صورت حال سے خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں، کیوں نہ ریاض کے سفر کا پروگرام بنایا جائے تا کہ ایک بحرانی صورت حال کا قریب سے مشاہدہ کیا جا سکے۔ میرا سارا دفتری ساز و سامان، خط و کتابت کی فائلیں حتیٰ کہ علمی کام کے لیے مطلوب تحقیقی نوٹس بھی مختلف کارٹونوں میں بند تھے۔ اب میرا انحصار پوری طرح اس پوٹلی نما بیگ پر تھا جسے میں سفر و حضر میں اپنے ساتھ لیے پھرتا۔ سوچا جب ایک طرح کی بے دری

اور خانہ بدوشی اپنے حصے میں آہی گئی ہے تو کیوں نہ اپنے اونٹ کا رخ اس صحرا کی طرف موڑ دیا جائے جہاں اس وقت اہل ایمان ایک نئے معرکہ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں رابطہ عالم اسلامی کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہو رہی تھی۔ میں چونکہ اس ہجوم کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا، جو سعودی موقف کی غیر مشروط حمایت کے لیے اس موقع پر مکہ میں جمع ہو رہا تھا، سو میں نے رابطہ کی کانفرنس کا ویزا تو قبول کر لیا، البتہ اس سفر کی ذاتی حیثیت برقرار رکھی۔ مجھے کراچی میں کچھ ضروری کام نپٹانے تھے۔ 'اسلامی انقلاب کا دستور العمل' کی اشاعت آخری مرحلے میں تھی جسے مدیر تکبیر محمد صلاح الدین اپنے ادارے سے شائع کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ان دنوں پی آئی اے کی فلائٹ دہلی سے صبح پہنچتی تھی اور دیر رات گئے جدہ کے لیے روانہ ہوتی تھی، لیکن جب ایئرپورٹ سے باہر آیا تو خیال آیا کیوں نہ وسط شہر میں قیام کیا جائے۔ وائی ایم سی اے کی قیام گاہ میں پہلے بھی ٹھہر چکا تھا جس کے سامنے پی آئی اے کا بڑا دفتر ہوا کرتا تھا۔ نہا دھو کر باہر نکلا تو میرے قدم غیر ارادی طور پر پی آئی اے کے دفتر کی طرف اٹھ گئے۔ خیال آیا اگر ایک دن کے لیے ٹکٹ میں توسیع ہو جائے تو لگے ہاتھوں جیلانی چچا سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ پچھلے سفر میں بھی یہ آرزو دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس نے میرا ہندوستانی پاسپورٹ دیکھ کر غیر معمولی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور اگلے دن کی سیٹ کنفرم کر دی۔

میرے پاس فیڈرل بی ایریا کا پتہ تھا۔ راستے میں ہماری ٹیکسی لیاقت آباد سے گزری جہاں الطاف حسین کے قدآور کٹ آؤٹ اور دیوہیکل ہورڈنگس آویزاں تھیں۔ میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا: یہ جا بجا الطاف حسین کے فرمودات اور ان کی تصویریں کیوں آویزاں ہیں؟ کہنے لگا: آپ کو پتہ نہیں یہ شہر قائد ہے۔

'وہ تو مجھے معلوم ہے کہ مزار قائد اسی شہر میں واقع ہے'، میں نے کہا۔

بولا: آپ قائداعظم کی بات کر رہے ہیں؟ ان کا دور گیا، اب یہ قائد انقلاب کا دور ہے۔

'تو کیا آپ لوگوں نے اب اپنا قائد بدل لیا ہے؟'

بولا: آپ ہی بتائیے کرتے بھی کیا۔ ہم لوگوں نے پاکستان کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا۔ آبا واجداد کی حویلیاں چھوڑ کر ہم لالوکھیت کے ویرانے میں آبسے۔ اس بات کو چالیس بیالیس سال کا عرصہ ہوا۔ اس دوران ایک پوری نسل یہیں پیدا ہوئی، پھلی پھولی لیکن ابھی تک ہم اس مٹی کا حصہ نہیں بن سکے۔ اب بھی ہمارے بچے مہاجر ہی کہلاتے ہیں۔

'یہ تو اعزاز کی بات ہے، مہاجر تو بہت بڑا لفظ ہے'۔

میرے یہ کہنے پر وہ مشتعل سا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ہمیں بلوچی، سندھی، پنجابی

اور پٹھانوں کی طرح ایک قوم تسلیم کرلو تا کہ ہمیں پاکستان میں باہری عنصر کے طور پر نہ دیکھا جائے۔

'مگر مہاجر تو پاکستان کی بنا میں ہیں۔ان کا رول مؤسسین کا رہا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان آئے بلکہ یہ جن اقلیتی مسلم علاقوں سے آئے پاکستان کی تحریک ان ہی علاقوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ پھر آپ ایک تاریخی قائدانہ رول کو چھوڑ کر خود کو محض سندھی، بلوچی یا پنجابی قوم کے مقام پر کیوں لانا چاہتے ہیں؟'

بولا: یہ سب کتابی باتیں ہیں۔آپ صحافی تو نہیں؟ ہمارے ہاں بھی ایک بندہ ہے صلاح الدین۔ وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتا ہے۔ وہ بھی مہاجر ہے مگر مہاجروں کے خلاف لکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔آپ کو پتہ ہے اس وقت بھی لاکھوں بہاری مسلمان بنگلہ دیش میں کیمپوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق بلوچی، سندھی، پنجابی یا پٹھان قوم سے ہوتا تو کیا وہ اسی طرح ان پناہ گزیں کیمپوں میں پڑے سڑ رہے ہوتے۔ان قوموں کے پاس تو اپنے اپنے صوبے ہیں نا۔ اگر مہاجروں کے پاس بھی پاکستان میں کوئی صوبہ ہوتا تو بنگلہ دیش میں پھنسے بہاری مسلمانوں کا مسئلہ کب کا حل ہو گیا ہوتا۔

ہماری ٹیکسی اب فیڈرل بی ایریا میں داخل ہو چکی تھی۔سڑکیں کشادہ اور مکانوں پر نمبر ڈلے تھے، مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا۔ میرے سامنے ایک وسیع بنگلہ نما مکان تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی، حاجب نے دروازہ کھولا۔ گھر میں جب یہ خبر پہنچی کہ ہندوستان سے کوئی ملنے آیا ہے تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اپنی دو تین بچیوں کے ساتھ میری ضیافت میں لگ گئیں۔لڑکیوں نے بتایا کہ دادا یہاں نہیں رہتے، وہ کچھ دن پہلے یہ گھر چھوڑ چکے ہیں، البتہ ابّا کو فون پر آپ کی آمد کی اطلاع دے دی گئی ہے۔اسی دوران پڑوس کے گھروں سے غالباً ان لڑکیوں کی سہیلیاں بھی ہندوستان سے آنے والے اس نو وارد بھائی کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئیں۔ ایک خاص بات جو میں نے ان لڑکیوں میں محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان سبھوں کے رخساروں پر ایک خاص قسم کی سرخی ہویدا تھی۔ پتہ نہیں یہ حیا کی سرخی تھی یا قدرت کا عطیۂ حسن۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کوئی خاص قسم کا غازہ تھا جس کا ان دنوں کراچی میں فیشن عام تھا۔ بہنوں کا اصرار تھا کہ میں قیام کروں لیکن مجھے جیلانی چچا سے ملنے کی جلدی تھی۔ میرے اصرار پر ایک صاحب موٹر سائیکل لے آئے اور میں ان کے ساتھ مختلف تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک گنجان علاقے کی مسجد میں جا پہنچا، جس کے بیرونی گوشے میں جیلانی چچا نے سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ مجھے اس طرح غیر متوقع طور پر دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ دیر تک ابّا کی خیریت پوچھتے رہے۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ ایک شب میں ان کے ہاں ضرور قیام کروں تا کہ سیر حاصل گفتگو کا موقع مل سکے۔

میں نے ایک اچٹتی نگاہ ان کے کمرے پر ڈالی جس کے ہر گوشے سے ایک بے سروسامانی عیاں تھی۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی تھی جسے چچا نے بصد اصرار مجھے سونے کے لیے پیش کی اور خود چٹائی بچھا کر فرش پر لیٹ گئے۔ صبح تین بجے کھٹ پٹ ہوئی، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چچا تہجد سے فارغ ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اسٹوو روشن کیا، چائے بنائی اور میری طرف ایک پیالی بڑھاتے ہوئے کہنے لگے: کیا کروں سگِ دُنیا ہوں، عادتوں کا غلام ہوں، جہاں بھی جاتا ہوں اپنے اردگرد ایک دُنیا اکٹھی کر لیتا ہوں۔ اب دیکھو کتنا ساز و سامان اس کمرے میں جمع ہو گیا ہے، جیسے قیامت تک یہیں رہنا ہو۔ مجھ جیسا سگِ دُنیا بھی کوئی ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ ان پر ترکِ علائق کا کوئی دورہ پڑا ہو، ورنہ جس پیالی میں انھوں نے مجھے چائے پیش کی تھی اس کا دستہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ چند ٹوٹی پھوٹی پیالیاں، ایک بوسیدہ اسٹوو، کھونٹیوں سے لٹکتے ہوئے چند کپڑے، ایک چھوٹی سی میز جس پر قرآن پاک اور کچھ کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں اور فرنیچر کے نام پر دو ہلتی کرسیاں اور ایک چارپائی۔ پھر بھی یہ احساس ستا رہا ہو کہ اس سگِ دُنیا نے بہت دُنیا جمع کر لی ہے۔

میں نے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے کہ آپ ایک کشادہ بنگلہ چھوڑ کر اس بے سروسامانی میں یہاں پڑے ہیں۔

بولے: بیٹا بڑی گھٹن ہو گئی تھی اس بنگلے میں۔ پہلے پہل تو محض ترقی کا خوشگوار احساس رہا۔ پھر تکلفات نے ڈیرہ ڈالا۔ حاجب اور دربان مقرر ہوئے۔ پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا جب جاہ و مال کی طلب انسان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، حلال و حرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے سلیم کو بہت سمجھایا کہ حلال آمدنی میں اگر مشتبہ مال کی تھوڑی آمیزش بھی ہو جائے تو سارا مال ناپاک ہو جاتا ہے۔ مگر وہ نہ مانا۔ بالآخر میں نے ایک سخت فیصلہ لیا۔ میں نے طے کیا کہ میں ایک اور ہجرت کروں گا۔ اب مسجد کے اس گوشے میں مجھے بڑا سکون ہے۔ شام میں بچوں کو قرآن پڑھاتا ہوں اور یہ میرے گذر بسر کے لیے کافی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ یہ کہتے ہوئے چچا کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

آپ نے اپنے حصّے کی بہت ہجرت کر لی۔ پہلے مشرقی پاکستان اور پھر بنگلہ دیش بن جانے کے بعد کراچی آئے اور اب اس بڑھاپے میں بال بچوں کو چھوڑ کر یہاں اس طرح پڑے رہنا کہاں تک مناسب ہے؟

بولے: سلیم آئے تھے، وہ گاہے بگاہے میری خبر گیری کے لیے آتے رہتے ہیں، انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ مشتبہ ذرائع آمدنی سے دور رہیں گے۔ خدا انھیں نیک عمل کی توفیق دے۔ انھیں یہ بات

سمجھ میں آجائے کہ ہم لوگ یہاں کوٹھی بنگلوں کی تلاش میں نہیں آئے تھے۔ باپ دادا کی حویلیاں اور قطعاتِ اراضی تو ہمارے پاس وہاں ہندوستان میں بھی تھے۔ ہم تو ایک دارالاسلام کی آرزو میں یہاں آئے تھے تاکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے کھل کر جی سکیں۔ اب اگر ہمارے بچوں کی زندگی سے ہی اسلام نکل جائے تو ایسی مہاجرت کا کیا حاصل؟

آپ تو ڈبل مہاجر ہیں، کبھی جب آپ پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟ کتنا درست تھا ہجرت کا یہ فیصلہ؟

میرے اس سوال کے لیے شاید وہ تیار نہ تھے۔ کچھ دیر گہری خاموشی ان پر طاری رہی، پھر بولے: ہماری پہلی ہجرت بھی عجب رہی۔ ہم تو پاکستان سمجھ کر وہاں گئے تھے ہمیں کیا پتہ تھا کہ پاکستان ہی وہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ بس یہ سمجھو کہ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا، پھر بھی ایک آس باقی تھی سو یہاں آگئے۔

یہاں بھی تو مہاجروں کو بڑے مسائل درپیش ہیں؛ کوئی سندھو دیش کی بات کرتا ہے کہیں اس طرح کی نعرے لگائے جا رہے ہیں: سندھ میں ہوگا کیسے گذارہ؟ آدھا ہمارا، آدھا تمھارا۔

بولے: اس بات کا اندازہ تو ہمیں مشرقی پاکستان میں ہی ہو گیا تھا کہ ہم مہاجروں کو دراصل انصار میسر نہیں آئے۔ ہماری ایک پوری نسل مشرقی پاکستان میں جوان ہوگئی، ہمارے بچے بنگلہ زبان میں رچ بس گئے لیکن پھر بھی وہ بہاری کہلائے جاتے رہے۔ مقامی سماج انھیں کلی طور پر قبول کرنے سے انکاری رہا۔ یہاں بھی انھیں ایک ایسے گروہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے جس کی جڑیں کہیں اور ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان صرف مسلم اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کا ہوم لینڈ ہو، اقلیتی علاقوں کے مسلمان جو اس تحریک میں پیش پیش رہے، اس کا ہراول دستہ بنے ان کے ہاتھ محرومی اور بے بسی کے علاوہ اور کچھ نہ آیا۔

'اور جو پیچھے رہ گئے ان کی آہ و فغان کا سلسلہ بھی تو تھمتا نظر نہیں آتا'، میں نے تکملہ کے طور پر عرض کیا۔

بولے: ہاں یہ ایک الگ ہی دلخراش داستان ہے۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کسی کو نہیں معلوم۔ حالات ایک خاص رخ پر کچھ اس طرح آگے بڑھتے گئے کہ آخر آخر تک لوگوں کو خطرے کا احساس نہ ہو سکا اور جب آنکھ کھلی تو ہر طرف ایک پاگل پن تھا، نقلِ مکانی تھی۔

تو کیا مسلم علما و قائدین کو اس بات کا واقعی اندازہ نہ تھا کہ آنے والے ایام مسلمانوں کے لیے اتنے سخت ہو جائیں گے۔

ہمارے علما و قائدین خطابت کے اسیر تھے، عوام بھی پرجوش تقریروں کی عادی تھی۔ سنجیدہ تحلیل و

تجزیے کا رواج کم تھا، بے ہنگم نعروں کے بطن سے خلفشار جنم لے سکتا تھا، انقلاب نہیں۔ لیکن اس وقت یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

جیلانی چچا کی باتوں میں ایک عہد کا کرب سمٹ آیا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ گفتگو کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے لیکن ابھی مدیر تکبیر سے ملاقات باقی تھی۔ میں نے چچا سے اجازت لی اور ناملکوسنٹر کی جانب چل پڑا جہاں ان دنوں ہفت روزہ تکبیر کا دفتر واقع تھا۔

شام کو جب میں وائی ایم سی اے پہنچا تو وہاں دو پولیس والوں کو اپنا منتظر پایا۔ انھوں نے پہلے تو میرے پاسپورٹ کا ایک سرسری جائزہ لیا پھر یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ اوپر آئے کہ چلیے وہیں کمرے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ پتہ چلا کہ میں کراچی میں دو دنوں سے گھوم رہا ہوں اور میرے پاس اس کے لیے کوئی باضابطہ ویزا نہیں ہے۔ یہ ضابطے کی خلاف ورزی تھی جس کا میں جانے انجانے مرتکب ہوا تھا۔ انھوں نے مختلف حیلے بہانوں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میرے پاس کتنا پیسہ ہے۔ جب انھیں یقین ہوگیا کہ میں نرا طالب علم ہوں اور میرے پاس زادِسفر کے نام پر چندسو روپے اور ان پچاس ڈالر کے علاوہ اور کچھ نہیں جس کا اندراج پاسپورٹ پر موجود تھا تو ان کے اندر کا انسان جاگ اٹھا۔ اپنے ساتھی سے کہنے لگا ان پر ہاتھ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بیچارے کسی کانفرنس کے لیے نکلے ہیں ان کے پاس نوکری کا ویزہ بھی نہیں۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا بولا: اچھا جناب یہ بتائیے آپ کانفرنس کے بعد مدینہ تو جائیں گے نا؟ جی! ان شاءاللہ، میں نے کہا۔ بولا یہ سب باتیں چھوڑیں، آپ کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں، آپ بس ایک کام کریں۔ جب آپ مدینہ جائیں تو سرکار کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دیں۔ میرا نام صدیق خاں ہے۔ یاد سے! بھولیے گا نہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے الوداعی مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا، اس کے چہرے پر ایک محبّت آمیز مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ اب اس کے رویے میں احترام تھا، عقیدت تھی کہ اب میری حیثیت سرکار کی خدمت میں سلام پہنچانے والے ایک قاصد کی تھی۔

۵۴

Gasping For Breath

رابطہ کے ہنگامی اجلاس میں قدرے تاخیر سے پہنچا۔ آج سہ روزہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ جب میں کانفرنس ہال میں داخل ہوا اس وقت مولانا علی میاں کی تقریر چل رہی تھی۔ وہ کلمۂ مندوب پیش کر رہے تھے۔ میں نے مولانا علی میاں کی عربی خطابت اور ان کی سحرالبیانی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ لوگ کہتے کہ جب وہ بولتے ہیں تو اہلِ زبان دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتے ہیں۔ آج انھیں عربوں کے درمیان براہ راست سن کر ایسا کچھ بھی نہ لگا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ سب باتیں 'مریداں می پرانند' کی قبیل سے ہیں۔ ہمارے ہاں علی گڑھ میں بھی ایک صاحب کی انگریزی دانی کا بڑا شہرہ تھا جو ہر سال انگریزوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے انگلستان کا سفر کرتے تھے۔ آگے چل کر یہ بھی معلوم ہوا کہ کلمۂ مندوب پیش کرنے کی ذمہ داری دراصل ان لوگوں کو تفویض ہوتی ہے جو مملکت کی پالیسیوں کی غیر مشروط حمایت کے قائل ہوں۔ جن دنوں پرنس سلمان ریاض کے گورنر تھے مجھے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے شرکا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ توقع تھی کہ اس دوران گورنر ریاض سے کچھ کہنے اور سننے کا موقع ملے گا۔ لیکن وہاں بھی معروف سعودی روایت کے مطابق پہلے سے ہی دو انتہائی معتمد صاحبان کو کلمہ مندوب کے لیے نامزد کر دیا گیا تھا جنھوں نے گورنر کی تعریف و توصیف میں سارا وقت ضائع کر دیا۔ حالانکہ پرنس سلمان بار بار یہ کہتے رہے کہ ہم آپ سے جاننا چاہتے ہیں کہ باہر سے چیزیں کیسی نظر آتی ہیں، آپ ہمیں بتائیے، مشورہ دیجیے۔ مگر روایتی کلمۂ مندوب میں اس کی گنجائش کہاں تھی۔ بالآخر پرنس سلمان نے زچ ہو کر مجلس برخاست کرنے میں ہی عافیت جانی۔

آج شیخ بن باز احرام میں دکھائی دیئے۔ شاید وہ بھی میری طرح عمرے سے فارغ ہو کر براہ راست جلسہ گاہ میں آ گئے تھے۔ شرکا میں اکثر لوگوں سے میں واقف نہ تھا۔ ایک انبوہِ عظیم تھا جو اس موقع پر یہاں جمع ہو گیا تھا۔ اعلانِ مکہ کے باقاعدہ اجرا میں ابھی وقت تھا سو اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اپنے پرانے کرم فرما سید حسن مطہر صاحب کے دفتر کی طرف نکل آیا جو اسی عمارت کی دوسری منزل پر

واقع تھا۔ سید صاحب میری سرگرمیوں اور فتوحات میں بڑی دلچسپی لیتے، اسے بڑی توجہ سے سنتے اور مفید مشوروں سے نوازتے رہتے۔ میں نے انھیں مسلم ملیشیا کا کتابچہ بھی ارسال کیا تھا جس پر انھیں تشویش تھی۔ کہنے لگے: نتائج پر پہنچنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہندوستانی مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں ابھی اس کے گہرے تحلیل و تجزیئے کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اہلِ یہود اپنے قومی سانحے کو ہولوکاسٹ سے تعبیر کرتے ہیں، فلسطینی مسلمانوں کو جو حادثۂ فاجعہ پیش آیا اسے انھوں نے نکبہ کا نام دیا ہے۔ کیا ہندوستانی مسلمانوں کے سانحۂ عظمیٰ کو بھی کوئی نام دیا جا سکتا ہے؟ میرے اس سوال پر وہ کچھ اس طرح چونکے، جیسے انھیں کوئی جھٹکا لگا ہو مگر خاموش رہے۔

اگلے دن وہ مجھے حرم میں مل گئے۔ کہنے لگے: تم نے بہت مناسب سوال قائم کیا ہے۔ اس حادثۂ عظمیٰ کو کوئی نام تو دینا ہی چاہیے۔ مگر کیسے دیں؟ ہمیں اس بات کا ادراک تو ہو کہ ہمارے ساتھ واقعتاً ہوا کیا؟ ہم مہاجر بنے مگر ہجرت ہمیں مطلوب نہ تھی۔ اپنے ہی وطن میں جہاں ہم صدیوں سے رہتے آئے تھے ہم پناہ گزیں کہلائے، محصورین میں ہمارا شمار ہوا، جلاوطنی ہمارا مقدر بنی، حتیٰ کہ جو لوگ کبھی اس ملک کے مقتدر اعلیٰ تھے انھیں ایک بے بس اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہماری زبان اور ثقافت اور وہ تہذیب جس کے دم سے اس ملک میں ہماری سطوت قائم تھی سب تباہ ہو گئی۔ تہذیب کی تباہی بڑا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ جس طرح رومن ایمپائر کے زوال، بازنطینی پایۂ تخت کے انہدام اور عثمانی خلافت کے سقوط کو ہم بڑا تاریخی وقوعہ گردانتے ہیں اسی طرح دہلی کا سقوط اور پھر ملک کی فرقہ وارانہ تقسیم بھی کم اندوہناک حادثہ نہیں تھا۔ مگر اب تک اس کے مالہ و ماعلیہ کا صحیح اندازہ لگایا جانا باقی ہے۔

اچھا یہ بتاؤ کیسا لگتا ہے آزاد ہندوستان میں رہنا؟ انھوں نے غالباً مجھے زچ کرنے کے ارادے سے پوچھا۔ پھر فرمایا: مجھے تو انڈیا چھوڑے ایک زمانہ ہو گیا، ویسے بھی میری علی گڑھ کی یادوں میں طالب علمانہ رومانویت کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔

'آزاد ہندوستان میں رہنا؟ بظاہر تو کوئی پریشانی نہیں بس یہ سمجھیے کہ ہر لمحہ ایسا لگتا ہے جیسے اندرون میں کوئی چیز ٹوٹ رہی ہو۔ جے پرکاش نرائن سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو یہ آزادی کیسی لگی تو انھوں نے برملا کہا tasteless۔ بس اسی پر قیاس کیجیے۔'

پھر تم میری طرح برطانیہ کیوں نہیں منتقل ہو جاتے؟

'اپنے ملک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا بہت بڑا فیصلہ ہے۔ میری تحریروں نے لوگوں میں ایک امید جگائی ہے اگر میں نے ہی میدان چھوڑ دیا تو اس چیلنج کا، جو وہاں درپیش ہے، مقابلہ کون کرے گا؟ پھر ان

گلیوں اور کھیت کھلیانوں سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔

مگر وہاں تو زندگی بے مزہ ہے؟

بے مزہ نہ کہیں، شاید یہ بھی صحیح لفظ نہیں۔ بس یہ سمجھیے کہ ایک گھٹن ہے، سانس پوری طرح نہیں آتی، ہر لمحہ جان پر بنی رہتی ہے۔ جیسے زندگی سے نشاط غائب ہو، وہ جو کہتے ہیں نا gasping for breath، میں اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

عرصہ بعد جب آکسیجن کی شدید قلت کے سبب ملک بھر میں کرونا وائرس کے مریضوں کی بے دریغ اموات ہو رہی تھیں، لوگ آکسیجن سلنڈر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے اس وقت پریشاں حال لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے ایک معروف یوگ گرو نے کہا تھا کہ کون کہتا ہے ملک میں آکسیجن کی کمی ہے۔ فضا میں آکسیجن کی کوئی کمی نہیں۔ کمی تو آپ کے کمزور پھیپھڑے میں ہے جو فضا سے مناسب مقدار میں آکسیجن کشید نہیں کر پا رہا ہے۔ تب یہ سن کر مجھے ایسا لگا کہ یوگ گرو نے میری مشکل حل کر دی ہو۔ یہی تو وہ گھٹن ہے جس کے ہم ہندوستانی مسلمان عرصے سے شکار ہیں۔ گزشتہ تہتر چوہتر برسوں سے ہم کھل کر سانس نہیں لے پا رہے ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں آکسیجن کا بہاؤ روک لیتے ہیں اور ہم کسی ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ ہمارے پھیپھڑوں میں اتنی قوت نہیں اور دستوری تحفظات ہمیں نشاطِ زندگی کا آکسیجن فراہم کرنے میں ناکام ہیں۔

تمت

اشاریہ

ث
س
ج
ط
ك
م
ط
ع
ا

مصنف کی دیگر کتابیں

ادراک زوالِ اُمت (اوّل ودوم)
کتاب العروج (تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ)
لستم یورخ (روحانیوں کے عالمی پایۂ تخت استنبول میں گیارہ دن)
کودرا (پارسی فال کے اساطیری قلعہ میں گیارہ دن)
ہندوستانی مسلمان: ایامِ گم گشتہ کے پچاس برس
غلبۂ اسلام اور دوسری تحریریں
اسلام: مستقبل کی بازیافت
اسلام: مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید
پردہ مگر کس حد تک
متحدہ اسلام کا منشور
مسلم مسئلہ کی تفہیم
ہندوستانی مسلمان: ارتداد کی زد میں
مسلم سیاسی پارٹی
ہم کیوں سیادت سے معزول ہوئے؟
اسلام میں تفسیر وتعبیر کا صحیح مقام
اسلام میں حدیث کا صحیح مقام
اسلام میں فقہ کا صحیح مقام
اسلام میں تصوف کا صحیح مقام
حقیقی اسلام کی بازیافت
کونوا ربانیین (اسلام کی آفاقی دعوت)
علمِ شرعی کی شرعی حیثیت